شاہ ولی اللہ دہلوی رح :

عربی زبان وادب میں انکا حصہ

تلخیص

مقالہ برائے

پی ایچ۔ڈی

زیر نگرانی

ڈاکٹر مسعود انور علوی

مقالہ نگار

سلمیٰ شروانی

شعبہ عربی

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۲۰۰۲ء

الخاتمة

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

برصغیر ہندوپاک سے اہل عرب کا تعلق صحابہ کرامؓ کے زمانہ سے ہی قائم ہوگیا تھا۔ سندھ (موجودہ پاکستان) اور گجرات میں عرب تاجر تو اس سے بھی پہلے سے آتے جاتے رہتے تھے۔ مغربی ساحل کی بندرگاہوں پر عرب تاجروں کے قافلوں کے ساتھ عربی زبان بھی آئی۔ اسکا ثبوت مالابار کی زبان میں عربی کے الفاظ کی کثرت ہے۔ شمالی ہند میں عربی زبان وادب ایران وافغانستان کے راستہ آیا اور آٹھویں صدی ہجری سے بارھویں صدی ہجری کے درمیان عربی زبان کے متعدد مصنفین کی تصنیفات نظر آتی ہیں۔ بارھویں صدی کے عربی ادباء و مصنفین میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا نام ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ مقالہ ہٰذا اسی شخصیت کی علمی وادبی حیثیت متعین کرنے کی غرض سے تحریر کیا گیا ہے۔ اسکا موضوع 'شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ :عربی زبان وادب میں انکا حصہ' ہے۔

کسی ادیب کی ادبی حیثیت اور ادب میں اسکا حصہ متعین کرنے کے لئے متعدد عوامل پر بحث کرنا ضروری ہے جن میں خارجی طور پر اس دور کے حالات، مصنف کے آباؤ واجداد اور اسکے ماحول کا جائزہ اسکی اپنی زندگی، تعلیم وتربیت، اساتذہ کے حالات اور پھر اسکی تصنیفات کا تذکرہ شامل ہیں۔ اسکے علاوہ اس کے معاصرین اور اس دور کے ادب کا جائزہ بھی تقابلی مطالعہ کے لئے اہم ہے۔ داخلی طور پر مصنف کی تالیفات کا مطالعہ، اسکی تحریر کے ادبی پہلو کی تلاش اور اس پہلو کو اجاگر کرنا تحقیق کا اہم حصہ ہے۔

ادب کیا ہے اور وہ کون سے عوامل اور اجزا ہیں جنکا مطالعہ اور مصنف کی تحریر پر انکا انطباق کرنے پر اسکا ادبی پہلو واضح ہوسکے، ان سوالات کا جواب بھی مصنف کے ادبی مقام کی تعیین کیلئے ضروری ہے۔ مقالہ ہٰذا میں ان تمام پہلوؤں پر غور کیا گیا ہے۔

اٹھارویں صدی عیسوی / بارھویں صدی ہجری ہندوستان میں انتہائی شورش اور انتشار کا دور تھا (یہی شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (۱۱۱۴ھ/۱۷۰۳ء تا ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) کا بھی دور تھا اسلامی حکومت (بشکل مغل سلاطین) اور اسلامی ثقافت زوال پذیر تھیں اور نئی نئی مخالف طاقتیں سر اٹھا رہی ہیں۔ ایسی صورت حال میں جو مصنفین عربی زبان میں تصنیف وتالیف کا کام کررہے تھے ان پر اس ماحول کا اثر پڑنا لازمی تھا۔ اس دور کے سیاسی، سماجی، مذہبی، اقتصادی، علمی وادبی حالات کا جائزہ کیا گیا ہے۔ اورنگزیب عالمگیر کے دور سلطنت کے آخری چار سال سے شاہ عالم ثانی کے ابتدائی ڈھائی سال تک مرکزی حکومت میں یکے بعد دیگرے تبدیلی اور درباری سازشوں کی بنا پر جو کمزوری آئی اس نے سارے ملک کا سیاسی اور حکومتی نظام درہم برہم کردیا۔ مرکز کی اس کمزوری کی بناء پر وہ جنگجو طاقتیں اور گروہ جنکو زیر کرنے کے لئے اورنگزیب کو پچاس برس لگے پھر اپنا سر ابھارنے لگیں اور انکا غصہ مسلمان

حکومت اور عوام پر اترا۔ مرہٹہ، سکھ اور جاٹ اقوام نے نہایت سنگدلانہ اور مجادلانہ رویہ اختیار کیا۔ انکے علاوہ افغان قبائل جو نادر شاہ درانی اور احمد شاہ ابدالی سے شکست کھا کر ہندوستان کی سرحد پار کر کے ملک کے شمالی حصوں میں آ گئے تھے انکی روہیلہ سرداروں کی زیر قیادت مغلوں سے کشمکش ہوئی جسکی بناء پر مغلیہ مرکز اور بھی کمزور ہو گیا۔

ان سیاسی واقعات کے مہلک اثرات معاشرہ کے تمام طبقات پر پڑے اور ہر طرف زوال پذیری، انحطاط اور مایوسی کا دور دورہ ہو گیا۔ سماجی طور پر عوام کی عادات اور طرز رہائش میں بگاڑ پیدا ہو گیا تھا اور عیش پسندی و تن آسانی کی تمام برائیاں معاشرہ میں زور پکڑ گئیں تھیں۔ عوام پر مذہب اور حکومت کی گرفت کمزور پڑنے کے باعث مذہبی برائیاں، بے اعتدالیاں اور بدعات چاروں طرف پھیل گئیں اور بدعقیدہ، کم علم و کم فہم علمائے سوء کی بن آئی جنہوں نے قرآن و حدیث کو چھوڑ کر ضعیف العقیدہ اور جاہل عوام کو اپنے بس میں کر لیا اور انکے احکام و فرمودات احکامات الٰہی سمجھے اور مانے جانے لگے جس کی بناء پر حالات بد سے بدتر ہو گئے۔ غرض کہ مرض پوری طرح مریض کی رگ و پے میں سرایت کر گیا۔

اس صورتحال میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر رحم کرتے ہوئے اسی ماحول میں ایسی ہستیاں پیدا کر دیں جو اس بگڑے ہوئے معاشرہ کی اصلاح پر کمر بستہ ہو گئیں۔ چنانچہ محمد شاہ بادشاہ کے دور میں صرف دہلی میں ہی بائیس صاحب ارشاد بزرگ موجود تھے اور شاہ ولی اللہ کے مدرسہ رحیمیہ کے علاوہ شاہ فخر الدین کا مدرسہ اور دیگر مدارس قرآن و حدیث کی ترویج و تعلیم میں کوشاں تھے اسی زمانہ میں مرزا مظہر جان جاناں، شاہ فخر الدین، شاہ عبدالغنی اور دوسرے متعدد علماء اور بزرگ عوام کی اصلاح اور بہبود کی کوششوں میں ہمہ تن مصروف تھے۔ ان بزرگوں میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی شخصیت اپنی ہمہ جہتی اور متعدد صلاحیتوں اور خوبیوں کے ساتھ اس صفحۂ ہستی پر نمودار ہوئی۔

شاہ صاحب کی شخصیت میں آپکی نسلی خصوصیات اور خاندانی بزرگوں کی صفات حمیدہ بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ نسلی اعتبار سے آپ والد کی جانب سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور والدہ کی جانب سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سلسلۂ نسب سے ہیں۔ آپ کے اجداد میں سب سے پہلے شیخ شمس الدین مفتی عرب سے ہندوستان آئے اور رہتک میں مقیم ہو گئے۔ شاہ صاحب کے بزرگوں کے حالات جاننے کے لئے ابتدائی مآخذ خود آپ کے لکھے ہوئے رسالے ہیں جن کے ذریعہ انھوں نے اپنے اجداد خصوصاً جد امجد شیخ وجیہ الدین، نسبت مادری سے اپنے جد اعلیٰ شیخ رفیع الدین، اپنے والد مرحوم شیخ عبدالرحیم اور عم مکرم شیخ ابوالرضاء وغیرہ کا تعارف کرایا ہے اور ان کے حوالے سے اپنی نسلی خصوصیات کا بیان کیا ہے۔ ان مآخذ اور دیگر تذکرہ نگاروں کی تحریروں سے شاہ

صاحب کی خاندانی نجابت اور علمی و عملی صلاحیتوں اور کارہائے نمایاں کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ان بزرگوں کی خوبیوں اور خصوصیات کا اثر کہیں براہ راست اور کہیں بالواسطہ شاہ صاحب کی زندگی، آپ کی تعلیم تربیت اور عظیم الشان کاموں پر جن میں آپکی تصنیفات اور ادبی و علمی مصروفیات شامل ہیں پڑا۔ اسی لیے آپکی ادبی و علمی زندگی کے مطالعہ کے لیے بطور پس منظر ان حضرات کا تذکرہ ضروری ہے۔ شاہ صاحب کے والد شیخ عبدالرحیم کے اساتذہ کا ذکر بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ شاہ ولی اللہ کی تعلیم و تربیت میں سب سے بڑا ہاتھ انکے والد شیخ عبدالرحیم ہی کا تھا۔ آپکی پرورش اور تربیت کے علاوہ آپ کے والد محترم نے مدرسۂ رحیمیہ کی بنیاد ڈالی جو بعد میں شاہ ولی اللہ کی زندگی میں ایک اہم سنگ میل بن گیا جہاں سے آپ نے اپنے تعلیم و تعلم اور تصنیف و تألیف کے سفر کی ابتدا کی۔ آپ کی ادبی و علمی زندگی میں مدرسۂ رحیمیہ کا بھی ایک اہم کردار ہے۔

شاہ صاحب نے اپنے حالات زندگی اپنے خودنوشت رسالہ الجزء اللطیف فی ترجمہ العبد الضعیف میں تحریر کیے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کے ماموں زاد بھائی، برادر نسبتی، محبّ، ہم عمر و ہم سبق اور پھر شاگرد اور مرید شاہ محمد عاشق پھلتی نے اپنی ضخیم تصنیف 'القول الجلی فی ذکر آثار الولی' میں آپکے تفصیلی حالات لکھے ہیں۔ دیگر مآخذ میں رحیم بخش دہلوی کی 'حیات ولی' نواب صدیق حسن خان کی 'اتحاف النبلا' اور مولانا محسن ترہتی کی 'الیانع الجنی فی اسانید الشیخ عبدالغنی' وغیرہ شامل ہیں۔ انکے علاوہ متعدد تذکرہ نگاروں نے آپ کی زندگی اور کارناموں کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔ ان مصنفین کی تصنیفات سے بھی مقالہ ہٰذا کی تیاری میں خاطر خواہ استفادہ کیا گیا ہے۔

شاہ صاحب کی ولادت ۴ شوال ۱۱۱۴ھ مطابق ۲۱ فروری ۱۷۰۳ء بروز بدھ اپنے نانہال قصبہ پھلت ضلع مظفر نگر میں ہوئی۔ بچپن سے ہی آپ کے عادات و اطوار نہایت متین اور سنجیدہ تھے۔ ابتدا ہی سے آپ کی تعلیم و تربیت کی مکمل ذمہ داری آپ کے والد شاہ عبدالرحیم نے اپنے اوپر لے لی اور نہایت توجہ، شفقت اور عرق ریزی سے اس کام کو انجام تک پہنچایا۔ علوم ظاہری کے ساتھ علوم باطنی کی تعلیم بھی جاری رہی اور ۱۵ سال کی عمر تک تمام مروجہ علوم دینی، معقولی اور علوم و اعمال روحانی سے آراستہ کر کے خرقہ و اجازت عطا کر دی۔ اس طرح شاہ صاحب کی زندگی کا پہلا دور پورا ہوا اور آپنے دور تعلیم سے دور تعلم و تدریس میں قدم رکھا۔ شاہ صاحب کا یہ دوسرا دور بارہ برس کا تھا جس میں آپ نے مدرسہ رحیمیہ میں تدریس کا فرض نبھانے کے ساتھ ہی اپنے حاصل کردہ علوم پر گویا صیقل کرنے کا کام انجام دیا جو والد مرحوم کی وفات ۱۱۳۱ھ سے ۱۱۴۳ھ تک محیط ہے۔ یہ انکا دور تربیت تھا جس نے انکو آئندہ کے عظیم المرتبت کارہائے نمایاں کے لیے تیار کر دیا۔ ۱۱۴۳ھ میں شاہ صاحب حج و زیارت کے لئے حرمین شریفین تشریف لے گیے اور دو سال کا عرصہ گذار کر ۱۱۴۵ھ میں واپس ہندوستان آئے۔ دو سال کا یہ وقفہ شاہ صاحب کی علمی و

روحانی ترقی کا نقطہ عروج ہے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اطہر پر حاضری اور حرم مصطفیٰؐ کی جاروب کشی آپکے لیے گویا معراج ثابت ہوئی۔ جس کی بدولت آپ روحانی ترقی کے اعلیٰ مدارج طے کر کے بقول خود حضور اکرمؐ کے اویسی شاگرد ہو گئے۔ اس کے بعد شیخ ابو طاہر محمد الکردی المدنی کی صحبت اور ان سے علوم ظاہری خصوصاً علم حدیث اور علم باطنی کے حصول اور خرقۂ جامع و اجازت حاصل ہونے کے بعد جب آپ واپس آئے تو آپکی شخصیت میں ایک واضح انقلاب آچکا تھا۔ ۱۱۴۵ھ سے ۱۱۷۶ھ آپکی وفات تک کا دور آپ کی زندگی کا آخری دور تھا جسکو دور تصنیف و تالیف اور دور اصلاح و تجدد کہا جاسکتا ہے جو تیس سال پر محیط ہے۔

قیام عرب کے دوران آپ نے جن علماء و مشائخ سے بالواسطہ یا بلاواسطہ کسب علم اور کسب فیض کیا ان کا ذکر شاہ صاحب نے اپنے رسالہ انسان العین فی مشائخ الحرمین میں کیا ہے۔ اس رسالہ میں آپ نے اپنے استادوں بلکہ انکے اساتذہ و شیوخ کا بھی تذکرہ کیا ہے جن کی نسبت اور فیض آپ کو حاصل ہوئے۔ یہ رسالہ اس سلسلہ میں بنیادی مأخذ ہے۔

شاہ صاحب کے وصال کے بعد آپ نے بطور یادگار اپنی اولاد، اپنے تلامذہ و خلفاء اور اپنی تصانیف چھوڑیں۔ کسی شخصیت کے کمالات اور اسکی علمی، ادبی حیثیت کے سلسلہ میں فیصلہ کرنے کے واسطے اس کی اپنی خصوصیات کے علاوہ ان ہی تینوں چیزوں کا حوالہ ضروری ہوتا ہے۔ جو طریقۂ تعلیم و تربیت آپ نے اختیار کیا اس کا اندازہ آپ کے اخلاف اور تلامذہ کی صلاحیتوں اور کارناموں سے ہوسکتا ہے اور جو رفعت و بلندی آپ نے حاصل کی وہ آپکی تصانیف سے ظاہر ہوتا ہے۔

شاہ صاحب کی اولاد و اخلاف کا جائزہ لینے کے لیے آپکے پانچوں صاحبزادوں کا تذکرہ ضروری ہے۔ ان میں ہر ایک خصوصاً شاہ عبدالعزیز اپنے دور کی تابندہ ہستی ثابت ہوئی اور آپ کا نام ان کے توسط سے مزید روشن ہوا۔

تلامذہ کی فہرست میں آپ کے متعدد شاگردوں، خلفاء و مریدین کا نام آتا ہے۔ مگر ان تمام اصحاب میں شیخ محمد عاشق پھلتی سب سے زیادہ قابل ذکر ہیں جنکا شاہ صاحب سے تعلق کئی طریقہ پر تھا۔ شاہ صاحب کی حیات و کارناموں کے سلسلے میں شاہ عاشق کی تالیف 'القول الجلی فی ذکر آثار الولی' انتہائی اہم کتاب اور بنیادی مأخذ ہے۔ ان کے علاوہ شاہ نور اللہ بڈھانوی، خواجہ محمد امین کشمیری اور شاہ ابوسعید بریلوی آپکے مخصوص شاگرد اور آپ کے نظریات و خیالات کے حاملین اور سمجھنے والے ہیں۔ انکا تذکرہ شاہ صاحب کے مقام کو سمجھنے اور متعین کرنے اور آپکی صحبت کے اثرات کے اظہار کے لیے مدد و معاون ثابت ہوسکتا ہے۔

شاہ صاحب نے جو تصانیف چھوڑی ہیں وہ زبان، موضوع اور تعداد کے اعتبار سے متعدد اور مختلف النوع

ہیں۔ سنجیدہ علمی، ادبی، مذہبی، سوانحی، تاریخی اور اصلاحی موضوعات کے علاوہ باطنی علوم اور واردات قلب کو بیان کرنے کے لیے آپنے اپنا قلم اٹھایا۔ اس طرح موضوعات کے لحاظ سے آپکی تصانیف نیرنگ اور مختلف النوع ہیں۔ جہانتک آپکی تصانیف کی تعداد کا سوال ہے مختلف تذکرہ نگاروں نے انکی تعداد مختلف لکھی ہے۔ بعض اصحاب نے انکے تصنیف کردہ کئی رسائل ایک کتاب کی شکل میں مدون کر کے انکو ایک ہی تصنیف کے ابواب یا اجزا کی شکل دی ہے۔ آپ کی چند تصنیفات بعد میں طبع ہو کر شائع ہو گئیں، بعض مخطوطات کی شکل میں ہیں اور ان میں سے بعض نایاب ہیں۔ کچھ تصنیفات ایسی ہیں جنکا صرف نام دوسری کتابوں میں ملتا ہے مگر واقعتاً انکا وجود نہیں۔ اکثر تذکرہ نگاروں نے دونوں زبانوں کی تصنیفات کو خلط ملط کر کے فہرست مرتب کی۔ مقالہ ہٰذا میں آپ کی عربی اور فارسی تصنیفات کو الگ الگ حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس طرح ۲۶ عربی کتب ورسائل اور ۲۵ فارسی کتب کی فہرست دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ان تحریروں کا تذکرہ بھی ہے جنکا صرف ذکر ملتا ہے، اصل کا وجود نہیں ملتا۔ ایک فہرست ان مخطوطات کی بھی دی گئی ہے جو مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ میں موجود ہیں اور جن سے مقالہ کی تحقیق میں مدد لی گئی ہے۔

مقالہ کے اہم ترین مرکزی حصہ میں شاہ صاحب کی تصنیفات پر ادبی نقطۂ نظر سے تحقیق کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے ادب کی تعریف اور ان عناصر کی نشاندہی ضروری ہے جو ایک اچھے ادیب کی کاوش میں پائے جائیں۔ یہ عناصر عاطفہ، اسلوب اور فکر یا معانی (موضوع) ہیں۔ عاطفہ کی کمی وبیشی، اسکی تربیت وترقی، خیال کی ندرت ووسعت، اسلوب کی نیرنگی، تحریر میں لسانی خصوصیات، صنائع وبدائع اور محسنات معنویہ ولفظیہ کا استعمال اور افکار کا انتخاب، انکی منطقی ترتیب، انکی وضاحت یا ابہام، یہ وہ تمام نکات ہیں جو ایک شاعر وادیب کو دوسرے سے متمیز کرتے ہیں۔

بارہویں صدی ہجری میں ہندوستان میں عربی ادب کا کیا مقام تھا؟ لسانی اعتبار سے عربی زبان کی کیا اہمیت تھی؟ ادبی لحاظ سے اسوقت کی عربی نظم ونثر کس قسم کی تھی؟ شاہ صاحب نے اپنی تحریروں میں اس زمانہ کے اسلوب نگارش میں سے کیا اختیار کیا اور کیا ترک کیا؟ ان سوالوں کے جواب آپ کی ادبی حیثیت کے تعین کے لیے ضروری ہیں۔

فطری طور پر شاہ صاحب کے اندر عاطفہ کا عنصر فراوانی سے پایا جاتا ہے جس کو انہوں نے اپنی محنت اور مطالعہ سے بام عروج پر پہنچا دیا۔ آپ کی تحریر میں خیالات کی پختگی، اظہار خیال میں مہارت اور الفاظ پر مکمل قدرت نظر آتی ہے۔ ساتھ ہی اس قلبی اطمینان اور ذہنی سکون کا بھی اظہار ہوتا ہے جو ایک قادر الکلام مصنف کیلیے

ضروری ہے۔ شاہ صاحب نے اس دور کے فارسی سے متاثر ثقیل اور مصنوعی طرز سے ہٹ کر سنجیدہ اور دقیق موضوعات کے لیے ایک نہایت سلیس اسلوب کا انتخاب کیا جو تصنع سے پاک وصاف ہے لیکن ادبی ولسانی خصوصیات ومحاسن سے مالا مال ہے اسکے ساتھ ہی قدیم اور کلاسیکی ادب کی فطری سادگی اس کا طرہ امتیاز ہے۔ فکری اعتبار سے شاہ صاحب نے زیر بحث ہر موضوع میں معانی کی نئی توجیہ کی ہے اور رموز وحقائق کی تہ تک پہنچ کر معانی کو نیا جامہ پہنایا۔

شاہ صاحب کی تصانیف میں سے نثر میں آپ کی نمائندہ اور مشہور کتب **حجة الله البالغه، البدور البازغه، الانصاف فی بیان سبب الاختلاف، الخیر الکثیر، التفهیمات الالهیه** اور آپ کے مکتوبات اور نظم میں قصیدہ **اطیب النغم، قصیده همزیه، قصیده لامیه** اور آپکے دیوان سے انتخاب کر کے ان تمام کتابوں کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان میں سے اقتباسات لے کر مندرجہ بالا اصولوں کی روشنی میں آپکے تحریر کردہ ان شہ پاروں کی ادبی حیثیت کا مفصل تجزیہ کیا گیا ہے۔ اور اسکے ذریعہ شاہ صاحب کی عربی تحریر کی ادبی خصوصیات کو اجاگر کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

شاہ صاحب کی تصانیف کا ادبی اعتبار سے تفصیلی جائزہ لینے کے بعد آپ کے ادبی مقام کی جانب اشارہ کرتے ہوئے موضوع، اسلوب اور زبان کے لحاظ سے عربی زبان وادب میں آپکا حصہ متعین کیا گیا ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی شخصیت اپنے دور کی ایک عبقری شخصیت تھی۔ آپکے دور سے آج تک اکثر تذکرہ نگاروں اور محققین نے آپ کے تحریر کردہ ادب اور فن پر گرانقدر آراء کا اظہار کیا ہے۔ ان بیش قیمت آراء سے شاہ صاحب کی ممتاز حیثیت قاری کے سامنے آجاتی ہے۔ چنانچہ ان آراء کو بھی آپکے ادبی مقام کی تعیین کے عمل میں شریک کرتے ہوئے نقل کیا گیا ہے۔

مقالہ کے آخری حصہ میں شاہ ولی اللہ کے چند اہم معاصرین کا ذکر ہے اور اس تناظر میں ان معاصرین کے تخلیق کردہ ادب سے آپ کے ادب کا موازنہ کرتے ہوئے اور دور کے ادب میں آپ کے منفرد مقام اور حصہ کو بیان کیا گیا ہے۔ اسکے بعد اختتامیہ کلمات تحریر کرتے ہوئے یہ مقالہ اختتام پذیر ہوتا ہے۔

فالحمدلله. ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم-- والسلام علیٰ من اتبع الهدیٰ

تمت بالخیر

SHAH WALI ULLAH DEHLAVI :

HIS CONTRIBUTION TO ARABIC LANGUAGE AND LITERATURE

ABSTRACT

THESIS

SUBMITTED FOR THE AWARD OF THE DEGREE OF

Doctor of Philosophy

IN

ARABIC

BY

SALMA SHERWANI

UNDER THE SUPERVISION OF

DR. MASOOD ANWAR ALAVI

DEPARTMENT OF ARABIC
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH (INDIA)

2002

شاہ ولی اللہ دہلوی رح :

عربی زبان وادب میں انکا حصہ

مقالہ برائے

پی ایچ۔ڈی

زیرنگرانی

ڈاکٹر مسعود انور علوی

مقالہ نگار

سلمیٰ شروانی

شعبہ عربی

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۲۰۰۲ء

T- 6251

T6251

بسم الله الرحمن الرحيم

انتساب

اپنے محترم والدین کے نام

جن کی مشفقانہ دعاؤں

کے سبب میں اس لائق ہوئی۔

رب ارحمھما کما ربیانی صغیراً

قسم اللغة العربية و آدابها
جامعة عليكره الاسلامية، عليكره (الهند

External : 709062
Uny. Ex. : 700920
Internal : 222
DEPARTMENT OF ARABIC
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH–202002 (U.P.), INDIA

التاريخ .....

Dated .....
12.12.2002

To Whom It May Concern

This is to certify that **Ms. Salma Sherwani** Enrolment No. V-4009 has completed her Ph.D. thesis entitled **"Shah Wali Ullah Dehlavi: His Contribution to Arabic Language and Literature"** under my supervision successfully. This is an original contribution and it is now recommended for the award of Ph.D. in Arabic.

(Dr. Masood Anwar Alavi)
SUPERVISOR
Department of Arabic
A.M.U. Aligarh.

فہرست مضامین

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱۔	مقدمہ	۱-۹
۲۔	باب اول: اٹھارویں صدی کے ہندوستان کے سیاسی، سماجی، مذہبی، اقتصادی، علمی اور ادبی حالات	۱۰-۴۸
	سیاسی حالات	۱۱
	(۱) بہادر شاہ اول	۱۳
	(۲) فرخ سیر	۱۵
	(۳) محمد شاہ بادشاہ	۱۶
	مرکز کی کمزوری کے اثرات	۲۰
	(۱) مرہٹہ تحریک	۲۱
	(۲) سکھ تحریک	۲۶
	(۳) جاٹ تحریک	۳۰
	(۴) روہیلے	۳۱
	ہندوستانی معاشرہ پر تاریخی واقعات کا اثر	۳۵
	سماجی، ثقافتی، تہذیبی و مذہبی حالات	۳۶
	علماء و مشائخ کی کمزوریاں	۳۹
	اقتصادی حالات	۴۳
	علمی و ادبی حالات	۴۸
۳۔	باب دوم: شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا خاندان اور اسکی اہم شخصیات	۴۹-۹۴
	سلسلۂ نسب	۵۴
	شیخ شمس الدین مفتی	۵۶
	شجرۂ اولاد شیخ شمس الدین	۶۰
	شیخ کمال الدین	۶۱
	شیخ عبدالملک	۶۲

شیخ بدھا ۶۲

شیخ معظم ۶۵

شاہ صاحب کے دادا شیخ وجیہ الدین شہید ۶۷

شیخ طاہر ۷۱

شیخ حسن ۷۲

شیخ خیالی۔ شیخ عبدالعزیز شکر بار۔ شیخ قطب عالم ۷۳

شیخ رفیع الدین ۷۴

شیخ ابوالرضاء محمد ۷۷

شاہ صاحب کے والد شیخ عبدالرحیم ۸۱

(۱) تدوین فتاویٰ عالم گیری ۸۶

(۲) مدرسہ رحیمیہ کا قیام ۸۸

(۳) تربیت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ۸۸

عام معمولات ۹۰

ازدواج واولاد ۹۱

تذکرۂ اجداد کا مقصد ۹۲

(۱) علم دین کے ساتھ باطنی سلسلوں سے تعلق ۹۲

(۲) انساب کی حفاظت ۹۳

(۳) شجاعت وتہور ۹۴

۴۔ باب سوم : شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ۔ حالات زندگی ۹۵-۱۷۱

سوانحی مأخذ ۹۶

حالات زندگی ۹۸

نسب ۹۸

پیدائش ۹۹

عادات واطوار ۱۰۲

تعلیم وتربیت ۱۰۴

روحانی تربیت ۱۰۹

ازدواج ۱۱۰

اجازت بیعت ووفات شاہ عبدالرحیم ۱۱۵

درس وتدریس ۱۱۷

طریقہ تعلیم ۱۱۸

سفر برائے حصول درجات ۱۲۰

سفر حج ۱۲۲

اساتذۂ شیخ ۱۲۸

(۱) شیخ وفداللہ ۱۲۹

(۲) شیخ ابوطاہر المدنی الکردی ۱۳۱

(۳) شیخ تاج الدین قلعی ۱۳۵

وہ مشائخ جن سے بالواسطہ فیض پہنچا ۱۳۶

(۱) شیخ ابراہیم کردی ۱۳۷

(۲) شیخ احمد قشاشی ۱۳۸

(۳) شیخ احمد شناوی ۱۳۹

(۴) محمد بن محمد بن سلیمان المغربی ۱۳۹

(۵) سید عبدالرحمٰن ادریسی المجوب ۱۴۰

(۶) شیخ عیسیٰ المغربی ۱۴۱

(۷) شمس الدین محمد بن العلاء البابلی ۱۴۱

(۸) شیخ حسن عجمی ۱۴۲

(۹) شیخ احمد نخلی ۱۴۲

(۱۰) شیخ عبداللہ بن سالم مکی ۱۴۳

حالات شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ در حجاز ۱۴۴

واپسی از سفر حج وحالات تا انتقال ۱۴۸

اخلاف شیخ ۱۵۲

اولاد صلبی ۱۵۲

شجرۂ اولاد واحفاد ۱۵۳

(۱) شیخ محمد ۱۵۴

(۲) شاہ عبدالعزیز ۱۵۵

(۳) شاہ رفیع الدین ۱۵۷
(۴) شاہ عبدالقادر ۱۵۹
(۵) شاہ عبدالغنی ۱۶۰
تلامذہ ومریدین ۱۶۱
(۱) شیخ محمد عاشق پھلتی ۱۶۱
(۲) شاہ نوراللہ پھلتی (بڈھانوی) ۱۶۸
(۳) خواجہ محمد امین کشمیری ۱۶۹
(۴) شاہ ابوسعید بریلوی ۱۷۰
۵۔ باب چہارم: علمی وادبی خدمات (عربی وفارسی) ۱۷۱-۱۹۳
(۱) زبان ۱۷۴
(۲) موضوعات ۱۷۶
(۳) تعداد ۱۷۷
عربی تصانیف (فہرست) ۱۷۹
فارسی تصانیف (فہرست) ۱۸۶
۶۔ باب پنجم: شاہ صاحب کی عربی تصانیف (نثر نگاری وشاعری) اور زبان وادب میں ان کا حصہ ۱۹۵-۳۳۸
ماالادب ۱۹۶
(۱) العاطفہ ۱۹۷
(۲) خیال ۱۹۸
(۳) اسلوب ۲۰۰
(۴) فکر یا معانی ۲۰۰
عربی ادب کا ہندوستان میں مقام ۲۰۱
شاہ صاحب کی تحریر کی خصوصیات ۲۰۵
(الف) العاطفہ ۲۰۵
(ب) خیال ۲۰۶
(ج) اسلوب ۲۰۸
(د) فکر یا معانی ۲۱۲
شاہ ولی اللہؒ کا نثری ادب ۲۱۴

حجۃ اللہ البالغہ اور عربی ادب میں اس کا مقام ۲۱۴

شاہ صاحب کی دیگر تصانیف اور ادب میں انکا مقام ۲۵۴

الانصاف فی بیان سبب الاختلاف ۲۵۵

العقد الجید ۲۵۸

البدور البازغہ ۲۶۱

الخیر الکثیر ۲۶۶

دیگر تصنیفات ۲۷۲

الدر الثمین ۲۷۴

التفہیمات الالٰہیہ ۲۷۶

مکتوبات ۲۸۰

شاہ صاحب کا منظوم ادب ۲۹۱

اطیب النغم ۲۹۳

قصیدہ ثانی ہمزیہ ۳۰۹

دیوان اشعار ۳۲۱

شاہ ولی اللہؒ کا ادبی مقام ۳۳۱

(۱) موضوع ۳۳۲

(۲) اسلوب ۳۳۳

(۳) زبان ۳۳۳

شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی ادبی حیثیت دیگر اصحاب قلم کی نظر میں ۳۳۵

۷۔ باب ششم: چند ہم عصر ممتاز شخصیتیں ۳۳۹-۳۶۲

(۱) شاہ فخر الدین دہلوی ۳۴۱

(۲) میر غلام علی آزاد بلگرامی ۳۴۷

(۳) مرزا مظہر جان جاناں ۳۵۱

(۴) سید مرتضیٰ بلگرامی زبیدی ۳۵۵

۸۔ اختتامیہ ۳۶۳-۳۶۵

۹۔ ضمیمہ ۳۶۷-۳۷۸

۱۰۔ مصادر و مراجع ۳۷۹-۳۹۰

بسم اللہ الرحمن الرحیم .

مقدمہ

الحمد للہ رب العالمین. والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید الانبیاء و المرسلین خاتم النبیین سید نا و مولانا محمد النبی الامی وعلیٰ اٰلہٖ و اصحابہٖ اجمعین امابعد

راقمہ اپنے دوران تعلیم اپنے اساتذہ کی زبانی ہندوستان کے عربی زبان وادب کے مصنفین کے سلسلہ میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ برابر سنتی رہی اس وقت ذہن کے کسی گوشہ میں یہ خیال بھی نہ تھا کہ پی ایچ۔ڈی کے تحقیقی مقالہ کے واسطہ ''شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ: عربی زبان و ادب میں ان کا حصہ'' جیسے موضوع پر کام کرنے کا موقع ملے گا۔عربی ادب میں ایم۔اے۔کرنے کے بعد جب پی ایچ۔ڈی۔میں داخلہ کی نوبت آئی تو استاد محترم جناب مسعود انور علوی نے مشورہ دیا کہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی شخصیت کے ادبی پہلو پر کام کرو۔اس وقت میں شاہ صاحبؒ کی حیات وعلمی کارناموں سے صرف اس حد تک واقف تھی کہ ہندوستانی عربی ادب کے خصوصی امتیازی پرچہ میں دوسرے ہندوستانی ادباء وشعرا کی طرح ان کا بھی مطالعہ کیا تھا۔اس لئے اس کام کو آسان سمجھ کر بخوشی آمادگی کا اظہار کر دیا اور اس طرح شاہ صاحب سے واقفیت کا سفر شروع ہوا۔ لیکن بہت جلد احساس ہو گیا کہ یہ کام اتنا آسان نہ تھا جتنا میں نے سمجھ لیا تھا۔

شاہ صاحب علیہ الرحمہ کی شخصیت بڑی متنوع اور ہمہ جہتی ہے اور آپکی تصانیف مختلف النوع موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔تقریباً ڈھائی سو برس کے عرصہ میں متعدد لوگوں نے آپکی شخصیت اور علمی کارناموں پر الگ الگ زاویہ سے تحقیق کی ہے اور آپکو اپنے دور کا مجدد، مصلح، محقق، عالم، علوم ظاہری و باطنی کا ماہر ایک عبقری شخصیت ثابت کیا ہے۔لیکن بہت کم حضرات نے آپکی ان تمام خصوصیات کو مدنظر رکھتے ہوئے آپکے ادبی مقام کا کما حقہ، تجزیہ کیا ہے۔مختلف تذکرہ نگاروں نے اپنی تصانیف میں اگر چہ اس طرف اشارے کئے ہیں اور اس پہلو پر کام کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے لیکن خالصتاً اسی نقطہ نظر سے غالباً کسی نے بھی اس پر اب تک باقاعدہ قلم نہ اٹھایا اسی لئے اس سلسلہ میں بہت کم مواد میسر آتا ہے جسکی تلاش اس تحقیق کا مشکل ترین مرحلہ تھا۔

اس سلسلہ میں جو مسائل درپیش تھے انمیں سب سے پہلا مسئلہ خود شاہ صاحب کی تصانیف اور دیگر مصادر و مآخذ کا تھا۔مولانا حافظ شاہ تقی انور علوی کاکوروی نے القول الجلی فی ذکر آثار الولی کے اردو ترجمہ کے مقدمہ میں

اور مولانا حکیم محمود احمد برکاتی نے اپنی کتاب 'شاہ ولی اللہ اور انکا خاندان' میں شاہ صاحب کی ان تصانیف کا ذکر کیا ہے جنکے یا تو کوئی مخطوطات موجود نہیں یا صرف انکا نام دوسری تصنیفات میں ملتا ہے علاوہ ازیں ان تصنیفات کا بھی ذکر ہے جن میں تحریف کی گئی ہے یا کسی دوسرے کی تصنیف کو شاہ صاحب کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے ایسی تصنیفات کسی لحاظ سے اور خصوصاً ادبی لحاظ سے شاہ صاحب کی ان تالیفات کے ساتھ نہیں رکھی جا سکتیں جو مسلمہ طور پر آپ کی تحریر کردہ ہیں (ان کے بارے میں تحقیق ایک الگ موضوع ہے)۔

ان بنیادی مآخذ کے علاوہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے تذکرہ نگاروں نے آپکی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر جو تحقیقات کی ہیں اسکو اس تحقیق میں پیش نظر رکھا گیا ہے اور ان سے مدد لی گئی ہے ان تمام کتب کو مصادر و مراجع کی فہرست میں شامل کر دیا گیا ہے۔

شاہ صاحب کی مطبوعہ مصنفات کے مخطوطات بھی ابتداء ہی سے کم یاب ہیں۔ فتح الخبیر، حجۃ اللہ البالغہ، البدور البازغہ، ازالۃ الخفاء، قرۃ العینین جب پہلی بار شائع ہوئیں تو انکے ناشرین کو انکے علیٰ الترتیب ایک، چار، تین، تین اور ایک مخطوطے دستیاب ہوئے تھے۔ مذکورہ بالا کتب میں پہلی کتاب ۱۸۳۴ء میں ہوگلی سے شائع ہوئی اور ناشر کو صرف ایک نسخہ ملا تھا۔ یہ کم یابی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور سقوط سلطنت دہلی (مغلیہ) سے بھی ۲۳ سال قبل اور شاہ صاحب کی وفات کے ستر سال کے اندر اندر شروع ہوگئی تھی۔ اس صورتحال کا اندازہ صرف اسی واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ مولوی سید احمد جو شاہ رفیع الدین ابن شاہ ولی اللہ کے نواسے کے پوتے تھے انھوں نے مصنف نزھۃ الخواطر مولوی سید عبدالحیٔ حسنی سے ہمعات بھیجنے کی فرمائش کی اور جب تفہیمات الٰہیہ شائع ہوئی تو اسکے آخر میں یہ اپیل بھی شائع ہوئی کہ جن حضرات کے پاس اس خاندان کے اکابر کے رسائل ہوں وہ ہمیں عاریتاً فراہم کریں کہ ہم انہیں طبع کرا سکیں (۱) اسکے علاوہ ابتدائی مطبوعات جنکو شائع ہوئے سو سال سے زیادہ کا عرصہ گذر گیا انکے نسخہ جات بھی بہت کمیاب ہیں۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ ادارہ علوم اسلامیہ میں پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی ڈائریکٹر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ریسرچ سیل نے انتہائی عرق ریزی سے شاہ صاحب کی تصانیف اور آپکے تذکرہ نگاروں کی کاوشوں کو یکجا کر کے عربی و علوم اسلامیہ کی مشترکہ لائبریری میں ایک الگ سیکشن کی شکل دیدی جہاں سے شاہ ولی اللہ پر تحقیق کرنے والے مستفیض ہو سکیں۔ اسکے علاوہ شاہ صاحب کی تصنیفات یا انکے تراجم اگر اصل حالت میں دستیاب نہ ہو پائے تو جہاں سے بھی ہو سکا انکے فوٹو کاپی نسخہ جات کو منگوا کر کتابی شکل میں مجلد کر کے یہاں رکھا گیا ہے۔ اگرچہ اس لائبریری میں مخطوطات کا کوئی الگ شعبہ نہیں لیکن چونکہ یہ سلسلہ

---

(۱) شاہ ولی اللہ: مولانا برکاتی، صفحہ ۳۵۔

چونکہ یہ سلسلہ برابر جاری ہے لہٰذا امید ہے کہ یہ اہم کام بھی جلد یا بدیر پایہ تکمیل کو پہونچے گا۔(انشاءاللہ تعالیٰ)

اس ریسرچ سیل سے راقمہ کو اپنی تحقیق میں بے حد مدد ملی ہے۔اسکے علاوہ مولانا آزاد لائبریری اور شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی کی لائبریری سے بھی میں نے بہت استفادہ کیا اور تاریخی مواد کے بنیادی مآخذ وہیں سے مہیا کئے ہیں۔شاہ رفیع الدین کے تدوین کئے ہوئے دیوان شاہ ولی اللہ کا جو مخطوطہ ندوۃ العلماء کی لائبریری میں ہے اسکی فوٹو کاپی سے آپکے دیوان کی ادبی حیثیت متعین کرنے میں بڑی مدد ملی۔

دوسرا مسئلہ جو اس تحقیق کے سلسلہ میں پیش نظر تھا وہ ادب کی تعریف اور ادیب و ادب کے رشتہ کے بارے میں تھا۔ماالادب۔ادب کیا ہے؟ ایک ادیب کی تصنیفات کے مطالعہ سے اسکی ادبی حیثیت اور ادب میں اسکا حصہ متعین کرنے کے لئے کن خصوصیات نگارش کا جائزہ لیا جانا ضروری ہے؟ کسی ادیب کے ادب کا اسکی زندگی، اسکے ماحول، اسکے معاصرین اور اسکی اپنی تصانیف سے کیا تعلق اور رشتہ ہے اور وہ کون سے عوامل ہیں جنکا اثر ادیب کے تخلیق کردہ ادب پر پڑتا ہے؟ یہ سارے سوالات ادیب کا مقام متعین کرنے کے لئے ضروری ہیں اور ان پر غور کرنے کے بعد ہی ادیب کے بارے میں کوئی رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ان سوالات کے پیش نظر ہماری تحقیق کا دائرہ کار اور زیادہ وسیع ہو جاتا ہے۔ایم-اے کے دوران جو مقالہ بطور desertation میں نے تحریر کیا تھا اسکا عنوان تھا ماالادب۔اس عنوان کے تحت ادب کی تعریف اور ادیب سے اسکے رشتہ کے بارے میں جو خیالات ظاہر کئے گئے تھے وہ اسوقت بہت کام آئے اور انہیں خطوط پر مزید مطالعہ سے نئی راہیں کھلیں اور مقالہ ہٰذا کو وسعت دینے میں مدد ملی۔علاوہ ازیں ضروری محسوس ہوا کہ شاہ صاحب کی زندگی، آپکے آباء واجداد، آپکی تعلیم و تربیت، اساتذہ، اخلاف وطلباء اور ان پر آپکی دی ہوئی تربیت کا اثر غرضکہ ہر اس عمل کا جائزہ لیا جائے جسکا اثر آپکی تصنیف و تالیف پر پڑا ہو یا جو آپکی علمی و ادبی حیثیت کے تعین اور عربی ادب میں آپکا حصہ متعین کرنے میں مددگار ثابت ہو۔

تیسرا مسئلہ شاہ صاحب کی تصانیف اور کتب کا تھا۔مختلف تذکرہ نگاروں نے آپکی عربی و فارسی تصانیف کی فہرست مرتب کی ہے۔ان میں آپ کی تصنیف کردہ تمام مطبوعہ و غیر مطبوعہ تحریریں ہیں جو آپ کے قلم سے معرض وجود میں آئیں اور ان کتب کا بھی ذکر ہے جنکا صرف نام ہی سننے میں آتا ہے۔ان تمام تصانیف میں سے عربی اور فارسی کی تصانیف کو علیحدہ کر کے انکی فہرست مرتب کرنا بھی آپکے کام کا جائزہ لینے کے لئے ضروری تھا۔

اگلا مسئلہ جو سب سے اہم اور سب سے مشکل تھا وہ خود شاہ صاحب کی عربی تصانیف نظم ونثر کا مطالعہ اور ان میں سے ان کتابوں کے انتخاب کا تھا جن سے آپ کے تحریر کردہ ادب کی ادبی خصوصیات واضح ہوسکیں۔ شاہ صاحب کے منتخب کردہ ادق اور انتہائی سنجیدہ موضوعات، آپکی تحریر کردہ زبان اور آپکے باطنی تصورات اور خیالات کو سمجھنا انتہائی مشکل مرحلہ تھا۔ جسمیں قدم قدم پر مجھ کو اپنے مشفق اور ہمدرد استاد اور نگراں محترم جناب ڈاکٹر مسعود انور علوی سے مدد ملی جسکے بغیر اس مقالہ کو مکمل کرنا شاید میرے لئے ممکن نہ ہوتا۔ شاہ صاحب کی عربی تصنیفات جنکا ذکر باب چہارم میں کیا گیا ہے ان سب کا جائزہ لینا میرے لئے دشوار تھا۔ اس لئے ان میں سے ان کتابوں کا انتخاب کیا گیا جو انکی تحریر کردہ کتب میں سب سے زیادہ نمائندہ حیثیت رکھتی ہیں اور مشہور ہیں۔ نثر میں حجۃ اللہ البالغہ، البدور البازغہ، الخیر الکثیر، الدر الثمین، التفہیمات الالٰہیہ کے علاوہ آپ کے مکتوبات شامل تھے اور نظم میں مشہور قصیدہ بائیہ اطیب النغم کے علاوہ قصیدہ ہمزیہ اور دیوان عربی تھا جو آپکے صاحبزادہ نے مدون کیا تھا۔

آخری مسئلہ جو اس سلسلہ میں قابل غور تھا وہ ہندوستان میں تحریر کردہ عربی ادب خصوصاً شاہ صاحب کے دور حیات میں آپکے معاصرین کی کاوشوں کا جائزہ لینے کا تھا تاکہ اس تمام ادب میں آپ کے حصہ کو متعین کیا جاسکے اور آپکا ادبی مقام مقرر کیا جاسکے۔

ان تمام مسائل اور حالات کے پیش نظر مقالہ ہٰذا کے ابواب قائم کئے گئے ہیں اور ہر مسئلہ پر علیحدہ علیحدہ باب کے تحت غور کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس مقالہ میں چھ ابواب ہیں اسکے بعد بطور اختتامیہ نتائج اخذ کئے گئے ہیں۔

باب اول جو شاہ صاحب کے دور ۱۱۱۴ھ/۱۷۰۳ء کے حالات پر محیط ہے اسمیں چار عنوانات اور ۱۲ ذیلی عنوانات کے تحت اس دور کے سیاسی، سماجی، ثقافتی، تہذیبی، مذہبی، اقتصادی، علمی اور ادبی حالات کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔

باب دوم میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے خاندان اور اسکی اہم شخصیات کا تذکرہ ہے۔ اس باب میں ان نسلی خصوصیات کی جانب بھی اشارہ کیا گیا ہے جو شاہ صاحب کی زندگی اور آپکی تصنیفات پر اثر انداز ہوئیں۔

باب سوم میں خود حضرت شاہ صاحب کے حالات زندگی اور آپکے اخلاف، اساتذہ وتلامذہ کا ذکر ہے۔ باب کی ابتداء میں ان مآخذ کا تذکرہ ہے جن سے اس سلسلہ میں مواد حاصل کیا گیا ہے۔ ان مصادر میں خود شاہ صاحب کی تصنیف کردہ کتب سے بھی حوالہ جات ہیں جو بنیادی مآخذ کے طور پر استعمال کی گئی ہیں۔

باب چہارم میں شاہ صاحب کی تحریر کردہ مطبوعہ وغیر مطبوعہ، دستیاب شدہ اور ناپید تمام عربی وفارسی کتب و رسائل کی فہرست درج کی گئی ہے۔ اوران مخطوطات کا ذکر ہے جنکا ذکر نسیم احمد فریدی نے اپنی کتاب 'نادر مکتوبات شاہ ولی اللہ محدث دہلوی' میں کیا ہے۔

باب پنجم اس مقالہ کا سب سے زیادہ ضخیم اور سب سے زیادہ اہم حصہ ہے۔ اس حصہ میں پانچ عنوانات قائم کئے گئے ہیں۔ ان کے تحت ہندوستان میں عربی زبان وادب کی تاریخ اور اسکی علمی حیثیت پر بحث کی گئی ہے۔ اسکے بعد ماالادب کے تحت ادب کی تعریف اور اسکے اہم اجزاء کا تذکرہ ہے جن کے پیش نظر کسی ادیب کی ادبی کاوشوں کو جانچا پرکھا جا سکتا ہے۔ ادب اور اسکے عوامل کی تعریف کے بعد شاہ صاحب کی منتخب کردہ منثور و منظوم تحریروں اور تالیفات کے اقتباسات کے ذریعہ انکے ادبی پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں نثر اور نظم کے حصوں کا الگ الگ عنوان کے تحت تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس تفصیلی تجزیہ کے بعد مختلف مشہور ادیبوں اور صاحبان قلم کی شاہ صاحب اور انکی تصانیف کے بارے میں آراء کو بیان کیا گیا ہے۔ ان پر یہ باب پایہ تکمیل کو پہنچتا ہے۔

باب ششم میں شاہ ولی اللہ کے معاصرین میں سے چند اصحاب کا ذکر ہے جو آپکے دور میں عربی ادب کے مختلف میدانوں میں اپنے قلم کے جوہر دکھا رہے تھے۔ ان میں سے کچھ تو وہ ہیں جو آپ کے انتہائی قریبی دوست یا شاگرد تھے اور جن سے آپ کے قریبی روابط تھے ایسے بھی معاصرین ہیں جنکا کبھی شاہ صاحب سے کوئی واسطہ بلکہ ملاقات تک ثابت نہیں لیکن آپکے ہم عصر اور ہم وطن ہونے کے ناطے جنکی تحریروں کا تقابل شاہ صاحب کی تحریروں سے کرتے ہوئے شاہ صاحب کی ادبی حیثیت اور مقام کی نشاندہی کی گئی ہے۔

باب ششم کے بعد بطور اختتامیہ ان تمام مباحث کے نتائج اخذ کرتے ہوئے اس مقالہ کو ختم کیا گیا ہے۔ مقالہ کے خاتمہ پر بطور ضمیمہ ان فارسی اور عربی مخطوطات کی تفصیل دی گئی ہے جو مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں موجود ہیں۔

اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ میری اس کاوش کو قبول فرمائے۔ آمین

الحمدللہ کہ مقالہ 'شاہ ولی اللہ محدث دہلوی: عربی زبان وادب میں آپکا حصہ' اختتام پذیر ہوا اب میری یہ حقیر کاوش پیش نظر ہے۔ اسکے لئے میں اللہ تعالیٰ کی شکر گذار ہوں کہ اس نے مجھے ہمت دی اور توفیق عطا فرمائی کہ اس کام سے عہدہ برا ہوسکوں۔ اگر اسکا کرم اور حکم نہ ہوتا تو ہرگز یہ کام پورا نہیں ہوسکتا تھا۔

گر برتن من زبان شود ہر سرمو　　یک شکر تو از ہزار نہ توانم کرد

اسکے بعد میں اپنی اس کاوش کے لئے اپنے محترم استاد اور شفیق نگراں جناب ڈاکٹر مسعود انور علوی ریڈر شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی۔ علیگڑھ کی ممنون ہوں جنہوں نے نہ صرف میری ہمت افزائی فرمائی بلکہ ہر ہر قدم پر میری مدد کی۔ مآخذ و مصادر کے انتخاب سے لے کر انکے مطالعۂ مقالہ کی تحریر، نفس مضمون کی اصلاح اور نہایت عرق ریزی سے اس پر نظر ثانی کرنے تک انکے مفید مشورے اور توجہ میرے شامل حال رہے۔ باوجود اپنی معلمانہ مصروفیات کے انھوں نے اپنے بیش قیمت اوقات میں سے ہمیشہ میرے لئے وقت نکالا اور انتہائی شفقت سے میری رہنمائی کی۔ میں اسکے لئے ان کی سب سے زیادہ مشکور ہوں۔

شعبہ عربی کے صدر کی حیثیت سے محترم پروفیسر عبدالباری صاحب شعبہ کے تمام اساتذہ، طلباء اور کارکنان کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ اپنی تحقیق کے سلسلہ میں جب بھی مجھے کسی قسم کی دقت پیش آئی اور جسوقت بھی میں نے صدر محترم سے رجوع کیا انھوں نے بطور خاص میری گزارشات کو سنا اور میرے مسائل کو حل کرنے میں ہر طرح مدد فرمائی، میری کوتاہی ہوگی اگر میں انکا شکریہ نہ ادا کروں۔

شعبہ عربی میں میری تعلیمی زندگی کا ایک طویل عرصہ گذرا ہے اور میرے شفیق اساتذہ نے اس علمی سفر میں ہمیشہ میری رہنمائی اور معاونت کی ہے۔ میری بڑی ناسپاسی ہوگی اگر اس موقعہ پر میں ان تمام اساتذہ کو فراموش کر دوں۔ چنانچہ میں خاص طور پر سابق صدر محترم پروفیسر راشد ندوی محترم پروفیسر سید کفیل احمد قاسمی، محترم ڈاکٹر صلاح الدین عمری اور محترم ڈاکٹر فیضان احمد صاحبان اور اپنے شعبہ کے تمام اساتذہ کی مشکور اور انکی دعاؤں کی طالب ہوں۔

ادارہ علوم اسلامیہ میں قائم شدہ شاہ ولی اللہ دہلوی ریسرچ سیل کے کتب خانہ سے مجھے اپنی تحقیق کے سلسلہ میں بہت مدد ملی ہے کتابوں کی فراہمی، انکے مطالعہ اور ان سے اقتباسات حاصل کرنے کے سلسلہ میں اراکین لائبریری بالخصوص جناب کبیر احمد صاحب اور جناب خالد صاحب کا تعاون مجھ کو حاصل رہا ہے۔ اگر میں انکو یاد نہ رکھوں تو یہ زیادتی ہوگی۔ لہٰذا میں بطور خاص ان حضرات کی ممنون و مشکور ہوں۔ اسکے ساتھ شعبہ عربی میں اپنے تمام ساتھیوں، ہم جماعتوں اور ہمدردوں کی بھی ممنون ہوں جنکا خلوص و محبت مجھے ہمیشہ تقویت پہنچاتا رہا اور اس ماحول میں کام کرنے کا حوصلہ دیتا رہا۔

مقالہ کے باب اول کی تکمیل کے لئے مجھ کو مولانا آزاد لائبریری کے علاوہ شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کی لائبریری سے استفادہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس سلسلہ میں میری ہر جگہ پذیرائی اور حوصلہ

افزائی ہوئی اور جن کتابوں کی مجھے ضرورت ہوئی وہ نہ صرف وقت پر فراہم کی گئیں بلکہ ان سے مواد حاصل کرنے میں میری پوری مدد کی گئی۔ اسکے لئے میں صدر شعبہ تاریخ کی بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے اپنے شعبہ کی لائبریری کی کتب کو استعمال کرنے کی اجازت دی اور لائبریری انچارج جناب یوسف صاحب کی بھی شکر گذار ہوں جنہوں نے ان کتب کو تلاش کرنے میں میرا ہاتھ بٹایا۔ اسی کے ساتھ لائبریرین اور اراکین مولانا آزاد لائبریری بالخصوص اراکین شعبہ مخطوطات کی بھی میں احسان منداور مشکور ہوں جنکا بھرپور تعاون مجھے حاصل رہا۔

اپنے ساتھیوں میں مجھ کو اپنے علمی و دینی بھائی، ہم جماعت اور مخلص دوست محمد جنید قریشی کا خاص طور پر ذکر کرنا ہے جنید بھائی نے نہ صرف میرے کام میں پوری دلچسپی لی اور میری حوصلہ افزائی کی بلکہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کی لائبریری سے شاہ ولی اللہؒ کے مخطوطہ دیوان کی فوٹو کاپی فراہم کی جسکے بغیر شاہ صاحب کے منظوم حصہ ادب پر تحقیق کا کام ادھورا رہ جاتا۔ اسکے علاوہ جنید بھائی نے میرے مقالہ کی کمپیوٹر کمپوزنگ لکھنؤ میں اپنی نگرانی میں کرائی اور اسکی پروف ریڈنگ میں بھی مدد دی۔ اس اہم کام کے بغیر میرا یہ مقالہ مکمل نہیں ہوسکتا تھا۔ میں جنید بھائی کی دونوں جہاں میں ترقی و کامیابی کے لئے خلوص نیت سے دست بدعا ہوں اور انکی انتہائی مشکور ہوں۔

کسی محقق، ادیب یا مصنف کو اپنی تحقیق و تالیف میں کامیابی نہیں مل سکتی جب تک کہ عمدہ تعلیمی ماحول کے ساتھ اسکو اپنے بزرگوں کی صحیح تربیت اور گھر والوں کا بھرپور تعاون حاصل نہ ہو۔ الحمد اللہ مجھ کو یہ دونوں چیزیں بخوبی میسر آئیں۔

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ اسنے مجھ کو ایسے گھر میں پیدا فرمایا جسکا ماحول مذہبی اور علمی تھا۔ اس ماحول میں بچپن سے مجھے وہ تعلیم و تربیت نصیب ہوئی جسنے آج مجھے اس قابل بنایا ہے کہ میں اپنا پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ پیش کر رہی ہوں۔ اس تعلیم و تربیت میں سب سے بڑا ہاتھ میری والدہ محترمہ طلعت پروین خانم شروانی کا ہے جنکی گود سے ہی مجھے وہ ماحول میسر آیا جو میری علمی و مذہبی تربیت کے لئے بے حد ضروری تھا۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے جب ایک صحابیؓ نے دریافت کیا کہ اللہ تعالیٰ کے حقوق کے بعد بندہ پر سب سے زیادہ حق کس کا ہے تو آپؐ نے فرمایا 'تیری ماں کا' اور یہ بات آپنے تین مرتبہ کہی اور پھر چوتھی مرتبہ فرمایا 'اسکے بعد تیرے باپ کا'۔ ماں کا احسان یاد دلاتے ہوئے کلام پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

حملتہ امہ وھنا علیٰ وھن (سورۃ لقمان) اور فرماتا ہے حملتہ امہ کرہ و وضعتہ کرھا۔ (سورۃ الاحقاف)

صرف اسی ایک احسان کا شکریہ ادا کرنے کے لئے انسان کی عمر بھر کی خدمت اور شکر گذاری ناکافی ہے چہ جائیکہ تعلیم وتربیت اور اصلاح وہدایت۔ اسکے علاوہ میری والدہ نے میرے تعلیمی کیریر میں اپنی تکلیف، بیماری اور کمزوری غرض ہر پریشانی کو نظر انداز کرتے ہوئے مجھے گھریلو تربیت کے علاوہ ہر قسم کی گھریلو ذمہ داریوں سے الگ رکھا تاکہ یکسوئی سے میں اپنی تعلیمی سرگرمیوں میں مصروف رہ سکوں جس کا نتیجہ آج اس مقالہ کی شکل میں ہے۔ ان تمام احسانات اور مہربانیوں اور شفقتوں کے لئے میں اپنی والدہ کی مشکور ہوں اور انکے بلند درجہ ومرتبہ کیلئے دست بدعا ہوں۔

میری علمی وعملی زندگی کے لئے جس شخصیت نے سب سے زیادہ فکر کی وہ میرے والد محترم حاجی حافظ علی اسلم خاں شروانی کی ہے۔ ۴ سال کی عمر میں نشرہ سے لے کر آج پی ایچ۔ ڈی تک حرف بحرف اور لفظ بہ لفظ انہوں نے میرے تعلیمی ارتقاء پر نگاہ رکھی ہے اور اپنی زیر نگرانی میری پوری تعلیمی کدوکاوش میں عملی حصہ بھی لیا ہے۔ بچپن میں مدرسہ کی تعلیم کے بعد یونیورسٹی کے علاوہ گھر پر میری جتنی بھی تعلیم ہوئی سب انھیں کی مرہون منت ہے۔ اسکے لئے میں ان کی بھی دل سے ممنون ومشکور ہوں۔ اللہ تعالیٰ میرے والدین کو صحت کاملہ عطا فرمائے اور تادیر ان دونوں کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رکھے۔ آمین۔

ایک اور شخصیت جو میری تعلیم میں عملی حصہ تو نہیں لے سکی مگر ان کا روحانی فیض تربیت ہمہ وقت میرے ساتھ رہا ہے۔ خصوصاً عربی ادب کے حصول کے سلسلہ میں انکی اپنی اولاد (اور اولاد کی اولاد) کیلئے دعائیں میرے کام آئی ہیں وہ شخصیت میرا دادا حاجی حافظ علی اکبر خاں شروانی مرحوم کی ہے جنکی وفات کے وقت میری عمر صرف پانچ سال کی تھی۔ مرحوم عربی زبان وادب کے عاشق تھے۔ انہوں نے عربی ادب میں ۱۹۱۹ء میں ایم اے کیا تھا جب مسلم یونیورسٹی نہیں تھی بلکہ ایم-اے-او کالج تھا اور الہ آباد یونیورسٹی سے ملحق تھا۔ انکے اساتذہ میں Prof. C.A. Storey جیسے مستشرق تھے جو اس کالج میں عربی پڑھاتے تھے۔ میرے دادا مرحوم نے والد صاحب کو بھی عربی زبان کی تعلیم دلائی جو بعد میں بالواسطہ میرے کام آئی۔ اسکے علاوہ دادا صاحب مرحوم کی عربی کتابیں خصوصاً انکے زیر استعمال لغت المنجد اب بھی میرے استعمال میں ہے۔ موصوف خود بھی صاحب قلم تھے۔ انکی علمی سرگرمیاں جن پر آج تک پردہ پڑا ہوا ہے تحقیق کا الگ موضوع بن سکتی ہیں۔ لیکن موجودہ حالات میں میں اپنے قلب کی گہرائیوں سے سمجھتی ہوں کہ میری تعلیم انکے فیض روحانی کا کمال ہے۔ اسکے لئے میں صرف اسی

طرح شکر گذار ہو سکتی ہوں کہ دعا کروں کہ اللہ تعالیٰ انکو اعلیٰ علیین میں بلند درجات عطا فرمائے۔ آمین۔

والدین کے علاوہ میں اپنے بڑے چچا صاحب (تایا) ڈاکٹر حافظ علی اکرم خاں شروانی ریٹائرڈ ریڈر شعبہ سماجیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی بھی ممنون احسان ہوں جنکی وقتاً فوقتاً تحریک و دلچسپی میرے کام کو پورا کرنے میں میری مدد و معاون رہی ہے۔

میرے گھر میں تمام بہن بھائیوں کی مدد، نیک خواہشات اور دعائیں ہمہ وقت میری تقویت اور ہمت افزائی کا باعث رہی ہیں۔ خصوصاً میری چھوٹی بہن اسماء فرحت شروانی۔ ایم۔فل (زولوجی) متعلمہ پی ایچ۔ڈی نے موضوع تحقیق بالکل مختلف ہونے کے باوجود اس مقالہ کی عملی تیاری میں میری بہت مدد کی۔ میں اپنے سب بہن بھائیوں کی بہت مشکور ہوں اور ان سب کی دینی و دنیاوی ترقی کے لئے دست بدعا ہوں۔

آخر میں اس دعا پر مقدمہ کو ختم کرتی ہوں:

رب اوزعنی ان اشکر نعمتک التی انعمت علی و علیٰ والدیّ و ان اعمل صالحاً ترضاہ و ادخلنی برحمتک فی عبادک الصالحین آمین. ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم.

سلمیٰ شروانی

ریسرچ اسکالر

شعبۂ عربی علیگڑھ مسلم یونیورسٹی،

علیگڑھ

۲۷ر دسمبر ۲۰۰۲ء

باب اوّل

اٹھارویں صدی کے ہندوستان
کے سیاسی، سماجی، مذہبی،
اقتصادی، علمی اور ادبی حالات

سیاسی حالات

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی ولادت اورنگ زیب عالمگیر کی وفات (۱۱۱۸ھ مطابق ۱۷۰۷ء) سے چار سال قبل (۱۱۱۴ھ مطابق ۱۷۰۳ء) ہوئی۔ ۱۱۷۶ھ یعنی شاہ صاحبؒ کے سال وفات تک کا ۶۱ سالہ دور ہندوستان میں سیاسی اتھل پتھل اور انتشار کا دور تھا۔ اورنگ زیب نے اپنی زندگی کے آخری پچاس سال جس حکومت کو مستحکم کرنے اور پورے ہندوستان میں پھیلانے کے لئے جنگ و جدال اور جدوجہد میں گزارے اس کا شیرازہ ان کے انتقال ۱۷۰۷ء کے فوراً بعد سے بکھرنا شروع ہو گیا۔ اس کی دو بڑی وجوہات تھیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ اورنگ زیب کے بعد ان کے جانشین اپنے آباء واجداد کی انتہائی کاوش سے حاصل کردہ سلطنت پر اپنی گرفت مضبوط نہ رکھ سکے۔ جس کی وجہ حصول تاج و تخت کے لئے خانہ جنگی، مذہب اور رعایا سے دوری، خود پرستی، عیش پسندی اور تن آسانی اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی کمزوری تھی۔ قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام کے بعد ان کے جانشینوں کے سلسلے میں جو آیت نازل ہوئی ہے: **فخلف من بعدهم خلف اضاعوا الصلوٰة و اتبعوا الشهوات**[۱]۔ (ترجمہ: انکے بعد انکے جانشینوں نے نمازوں کو ضائع کر دیا اور خواہشات نفسانی کے پیچھے لگ گئے)۔ یہ لوگ اسی کے مصداق تھے چنانچہ انکے لئے اس آیت کی پیشینگوئی ہوئی۔ **فسوف يلقون غياً**[۲]۔ (ترجمہ: پس ان کو جلد ہی ہلاکتوں میں ڈال دیا جائے گا)۔

اس سیاسی زوال کی دوسری وجہ وہ درباری کشمکش تھی جس کا نتیجہ نہ صرف طوائف الملوکی کی شکل میں ظاہر ہوا بلکہ بادشاہ کا اقتدار، اعتبار اور جاہ و جلال جو سلطنت کی مضبوطی کے لئے ایک ضروری عنصر ہے قطعی طور پر مٹ گیا اور بعد کے آنے والے بادشاہ انہیں امراء و وزراء کی کٹھ پتلی بن گئے۔ مغل دربار میں مدت تک ایرانی امراء کا طوطی بولتا رہا لیکن بعد میں تورانی امراء نے ایرانی اقتدار ختم کر کے اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ لیکن یہ صورتحال قائم نہ رہ سکی اور دوبارہ محمد شاہ (المعروف بہ رنگیلا) ایرانیوں کے زیر اثر آ گئے۔ غرض کہ یہ تمام فتنہ و فساد ایرانی و تورانی امراء کے آپسی جھگڑوں کا نتیجہ تھا۔ حتیٰ کہ بعض مورخین کا یہ خیال ہے کہ سلطنت مغلیہ کے آخری دور کی تاریخ صرف ان ہی دو پارٹیوں کی نبرد آزمائی کا نام ہے۔

سلطنت مغلیہ کے زوال کی تیسری وجہ یہ ہوئی کہ اورنگ زیب عالمگیر نے اپنی وفات سے قبل جن علاقوں پر اپنا تسلط قائم کیا تھا ان کی وفات، ان کے جانشینوں کی نااہلی اور درباری چپقلش کی بناء پر بعد کے

۱، ۲ القرآن: سورہ مریم، الآیۃ ۵۹

آنے والے حکمراں ان علاقوں پر اپنی حکومت قائم نہ رکھ سکے اور جلد ہی یکے بعد دیگرے وہ تمام علاقے مرکزی حکومت سے الگ ہوگئے۔ یہاں تک کہ مثل مشہور ہوگئی۔ سلطنت شاہ عالم از دہلی تا پالم

جن قوتوں نے اس لامرکزیت سے فائدہ اٹھا کر ملک میں اپنا اثر قائم کرنا چاہا انمیں مرہٹہ، جاٹ، سکھ، روہیلے اور دوسری مقامی اقوام کے علاوہ غیر ملکی قوتیں مثلاً ابدالی، درانی اور انگریز شامل تھے۔ جن کے اثرات سے ملک پارہ پارہ ہوگیا اور سیاسی حالات ناگفتہ بہ ہو کر اس مقام پر پہونچ گئے کہ ملک غیر ملکی حکمرانوں کا غلام ہوگیا۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے دہلی میں یکے بعد دیگر دس بادشاہوں کا عروج وزوال دیکھا[۱]۔

۱) اورنگ زیب عالمگیر۔ ۱۱ ذیقعدہ ۱۰۶۸ھ تا ۲۸ ذیقعدہ ۱۱۱۸ھ مطابق ۱۶۵۸ء-۱۷۰۷ء (آخری چار سال)

۲) شاہ عالم بہادر شاہ اول۔ ذی الحجہ ۱۱۱۸ھ تا ۲۱ر محرم ۱۱۲۴ھ مطابق ۱۷۰۷ء-۱۷۱۲ء

۳) معزالدین جہاندار شاہ۔ ۱۱۲۴ھ تا ۸ محرم ۱۱۲۵ھ مطابق ۱۷۱۲ء-۱۷۱۳ء (قتل کیا گیا۔)

۴) فرخ سیر۔ ۱۱۲۵ھ تا ۸ر ربیع الثانی ۱۱۳۱ھ مطابق ۱۷۱۳ء-۱۷۱۹ء (قید ہوا)

۵) رفیع الدرجات۔ ۹ر ربیع الثانی ۱۱۳۱ھ تا ۲۰ر جب ۱۱۳۱ھ مطابق ۱۷۱۹ء

۶) رفیع الدولہ۔ ۲۰ر جب ۱۱۳۱ھ تا ۱۷ ذیقعدہ ۱۱۳۱ھ مطابق ۱۷۱۹ء

۷) محمد شاہ۔ ۱۱۳۱ھ تا ۲۹ر ربیع الثانی ۱۱۶۱ھ مطابق ۱۷۱۹ء-۱۷۴۸ء

۸) احمد شاہ۔ ۲ جمادی الاول ۱۱۶۱ھ تا ۲۷ شوال ۱۱۶۷ھ مطابق ۱۷۴۸ء-۱۷۵۴ھ (اندھا کر کے قید کیا گیا۔)

۹) عالمگیر ثانی۔ ۱۰ شعبان ۱۱۶۷ھ تا ۸ر ربیع الثانی ۱۱۷۳ھ مطابق ۱۷۵۴ء-۱۷۵۹ء (قتل کیا گیا)
محی السنۃ بن کام بخش بن عالمگیر ثانی ۳۵ دن

۱۰) شاہ عالم ثانی۔ ۱۴ جمادی الاول ۱۱۷۳ھ تا ۷ شعبان ۱۲۲۱ھ مطابق ۱۷۵۹ء-۱۸۰۶ء۔ (ابتداء کے ڈھائی سال تا ۱۱۷۶ھ)

اس فہرست پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر کے آخری چار سالوں اور شاہ عالم ثانی کے ابتدائی ڈھائی سالوں کو چھوڑ کر باقی آٹھ بادشاہوں میں سے چار قتل کر دیئے گئے اور دو کی حکومت صرف تین تین ماہ رہی۔ شاہ صاحب کے انتقال کے وقت بھی شاہ عالم ثانی بہار و بنگال میں جلاوطنی کی کیفیت میں بھٹک رہا تھا اور دہلی کا تخت خالی تھا۔ تخت نشینی کے لئے جو خانہ جنگی ہوئی اس میں بھی تخت و تاج کے کم و بیش دس بارہ دعویدار قتل ہوئے۔

---

[۱] مجموعہ وصایا اربعہ مصنفہ شاہ ولی اللہ دہلوی مترجمہ محمد ایوب قادری صفحہ ۱۵، حیدر آباد ۱۹۶۴ء

اس سیاسی افراتفری اور بادشاہوں اور حکومتوں کی ناپائیداری اور جلد جلد تبدیلی میں کسی کی مدت حکومت صرف دس ماہ (معزالدین جہاندار شاہ) کسی کی چار ماہ سے کم (رفیع الدرجات و رفیع الدولہ) اور کسی کی صرف چند دن (محی السنہ بن کام بخش بن عالمگیر ثانی) رہی اور وہ سب یا تو قتل کر دیئے گئے یا بیماری سے انتقال کر گئے۔ صرف اورنگ زیب عالمگیر کے پہلے جانشین، شاہ عالم بہادر شاہ اول، فرخ سیر بن عظیم الشان، محمد شاہ اور شاہ عالم ثانی کو کچھ مدت حکمرانی کا موقع ملا۔

چنانچہ ان کے عہد حکومت میں جو اہم واقعات رونما ہوئے انہوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے سماجی، مذہبی، ثقافتی اور علمی ماحول کو بنانے یا بگاڑنے میں ایک خاص حصہ لیا اور کیوں کہ یہی دور ولی اللہی دور ہے اس لئے ان کے ماحول اور کیفیات کو جانچنے کے لئے ان واقعات کا تفصیلی جائزہ ضروری ہے۔

ا۔ شاہ عالم بہادر شاہ اول:

شاہ عالم اورنگ زیب عالمگیر کا سب سے بڑا بیٹا تھا جو دوسرے فرزند محمد اعظم شاہ کو شکست دے کر تخت نشین ہوا۔ اپنے آباء واجداد کے برعکس شاہ عالم نے ایرانی امراء کے زیر اثر علی الاعلان شیعی مسلک اختیار کر لیا۔ نہ صرف یہ بلکہ اس نے رفض کی اشاعت میں بھرپور کوشش وجدوجہد کی۔ ہندوستان کی غیر مسلم آبادی کے علاوہ مسلمانوں کا نوے پچانوے فیصد طبقہ مشرقی سرحد بنگالہ سے مغربی حدود کابل و قندھار تک سنی فرقہ اور حنفی مذہب کا پیرو تھا اس لئے نہ صرف مذہبی بلکہ سیاسی اور ملکی لحاظ سے بھی یہ تبدیلی اکثریت کے لئے قابل قبول نہ تھی۔

سیر المتاخرین کے مصنف غلام حسین طباطبائی (جو خود اثنا عشری فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں) کے مطابق خطبہ میں کلمہ "علی وصی رسول اللہ" کے داخل کرنے کے حکم دینے پر لاہور میں جہاں بادشاہ کا قیام تھا شورش برپا ہوئی اور بلوا ہوا۔ طباطبائی نے خود اس کے رواج نہ پکڑنے کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

بہادر شاہ بدستور اصرار بایں کار داشتہ در ترویج و تقویت مذہب شیعہ می کوشد و مدت ہائے دراز در مباحثہ بعلماء باز بود۔ اماں فائدہ بر آں مترتب نمی شد۔[۱]"

بہادر شاہ بدستور اس بات پر اصرار کرتا رہا اور مذہب شیعہ کی ترویج و تقویت میں ساعی و سرگرم رہا۔ مدتوں علماء کے ساتھ مباحثہ کا دروازہ کھلا رہا لیکن اس سے کچھ فائدہ مرتب نہیں ہوا۔

مذہبی پالیسی میں اس تبدیلی کا یہ نتیجہ نکلا کہ عوام و خواص میں ایک بے چینی پھیل گئی۔ دربار کے

---

۱ سیر المتاخرین، مصنفہ مولوی غلام حسین طباطبائی، مترجمہ گوکل پرشاد، جلد ۲، صفحہ ۲۳، ۱۸۹۸ء

ایرانی امراء جو شیعہ رجحان رکھتے تھے اپنے مسلک کی ترویج میں سختی سے کام لینے میں بادشاہ کے احکامات کے بھی پابند نہ رہے۔ تورانی امراء جو دربار میں سابقہ روایات اور رعایا کی اکثریت کی نمائندگی کرتے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ ان کی وفاداری اور خلوص کی کوئی قدر نہیں رہ گئی تو ان کے اندر بھی بادشاہ کے خلاف جذبات پیدا ہو گئے۔ چنانچہ عوام و خواص اور خود فوج میں ایک بددلی بلکہ مردہ دلی پھیل گئی اور وہ مذہبی اور قومی جوش نہیں رہا جو باعزم بادشاہوں کے لئے ایک قوت محرکہ ثابت ہوتا ہے۔ بادشاہ کی وہ خداداد ہیبت اور رعب جو ایک مضبوط حکومت کا خاصہ ہوتا ہے مفقود ہو گیا۔ اورنگ زیب عالمگیر اگر اورنگ آباد (دکن) کی مہم میں بھی مصروف ہوتا تو بھی بہار بنگال اور دہلی تک کی جزئیات کی ایک ایک تفصیل سے واقف رہتا اور بروقت اور مناسب فوری احکامات صادر کرتا جن کی تعمیل میں کوتاہی ممکن نہ تھی۔ لیکن اس کے جانشین کی یہ حالت ہو گئی کہ تاریخ ہندوستان کے مؤلف مولوی ذکاءاللہ کے الفاظ میں :

> "باضابطہ و بے ضابطہ اجراء کار میں فوراً تفاوت ہوتا، بادشاہ کے دستخط کا اعتبار نہیں رہا۔ بادشاہ اپنے متصدیوں سے فرمایا کرتا کہ سب اہلکار آپس میں مل گئے ہیں جو بہتر جانتے عمل میں لاتے ہیں ہمارا فقط نام کا اعتبار رہ گیا ہے۔ خلق کے مطلب قبول کرنے کے سوا ہم کو کوئی اور چارہ نہیں ہے"۔[۱]

بادشاہ کے اس قول سے کتنی بیچارگی اور عب و دبدبہ کی کمی کا اظہار ہوتا ہے۔

اسی کے آگے مصنف لکھتے ہیں:

> "ظریف شوخ طبعوں نے اس کی تاریخ "شہ بے خبر" کہی ہے۔ راتوں کو جاگتا دوپہر دن چڑھے تک سوتا جس کے سبب سے خلق اللہ کو سفر کے دن تکلیف ہوتی کہ ان کو اپنے خیموں کی مثل نہ ملتی"۔[۲]

اس بے راہ روی کا یہ نتیجہ نکلا کہ آخر عمر میں بادشاہ کو جنون ہو گیا اور اسی کیفیت میں اس نے الٹے سیدھے احکامات صادر کرنے شروع کر دیئے۔ چنانچہ اس نے حکم دیا کہ شہر کے سارے کتے شہر سے باہر نکال دیئے جائیں یا مار دیئے جائیں۔ ہندوؤں کو حکم دیا کہ اپنی داڑھی منڈائیں اور آئندہ کوئی ہندو داڑھی نہ رکھے۔ جب کہ راج پوتوں میں عام طور پر چڑھی ہوئی داڑھی کا رواج تھا پھر اسی جنون کی حالت میں ۱۹ محرم ۱۱۲۴ھ کو اس جہان فانی سے رخصت ہو گیا۔[۳]

---

۱ تاریخ ہندوستان، مصنفہ مولوی ذکاءاللہ دہلوی، جلد ۹، صفحہ ۳۸ علی گڑھ ۱۹۱۹ء

۲ (ایضاً)

۳ ترجمہ سیر المتاخرین، جلد ۲، صفحہ ۸-۹

اس طرح عالمگیر کے پہلے جانشین کے زمانہ حکومت میں ہی جو صرف چھ برس کا ہوا عظیم سلطنت مغلیہ کی چولیں ہل گئیں اور اس کی وہ ساکھ اور دھاک ختم ہو گئی جو مخالف طاقتوں، فتنہ پردازوں اور عوام و خواص کے دماغ پر بابر کے زمانے سے بیٹھی ہوئی تھی۔

۲۔ فرخ سیر:

بادشاہ وقت کی ذاتی کمزوری خود سلطنت کی کمزوری کا باعث ہوتی ہے۔ بہادر شاہ کے عہد حکومت کے آخری سالوں میں دربار میں ایرانی (شیعہ) و تورانی (سنّی) امراء میں طاقت حاصل کرنے کے لئے جو رسہ کشی تھی بادشاہ کے جھکاؤ کی وجہ سے ایرانی امراء کے دبدبہ اور اثر میں اضافہ کا باعث بن گئی۔ شاہ عالم کے انتقال کے بعد یہ اثر اتنا بڑھا کہ خود بادشاہ ان کے ہاتھ میں کھلونا بن گیا۔ شاہ عالم کے بعد تخت نشینی کے لئے معزالدین جہاندار شاہ اور فرخ سیر میں جنگ ہوئی۔ اس جنگ کے نتیجہ میں جہاندار شاہ کو قتل کر دیا گیا اور فرخ سیر کو تخت نشین کر دیا گیا۔ اقتدار حکومت کے لحاظ سے فرخ سیر کو اپنے چھ سالہ دور میں قطعاً آزادی نہیں تھی۔

اس کی وجہ یہ تھی کی سادات بارہ (حسین علی خاں اور حسن علی خاں عرف عبداللہ خاں) نے جو دربار میں ایک طاقتور حیثیت رکھتے تھے اور جن میں سے اول الذکر امیر الامراء اور ثانی الذکر قطب الملک کے لقب سے ملقب تھے، اس جنگ میں فرخ سیر کا ساتھ دیا تھا۔ ان دونوں کا اقتدار بادشاہ اور پوری سلطنت پر قائم ہو گیا۔ یہاں تک نوبت آگئی کہ یہ دونوں "بادشاہ گر" کے نام سے مشہور ہو گئے کہ جس کو چاہتے اور جس کی حمایت کرتے اس کو تخت پر بٹھا دیتے اور جب وہ ان کے اثر سے آزاد ہونے کی کوشش کرتا تو اس کو معزول کرا دیتے یا قتل کرا دیتے۔ چنانچہ خود فرخ سیر کو آخر میں انہوں نے قید کیا پھر قتل کرا دیا۔

ان واقعات نے پورے ملک میں تخت مغلیہ کے جانشینوں کی بے احترامی اور سلطنت کی بے اعتباری پیدا کر دی۔

مصنف "تاریخ ہندوستان" مولوی ذکاء اللہ اپنی تصنیف میں فرخ سیر کی بابت ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> "اگرچہ محمد فرخ سیر وسیع الاخلاق اور قدردان تھا ہر ایک کی خدمت اور تردد کے مقابل میں چاہتا تھا کہ بقدر امکان منصب و عمدہ خدمات عنایت کر کے ہم چشموں میں ممتاز کرے مگر اختیار نہیں رکھتا تھا اور نہ آزمودہ کار جوان تھا امور سلطنت سے بے خبر خوردسالی سے صوبہ

بنگالہ میں باپ دادا سے دور نشو نما پایا استقامت مزاج اور رائے صائب نہیں رکھتا تھا اوروں کی رائے پر چلتا تھا قسمت سے تاج و سلطنت مل گیا تھا۔ خاندان تیموریہ کا جوہر شجاعت تھا وہ اس کے خلاف جبن ذاتی رکھتا تھا۔ صاحب غرض کی سخن کی تہ پر نہ پہونچتا۔ ابتداء سے اپنی سلطنت کا مادہ فساد خود ہی بنا"۔[۱]

"بادشاہ کی عیاشی، خلوت نشینی علاوہ بے دماغی کے زیادہ ہو گئی تھی خلق اللہ کا کاربند تھا"۔[۲]

فرخ سیر کا قتل ۱۱۳۱ھ مطابق ۱۷۱۹ء میں ہوا۔ اس وقت شاہ صاحب کی عمر ۱۶ سال تھی۔ اس عمر میں انہوں نے اپنی تعلیم مکمل کر لی تھی اور مدرسہ رحیمیہ میں اپنے والد شاہ عبدالرحیم کی مجلس درس پر متعین ہو گئے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ فرخ سیر کے دردناک قتل سے عام بےچینی اور برہمی پیدا ہو گئی جس کے نتیجہ میں بقول شاہ صاحب "ہرج و مرج عظیم دست داد" یعنی سخت کشت و خون کی گرم بازاری ہوئی۔[۳]

۳۔ محمد شاہ بادشاہ:

بادشاہ گر برادران حسین علی خان و عبداللہ خان نے فرخ سیر کے سفاکانہ قتل کے بعد مناسب متبادل نہ ملنے پر یکے بعد دیگرے دو مریض شہزادوں رفیع الدرجات اور اس کے بعد اس کے بھائی رفیع الدولہ کو جو دق اور اسہال کے مرض میں گرفتار تھے تخت دہلی پر بٹھایا مگر دونوں تقریباً تین تین مہینہ میں انتقال کر گئے۔ ان کے انتقال کے بعد ۱۵/ ذیقعدہ ۱۱۳۱ھ مطابق ستمبر ۱۷۱۹ء کو روشن اختر کو جو اپنی ماں کے ساتھ فتح پور میں قید تھا قید سے نکال کر ابوالفتح ناصر الدین محمد شاہ بادشاہ کے لقب کے ساتھ تخت شاہی پر بٹھا دیا۔ روشن اختر شاہ عالم پسر اورنگ زیب عالمگیر کے سب سے چھوٹے اور چہیتے بیٹے خجستہ اختر کا بیٹا تھا۔

جہاں فرخ سیر کی برائی اس کی ذاتی کمزوری اور جبن و کم ہمتی تھی وہیں محمد شاہ کی برائی اس کی عیش و عشرت سے حد اعتدال سے بہت زیادہ بڑھی ہوئی دلدادگی تھی۔ دن رات زنانہ حرم میں پڑا رہتا تھا۔ ۲۸ سالہ دور حکومت میں اگر کبھی وہ محل سے باہر نکلا ہے تو صرف لونی پارک گھومنے کے لئے یا گڑھ کا میلہ دیکھنے کیلئے۔[۴]

۱۔ تاریخ ہندستان، جلد ۹، صفحہ ۱۰۸-۱۰۹

۲۔ تاریخ ہندوستان، جلد ۹، صفحہ ۱۳۰

۳۔ الامام ولی اللہ محدث دہلویؒ، مصنفہ عبدالقیوم مظاہری، صفحہ ۲۳۱، کانپور ۱۹۶۷ء

۴۔ جادوناتھ سرکار اپنی انگریزی تصنیف "The fall of the Mughal Empire" میں محمد شاہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"He therefore, totally withdrew himself from public business leaving it to his ministers and plunged into a life of pleasure and amusement, hardly ever going out of Delhi during his 28 years of reign. except to visit parks in the neighbourhood (usually at Loni) and occasionally to see the annual fair at Grah Mukteshwar" (Fall Vol.I. P.No.6)

سیر المتاخرین کا مصنف طباطبائی لکھتا ہے:

"پادشاہ چوں جواں بے عزم و کم جرأت بود مشغول عیش و عشرت و طرب گردیدہ در امرے کہ اشد ضرور بود توجہ می نمود"[۱]

(بادشاہ چونکہ بے عزم اور کم جرأت جوان تھا عیش و عشرت میں مشغول ہو کر صرف اسی کام پر توجہ دیتا جو اشد ضروری ہوتا)

اس کی اس بڑھی ہوئی غفلت کے باعث سید برادران اور ایرانی عناصر کا دربار پر اس قدر اثر ہو گیا کہ صاحب عزم وفادار اور مخلص اراکین سلطنت جن میں نظام الملک آصف جاہ کی شخصیت ممتاز ہے دربار چھوڑ کر چلے گئے۔ آصف جاہ نے دکن کا رخ کیا جہاں بعد میں کمزور مرکز سے علیحدہ ہو کر آصف جاہی حکومت کی داغ بیل ڈالی۔ دہلی کا میدان اہل غرض کے لئے خالی ہو گیا۔ چونکہ محمد شاہ کی حکومت سید برادران کی مرہون منت تھی اس کا دونوں بھائیوں سے خائف ہونا ایک قدرتی بات تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب محمد شاہ کو انہوں نے یہ مشورہ دیا کہ وہ آصف جاہ کے خلاف لشکر کشی کرے تو وہ فوراً آمادہ ہو گیا۔ ابھی دہلی سے چند منزل ہی بڑھے تھے کہ آصف جاہ کے چچازاد بھائی امین خاں کے اشارہ پر میر حیدر کاشغری نے حسین علی خاں کا کام تمام کر دیا۔ حسین علی خاں کا قتل دراصل ایرانی امراء کے بازو ٹوٹنے کے مرادف تھا چنانچہ زیادہ زمانہ نہ گزرا کہ اس کا دوسرا بھائی حسن علی خاں قطب الملک (عرف عبداللہ خاں) محمد شاہ کے ہاتھوں گرفتار ہوا اور پھر قید خانہ ہی میں انتقال کیا۔ سید برادران کے ختم ہونے کے بعد محمد شاہ نے نظام الملک کو دکن سے بلا کر وزیر اعظم بنالیا لیکن دربار میں ایرانی اثرات اور بعض خود غرض اور جاہ پرست امراء نے پھر تورانیوں کے بجائے ایرانیوں کو برسر اقتدار کر دیا اور بادشاہ دوبارہ ایرانیوں کے زیر اثر آگیا۔[۲]

اس کے بعد محمد شاہ پر تعیش کا وہ غلبہ ہوا کہ اس نے اس سے پہلے کے عیش پسندوں کو مات کر دیا اور ان کے واقعات بھلا دیئے۔ ہندوستان کے مورخین لکھتے ہیں کہ:

"محمد شاہ بادشاہ نے مذہب تو نہیں بدلا لیکن مشرب بدل دیا۔ ابر سیاہ ان کا نقیب قرار پایا۔ عام حکم تھا کہ ادھر ہمالیہ کے دامن سے گھٹا اٹھے بادل گرجے کہ میرا خیمہ و خرگاہ صحرا روانہ ہو۔

۱۔ سیر المتاخرین، جلد ۲، صفحہ ۲۳

۲۔ الامام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، صفحہ ۲۳۳-۲۳۴، تاریخ دعوت و عزیمت، مصنفہ ابوالحسن علی ندوی، صفحہ ۵۱-۵۶، جلد ۵، لکھنؤ ۱۹۸۹ء

می دید صبح کله بسته سحاب
الصبوح الصبوح یـــا اصحاب
ژاله باریـــــد بر رخ لاله
المدام المدام یـــا احباب

کا شور تھا[۱]

محمد شاہ کی اس بڑھی ہوئی عیش و عشرت کی زندگی کی بناء پر وہ تاریخ میں محمد شاہ رنگیلا کے نام سے مشہور ہے۔ بادشاہ کی غفلت اور عیش پسندی نے زوال اور انحطاط کی رفتار تیز سے تیز تر کر دی۔

جادوناتھ سرکار نے اپنی کتاب Fall of the Mughal Empire میں محمد شاہ کی کمزوریوں پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کے دفاع میں مندرجہ ذیل رائے درج کی ہے:

"محمد شاہ اگرچہ عزت کا مستحق نہیں ہے مگر رحم کا مستحق ضرور ہے۔ حالات نے اسے ایسی جگہ لا کھڑا کیا تھا جہاں کسی عبقری (Genius) کی ضرورت تھی۔ مگر وہ ایک معمولی انسان تھا۔ مورخ اسے اس بات پر ملامت کرتے ہیں کہ اس نے کاروبار حکومت انجام دینے کے بجائے تعیش میں اپنا وقت صرف کیا۔ لیکن حالات کی ٹریجڈی یہ تھی کہ اس کے جیسا آدمی اگر کاروبار حکومت پر پوری توجہ دیتا تب بھی وہ حالات کا رخ نہیں موڑ سکتا تھا۔ رفیع الدرجات اور رفیع الدولہ جیسے لوگ کٹھ پتلیوں کی طرح اپنی ذلت کے احساس سے بھی عاری تھے۔ لیکن محمد شاہ میں بدترین حالات اور انہیں سدھارنے میں اپنی لاچاری دونوں کا احساس موجود تھا"[۲]

مغل سلطنت کی اس گرتی ہوئی عمارت کو ایک سخت دھچکا اس وقت لگا جب ۱۱۵۱ھ مطابق ۱۷۳۸ء میں نادر شاہ درانی نے دہلی پر حملہ کیا۔ نادر شاہ کے ہندوستان پر حملہ کے اسباب و علل کچھ بھی ہوں لیکن اس کی واپسی کے بعد دہلی کی وہ حالت ہو گئی گویا کہ ایک زبردست سیلاب کے بعد ہر چیز تہس نہس ہو جائے۔

نادر شاہ کے ہاتھوں ہندوستان کو ایسی زبردست شکست ہوئی جس کی مثال تاریخ ہند میں نہیں ملتی۔ خود محمد شاہ نے اپنی بیچارگی کا اظہار اس مصرعہ میں کیا ہے۔

---

۱ تاریخ دعوت و عزیمت، صفحہ ۵۲، جلد ۵۔
۲ Fall of the Mughal Empire by J.N. Sarkar Vol I P. 373-74

شامت اعمال ماصورت نادر گرفت[۱]

نادر شاہ نے دہلی میں جو آگ وخون کا ہنگامہ برپا کیا، آج بھی اس کے تصور سے دل کانپ جاتا ہے، عہد اورنگ زیب کے امن و چین دیکھے ہوئے لوگ بد حواس ہوگئے۔ نادر شاہی کا لفظ ظلم و بربریت کا مرادف بن گیا۔ اس بربریت اور قتل وخون سے بچنے اور باعزت شریفانہ زندگی گزارنے کی کوئی راہ لوگوں نے نہ پائی تو ہندو مسلمان سب لوگوں نے ہندوؤں کی رسم جوہر کی تقلید میں آگ میں جل مرنے کا فیصلہ کیا۔[۲]

اس وقت شاہ ولی اللہ کی عمر ۳۷ برس تھی اور حجاز سے واپس تشریف لا چکے تھے جب قوم کی پست ہمتی کا یہ حال دیکھا تو آپ نے لوگوں کو سیدنا امام حسینؓ اور کربلا کے واقعات سنا کر صبر وضبط اور توبہ و استغفار کی تلقین فرمائی جس کے نتیجہ میں لوگوں نے اپنے ارادہ خودکشی سے توبہ کی۔

بظاہر نادر شاہ ہندوستان کو ایرانی شیعہ اثرات اور درباری سازشوں سے آزاد کرنے آیا تھا مگر اس قتل وغارتگری کے بعد جب وہ واپس گیا تو اس بادشاہ کی شہنشاہیت کو گویا کہ ختم کر گیا جس کو بچانے وہ آیا تھا۔ نادر شاہ نے مغل بادشاہ سے تخت نہیں لیا مگر پچاس کروڑ کا تاوان وصول کیا۔ اسی پر بس نہ ہوا بلکہ اپنے چھوٹے بیٹے مرزا نصر اللہ کا عقد داور بخش (جو کہ مراد کا پوتا اور شاہجہاں کا پرپوتا تھا) کی بیٹی سے کرادیا اور شاہی خون کو بھی لے گیا۔[۳]

یہ سب کچھ ہوا مگر دراصل جس بہانہ سے نادر شاہ نے حملہ کیا تھا یعنی بادشاہ کی درباری سازشوں سے آزادی اور بادشاہ کا خود مختار ہونا، وہی نہ ہو سکا۔ محمد شاہ اتنا زیادہ خوف زدہ اور حالات سے سہما ہوا تھا کہ تورانی اور ایرانی امراء سے خود کو الگ نہ کر سکا۔ اگر بعد میں دوسری طاقتیں نہ آتیں تو ان امیروں نے سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کبھی کے تقسیم کر لئے ہوتے اور خاندان تیموریہ کو بے نام ونشان کر دیا ہوتا۔[۴]

آخر ۲۶ ربیع الثانی ۱۱۶۱ھ مطابق ۱۷۴۸ء کو محمد شاہ مرض اسہال میں مبتلا ہو کر دنیا سے رخصت ہوا اور بقول مصنف تاریخ ہندستان کے "تیس سال سلطنت کر کے خاندان تیموریہ ہی کو تباہی کے کنارے پر پہونچا گیا۔[۵]"

۱۔ تاریخ دعوت وعزیمت، صفحہ ۵۵، جلد ۵
۲۔ تاریخ ہندوستان، صفحہ ۲۵۷-۵۸ جلد-۹
۳۔ The Later Mughals by W.Irvim Vol. II P.370
۴۔ تاریخ ہندستان، صفحہ ۲۷۲، جلد ۹
۵۔ ایضاً، صفحہ ۲۸۴، جلد ۹

۱۱۶۱ھ میں محمد شاہ کی وفات کے بعد سے شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے انتقال یعنی ۱۱۷۶ھ تک سلطنت دہلی پر چار مغل حکمراں رہے لیکن ان کی حکمرانی برائے نام تھی۔ وہ سب یا تو درباری سازشوں کا شکار ہوئے یا ملکی و غیر ملکی قوتوں کی ریشہ دوانیوں کی باعث کمزور سے کمزور تر ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ بالآخر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد سلطنت مغلیہ کا بالکل خاتمہ ہو گیا اور حکومت غیر ملکی حاکموں (تاجدار برطانیہ) کے ہاتھوں میں منتقل ہو گئی۔

ان حکمرانوں میں احمد شاہ (۱۱۶۱ھ تا ۱۱۶۷ھ) اور عالمگیر ثانی (۱۱۶۷ھ تا ۱۱۷۳ھ) کا دور حکومت تقریباً ساڑھے پانچ۔ ساڑھے پانچ سال رہا۔ اور محی السنہ بن کام بخش بن عالمگیر ثانی کا تو صرف ۳۵ دن ہی چلا۔ اول الذکر کو اندھا کر کے قید کیا گیا اور عالمگیر ثانی کو قتل کر دیا گیا۔ اور یہ سب درباری امراء کی سازشوں کے تحت ہوا۔ ۱۱۷۳ھ میں محی السنہ کے ۳۵ دن کے دور حکومت کے بعد ۱۴ر جمادی الاول ۱۱۷۳ھ مطابق ۱۷۵۹ء کو شاہ عالم ثانی دہلی کے تخت پر تخت نشین ہوا۔

> "محمد شاہ کے زمانہ میں اگر سلطنت مغلیہ کو اخلاقی و انتظامی طور پر زوال ہوا اور ہندوستانی معاشرہ اور خاص طور پر طبقہ امراء کا رجحان "الناس علی دین ملوکھم" کے اصول کے مطابق عیش و عشرت، تن آسانی اور لذت اندوزی کی طرف تیزی کے ساتھ ہوا تو شاہ عالم ثانی کے زمانہ میں سیاسی طور پر زوال اپنے آخری مرحلہ تک پہونچ گیا"[۱]۔

اگرچہ شاہ عالم کا دور حکومت ۴۷ سال ہے لیکن شاہ ولی اللہ اس کے عہد کے پہلے ڈھائی سال ہی زندہ رہے۔ اس وقفہ میں انہوں نے مسلمانوں اور مسلمان بادشاہ کی ذلت کے وہ نمونہ دیکھے کہ ان کا درد مند و حساس دل خون کے آنسو رونے پر مجبور ہو گیا۔

مرکز کی کمزوری کے اثرات

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے وقت مغل سلطنت (شمال میں) کشمیر سے (جنوب میں) اورنگ آباد (دکن) تک اور (مغرب میں) گجرات سے (مشرق میں) بنگال تک پھیلی ہوئی تھی۔ حکومت کا اقبال اور ہیبت اتنی زبردست تھی کہ وہ اورنگ آباد میں ہوتا تو دہلی کا کیا ذکر بہار و بنگال میں بھی کارکنان سلطنت پر اس کی ہیبت طاری رہتی۔ وہ جزئیات سلطنت سے باخبر رہتا اور بروقت مناسب احکام جاری کرنے میں ذرا سی بھی تاخیر سے کام نہ لیتا اور ان احکامات کی تعمیل میں ذرا سی لیت و لعل نہ ہوتی۔ لیکن محمد شاہ اور شاہ

---

[۱] تاریخ دعوت و عزیمت، جلد ۵، صفحہ ۵۷۔

عالم ثانی کے آتے آتے اس کے جانشین بے حد کمزور اور ان کا اقبال اور رسوخ اتنا کم ہو گیا کہ درباری امراء بھی ان کے احکامات سے روگردانی کرتے اور اپنی من مانی پر کمربستہ رہتے۔

مرکز کو کمزور پاکر صوبائی عاملوں اور گورنروں کا اعلان خود مختاری کر کے مرکز سے علیحدہ اپنی حکومت قائم کر لینا بالکل فطری بات تھی۔ چنانچہ سعادت علی خاں نے اودھ میں، علی وردی خاں نے بنگال میں اور نظام الملک آصف جاہ نے دکن میں اپنا اقتدار قائم کر لیا اور مرکز سے سیاسی اور اقتصادی طور پر الگ ہو گئے اور اس طرح سلطنت مغلیہ کا سیاسی اقتدار اور اقتصادی ذرائع ختم ہو گئے۔

وہ جنگجو طاقتیں اور گروہ جن کو زیر کرنے کے لئے اورنگ زیب کو پچاس سال لگے اس کے جانشینوں کی بدحالی کمزوری اور بزدلی کو دیکھ کر پھر سے زور پکڑ گئے اور چونکہ مغلوں اور اس سے قبل مملوک سلطانوں نے انکے اجداد سے حکومت چھینی تھی لہٰذا ان گروہوں کا غصہ مسلمانوں پر اترا اور وہ مسلمانوں کو سیاسی، معاشی، اقتصادی اور معاشرتی طور پر ہر طرح برباد کرنے پر تل گئے۔

سلطنت مغلیہ کے علاوہ اس وقت پورے ملک کی قسمت کا فیصلہ کرنے والی تین قوتیں مرہٹہ، سکھ اور جاٹ اپنا سر ابھار رہی تھیں۔ ان کے علاوہ افغان قبائل جو نادر شاہ درانی اور احمد شاہ ابدالی سے مختلف معرکوں میں شکست کھا کر جوق در جوق ہندوستان کی سرحد پار کے یہاں آگئے تھے وہ روہیلہ قبائل کی سرکردگی میں مغلوں سے نبرد آزما ہوئے۔ بیرونی قوتوں میں نادر شاہ درانی کے حملے کے بعد شاہ عالم ثانی کے دور حکومت میں احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر یکے بعد دیگرے نو حملے کئے ان حملوں میں چھٹا حملہ زیادہ اہم ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ان تمام تحریکوں اور ان سے پیدا ہونے والے مضر اثرات کے درمیان پلے بڑھے اور اپنی تمام تصنیف و تالیف، رشد و ہدایات، درس و تدریس اسی ماحول میں انجام دیں اس لئے ضروری ہے کہ ان تحریکوں اور ان سے پیدا شدہ اثرات کا جائزہ لے کر یہ دیکھا جائے کہ قلب و نظر کی وہ کون سی کیفیت تھی جس کی بنا پر اس حالت اضطراب میں بھی ان کے قلم سے وہ تحریریں معرض وجود میں آئیں جو آج بھی مشعل راہ ہیں۔

ا۔ مرہٹہ تحریک:

مرہٹہ قوم اصل میں مرہٹواڑہ (موجود مہاراشٹر) اور اس کے آس پاس کے علاقہ گجرات مالوہ کے رہنے والے مقامی لوگ ہیں۔ مرہٹہ تحریک ہندو مذہب اور تہذیب کی "احیائیت" (Revivalism) پر مبنی

تھی۔اس تحریک کے قائداول شواجی کے متعلق ماؤنٹ اسٹوراٹ الفنسٹن (گورنر ممبئی) اپنی تاریخ ہند میں لکھتا ہے:

"اس کی طبیعت نے ہندوانہ تعصب سے تربیت پائی تھی۔اس طبیعت پر مجبول ہونے سے وہ مسلمانوں اور ان کے رسم و رواج سے سخت نفرت اور ہندوؤں اور ان کے طور طریقوں سے بڑی رغبت رکھتا تھا اور یہ ترقی روز افزوں تھی۔اس کا یہ مزاج تدبیر ملکی سے ایسا راس آیا تھا کہ اس نے بھگتوں کی صورت بنائی اور اوتاروں کی کرامتوں اور دیوتاؤں کی عنایتوں کا دعویٰ کیا"[1]۔

مرہٹہ تحریک کا وجود عالمگیر کے زمانہ میں ہوا۔وہ تقریباً ۲۶ سال دکن میں مرہٹوں کے استیصال کے لئے جنگ کرتے رہے۔مرہٹوں کی حیثیت بھی ایک منظم قانونی حکومت کے خلاف ایک احتجاجی گروہ agitator اور چھاپہ مار gurrilla طاقت سے زیادہ نہ تھی۔دکن اور مراٹھواڑہ کے جغرافیائی حالات یعنی پہاڑی اور جنگلی علاقے (جہاں منظم فوج کے ساتھ باقاعدہ جنگ ممکن نہ تھی) اور مرہٹوں کے چھاپہ مار طریقہ جنگ کی وجہ سے مرہٹوں کا مکمل خاتمہ ناممکن ہو گیا۔لیکن اورنگ زیب کی وفات کے بعد مرکزی حکومت کی روز افزوں کمزوری، سرداروں اور امراء کی باہمی رقابت اور اقتدار کے لئے رسہ کشی اور اپنے حریف کو زک پہونچانے یا زچ کرنے کی خاطر مرہٹوں کو اکسا کر ایک دوسرے کے علاقہ میں پیش قدمی اور لوٹ مار کرانے کی پالیسی نے ان کو ایک ایسی ملک گیر طاقت بنادیا جو دہلی کے تخت پر قبضہ کرنے کا خواب دیکھنے لگی۔متعصبانہ ہندو ذہنیت اور مسلمانوں سے من حیث القوم نفرت نے جلتی آگ پر تیل کا کام کیا۔

فرخ سیر کے دور حکومت کے آخری ایام میں جب اس نے سید برادران کے چنگل سے اپنے کو آزاد کرنے کی جدوجہد کی تو سید حسین علی نے دکن میں مرہٹوں کو اپنا ساتھی بنانے کی غرض سے بالاجی وشوناتھ کو تمام دکن سے چوتھ اور سردیش مکھی وصول کرنے کا حق دے دیا (مرہٹے سلطنت مغلیہ کے زیر نگیں علاقوں میں اپنی فوجی اور اقتصادی طاقت قائم کرنے کے لئے کسانوں اور تاجروں سے سرکاری پٹہ کا چوتھائی وصول کرتے تھے جس کو چوتھ کہا جاتا تھا اور اس کے علاوہ کل کا دسواں حصہ سردیش مکھی کے نام سے جبریہ وصول کرتے تھے اور اگر ان کو یہ رقم نہ دی جاتی تو وہ لوٹ مار مچادیتے تھے) جب بادشاہ نے اس حق کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا تو حسین علی فروری ۱۷۱۹ء کو مرہٹوں کی فوج کے ساتھ دہلی پر

---

[1] تاریخ ہند (اردو ترجمہ) صفحہ ۱۰۴۰ (علی گڑھ ۱۸۶۷ء) بحوالہ تاریخ دعوت و عزیمت جلد ۵ صفحہ ۲۷۹

حملہ آور ہوا۔[1]

مرہٹوں کا دہلی پر حملہ غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے اسے مرہٹہ تحریک کے عروج کی بنیاد سمجھنا چاہئے۔ مغل حکومت کی طاقت اور اقتدار کا رہا سہا بھرم کھل گیا۔ اس وقت وہ ملازمین کی حیثیت سے نہیں بلکہ مددگار فاتح کی حیثیت سے آئے تھے۔ ڈاکٹر سنہا نے لکھا ہے کہ مرہٹوں کا اس وقت دہلی آنا تاریخ کا ایک اہم واقعہ تھا۔ عرصۂ دراز سے وہ مرکزی مغل سلطنت کی عظمت اور وقار کو انتہائی خوف کی نظر سے دیکھتے رہے تھے مگر یہاں دارالسلطنت میں آکر انہوں نے جو کچھ دیکھا..... خون میں ڈوبی ہوئی دہلی، سازشوں میں ملوث درباری، بادشاہ جو سرداروں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی تھے اور مرکزی قوت جو خاک میں مل چکی تھی..... ان تمام حقیقتوں نے مغل سلطنت کے بارے میں ان کی آنکھیں کھول دیں اور ان کو اصلیت سے آگاہ کر دیا جس کی بناء پر وہ نفسیاتی خوف جو ایک عظیم مرکز کے سلسلہ میں ان پر طاری تھا یک لخت کافور ہو گیا۔[2]

یہی وجہ ہے کہ بالاجی کے بعد اس کے بیٹے باجی راؤ نے نہ صرف دکن بلکہ مالوہ اور گجرات سے خراج وصول کیا اور بندیل کھنڈ پر قبضہ کر لیا۔ ۳۴-۱۷۳۳ء میں مرہٹے گوالیار سے اجمیر تک ۲۲۰ میل کے علاقہ میں پھیل گئے۔ راجا جے سنگھ جو دہلی دروازہ سے نربدا کے کنارے تک حاکم تھا باوجود ۳۰/ہزار فوج رکھنے کے کچھ نہ کر سکتا تھا۔

خود محمد شاہ کا یہ حال تھا کہ مرہٹوں کے حملوں کی خبر سن کر راجہ جے سنگھ کو بیس تیس لاکھ روپیہ دے کر مرہٹوں سے صلح خریدنے کے لئے بھیج دیتا تھا۔[3]

---

[1] تاریخ مشائخ چشت مصنفہ خلیق احمد نظامی، صفحہ ۳۲۰ دہلی ۱۹۵۳ء

[2] This journey of the Marathas to Delhi produced far reaching consequences in thier history. Besides its immediate advantages it deeply coloured the later policy of the Marathas, and came as an eye-opener to them in many respects. For long the Marathas who had looked upon the imperial power and prestige with awe, witnessed at Delhi what that power actually meant ..... Delhi reeking with blood, courtiers thirving in machination, the Emperor an instrument of the ambitious nobles, the central authority levelled to the dust ..... all these revealed the realities about the Mughal Empire.

Thus this journey of the Marathas to Delhi is a memorable episode in their history. (Rise of the Peshwas by H.N. Sinha, P.No. 67-69.)

[3] ولیم ارون اپنی کتاب The Later Mughals میں رقم طراز ہیں:

Several times in previous years the Rajah (Jai Singh) had received form Mohd. Shah large sums, as much as thirty lakhs or twenty lakhs it is, for payment to the Marathas. (The Later Mughals by Irvin P.no. 278.

۱۷۳۷ء میں جب مرہٹہ دہلی پر حملہ آور ہوئے تو مغل بادشاہ نے دریا میں کشتیاں ڈلوادیں تاکہ محل شاہی کی دریچی سے نکل بھاگنے میں سہولت ہو۔[۱]

اس وقت ۱۷۳۴ء میں شاہ صاحبؒ کی عمر تیس اکتیس سال تھی اور وہ مسلمانوں کی اس بے کسی اور پریشانی کو جوان کو ان سخت دل لٹیروں سے لاحق ہو رہی تھی بغور دیکھ رہے تھے۔ آپؒ فرماتے ہیں:

"وبالجملہ مرہٹہ نامی قومے از کفار کہ رئیسے دارند در اقصائے دکن از چندگاہ سر بر آوردند و جمیع ولایت ہندوستان احاطہ کردند۔ متاخران ملوک تیموریہ از جہت عدم دور اندیشی و کثرت غفلت و اختلاف فکر بدست خود ملک گجرات بہ مرہٹہ دادند باز بہ ہماں سست اندیشی واسباب غفلت مالوہ بہ آنہا سپردند و نام صوبہ داری آنجا ہادند رفتہ رفتہ قوم مرہٹہ قوی تر شدند اکثر بلاد اسلام را متصرف گشتند واز مسلماناں وہنود باج گرفتند و آں راچوتھ نام نہادند"[۲]

"کفار میں ایک قوم مرہٹہ نامی ہے ان کا ایک سردار ہے۔ اس قوم نے کچھ عرصہ سے دکن میں سر اٹھایا ہے اور تمام ملک ہندوستان پر اثر انداز ہے۔ شاہان مغلیہ میں سے بعد کے بادشاہوں نے عدم دور اندیشی اور غفلت کی وجہ سے ملک مالوہ بھی ان کے سپرد کردیا اور ان کو وہاں کو صوبہ دار بنادیا۔ رفتہ رفتہ قوم مرہٹہ قوی تر ہوتی گئی اور اکثر بلاد اسلام ان کے قبضہ میں آگئے مرہٹوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں سے خراج لینا شروع کردیا اور اس کا نام انہوں نے چوتھ رکھا۔"

مرہٹوں نے جب بنگال پر حملہ کیا اور اس علاقہ میں جو انسانیت سوز سلوک روا رکھا اس کے متعلق بنگال کا مشہور شاعر گنگارام لکھتا ہے:

"برگیوں (مرہٹوں) نے دیہاتوں کو لوٹنا شروع کردیا..... کچھ لوگوں کے انہوں نے ہاتھ ناک اور کان کاٹ لئے کچھ کو مار ڈالا، خوبصورت عورتوں کو وہ رسیوں میں باندھ کر لے گئے۔ جب ایک برگی (مرہٹہ) زنا کر چکتا تھا تو دوسرا کرتا تھا۔ عورتیں چیخیں

---

۱ ارون مزید لکھتے ہیں

As a precauton in case of disaster, all the boats from the ferries for a distance of fifteen to twenty miles up and down the river were collected and placed under the palace windows. If necessary the women of the harem could be embarked on them and thus escape from dishonour. (The Later Mughals by William Irvin P.no. 291)

۲ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے سیاسی مکتوبات، مرتبہ خلیق احمد نظامی، صفحہ ۴۶-۴۷، اقتباس از مکتوب بنام احمد شاہ ابدالی، علی گڑھ ۱۹۵۰ء

مارتی تھیں..... انہوں نے گھروں کو آگ لگادی اور ہر طرف لوٹ مار کرتے ہوئے گھومے"[1]

بنگال ہی کے مشہور پنڈت ونیشور ودیالنکر نے ۱۷۴۴ء میں مرہٹوں کے ہنگاموں اور مظالم کا ذکر بڑے دردانگیز لہجے میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"شاہو راجہ کی فوجیں حاملہ عورتوں، بچوں، برہمنوں اور غریبوں کو بڑی بے دردی کے ساتھ قتل کرتی تھیں وہ ہر طرح کے گناہ کرتے تھے۔ جدھر سے گزر جاتے تھے ایک قیامت برپا ہو جاتی تھی۔"[2]

مرہٹوں کی ہنگامہ آرائیوں سے ہندو مسلمان سبھی متاثر ہوتے تھے۔ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کے بقول:

"ان کی نیت یہ ہے کہ جہاں تک ان کی دسترس ہو خلق خدا کے معاشی ذرائع مسدود کر کے اپنے قبضہ میں کرلیں۔"[3]

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ، مرزا مظہر جان جاناں، شاہ عبدالعزیز، سلیم اللہ، گنگارام، دنیشور ودیالنکر اور بہت سے پرتگالیوں نے ان کے دل ہلا دینے والے مظالم کا ذکر اپنی تصنیفات میں کیا ہے۔[4]

شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے مجبور ہو کر احمد شاہ ابدالی کو خطوط لکھے اور ہندوستان آکر مرہٹوں کے تسلط سے خلاصی دلانے کی درخواست کی۔ احمد شاہ ابدالی کو جو خط آپ نے بھیجا اس میں ہندوستان کی سیاسی، اقتصادی پوری کیفیت لکھ بھیجی اور اسلام اور خدا رسول کا واسطہ بھی دیا۔

---

۱ جادوناتھ سرکار اپنی تصنیف میں لکھتے ہیں:

An eye-witness, the Bengali poet Gangaram, thus describes the sufferings of the people :

"The Bargis began to loot the villagers. Every class of men took to flight with their properties..... when suddenly the Bargis came up and encircled them in the plain. They snatched away gold and silver, rejecting everything else. Of some people they cut off the hand, of some the nose and ears, some they killed outright. They dragged away the beautiful women, tying their fingers to their necks with ropes. When one Bargi had done with a woman, another seized her, the women shrieked in the agony of ravishment ..... They set fire to the houses, large & small, temples & dwelling places."

2. Aother contemporary, Vaneshwar Vidyalankar, the pandit of the Maharajah of Bardwan, worte in November 1744 :

"Shahu Raja's troops are niggard of pity, slayers of pregnant women & infants, of Brahmans and the poor, fierce of spirit expert in robbing the property of every one and in committing every sinful act". (Fall of the Mughal Empire by J.N. Sarkar Volume I, P.no. 54)

۳ تاریخ دعوت وعزیمت، صفحہ ۲۷۹، جلد ۵

۴ تاریخ مشائخ چشت، صفحہ ۳۲۱

"..... ہم خدائے عزوجل کے نام پر التماس کرتے ہیں کہ ہمت مبارک کو اس جانب متوجہ فرما کر مخالفین سے مقابلہ کریں تاکہ خدا تعالیٰ کے یہاں بڑا ثواب جناب کے نامہ اعمال میں لکھا جائے اور مجاہدین فی سبیل اللہ کی فہرست میں نام درج ہو جائے۔ دنیا میں بے شمار غنیمتیں ملیں اور مسلمان دست کفار سے خلاصی پا جائیں.....

..... پناہ خدا اگر قوم کفار اسی حال پر رہی اور مسلمان ضعیف ہو جائیں تو اسلام کا نام بھی کہیں باقی نہ رہے گا"[۱]

احمد شاہ ابدالی ہندوستان آیا اور پانی پت کے مقام پر جو جنگ مرہٹوں سے ہوئی اس نے مرہٹوں کی طاقت کو پارہ پارہ کر دیا اور جادو ناتھ سرکار کے بقول مہاراشٹر میں کوئی گھر ایسا نہ رہا جہاں صف ماتم نہ بچھ گئی ہو۔"[۲]

۲۔ سکھ تحریک:

سکھ فرقہ پنجاب کا ایک مذہبی گروہ تھا۔ اس گروہ کے بانی بابا نانک (۱۴۹۶ء-۱۵۳۹ء) ہندوؤں کے مقابلہ میں عقیدۃً و عملی طور پر مسلمانوں سے زیادہ قریب تھے۔ پندرہویں صدی عیسوی میں اسلام کے اثر سے ہندو مذہب میں جو اصلاحی تحریکیں نمودار ہوئیں ان میں سکھ تحریک نمایاں تھی۔ خدا کی وحدانیت، دیوی دیوتاؤں کا انکار، ذات پات کی مخالفت، سماجی مساوات، اخلاقی زندگی اس تحریک کی خاص باتیں تھیں۔ گرونانک بڑے وسیع المشرب انسان تھے۔ مسلمان بزرگوں اور صوفیاء کی صحبت سے وہ کافی مستفیض ہوئے۔ پاک پٹن میں حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کے سجادہ نشینوں کی صحبت سے کافی فائدہ اٹھایا[۳]۔ اس لئے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں ان کے خیالات بڑی حد تک حسن ظن پر مبنی تھے۔ "سیر المتاخرین" کے بیان کے مطابق بابا نانک نے فارسی اور دینیات کی تعلیم ایک بزرگ سید حسن سے حاصل کی تھی اور ان کی بابا نانک پر خصوصی نظر تھی[۴]۔

ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور نے لکھا ہے:

۱۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات، مکتوب دوئم، صفحہ ۱۰۶

۲۔ تاریخ مشائخ چشت، صفحہ ۳۲۳۔

۳۔ ارون لکھتے ہیں:

He seems to have consorted freely with Muhammadans, particularly with the successors of Shaikh Farid, known as Ganji-i-Shakkar, whose tomb is at Pak Patan (or Ajodhan), south of Lahore. (Later Mughals by W.Irvin Vol, I P. no. 74)

۴۔ ترجمہ سیر المتاخرین۔ صفحہ ۲۸

"بابا نانک انسانی دل کو سیاسی آزادی نہیں بلکہ روحانی آزادی دلانا چاہتے تھے۔ ان کا مقصد تھا کہ ان کے پیرو، خود غرضی، مذہبی تعصب اور روحانی جمود سے آزاد ہوں۔ گرو گوبند نے ان کی روحانی طاقت کو مادی کاموں میں لگادیا یہ ایک اچھی تحریک کا حسرتناک انجام تھا۔"

ابتداً مغل بادشاہوں سے ان کے تعلقات عزت واحترام اور یگانگت پر مبنی تھے۔ بابر جب ہندوستان آیا تو گرونانک کی خدمت میں عقیدتمندانہ حاضر ہوا۔ گرونانک نے اسے ہندوستان کی فتح اور سات پشتوں تک اس کی نسل میں حکمرانی کی دعا دی۔ اکبر نے بھی گرو امرداس، گرو ارجن کی بڑی عزت کی اور ان کو بڑے انعام واکرام سے نوازا۔ اکبر نے خود جاکر گرو امرداس سے بارہ دیہات قبول کرنے کی درخواست کی۔ گرو گرنتھ پر اکیاون اشرفیاں چڑھائیں۔ گرو ارجن کی سفارش پر پنجاب کا ایک سال کا لگان معاف کیا۔ امرتسر جس کا قدیم نام گرو چاک ہے اکبر ہی نے سکھوں کو دیا۔[۱]

لیکن اکبر کے بعد جب گرو ارجن نے سکھ تحریک کو سیاسی بنیادوں پر منظم کرنا شروع کیا اور امرتسر کو اپنا عسکری مرکز بنا کر کابل سے ڈھاکہ تک جہاں جہاں سکھ بستے تھے ان سے محصول لینا شروع کیا تو مغل بادشاہوں کے رویہ میں بھی تبدیلی آگئی۔ مسلمان بادشاہوں کی مخالفت کا سبب کوئی مذہبی عناد نہ تھا بلکہ اس کی وجہ کلیتاً سیاسی تھی۔[۲]

سکھوں کا سب سے پہلا جھگڑا جہانگیر سے ہوا۔ گرو ارجن ذہنی طور پر شہزادہ خسرو سے قریب تھا۔ جب شہزادہ خسرو نے اپنے باپ سے بغاوت کی تو گرو ارجن نے اسے پناہ دی اسی بناء پر جہانگیر نے گرو پر جرمانہ کیا اور عدم ادائیگی پر اس کو قتل کرادیا۔ اس قتل میں کوئی مذہبی جذبہ ہرگز کارفرمانہ تھا بلکہ یہ سزا صرف سیاسی اسباب کی بناء پر دی گئی تھی۔ لیکن اس واقعہ کے بعد شاہان مغلیہ کی جانب سے سکھوں کے دلوں میں ابدی نفرت کا جذبہ پیدا ہو گیا جو بعد میں عام مسلم بیزاری میں تبدیل ہو گیا۔[۳]

گرو ارجن کے بعد گرو گوبند نے اعلانیہ عملی مدافعت ومزاحمت کا طرز عمل اختیار کیا۔ جہانگیر نے

---

۱ تاریخ مشائخ چشت، صفحہ ۳۱۵

۲ جادوناتھ سرکار نے اپنی کتاب History of Aurangzeb میں لکھا ہے:
With the business instinct of a Khatri (petty traders) Gru Arjun organized a permanent source of income. A band of agents called masands were stationed in every city from Kabul to Dacca, where there was a Sikh, to collect the tithes and offernigs of the faithful, and this spiritual tribute, so far as it escaped peculation by the agents, reached the central treasury at Amritsar. (History of Aurangzeb by J.N. Sarkar Vol. III P.no. 204)

۳ الامام ولی اللہ محدث دہلویؒ، صفحہ ۲۳۸

انہیں گوالیار کے قلعہ میں نظر بند کردیا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد رہا کردیا۔ لیکن شاہجہاں کی تخت نشینی کے فوراً بعد انہوں نے پھر کھلم کھلا سرکشی کی اور حکومت کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا۔ آخر میں وہ پہاڑیوں میں نکل گئے۔ جہاں ۱۶۴۵ء میں انکا انتقال ہو گیا۔

اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں گرو تیغ بہادر اور گرو گوبند سنگھ سکھوں کے گرو ہوئے لیکن ان سب نے حکومت وقت کے خلاف سیاسی اور فوجی کارروائیاں کیں اور شاہی فوج سے مقابلہ آرائی کی جس کے نتیجہ میں اورنگ زیب نے قانون وقت کے مطابق گرو تیغ بہادر کو سزائے موت دی بلکہ گرو تیغ بہادر کے بارے میں تو یہ کہا جاتا ہے کہ اس کے قتل کی ذمہ داری تنہا اورنگ زیب پر نہ تھی بلکہ اس میں اس کے مخالفوں کا ہاتھ تھا۔[1]

گرو گوبند سنگھ نے سکھوں کو جو ابتداء میں محض ایک "مذہبی گیان" والی جماعت تھی ایک جنگجو قوم بنادیا اور انہیں ایک قوم کی صورت میں منظم کرنے کا کام کیا۔ اورنگ زیب کے انتقال تک وہ زندہ رہے یہی وہ زمانہ ہے جب شاہ ولی اللہ دہلویؒ پیدا ہوئے۔

اورنگ زیب کے انتقال کے بعد ان کے جانشین بہادر شاہ اول نے گرو کے ساتھ مفاہمت کی کوشش کی اور انہیں دکن کی فوجی کمان عطا کردی۔ لیکن اکتوبر ۱۷۰۸ء میں ایک افغان ملازم نے ان پر حملہ کر کے ان کو زخمی کردیا اس زخم سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔ انہوں نے کسی کو اپنا جانشین نامزد نہیں کیا اور پیروؤں کو حکم دیا کہ وہ گرنتھ کو اپنا گرو اور خدا کو اپنا واحد محافظ مانیں۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد ان کے بیٹے پوتوں میں تخت کے لئے متواتر جھگڑے اور لڑائی شروع ہو گئی اور درباری چپقلش کی وجہ سے سلطنت کے وقار کو نقصان پہنچا اور سلطنت پر بہت سرعت سے زوال آنا شروع ہو گیا جس کی وجہ سے سکھوں کو علی الاعلان اپنی طاقت میں اضافہ کا موقع مل گیا۔ گرو گوبند کے بعد سکھوں کی فوجی قیادت ایک کشمیری ہندو راجپوت بندہ بیراگی کے ہاتھوں میں منتقل ہو گئی جس نے سکھ مت اختیار کرلیا تھا۔ اس نے پنجاب میں وسیع پیمانہ پر رہزنی کی وارداتیں شروع کردیں۔ بندہ بیراگی کے مظالم سے تمام شمالی ہندوستان کانپ گیا۔ وہ ہزاروں کی تعداد میں مسلمانوں کو بے رحمی سے قتل کرتا اور لوٹ مار کرتا ہوا دہلی کے قرب وجوار میں جا پہنچا۔ مئی ۱۷۱۰ء میں اس نے سرہند پر دھاوا بول دیا اس کے ظلم سے بچنے کے لئے بہت سے مسلمانوں نے ہندوؤں کے گھروں میں بھیس بدل کر پناہ لی۔

سیر المتاخرین میں لکھا ہے:

---

[1] تاریخ دعوت وعزیمت، صفحہ ۲۸۳، جلد ۵

"زنہائے حاملہ راشکم دریدہ و جنین راکشیدہ می کشتند"[1]

(حاملہ عورتوں کا پیٹ چاک کر کے بچہ کو باہر نکال کر مار ڈالتے۔)

بندہ بیراگی نے مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس کا اندازہ اس تحریر سے ہو سکتا ہے:

"بر دیہات و آبادی اہل اسلام ہر جا دست او می رسید تاختہ از سکنہ آنجا ہر کرامی یافت ابقا نمی کرد ہر چند کہ اطفال صغیر السن باشند"[2]

اہل اسلام کی بستیوں اور آبادیوں پر جہاں کہیں قابو پاتا تھا چڑھ دوڑتا اور وہاں کے باشندوں میں جس کسی کو پاتا باقی نہ چھوڑتا تھا خواہ ننھے بچے ہی کیوں نہ ہوں۔

مرزا حیرت نے ایک ہندو مصنف (ایکسٹرا اسسٹنٹ) کی شہادت نقل کی ہے وہ لکھتے ہیں:

"مسلمانوں سے سکھوں کو بڑی دشمنی تھی۔ اذان بآواز بلند نہیں ہونے دیتے تھے مسجدوں کو اپنے تحت میں لے کر گرنتھ ان میں پڑھنا شروع کرتے اور اس کا نام مست گڑھ رکھتے تھے..... جو مٹی کا برتن کسی مذہب والے کا (خصوصاً مسلمان کا) پڑا ہوا ان کو ہاتھ آجاتا تھا پانچ جوتے اس پر مار کھانا پکا لیتے تھے یعنی پانچ جوتے اس پر مارنا اس کو پاک ہونا سمجھتے تھے"[3]

مرزا حیرت ہی کا بیان ہے:

"سکھوں کا دستور ہے کہ وہ ہولے کر کے کھاتے ہیں، دہلی میں ہولے سوکھے بونٹوں کو گھاس پھوس کی آگ میں معہ شاخوں کے خستہ کرنے کو کہتے ہیں۔ مگر سکھوں میں انہیں ہولے نہیں کہتے۔ وہ ایک بڑے فولادی پنجرے میں چیل، کوئے، کبوتر، تیتر، مینائیں، طوطے غرض مختلف قسم کے جانور بند کر کے پنجرے کو کسی درخت میں لٹکا دیتے ہیں اور پھر نیچے آگ دے دیتے ہیں وہ زندہ پرندہ پھڑ پھڑا کے بھن کے کوئلہ ہو جاتے ہیں پھر انہیں صاف کر کے یہ ناخدا ترس کھاتے ہیں۔۔ اسی طرح بے گناہ مسلمانوں کے بھی ہولے کئے جاتے تھے اور انہیں تڑپا تڑپا کر مارا جاتا تھا"[4]

بہادر شاہ نے پنجاب میں بندہ کو شکست دی اور وہ پہاڑیوں میں فرار ہو گیا۔ فرخ سیر کی تخت نشینی کے بعد سیاسی انتشار سے فائدہ اٹھا کر بندہ بیراگی نے دوبارہ دہشت انگیزی شروع کی۔ لیکن بالآخر ۱۷۱۶ء

---

[1] ترجمہ سیر المتاخرین، صفحہ ۲۹، جلد ۲

[2] ایضاً، صفحہ ۲۹-۳۰، جلد ۲

[3] حیات طیبہ مصنفہ مرزا حیرت دہلوی، صفحہ ۲۴۰، لاہور ۱۹۵۸ء

[4] حیات طیبہ، صفحہ ۲۳۹-۲۴۰

میں گرفتار کر کے دہلی لا کر اسے قتل کر دیا گیا۔ لیکن اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً سکھ تحریک بار بار ابھرتی رہی۔ آخر کار ۱۷۶۲ء میں احمد شاہ ابدالی پھر واپس آیا اور لدھیانہ میں اس نے سکھوں کو شکست فاش دی۔[۱]

لیکن چونکہ اس کے بعد کا دور دور ولی اللہی نہیں ہے اس لئے ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ بندہ بیراگی اور اس کے ساتھیوں کے مظالم کو حضرت شاہ صاحب نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا آپ اس وقت دہلی میں موجود تھے۔ جب فرخ سیر کے دربار میں ان کو گرفتار کر کے لایا گیا اور جو مظالم انہوں نے مسلمانوں پر کئے اور ان سے جو افراتفری پھیلی اس کا عکس بھی شاہ صاحب کی تحریروں پر پڑا۔

۳۔ جاٹ

جاٹ مرہٹوں کی طرح نہ کوئی منظم فرقہ تھے نہ سکھوں کی طرح کوئی مذہبی گروہ بلکہ جمنا کے جنوبی علاقہ میں آگرہ اور دہلی کے درمیان آباد ایک قبیلہ کے لوگ تھے جو زیادہ تر زراعت پیشہ تھے مگر ان کی گزر بسر رہزنی اور بٹ ماری پر ہوتی تھی۔ ان کا مقصد کسی سلطنت کا قیام یا سیاسی انقلاب نہ تھا بلکہ بگڑے ہوئے حالات سے عارضی فائدہ اٹھانا، استحصال اور اقتصادی مقاصد کی تکمیل تھی۔[۲]

پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:

"جمنا کے جنوبی علاقہ میں آگرہ سے دہلی تک جاٹ آباد تھے ان کی مشرقی سرحد چنبل تھی۔ اس علاقہ میں ان کی ہنگامہ آرائی کا یہ عالم تھا کہ مرکزی حکومت کا ناک میں دم آگیا تھا۔ بقول جادو ناتھ سرکار دہلی اور آگرہ کی سڑک پر ایسا کانٹا برداشت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ (Fall, Vol I, P. 369) دہلی سے آگرہ نقل و حرکت میں بڑی احتیاط برتنی پڑتی تھی، دکن کو اجمیر ہوتی ہوئی جو فوجیں جاتی تھیں وہ اسی علاقہ سے گزرتی تھیں"۔[۳]

جاٹوں کے مظالم سے دہلی اور ارد گرد کے باشندے سخت پریشان ہو گئے تھے۔

"ہرچرن داس مصنف چہار گلزار شجاعی کا بیان ہے کہ جب جاٹوں نے پرانی دہلی کو لوٹنا شروع کیا تو دہلی کے باشندے گھبراہٹ اور پریشانی میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے وہ در بہ در گلی بہ گلی مارے پھرتے تھے بالکل اسی طرح جیسے کوئی ٹوٹا ہوا جہاز ظالم موجوں کے رحم و کرم پر ہو پاگلوں کی طرح ہر شخص پریشان حال اور گھبرایا ہوا نظر آتا تھا"[۴]

۱۔ تاریخ دعوت و عزیمت، صفحہ ۲۸۴، جلد ۵

۲۔ تاریخ مسلمان پاک و بھارت: ہاشمی فرید آبادی، پاکستان ۱۹۵۳ء

۳۔ تاریخ مشائخ چشت، صفحہ ۳۲۳؛ Fall of the Mughal Empire by J.N. Sarkar, Vol. I. P. 369.

۴۔ تاریخ مشائخت چشت، صفحہ ۳۲۴۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے مکتوبات سے دہلی کے باشندوں کی پریشانی کا اندازہ ہوتا ہے۔ حافظ جار اللہ کو جو اس وقت سفر حج میں تھے مطلع کرتے ہیں:

" و قد وقعت بالدهلی داهية عظيمة فنهب الكفار من قوم جت، البلدة القديمة من الدهلی و عجزت الدولة عن دفعهم فنهبت الاموال و انتهت و حرقت البيوت..... و كانت الواقعه فی اوائل رجب ۱۱۶۱ھ و استمرت الی اواخر شعبان"[۱]

دہلی میں ایک عظیم حادثہ واقع ہوا۔ قوم جاٹ نے دہلی کے شہر کہنہ کو لوٹا اور حکومت اس فساد و شرارت کو دفع کرنے سے عاجز رہی۔ انہوں نے مال لوٹے، عزت و ناموس کو برباد کیا اور مکانات کو آگ لگائی.....اور یہ لوٹ مار کا حادثہ اوائل رجب ۱۱۶۱ھ میں ہوا اور آخر شعبان تک باقی رہا۔

۴۔ روہیلے

بارہویں صدی ہجری میں جو تین مزاحمتی تحریکیں یعنی مرہٹہ، جاٹ اور سکھ اٹھیں ان میں سے کوئی بھی سیاسی طور پر اتنی منظم اور اخلاقی طور پر اتنی معتبر نہ تھی کہ علاقائی اثر کو چھوڑ کر کوئی بین الملکی حکومت قائم کر سکتی یا اس کو چلا سکتی۔ جیسا کہ بیان ہوا ہے مرہٹہ حسین علی خاں کی سازش سے دہلی پر حملہ آور ہوئے یا دکن میں ان کو چوتھ وصول کرنے کا اختیار دے دیا گیا تھا یا پھر بنگال اور دیگر علاقوں پر ہر جگہ سوائے لوٹ مار اور قتل و غارت گری کے انہوں نے کسی تنظیمی یا حکمرانی صلاحیت کا کوئی ثبوت نہیں دیا۔ سر جادو ناتھ سرکار لکھتے ہیں کہ مرہٹے چوتھ وصول کرنے کے بعد کبھی یہ بھی نہ سوچتے تھے کہ ان علاقوں کی نگہداشت کی اخلاقی ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے یا نہیں۔ تاریخ ہندوستان میں مولوی ذکاء اللہ دہلوی لکھتے ہیں:

"وہ آدھے بادشاہ آدھے راہزن تھے۔ رعایا پروری، ہمدردیٔ خلائق اور انسانی جان و مال عزت و آبرو کی حفاظت کی قدیمی و موروثی روایات (جو کہ رعونت و نفسانیت کے موقعوں پر بھی خود مختار حاکموں اور بادشاہوں کی کسی حد تک حفاظت کرتی۔ اور عناں گیر ہوتی رہی ہیں) نیز شاندار تاریخی پس منظر نہ ہونے اور اعلیٰ اور واضح تعمیری و سیاسی مقاصد کے مفقود ہونے کی وجہ سے پھر اس سب کے علاوہ ہندو مذہب و تہذیب کے احیاء کے جذبہ (Hindu Revivalism) نے ان میں جارحیت فیصلوں میں عجلت اور عدم رواداری کی صفت

[۱] شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات، صفحہ ۸۹

پیدا کردی تھی"[۱]

اسی طرح سکھ تحریک بھی کوئی ملک گیر تحریک نہ تھی۔ ابتدا میں وہ برہمنی ہندو سماج اور ذات پات کے خلاف ایک مذہبی تحریک تھی جو بعد میں مغل شاہی کے خلاف ایک مزاحمتی اور انتقامی تحریک بن گئی۔ جو بہت عرصہ گزرنے کے بعد صرف پنجاب میں اپنی کوئی مستقل حکومت قائم کر سکی۔ جس کو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے آپسی جھگڑوں میں پڑے ہوئے مخالف گروہوں (جن کو مسل کہا جاتا ہے) کو ایک مضبوط سلطنت کی شکل میں متحد کر دیا۔

جہاں تک جاٹوں کا تعلق ہے تو وہ بھی متفرق قبائل کے علاوہ کسی جگہ بھی متحد نہ رہے۔ حکومت تو بڑی بات ہے وہ لوگ ہمیشہ آگرہ اور دہلی کے درمیان اپنے گڑھ اور گڑھیاں بنا کر رہتے اور حکومت کے لئے ہمیشہ خطرہ بنے رہتے۔ لیکن افغان قبائل جو کابل و قندھار سے آکر مختلف مقامات پر بس گئے تھے۔ بریلی، شاہجہانپور، اور فرخ آباد میں خاص طور پر ان کی نو آبادیاں قائم ہوئیں۔ فرخ آباد کے افغانوں نے محمد خاں بنگش کی قیادت میں بڑا عروج حاصل کیا۔ بریلی کے افغان قبائل روہیلوں کے نام سے مشہور ہوئے اور انہوں نے اتنی تیزی سے تنظیم کی کہ اٹھارویں صدی عیسوی کی سیاسی دنیا میں اپنے لئے ایک خاص جگہ پیدا کر لی[۲]۔

روہیلوں میں جذبہ حکمرانی بدرجہ اتم موجود تھا۔ ان میں وہ تمام صلاحیتیں موجود تھیں جو اعلیٰ درجہ کے حکمرانوں میں ہونی چاہیں۔ ان کا عسکری نظام بہت مستحکم تھا اور انمیں سیاسی بصیرت کی کوئی کمی نہ تھی۔ وہ مہلک امراض جنہوں نے سلطنت مغلیہ کو کھوکھلا کر دیا ان کو چھو کر بھی نہ گزرے تھے۔ حکمراں کی حیثیت سے بھی ان کی شان امتیازی تھی۔ روہیلوں نے جن علاقوں پر حکومت کی۔ ان کے باشندوں کو اپنی انصاف پسندی سے فتح کر لیا۔ جارج فاسٹر ۱۷۸۳ء میں روہیلوں کے علاقوں سے گزرا تو ان کے نظام حکومت سے بڑا متاثر ہوا۔ وہ لکھتا ہے:

"روہیلوں کے نام کی بھی اس علاقہ میں عزت کی جاتی ہے۔ انہوں نے اپنے مفتوحہ علاقوں میں فارغ البالی اور خوشحالی پھیلا دی ہے گاؤں سرسبز و شاداب ہیں اور ہر طرف بحالی ہی بحالی ہے"[۳]

۱۔ تاریخ ہندوستان، صفحہ ۳۰۴ جلد ۹

۲۔ تاریخ مشائخ چشت، صفحہ ۳۲۵۔

۳۔ A Journey form Bengal to England by George Forster Vol !, P.no. 97-99

روہیلوں کے مذہبی عقائد:

روہیلے عموماً نہ صرف سنی مسلمان تھے بلکہ پکے حنفی المسلک تھے۔ ان کا مخصوص قومی مزاج جوان کے افغانی النسل ہونے کا مرہون منت تھا نہایت متشدد اور سخت تھا۔ جو ہندوستان میں پہلے سے موجود عناصر یعنی تورانی اور ایرانی مزاج سے بالکل مختلف بلکہ مخالف تھا۔ ان کے مزاج میں جو فطری سختی اور کرختگی پائی جاتی ہے وہ نہ ایرانیوں میں تھی نہ تورانیوں میں۔ ایرانیوں سے تو ان کا عناد کھلم کھلا تھا۔ مذہبی طور پر وہ شیعہ کو کافر سمجھتے تھے اور اس سلسلہ میں اتنے سخت تھے کہ خود شاہ ولی اللہ دہلویؒ بھی ان کے اس تعصب کے تیروں سے محفوظ نہ رہ پائے۔

شاہ عبدالعزیزؒ کہتے ہیں:

"ہم چنیں شخصے از والد ماجدؒ مسئلہ تکفیر شیعی پرسید آں حضرت اختلاف حنفیہ کہ دریں باب ست بیان کردند۔[1]

یوں ہی ایک شخص نے والد ماجد سے شیعوں کے کافر قرار دینے کے متعلق فتویٰ پوچھا، آنجناب (والد ماجد) نے حنفی فقہاء میں جو اختلاف ہے اس کو بیان کیا۔

"ملا کیش" غریب روہیلہ پہلی دفعہ تو یہ سن کر چپ رہا اور پھر دہرا کر ذرا اصرار سے اپنے منشاء کو ظاہر کرتے ہوئے

چوں مکرر پرسید ہما شنید۔[2]

جب اس نے دوبارہ وہی بات پوچھی تو جواب میں پھر وہی سنا

دوسری دفعہ اس کا یہ سننا تھا کہ آگ بگولہ ہو گیا۔ جن کو وہ قطعی کافر سمجھتا تھا ان کے کفر کے متعلق اختلاف کا سننا اور دوبارہ پوچھنے کے بعد بھی سننا ناقابل برداشت ہو گیا۔ گیا تھا خود حضرت سے فتویٰ پوچھنے لیکن الٹ کر خود مفتی بن بیٹھا۔

شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں:

"شنیدم می گفت ایں شیعی است"[3]

میں نے سنا وہ کہتا تھا کہ یہ (یعنی شاہ ولی اللہ) شیعی ہے۔

---

[1] تذکرہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ مصنفہ مناظر احسن گیلانی، صفحہ ۱۹۸، کراچی ۱۹۵۹ء

[2] تذکرہ شاہ ولی اللہ دہلوی، صفحہ ۱۹۹

[3] ایضاً، صفحہ ۱۹۴-۱۹۶

معاشرتی اور تہذیبی لحاظ سے ان میں وہ تکلف نرمی اور لطافت مفقود تھی جو ایرانی تہذیب کا خاصہ تھی اور اس کے نفوذ کی بنا پر ہندوستانی تہذیب میں شامل ہو گئی تھی۔ جس کو کبھی لکھنوی تہذیب اور کبھی دہلی کے شرفاء کی تہذیب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ اس معاملہ میں بڑے "اجڈ" تھے اور بلا تکلف اپنے نزدیک کالے کو کالا سمجھنے اور کہنے سے ذرا نہ چوکتے۔

دوسری طرف تورانی اگرچہ سنی تھے مگر زیادہ تر صوفی مشرب اور حضرات صوفیائے کرام و اولیائے عظام کے زیر اثر تھے۔ ان کے برخلاف روہیلے مسلمانوں پر بجائے صوفیوں اور ارباب باطن کے زیادہ تر تنگ نظر، ظاہر بین، جزئیاتی فقہاء کا پنجہ سختی سے جما ہوا تھا۔ پشتہا پشت سے وہ اپنے ان ہی مذہبی پیشواؤں کے زیر اثر تھے جن کا قول ان کو قرآن و حدیث سے بھی زیادہ قابل اطاعت ہوتا اور جن کو وہ مُلا کہتے تھے[1]۔

بہر حال اس قوم کے اسی فطری "بطش شدید" اور "ملا کیشی" کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان اور مغلی حکومت جس میں ایرانی اور تورانی اب تک رواداری اور باہمی مدارات کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے (اگرچہ سیاسی حریف تھے) اس میں روہیلوں کی شدید ملایانہ ذہنیت نے بتدریج تلخی اور تندی کا اضافہ کرنا شروع کر دیا۔

روہیلوں میں مذہبی جذبہ بدرجہ اتم موجود تھا اور اس معاملہ میں وہ بے حد متشدد تھے لیکن (مرہٹوں کے خلاف) مذہبی تعصب نام کو نہ تھا۔ روہیلوں نے ہندو دیوان بکثرت ملازم رکھے تھے، نجیب الدولہ خاص طور پر ہندوؤں کے تہواروں کے موقعوں پر ان کا خیال رکھتا تھا۔

پروفیسر خلیق نظامی لکھتے ہیں:

> "اس کی عدل گستری و بالغ نظری کا یہ واقعہ ہمیشہ تاریخ میں یاد رہے گا کہ وہ جس وقت بستر مرگ پر آخری سانس لے رہا تھا تو اس نے اپنی فوجوں کو (جو اس کے ساتھ ہاپڑ کے مقام پر تھیں اور گڑھ کا میلہ ہو رہا تھا) حکم دیا کہ گنگا کے میلے میں آنے جانے والے ہندو یاتریوں کے جان و مال کی پوری حفاظت کی جائے"[2]

ہندوستان میں جب مغلوں کے تعیش اور درباری رقابتوں اور بادشاہوں کے ذاتی جبن کی بدولت مرکز کی گرفت کمزور پڑی تو روہیلوں نے اپنے عسکری نظام کی بدولت مختلف مرکز

---

[1] تذکرہ شاہ ولی اللہ۔ صفحہ ۱۹۴-۱۹۶

[2] شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، صفحہ ۴۱۵

قائم کر لئے۔ بریلی، شاہ جہاں پور، آنولہ، سنبھل، مراد آباد وغیرہ میں محمد خاں روہیلہ نے اعتماد الدولہ امین خاں کی نظر التفات سے سر فراز ہو کر روہیلکھنڈ کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس طرح روہیلوں کی جدید طاقت ملک میں مسلم ہو گئی۔[۱]

شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور نواب نجیب الدولہ والی نجیب آباد کے تعلقات بہت گہرے تھے۔ وہ نجیب الدولہ کی خوبیوں سے اچھی طرح واقف تھے اور انتشار کے دور میں ملکی طاقتوں میں انکی نظر نجیب الدولہ پر ہی پڑی جن کو انہوں نے احمد شاہ ابدالی کے ساتھ ہی مرہٹہ قوت کو توڑنے کی دعوت دی اور ان کو رئیس الغزات اور رأس المجاہدین کے لقب سے پکارا۔

ہندوستانی معاشرہ پر تاریخی واقعات کا اثر:

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ جس زمانہ میں پیدا ہوئے اور جس میں انہوں نے اپنی زندگی کے ۶۱ سال گزارے اس میں اسلام اور مسلم معاشرہ چاروں طرف سے اغیار کے نرغہ میں گھرا چلا جاتا تھا۔ یہ اغیار نہ صرف غیر مسلم قومیں تھیں بلکہ وہ تحریکیں، تغیرات، بدعتیں اور غیر اسلامی اعتقادات و رسوم بھی تھے جو اسلام کے مصفی پانی کو گدلا کر رہے تھے۔

شمال مغربی علاقوں میں سکھوں کی آتشیں قوت سر اٹھا رہی تھیں۔ جنوبی ہند سے مرہٹوں کا سیلاب سرگرم تھا۔ دونوں قوتوں میں باہم جو بھی اختلاف ہو لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مآثر و نشانات ان کے نام لیوا اور وابستگان و حلقہ بگوشوں کا کلی طور سے قلع قمع کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے تھے۔ تیسری طرف خلیج بنگال کے ساحلی علاقوں سے مغربی قوتیں (جن کا اثر ولی اللہی عہد کے بعد ظاہر ہوا مگر جن کی ریشہ دوانیاں ان کے آخری دور میں شروع ہو چکی تھیں) بتدریج اپنا پنجہ ملک پر جماتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھیں۔

یہ تو اغیار کے یا پھر (اسلام کے لحاظ سے) بیرونی فتنے تھے، سلطنت کے اندر ایرانیوں اور تورانیوں پھر ان کے ساتھ روہیلوں کے باہمی تصادم اور مختلف اغراض و مقاصد کی کشمکش سے "اسلامی حکومت ہند" کی قبا تار تار ہو رہی تھی۔[۲]

ان سیاسی اور تاریخی واقعات کا جو اثر ہندوستان کے تہذیبی، ثقافتی، سماجی، معاشی، مذہبی اور علمی حالات پر پڑا اس کا جائزہ آئندہ سطور میں لیا جائے گا۔

---

۱ الامام ولی اللہ محدث دہلویؒ، صفحہ ۲۵۶

۲ تذکرہ شاہ ولی اللہ، صفحہ ۲۰۲-۲۰۳

سماجی، ثقافتی، تہذیبی و مذہبی حالات

سلطنت مغلیہ کا سیاسی زوال، مختلف طاقتوں اور تحریکوں کے ابھرنے کا لازمی نتیجہ ہندوستانی معاشرہ اور عوام کی عادات و طرز رہائش میں تبدیلی کا باعث ہوا۔ محمد شاہ کے زمانہ میں ہندوستانی معاشرہ اور طبقہ امراء کا رجحان "الناس علی دین ملوکھم" کے اصول کے مطابق عیش و عشرت، تن آسانی اور لذت اندوزی کی طرف تیزی سے ہوا۔ خصوصاً ہندوستان کا مسلم معاشرہ دولت کی فراوانی اور ایرانی تہذیب کے اثر سے اخلاقی زوال کے نقطہ عروج کو پہنچ گیا۔ امراء کے پاس دولت کی فراوانی اور دوسری طرف عام لوگوں میں افلاس اور اشیاء واجناس کی قیمتوں میں بے پناہ اضافہ۔ یہ تمام حالات ایسے تھے جن کی وجہ سے معاشرہ مجموعۂ اضداد بن گیا۔[1]

دربار میں ایرانی تورانی یا بالفاظ دیگر شیعہ سنی اقتدار کی کشمکش، کٹر حنفیت کے علمبردار پٹھانوں (روہیلوں) کی دربار میں امیر الامراء کی حیثیت سے ایک روہیلہ امیر نجیب الدولہ کی شکل میں ایک تیسرے عنصر کی موجودگی کے سبب اور دوسری طرف شاہان مغلیہ کی مذہبی پالیسیوں کی وجہ سے معاشرہ پر مذہب کی گرفت کمزور پڑ گئی۔

اس دور میں دہلی میں بہت سے سلسلوں کے عظیم المرتبت مشائخ جلوہ افروز تھے شاہ عبدالعزیز (بن شاہ ولی اللہ) کا بیان ہے:

"در عہد محمد شاہ بادشاہ بست و دو بزرگ صاحب ارشاد از ہر خانوادہ در دہلی بودند وایں چنیں اتفاق کم می شود"[2]

محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ میں بائیس بزرگ صاحب ارشاد ہر سلسلہ اور طریقہ کے دہلی میں تھے۔ ایسا اتفاق کم ہی ہوتا ہے۔"

شاہ فخر الدین صاحبؒ، مرزا مظہر جان جاناںؒ، وغیرہ کی خانقاہیں رشد و ہدایت کا منبع تھیں، پھر شاہ ابوسعیدؒ، شاہ عبدالغنیؒ، شاہ محمد آفاقؒ، خواجہ نصیر وغیرہ کی خانقاہیں تھیں۔ جہاں تزکیہ باطن اور تہذیب نفس کے درس دیئے جاتے تھے اور باطنی زندگی کو سنوارنے کے لئے دن ورات کوشش کی جاتی تھی۔

اسی سیاسی بدامنی اور سماجی انحطاط اور اخلاقی پستی کے دور میں کچھ اللہ کے نیک بندے علم کی شمع

---

[1] تاریخ دعوت و عزیمت، صفحہ ۶۱، جلد ۵

[2] ملفوظات شاہ عبدالعزیز ترجمہ مولوی محمد علی لطفی و مفتی انتظام اللہ شہابی، صفحہ ۱۹۸، کراچی ۱۹۶۰ء

جلائے ظلمات کے اندھیروں کو دور کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ بقول شاہ عبدالعزیز کے دہلی کا یہ عالم تھا کہ

بها مدارس لو طاف البصير بها

لم تفتح عينه الا على الصحف

اس میں (دہلی میں) ایسے مدارس تھے کہ اگر کوئی صاحب بصیرت ان میں نکل پڑتا تو اس کی نگاہیں بس صحائف (کتابوں) پر ہی پڑتیں۔

اس وقت دو مدرسے ایسے تھے جو بقول خلیق نظامی صاحب "دہلی کی جان" تھے۔ ایک مدرسہ رحمیہ جس میں دربار ولی اللہی سج رہا تھا اور ایک زبردست انقلابی تحریک کی داغ بیل ڈالی جارہی تھی اور دوسرا اجمیری دروازہ کا مدرسہ تھا جس میں دکن کا ایک نوعمر عالم شاہ فخر الدین شمع علم و عرفان فروزاں کئے بیٹھا تھا[۱]۔

شاہ فخر الدین دہلوی شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے معاصرین میں تھے اور ان کا ذکر شاہ صاحب نے اپنی کتاب انفاس العارفین میں کیا ہے۔[۲]

مرزا مظہر جان جاناں شاہ ولی اللہ کے دور کے زبردست عالم اور صوفی بزرگ تھے۔ شاہ صاحب سے ان کی ملاقات ثابت ہے۔ بلکہ آپ کی وفات سے قبل مرزا صاحب آپ کے بستر مرگ پر تشریف لائے اور خاموشی سے باطنی توجہ اور مراقبہ کے عالم میں بیٹھے رہے۔[۳]

ان حضرات کا مختصر تذکرہ ایک علیحدہ باب کی شکل میں آئندہ کیا جائے گا۔ یہاں صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ شاہ صاحب کا علمی اور ادبی ماحول کن بلند پایہ ہستیوں سے پُر تھا۔

لیکن دہلی میں جہاں خانقاہیں، مساجد و مدارس تھے وہیں شراب خانے، قمار خانے، اور فحاشی کے بازار بھی تھے۔ عوام میں ہر طرح کے اخلاقی برائیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ کبوتر بازی، کنکوے بازی، طوائفوں کے کوٹھوں پر جانا شریفوں کا شیوہ سمجھا جاتا تھا۔ اس وقت مسلمانان ہند نفسیاتی طور پر سخت ہیجان کی کیفیت میں مبتلا تھے۔ ایک طرف تو سات سو سالہ حکومت زوال پذیر تھی دوسری طرف تعیش تن آسانی اور حکومتی دبدبہ کی عادات راسخ جو اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھیں عوام و خواص میں پیوستہ تھیں اور ان کی وجہ سے یہ تمام بری عادات سماج میں پھیل رہی تھیں۔ مسلمان خاص طور پر تنزل و انحطاط کی حد آخر پر پہنچ گئے تھے مذہب کی

۱۔ تاریخ مشائخ چشت، صفحہ ۴۶۱-۴۶۲۔

۲۔ الانفاس العارفین مصنفہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ، مترجمہ سید محمد فاروق، صفحہ ۱۸۹-۲۰۰ (ب-ت)

۳۔ القول الجلی، مصنفہ شاہ محمد عاشق پھلتی، مترجمہ حافظ تقی انور علوی کاکوروی، صفحہ ۳۴۳، لکھنؤ ۱۹۹۷ء

روح اور پکڑ ختم ہو چکی تھی۔ ہندوؤں کی صحبت اور سماجی میل جول کی بناء پر ہر شخص ہر طرح کی توہم پرستی میں گرفتار تھا۔ بداعتقادی دلوں میں سرایت کر گئی تھی۔ تعویذ گنڈوں میں حد سے زیادہ اعتقاد پیدا ہو گیا تھا۔ عربی میں نازل کیا گیا قرآن محض کتاب اللہ کے طور پر تبرک بن کر رہ گیا تھا۔ اور اس کا یہ کام رہ گیا تھا کہ مرنے والے کے سرہانے یٰسین شریف کی تلاوت کر دی جائے اور وہ بھی صرف اس اعتقاد سے کہ اس عمل سے مردہ کا دم آسانی سے نکل جاتا ہے۔

اس معاشرتی و اخلاقی پستی سے زیادہ خطرناک خرابی ضعیف الاعتقادی، مسلم معاشرہ میں بدعات کا زور، ہندوؤں اور شیعوں کے بہت سے رسوم و عادات کی تقلید، شرک جلی کی متعدد صورتیں اور اعمال عوام کے رگ و پے میں سما گئے تھے جن کی کوئی علمی یا مذہبی توجیہ ممکن نہیں۔ کھلی ہوئی قبر پرستی، سجدہ تعظیمی، مزارات اور ان کے قرب و جوار کا حد سے بڑھا ہوا احترام، قبروں کو چادریں چڑھانا، سجدہ کرنا، منتیں ماننا، بزرگوں کے نام کی قربانی کرنا، مزارات پر میلے ناچ گانا غرض کوئی ایسا خلاف شرع فعل نہ تھا جو عوام میں مقبول نہ ہو۔ توہمات، عقائد فاسدہ، رسوم جاہلیت و التزام اور پابندی کا ایک سلسلہ تھا جو بہت طویل تھا۔[1]

تصور توحید بہت دھندلا اور شرک سے ملوث ہو گیا تھا جس میں اللہ کے مقرب بندے سفارشی، بلکہ مالک تک مان لئے گئے تھے اور اسی حیثیت سے ان کو یا ان کی قبروں کو براہ راست سجدہ اور توسل کا مستحق سمجھ لیا گیا تھا۔[2]

لوگ بڑی عقیدت سے خانقاہوں اور مزارات پر حاضر ہوتے پھر اسی جوش اور ولولہ کے ساتھ طوائفوں کی محفل میں شرکت کرتے تھے۔ یہ مذہبیت اور رندی پہلو بہ پہلو چلتی تھی جو فسق و فجور سے زیادہ متعفن تھی۔ یہ ضمیر کی آواز کو کچلنے کا ایک ظالمانہ انداز تھا۔[3]

یہ تو عوام الناس کی اخلاقی و مذہبی حالت تھی۔ دوسری طرف ہندوستان میں مذہب اسلام کی تعلیم و تعلم اور نشر و اشاعت کے جو ذمہ دار تھے ان کے دونوں طبقوں (یعنی مذہب کے ظاہری رسوم و عام عقائد کے محافظ جنہیں عموماً علماء کہتے ہیں اور مذہب کی واقعی روح اور اس کے باطنی مقاصد کے علمبردار جنہیں صوفیہ و مشائخ کہتے ہیں) دونوں گروہوں کا اس زمانہ تک پہونچتے پہونچتے عجب حال ہو رہا تھا۔

---

[1] تاریخ دعوت و عزیمت، صفحہ ۶۳-۶۴۔
[2] ایضاً
[3] تاریخ مشائخ چشت، صفحہ ۳۴۱

شاہ صاحب کے زمانہ میں علماء و مشائخ کی کمزوریاں:

تفہیمات الٰہیہ میں شاہ صاحبؒ ان علمائے سوء کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"اشتغلتم بعلوم الیونانین ..... الخ"[۱]

"اے بد عقلو! جنہوں نے اپنا نام علماء رکھ چھوڑا ہے تم یونانیوں کے علوم اور صرف و نحو کے معانی میں الجھے ہوئے ہو اور سمجھتے ہو کہ یہی علم ہے۔ یاد رکھو! علم یا تو قرآن کی کسی آیت محکم کا نام ہے یا سنت ثابتہ قائمہ کا"

اور یہ تو عام علماء کا حال تھا۔ خصوصیت کے ساتھ جنہیں علمائے دین کا لقب حاصل تھا اور فلسفہ و منطق سے وہ کارہ تھے جن کا نام فقہاء تھا ان کی یہ کیفیت تھی کہ دین کے حقیقی چشموں قرآن و حدیث اور ائمہ مجتہدین اور ان کے تلامذہ کے اقوال تک سے بہت دور آگے نکل گئے تھے کہ ہر وہ چیز جو فقہ کے نام سے کسی کتاب میں لکھی ہوئی تھی ان کے نزدیک "وحی محکم" اور "نص قطعی" کا درجہ حاصل کئے ہوئے تھی۔

شاہ صاحبؒ اپنی مشہور کتاب "الانصاف فی بیان سبب الاختلاف" میں فقہاء عصر کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں:

'فالفقیه یومئذ هو الثرثار المتشدق الذی حفظ أقوال الفقهاء قویها و ضعیفها من غیر تمیز و سردها بشقشقة شدقیة"[۲]

اس زمانہ کا فقیہ اس شخص کا نام ہے جو باتونی ہو۔ زور زور سے ایک جبڑے کو دوسرے جبڑے پر پٹکتا ہو۔ جو فقہاء کے اقوال کو قوی ہوں یا ضعیف یاد کر کے بلا امتیاز کے کہ ان میں سے کس میں قوت ہے اور کس میں نہیں اپنے جبڑوں کے زور زور سے چلتا کرتا ہے۔ (بیان کرتا ہے۔)

ماسوا اس کے ایک گروہ ان لوگوں کا بھی تھا جو:

[۳] "فاشربوا لطلب العلم توصلا الی نیل العز و درك الجاه فأصبح بعد أن

طلب علم کے لئے اس لئے آمادہ ہوئے تاکہ علم کو اپنی عزت اور جاہ حاصل کرنے

---

[۱] تفہیمات الٰہیہ مصنفہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، جلد اول، صفحہ ۲۱۴، بجنور ۱۹۳۶ء

[۲] الانصاف فی بیان سبب الاختلاف مصنفہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ صفحہ ۹۵، لکھنؤ ۱۹۵۲؛ حجۃ اللہ البالغۃ مصنفہ شاہ ولی اللہ دہلوی، صفحہ ۳۰۴ لاہور

[۳] ایضاً صفحہ ۸۸

كانوا مطلوبين طالبين و بعد أن كانوا اعزة بالاعراض عن السلاطين أذلة بالإقبال عليهم"۔

کا ذریعہ بنائیں۔ نتیجہ اس کے بعد یہ ہوا کہ فقہاء جو پہلے عوام کے مطلوب تھے اب یہی عوام کے طالب ہوگئے اور سلاطین اور بادشاہوں کے دربار سے الگ رہنے کی وجہ سے جو معزز تھے اب ان کے سامنے جھک کر ذلیل ہوگئے اور ان کا کوئی اقبال نہ رہا۔

شاہ صاحبؒ نے ان صوفیائے خام اور شہرت کے بھوکے متصوف علمائے سوء کی طرف جو محض اپنی شہرت کے لئے صوفیوں کا لباس اوڑھ کر عوام کے جذبات اور ان کی دولت سے کھیلتے تھے۔ اشارہ کرتے ہوئے اپنے وصیت نامہ میں تحریر کیا ہے:

"کرامات فروشان ایں زماں ہمہ الا ماشاء اللہ طلسمات و نیر نجات را کرامات دانستہ اند"[1]

(کرامتوں کو بیچنے والے اس زمانہ میں سب کے سب، سوائے اس کے جسے خدا چاہے، اپنی طلسماتی کارروائیوں اور علم نیرنج کے نتائج کو کرامات سمجھ بیٹھے ہیں)

ان خوارق کو دیکھ کر عام کمزور عقیدہ والا شخص مبہوت و مرعوب ہو جاتا تھا اور اس دور میں ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی۔ چنانچہ شاہ صاحبؒ نے کھل کر لکھ دیا ہے:

"و بسیارے از سادہ لوحاں را دیدہ ایم کہ چوں ایں اعمال را از شیخ فرا گرفتہ اند آن را عین کرامات می دانند"[2]

اور میں نے بہت سے سادہ لوحوں کو دیکھا ہے کہ جب کسی شیخ سے اس قسم کے اعمال کو حاصل کرتے ہیں تو ان کو در اصل کرامت مان لیتے ہیں۔

لیکن واقعہ یہ ہے:

صلاح و فجور و سعادت و شقاوت مقبول بودن یا مردود بودن دریں جا ہیچ فرق پیدا نمی کند[3]

نیکوکاری یا بدکاری، اس طرح مقبول ہونا یا مردود ہونا اس معاملہ میں اس (اختلاف حال) سے کوئی فرق نہیں پڑتا (یعنی ان روحانی یا سفلی ورزشوں سے یہ نتائج ہر شخص میں پیدا ہو سکتے ہیں خواہ شقی ہو یا سعید)۔

---

[1] مجموعہ وصایا اربعہ، وصیت سوم صفحہ ۷۳

[2] مجموعہ وصایا اربعہ، وصیت سوم صفحہ ۷۵

[3] مجموعہ وصایا اربعہ، وصیت سوم، صفحہ ۷۴

خصوصاً شاہ صاحبؒ کے زمانہ میں تصوف طرح طرح کے طریقوں اور نئی نئی شکلوں میں پیدا ہو رہا تھا۔ آپؒ ہی کے زمانہ میں دہلی کا مشہور مردود "نمودانمود" ایک خاص بھیس میں ان ہی طلسماتی نیر نجاتی جوگیانہ طریقوں کو سیکھ کر نمودار ہوا تھا جس نے خود کو ایک خاص زبان اور اصطلاح میں پیغمبر ہونے یا الہام ربانی کا مؤید ہونے کا دعویٰ کیا تھا جس کے تحت اس نے خود کو ایک لاہوتی عہدہ جس کا نام اس نے "بیگوکت" رکھا، کا دعویدار بتایا اور کہا کہ الوالعزم پیغمبر کے ساتھ نو بیگوت ہوتے ہیں۔ وہ خود کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نواں بیگوت کہتا تھا۔ اسی طرح کی خرافات کا اس دور میں بول بالا تھا اور ضعیف العقیدہ لوگ اس قسم کے لوگوں کے جال میں آسانی سے پھنس جاتے تھے۔

مسلمانوں کی یہ زود اعتقادیاں عملی طور پر بہت سی اوہام پرستیوں کی شکل میں ظاہر ہوتی رہتی تھیں۔ حتیٰ کہ بادشاہ تک ان ہی اوہام میں مبتلا تھا۔

اس مذہبی کمزوری اور بد عملی نے شخص پرستی، قبر پرستی اور طرح طرح کی بدعات کو جنم دیا اور پروان چڑھایا۔ نجوم، شعبدے، کہانت، کرامات سب کے سب اسی کا نتیجہ ہیں جو اوہام پرستی اور غیر اللہ سے استعانت کو فروغ دیتی ہیں۔

فاتحہ اور مردوں کو ثواب پہنچانے کے شرعی عمل کو بھی ان لوگون نے رفتہ رفتہ اسی صورت تک پہنچادیا جو ہندوؤں کے چڑھاوے کی ہوتی ہے یعنی مختلف قسم کے پھل، پھول، پکوان وغیرہ دیوتاؤں اور دیویوں پر اس لئے چڑھائے جاتے ہیں کہ دیوتا اس تحفہ سے خود متمتع اور لذت گیر ہوتے ہیں۔ جاہل مسلمانوں میں فاتحہ کا بھی قریب قریب یہی مطلب ہو گیا تھا اور عوام کیا بعض خواص تک کا یہ خیال تھا کہ جو کھانا کسی بزرگ کے نام فاتحہ دیا جاتا ہے اس پر اس بزرگ کی روح (بلکہ خود بزرگ) خود حاضر ہوتی ہے اور اس سے لذت گیر ہوتی ہے۔ مولوی غلام حسین طباطبائی جنہوں نے "سیر المتاخرین" جیسی کتاب لکھی ہے جو ان کے علم و فضل کی کھلی دلیل ہے، خود اسی توہم میں مبتلا نظر آتے ہیں جب اپنے "تجربہ" سے یہ دیکھتے ہیں کہ حضرت شاہ مرداں (حضرت علی کرم اللہ وجہہ) کی روح کے نشان اس دستر خوان پر نمودار ہوتے ہیں جو ان کی فاتحہ کے کھانے کے لئے بچھایا جاتا ہے۔[1]

الغرض غلط 'تصوف' اور جھوٹے 'تمشخ' کی راہوں سے اعتقادی و عملی تباہیوں کا سیلاب مختلف شکلوں میں ملک کے گوشوں میں مسلمانوں کی خالص اسلامی و دینی زندگی کے 'ایوان' کو دھمکیاں دے رہا تھا۔

---

[1] تذکرہ شاہ ولی اللہ، صفحہ ۱۴۲۔۱۴۳

اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ایک صاحب بصیرت روح کے لئے یہ سب کچھ کس درجہ سوہان روح رہا ہوگا اور اس کے نتیجہ میں اس کے قلم سے کیا کچھ نہ نکلا ہوگا۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اسی معاشرہ میں پیدا ہوئے تھے اور یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں نے مغلیہ سلطنت کے عہد زوال، فرخ سیر اور محمد شاہ کے زمانہ کی بد نظمی، طوائف الملوکی، راستوں کی بدامنی، بلا تفریق مذہب و ملت، اہل ملک کی جان و مال، عزت و آبرو کا عدم تحفظ اور انسانی خون کی ارزانی، شعائر اسلام کی بے حرمتی، عوام کی بے حسی، بے دینی اور بد عقیدگی اور مسلمانوں کی (جو چھ سو سال سے اس ملک پر حکومت کر رہے تھے) مجبوری اور بے بسی کا نظارہ دیکھا تو ان کا حساس و دردمند دل خون کے آنسو رویا اور خون کے یہ قطرے ان کے گوہر بار قلم سے ان تصانیف اور خطوط اور وصیتوں کی شکل میں ٹپک پڑے جو آج ایک سرمائے کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہیں۔

شاہ صاحب نے خاندان مغلیہ کے سلاطین کے عروج و زوال اور ان کے اسباب کا بغور مطالعہ فرمایا (جیسا کہ حجۃ اللہ البالغہ کے مضامین سے ظاہر ہوتا ہے) سلطنت مغلیہ کے علاوہ انہوں نے دوسری اسلامی سلطنتوں کی تاریخ بھی دقت نظری سے پڑھی تھی اور اس سے انہوں نے وہ حکیمانہ نتائج اخذ کئے تھے جو قرآن مجید کا ایسا ہی حامل اور عالم اخذ کر سکتا ہے جو خدا کے قانون مجازات اور سنت اللہ سے واقف ہے۔

اقتصادی حالات

اورنگ زیب عالمگیر نے اپنے دور حکومت کے آخری ۲۶ سال دکن کی مہمات میں گزارے ان مہمات کے لئے زر کثیر کی ضرورت تھی اس لئے انہوں نے حکومت کے تمام ذرائع آمدنی کا رخ اسی طرف کر دیا۔ ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک میں آمدنی کے بیشمار ذرائع تھے جن کے سبب ہندوستان کو سونے کی چڑیا کہا جاتا تھا۔ محمد شاہ کے بیٹے احمد شاہ کے زمانہ میں بھی جب کہ مغل حکومت پارہ پارہ ہو چکی تھی اور ہر طرف مختلف قوتیں ملک کے اتحاد اور سلامتی کے درپہ تھیں جو ذرائع آمدنی تھے وہ کم نہ تھے چنانچہ شاہ ولی اللہ نے جو خط احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان کی طرف متوجہ کرنے اور یہاں کے حالات کو درست کرنے کی غرض سے لکھا اس میں انہوں نے اس وقت کے ذرائع آمدنی کا جائزہ بھی لیا۔ وہ لکھتے ہیں:

"ہندوستان کے محصولات سات آٹھ کروڑ سے کم نہیں ہیں بشرطیکہ غلبہ و شوکت موجود ہو۔ ورنہ ایک کوڑی بھی ملنی مشکل ہے۔ جیسا کہ اس وقت دیکھا جا رہا ہے جس علاقہ پر جاٹ قابض ہیں وہ ایک کروڑ روپیہ محصول کی جگہ ہے۔ راجپوتانہ کا علاقہ اپنی وسعت کے باعث دو کروڑ روپیہ سے کم آمدنی کا نہیں ہے بشرطیکہ ہر راجہ پر خراج مقرر کیا جائے۔

محمد شاہ کے زمانہ میں بنگالہ سے ہر سال ایک کروڑ روپیہ کی آمدنی تھی اور وہاں کا صوبیدار ہمیشہ بلا توقف بھیجتا رہتا تھا۔ اس رقم کی ادائیگی کے باوجود صوبیدار بنگالہ ہندوستان کے امراء میں انتہائی مالدار امیر تھا۔ چنانچہ اس وقت بھی جب کہ بنگالہ میں بے انتظامی ہے اور وہاں ایک بے وقوف ناواقف کار نوجوان یعنی ناظم قدیم کا پوتا مسلط ہے پھر بھی وہ نوجوان بیشمار خزائن کا مالک ہے۔ (سراج الدولہ کی طرف اشارہ ہے جو ۱۷۵۶ء میں علی وردی خاں کے بعد صوبیدار ہوا تھا)

سعادت خاں ایرانی اور اس کے بعد اس کا داماد صفدر جنگ صوبہ اودھ پر قابض تھے دو کروڑ اس صوبہ سے وصول کرتے تھے ایک کروڑ خرچ کرتے تھے اور ایک کروڑ جمع کرتے تھے۔ اسی مالداری نے صفدر جنگ کے اندر بادشاہ سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ پیدا کر دیا تھا"[1]

ان کے علاوہ گجرات، مالوہ دکن اور دیگر علاقوں کی آمدنی تھی جو اورنگ زیب کے زمانہ میں پابندی سے شاہی خزانہ میں داخل ہوتی تھی، مصارف جنگ کے باوجود عالمگیر کے تدبر، معاملہ فہمی، انتظامی قابلیت

---

[1] شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، خط شاہ صاحبؒ بنام احمد شاہ ابدالی، صفحہ ۱۰۴

اور سیاسی بصیرت و اقتدار نے ملک کے اقتصادی حالات کو بگڑنے سے بچالیا تھا۔ دکن میں حد سے زیادہ بڑھے ہوئے اخراجات کے باوجود انہوں نے آگرہ کے قلعہ کے خزانہ میں چوبیس کروڑ چھوڑا تھا۔ لیکن عالمگیر کے انتقال کے بعد ان کے جانشینوں نے اپنی نااہلی کی وجہ سے اس روپیہ کو آنکھ بند کر کے خرچ کرنا شروع کر دیا۔ دوسری طرف مرکز کی کمزوری کی بناء پر سلطنت کا دائرہ محدود ہوتا گیا اور علاقے اس کے دائرہ اختیار سے آزاد ہو کر اپنی خود مختار حکومتیں بناتے چلے گئے۔ دکن، مالوہ، گجرات، اودھ رفتہ رفتہ الگ ہو گئے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے اقتصادی ذرائع محدود تر ہوتے گئے۔

اس کے ساتھ ہی جو علاقے بادشاہ کے زیر اثر تھے وہاں بھی محصول کی وصولی کے مروجہ طریقے ناقص تھے اس کی وجہ سے بھی وصولیابی میں کمی آئی۔ مغل سلطنت میں جو نظام رائج تھا اس میں محصول کی وصولی کے دو طریقہ تھے۔ (۱) جاگیرداری۔ (۲) خالصہ۔

۱۔ جاگیرداری:

بڑے بڑے علاقوں کے محاصل کی وصولیابی کا حق امراء، وزراء و دیگر اراکین سلطنت کو بطور جاگیر دے دیا جاتا تھا۔ ان علاقوں سے جو وصولیابی ہوتی اس کا تعین جاگیردار کرتا اور اکثر ظلم و زیادتی سے رعایا (کاشتکار، تاجر، صنعت و حرفت میں مشغول لوگ وغیرہ) سے وصول کرتا۔ بادشاہ کا اس محصول پر براہ راست کوئی قبضہ نہ ہوتا بلکہ اس کے بدلہ اس کو فوج اور ہتھیار فراہم کرنا جاگیردار کے ذمہ تھا۔ اس نظام میں سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ بادشاہ کا رعایا سے اقتصادی تعلق براہ راست نہ ہوتے ہوئے بالواسطہ تھا جس کی وجہ سے سیاسی خلفشار کے دور میں شاہی خزانہ میں ان جاگیروں سے کچھ حاصل نہ ہوتا۔

۲۔ خالصہ:

کچھ علاقے ایسے ہوتے جن کے محاصل کی وصولیابی بادشاہ کے اہلکار اور وزارت مالیات کے افسران کرتے اور اس کو خزانہ میں داخل کرتے تھے۔ بادشاہ کے اثرات میں کمی سے اہلکار اور امین اس رقم میں خیانت کرتے اور پورا محصول نہ وصول ہوتا نہ خزانہ میں جمع ہوتا۔ چنانچہ خالصہ میں اجارہ داری یا ٹھیکہ داری کا رواج ہو گیا یعنی ایک مخصوص رقم بطور ٹھیکہ یا اجارہ مقرر کر دی جاتی جو خزانہ میں داخل ہوتی بقیہ رقم اہلکار لے لیتے۔

سیاسی اور سماجی نظام میں خرابی آنے کے باعث دونوں طریقوں میں بے حد خرابیاں آگئیں جن کی وجہ سے بتدریج سارا اقتصادی نظام متزلزل ہو گیا۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد ہی خزانہ کے ذرائع آمدنی میں کمی آنے لگی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے جانشینوں نے فضول خرچی اور اسراف بیجا سے سرکاری خزانہ کو برباد کرنا شروع کر دیا۔ بہادر شاہ اول کا ہاتھ فیاضی میں اتنا کھلا ہوا تھا کہ سلطنت کی مالی حالت تباہ ہو گئی۔ پھر معزالدین جہاندار شاہ کی عیش کوشیوں نے تباہی میں اضافہ کر دیا۔ کہتے ہیں کہ صرف اس کی محبوبہ لعل کنور پر دو کروڑ روپیہ سالانہ خرچ ہوتے تھے۔ روزانہ عیش و طرب کی محفلیں سجتی تھیں۔[۱]

اس زمانہ میں اشیاء صرف کی قیمتیں اورنگ زیب کے زمانہ کے مقابلہ میں دس گنا بڑھ گئیں۔ گیہوں جو پہلے منوں کے حساب سے بکتا تھا سات سیر فی روپیہ بکنے لگا۔[۲]

معزالدین جہاندار کے بعد فرخ سیر کے دور میں حالات اور خراب ہو گئے۔ اس کو عمدہ پوشاک اور گھوڑوں کا بہت شوق تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں گھوڑے بیکار اصطبل میں بندھے رہتے اور کچھ اس کے شاہی محل کی دریچی کے نیچے بندھے رہتے تاکہ وقفہ وقفہ سے انہیں دیکھ سکے۔ ہزاروں روپیہ یومیہ ان کی دیکھ بھال پر خرچ ہوتا۔ اس کے اس شوق نے خزانہ شاہی پر ناقابل برداشت بوجھ ڈال دیا۔[۳]

محمد شاہ کی عیش پسندیوں کی داستانیں آج تک ضرب المثل ہیں جن کی وجہ سے اسکو محمد شاہ رنگیلا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کی عیش پرستی کی نقل میں امراء وزراء بھی اسی ناؤنوش میں مبتلا ہو گئے اور سارا معاشرہ غفلت و تباہی کے غار میں جا گرا۔

نادر شاہ درانی کے حملہ نے اس گرتے ہوئے مالی نظام کی کمر توڑ دی۔ اس نے نہ صرف قتل و غارت گری اور ظلم و ستم کا بازار گرم کیا بلکہ ستر کروڑ سے زائد روپیہ اور بیشمار ہیرے جواہرات اپنے ہمراہ لے گیا۔ جس کے بعد شاہی خزانہ اور امراء کے محل خالی نظر آنے لگے۔

احمد شاہ پسر محمد شاہ کے زمانہ میں تو حالات بالکل ہی قابو سے باہر ہو گئے۔ شاہی خزانہ کی کم مائیگی کا یہ عالم تھا کہ شاہی ملازمین کو جن کی تعداد ایک لاکھ سے زائد تھی۔ مسلسل دو دو ڈھائی ڈھائی سال تک

۱۔ الامام ولی اللہ محدث دہلویؒ، صفحہ ۳۰۰

۲۔ نقش حیات، مصنفہ شیخ الاسلام حضرت مدنی، صفحہ ۲۴۴، جلد اول، دہلی ۱۹۵۳ء

۳۔ ولیم ارون اپنی کتاب "The Later Mughals" میں اس سلسلے میں تحریر کرتے ہیں:

Among his passions two were especially marked–a fondness for fine clothes and for good horses ..... As for horses, he chose them with care for their fine paces,their colour and their great speed. Several thousand horses stood in his private stables and a selected number of them were tethered under the balcony window of the room where he slept. Thus he was able from time to time to see them from his window or the roof of the palace. (The later Mughals by W. Irvin Vol I, P. no. 396-7)

تنخواہیں نہیں ملتی تھیں۔اس زمانہ میں شہزادیوں کو تین تین دن فاقہ کرنے پڑتے۔[۱]

شاہ عالم کے عہد میں خالصہ کا علاقہ دہلی سے پالم تک رہ گیا تھا۔ مشہور تھا "سلطنت شاہ عالم از دہلی تا پالم" یعنی شاہ عالم کا سلطنت پر معاشی اور اقتصادی تسلط صرف دہلی سے پالم تک ہی بچا تھا باقی سب دوسروں کے اختیار میں تھا جن میں غیر یعنی مرہٹے وغیرہ اور اپنے یعنی جاگیر دار و امراء سب ہی شامل تھے۔ لیکن یہ رسم بھی ٹھیکیداری سے محفوظ نہ رہ سکی۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے سلطنت مغلیہ کے زوال کے اسباب میں اقتصادی تباہی کو سب سے اہم سمجھ کر اس پر اپنی تصانیف میں بہت کچھ لکھا ہے اور اس کو دور کرنے کی تدابیر کی بھی نشاندہی کی ہے اور اس بات کی بڑی کوشش کی کہ اقتصادی حالات درست ہوں۔

فرماتے ہیں:

"خالصہ را کشادہ تر باید ساخت"[۲]

(یعنی خالصہ کو زیادہ سے زیادہ کشادہ کرنا چاہئے)

کیوں کہ امور سلطنت میں ضعف کا سبب خالصہ کی کمی اور خزانہ کی قلت ہوا کرتی ہے اس کے علاوہ اجارہ داری اور جاگیرداری کی مذموم رسموں کو ختم کرنے کی تلقین کی۔

فرماتے ہیں:

"کہ موجب ضعف امور سلطنت کمی خالصہ و قلت خزانہ است"[۳]

(کیوں کہ امور سلطنت میں ضعف کا سبب خالصہ کی کمی اور خزانہ کی قلت ہوا کرتی ہے)

جاگیرداری سے مرکزی حکومت میں کمزوری لاحق ہو جاتی ہے۔ سلطنت کے نظم و ضبط میں اعلیٰ معیار قائم رکھنے میں بڑی مشکلات پیش آتی ہیں اور مرکزی حکومت جاگیرداروں کے رحم و کرم پر ہو جاتی ہے۔

لہٰذا آپ نے فرمایا کہ

---

[۱] جادوناتھ سرکار کے بقول:

"Therefore the last six months of Ahmad Shah's reign were continually disturbed by the tumults of the starving unpaid soldiery in an even more aggravated form then before. The officials and menials of the palace were unpaid for 32 months".(Fall of The Mughal Empire by J.N. Sarkar, Vol. I, P. no. 317)

[۲] شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، صفحہ ۹۴

[۳] شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے سیاسی مکتوبات صفحہ ۹۴-۹۵

"رسم اجارہ از خالصہ باید برانداخت"[۱]

(خالصہ سے اجارہ داری کی رسم موقوف کردی جائے) کیوں کہ

"در اجارہ دادن ملک خراب شود و رعیت پائمال و بدحال"[۲]

(اجارہ داری سے ملک خراب ہوتا ہے اور رعایا پائمال و بدحال ہو جاتی ہے)

چونکہ جاگیرداری کو مطلق ختم کرنے سے حکومت کو مزید خطرات کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ اس لئے آپ نے حکومت کو مشورہ دیا:

"جاگیر دادن مخصوص بامرائے کبار باشد منصب داران ریزہ را نقد باید داد"[۳]

(جاگیر صرف بڑے امراء کو عطا کی جائیں اور چھوٹے منصب داروں کو نقد دینا چاہئے)

شاہ صاحب نے کتاب و سنت کی روشنی میں فلسفۂ اقتصادیات پر مستقل اور مفصل بحث کی ہے جس کے نتیجے میں اسلام کا فلسفہ اقتصادیات دنیا کے سامنے نہایت واضح صورت میں آگیا ہے۔

---

۱ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے سیاسی مکتوبات صفحہ ۹۴-۹۵

۲ ایضاً

۳ ایضاً

علمی وادبی حالات

جیسا کہ پچھلی سطور میں بیان کیا گیا ہے، صوفیاء کے غلط تصوف اور فقہاء کے غلط تفقہ، حد سے گزری ہوئی عصبیت اور جاہل حمیت نے امت کے شیرازہ میں انتشار پیدا کر رکھا تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ ایرانی علماء و شعراء کا جو دباؤ مختلف وجوہ سے ہندوستانی علماء، ارباب فکر و نظر اور نظام تعلیم و تدریس اور تصنیف و تالیف پر پڑ رہا تھا اس کی وجہ سے رفتہ رفتہ یہاں اہل علم کی توجہ قرآن و حدیث، تحقیقی فقہ و اصول فقہ اور عقائد و کلام سے ہٹ کر بے معنی، نہ ختم ہونے والے ذہنی اور لفظی مباحث کے پر پیچ گورکھ دھندوں کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔ مغل دربار اور مغل درباریوں کے امراء جو ان لفظی نکتہ نوازیوں اور دماغی عیاشیوں کے قدردان تھے اور ان ہی باتوں میں اپنا وقت ضائع کر رہے تھے اور خود ان کا اپنا اقتدار اور نظام سلطنت اندر ہی اندر کھوکھلا ہوتا جا رہا تھا۔ ملک میں جو نئی قوتیں ابھر رہی تھیں ان کے سامنے ایرانی نژاد لفظی کج بحثیوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔[۱]

اس دور کے علماء عموماً یونانی علوم میں پھنسے ہوئے تھے اور ان کا سارا وقت دور از کار بحثوں میں صرف ہوتا تھا قرآن و حدیث سے ان کا رابطہ تقریباً ٹوٹ چکا تھا۔[۲]

لیکن یہ کہہ دینا قطعی غلط ہوگا کہ یہ دور مکمل طور پر تاریکی کا دور تھا اگرچہ سیاسی، سماجی، مذہبی اور تہذیبی و ثقافتی اعتبار سے یہ دور، دور انحطاط تھا مگر سیاسی انتشار، اجتماعی بد نظمی اور اخلاقی گراوٹ کے باوجود یہ دور انفرادی طور پر علمی کمالات، تدریسی و تصنیفی انہماک، روحانی یکسوئی، باطنی ترقی اور نفوس کے تزکیہ و اصلاح کا دور تھا، جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا جا چکا ہے۔ جتنا گھٹاٹوپ اندھیرا ہو روشنی کی چند کرنیں اتنی ہی زیادہ تیز روشن نظر آتی ہیں۔

اورنگ زیب کی وفات سے لے کر غدر ۱۸۵۷ء تک دہلی میں چند مدارس ایسے تھے جن سے علم و عرفان کے چشمے ابل رہے تھے۔ انمیں شاہ عبدالرحیم کا قائم کردہ مدرسہ رحیمیہ تھا جس میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے پہلے تو تعلیم پائی اور پھر درس و تدریس کی شمع روشن کی۔ بازار خانم کے مدرسہ میں شاہ کلیم اللہ کے جانشین اور اجمیری دروازہ کے مدرسہ میں شاہ فخر الدینؒ کا چشمہ فیض جاری تھا۔ مسلمانوں کی دینی اور علمی زندگی کو سنوارنے میں ان مدارس کا خاص حصہ تھا۔ شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ رفیع الدینؒ، کے وعظ مدرسہ رحیمیہ میں ہوتے تھے۔[۳]

---

۱ تذکرہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ صفحہ ۲۰۳

۲ تاریخ مشائخ چشت، صفحہ ۳۵۹

۲ تاریخ مشائخ چشت، صفحہ ۳۴۴

وفور علم، ذہانت، قوت تدریس اور حسن تصنیف کے لحاظ سے اس دور میں حضرت شاہ ولی اللہ کے علاوہ مولانا احمد بن ابوسعید عرف مُلا جیون امیٹھوی (۱۰۴۷ھ -۱۱۳۰ھ) صاحب "نورالانوار" اور "التفسیرات الاحمدیہ" مُلا حمداللہ سندیلوی (م ۱۱۶۰ھ) صاحب "شرح سلم" مشہور بہ حمداللہ، مولانا محمد حسن معروف بہ مُلا حسن فرنگی محلی صاحب "شرح سلم" مشہور بہ ملا حسن (م ۱۱۹۹ھ)، مولانا رستم علی قنوجی (م ۱۱۷۸ھ)، شیخ صفۃ اللہ خیر آبادی (م ۱۱۵۷ھ)، شیخ علی اصغر قنوجی (م ۱۱۴۰ھ)، مولانا غلام علی آزاد بلگرامی (۱۱۱۰ھ -۱۲۰۰ھ)، مولانا غلام نقشبند لکھنوی (م ۱۱۲۶ھ)، قاضی محبّ اللہ بہاری (م ۱۱۱۹ھ) مصنف "سلم العلوم" و "مسلم الثبوت" قاضی مبارک گوپاموی (م ۱۱۶۲ھ) مصنف شرح سلم معروف بہ قاضی مولانا محمد اعلیٰ تھانوی مصنف "کشاف اصطلاحات الفنون" اور آخر الذکر مُلا نظام الدین لکھنوی (م ۱۱۶۱ھ) جن کے ترتیب دیئے ہوئے درس نظامی کا سکہ ہندوستان سے بخارا و سمرقند تک چلتا تھا اور آج بھی چلتا ہے اور جن کو مصنف "نزہۃ الخواطر" نے "غیث الافادۃ الہتون' العالم بالربع المسکون، الانقاذ الاساتذۃ و امام الجہابذۃ" کے القاب سے یاد کیا ہے جیسے فخر البلاد و امصار عالم، مدرس مصنف اور پوری پوری علمی تحریک اور سلسلہ تدریس و ترتیب کے بانی اسی صدی کے دوران نظر آتے ہیں۔[۲]

اس زمانہ میں درس و تدریس اور علمی و روحانی تزکیہ کے مراکز صرف مدارس ہی نہیں بلکہ صوفیاء و مشائخ کی خانقاہیں بھی تھیں۔ اسی دور میں سلاسل ثلاثہ قادریہ چشتیہ نقشبندیہ کے عظیم المرتبت مشائخ کے اسمائے گرامی بھی موجود ہیں۔ مرزا مظہر جان جاناںؒ (۱۱۱۱ھ-۱۱۹۵ھ) سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ کی عظیم ہستی تھی جن کے بارے میں خود شاہ ولی اللہ کی شہادت ہے کہ:

"ہر زمانہ میں ایسے بزرگ زیادہ تعداد میں پائے نہیں جاتے چہ جائیکہ ایسے زمانہ میں جو فتنہ و فساد سے پُر ہے"[۳]

سلسلہ قادریہ کے مشہور بزرگ اور ملا نظام الدین بانی درس نظامی کے مرشد حضرت سید عبدالرزاق بانسوی (م ۱۱۳۶ھ)، سلسلہ چشتیہ نظامیہ کے مجدد شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی (م ۱۱۴۰ھ) اور اسی سلسلے کے امام شاہ فخر الدین (۱۱۹۹ھ) اور دیگر کئی جلیل القدر ہستیاں اس دور کی تابندہ ہستیاں ہیں جن کے نور سے ایک عالم منور نظر آتا ہے۔

یہ دور ایک طرف دور انحطاط تھا تو دوسری طرف دور تجدید و تجدد بھی تھا۔ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے اس سخت دور میں ہندوستانی مسلمانوں کو وہ گرامی قدر ہستی عطا فرمائی جس کا نام **حضرت سیدنا الامام مولانا الشاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہ** ہے۔

---

۱ تاریخ دعوت و عزیمت، صفحہ ۵۹-۶۰

۲ کلمات طیبات، مرتبہ مولوی حافظ محمد علی مراد آبادی، صفحہ ۱۶۵، مراد آباد ۱۳۰۸ھ

باب دوم

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ
کا خاندان اور اس کی
اہم شخصیات

باب اول میں اس دور پر فتن کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کی گئی ہے جن میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے آنکھ کھولی اور عمر عزیز صرف کی۔ یقیناً ماحول کا اثر ان کی تحریروں اور ادبی شاہ پاروں پر پڑا جو ان کے قلم سے نکل جاوداں ہو گئے۔ لیکن یہ صرف ماحول کا ہی اثر نہ تھا جس نے ان کی تحریروں پر اثر ڈالا بلکہ چند اور عوامل بھی تھے ان عوامل میں ایک بڑا عاملہ شاہ صاحبؒ کی تربیت و تعلیم ہے اور دوسرا اہم حصہ ان کے خاندانی پس منظر کا ہے جو ان کی تہذیب و تربیت اور علمی و ادبی کارناموں پر اثر انداز ہوا۔

سورۃ الحجرات میں ہے **وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم**[1] (اور تم کو مختلف قومیں اور خاندان بنایا تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے بڑا شریف وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔) عموماً مفسرین اور مترجمین اس آیت کے دوسرے جز و پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ لیکن قرآن مجید کا ہر ہر لفظ اور آیت کا ہر جزو مفکر اور مدبر ذہن کے لئے فکر و تدبر کا ایک خزانہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان کہ "ہم نے تم کو شعوب و قبائل کی صورت میں بنایا تاکہ تمہارا تعارف پہچان ہو سکے" نہایت باریک لیکن فکر انگیز بات ہے۔ کسی شخص کی اصل پہچان اس کے خاندان و قبیلہ سے بخوبی ہوتی ہے۔ یہ ایک نفسیاتی سائنسی حقیقت اور تحقیق ہے کہ کسی شخص کے ذاتی کردار کی بناوٹ میں اس کے Genetic make up اور heridity کا بہت بڑا حصہ ہے۔ آجکل علم بایولوجی کی تحقیقات میں Genetics بہت بڑا شعبۂ علم ہے جو اسی خیال پر منحصر ہے۔ نفسیات میں تربیت انسانی میں heridity کا انسانی افعال و اعمال پر اثر ایک مشہور بات ہے۔ انسان تو انسان حیوانات اور نباتات تک شعوب و قبائل میں بٹے ہوئے ہیں اور ان پر اس تقسیم کا زبردست اثر ہوتا ہے۔

نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ حنین میں جب بنو ثقیف و بنو ہوازن کے تیر اندازوں کی تیر اندازی کی وجہ سے لشکر اسلام کی ابتدائی پسپائی پر اپنے معدودے چند جانثاراں کے ہمراہ تنہا رہ گئے تو آپؐ نے جو نعرہ لگایا "**انا النبی لا کذاب ، انا ابن عبد المطلب**" اس میں بھی نبوت کے جلال کے ساتھ بلکہ فطرت انسانی کے مطابق اس کے برابر کی اہمیت کے احساس کا اظہار "**انا ابن عبد المطلب**" کی شکل میں ہوا جس میں آپؐ نے اپنی خاندانی وجاہت و بہادری کے اقدار کا فخریہ ذکر فرمایا۔ اس کے علاوہ متعدد احادیث صحیحہ میں بھی اس جذبہ کا اظہار ہوتا ہے۔ چنانچہ آپؐ نے اسی بناء پر خود کو "اکرمُ ولدِ آدم" فرمایا ہے جس سے آپؐ کا بنی نوع انسان پر اکرام و شرف تو ہے ہی، آپکا خاندانی مجد و شرف بھی ظاہر ہوتا ہے۔ ایک دوسری حدیث میں آپؐ نے اپنے قبیلہ قریش کو بہترین قبیلہ، اپنے اجداد

---

[1] القرآن: سورہ الحجرات، آیۃ ۱۳

کو بہترین اجداد اور نسل کو بہترین نسل فرمایا ہے۔

اسی اصول کی بناء پر اگر کسی کی شخصیت اور اس کے کارناموں (خواہ ادبی ہوں یا کوئی اور حیثیت رکھتے ہوں) کا جائزہ لینا ہو تو یہ ضروری ہے کہ اس کے آباء واجداد اور ان کے (علمی ادبی یا دیگر) کارناموں کا مطالعہ تفصیل سے کیا جائے۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے خاندانی حالات اور ان کے اجداد میں اہم شخصیات کا جائزہ لینے کے سلسلے میں جو مآخذ ہمارے پیش نظر ہیں ان میں سب سے زیادہ مستند مآخذ خود شاہ صاحبؒ کا تحریر کردہ مختصر مگر مجمل رسالہ "الامداد فی مأثر الاجداد" ہے جس میں انہوں نے اپنے اجداد کا تذکرہ کیا ہے۔ اس میں بھی اجداد اولین کا تعارف نہایت اجمال واختصار کے ساتھ اور جد امجد شیخ وجیہ الدین کا تعارف زمانہ کے قرب اور قلت وسائط یعنی واسطوں کی کمی یا براہ راست خود ذاتی علم ہونے کے سبب نسبتاً تفصیل سے کرایا گیا ہے۔ یہ رسالہ متوسط تقطیع پر دس صفحات میں ہے اور شاہ صاحبؒ کے پانچ رسائل کے مجموعہ میں شامل ہے جس کا پہلا رسالہ "انسان العین" ہے..... عرصہ ہوا کہ مطبع احمدی دہلی سے شائع ہوا تھا۔[1]

دوسرا مستند مآخذ شاہ صاحبؒ کی تصنیف "انفاس العارفین" ہے جو دراصل حسب ذیل سات رسائل کا مجموعہ ہے:

(۱)بوارق الولایة (۲) شوارق المعرفة (۳)الامداد فی مأثر الاجداد(٤)النبدة الابریزیة فی اللطیفة العزیزیة(٥)العطیة الصمدیة فی انفاس المحمدیة (٦) الانسان العین فی مشائخ الحرمین (۷) الجزء اللطیف فی ترجمة العبد الضعیف.

یہ کتاب ۱۳۳۵ھ / ۱۹۱۷ء میں مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوئی اور بعد میں اس کا اردو ترجمہ پاکستان سے اور دوبارہ ہندوستان سے شائع ہوا۔ (پانچ رسائل کا جو مجموعہ مطبوعہ احمدی دہلی سے شائع ہوا تھا وہ انفاس میں شامل ہے۔)

ان ساتوں رسالوں میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے مختلف موضوعات اور الگ الگ اشخاص کی سوانح کے بارے میں تحریر کیا ہے جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(۱)بوارق الولایة : والد ماجد شاہ عبدالرحیم کے حالات زندگی وکارہائے نمایاں (ملفوظات، کشف وکرامات اور معمولات) کے بارے میں۔

---

[1] تاریخ دعوت جلد ۵ صفحہ ٦٦

(۲)شوارق المعرفة : عم محترم شیخ ابوالرضاء کے حالات زندگی وکارہائے نمایاں (ملفوظات، کشف وکرامات اور معمولات) کے بارے میں

(۳)الامداد فی مأ ثر الاجداد : خاندانی بزرگوں کے حالات زندگی (ملفوظات، کشف وکرامات اور معمولات) کے بارے میں

(۴)العطیة الصمدیة فی انفاس المحمدیة : اپنے نانا شیخ محمد پھلتی کے حالات زندگی کے بارے میں۔

(۵)النبذة الا بریزیة فی اللطیفة العزیزیة : اپنے جدامجد کے خسر رفیع الدین اوران کے خاندان تا شیخ عبدالعزیز شکربار کے بارے میں جو نسبت مادری سے ان کے والد بزرگوار کے جداعلیٰ ہیں۔

(۶)الانسان العین فی مشائخ الحرمین : تذکرہ مشائخ حرمین، اساتذہ کرام شاہ ولی اللہ محدثؒ

(۷)الجزء اللطیف فی ترجمة عبد الضعیف : خودنوشت سوانح شاہ صاحبؒ

جیساکہ ظاہر ہوتا ہے۔"الامدادفی ماثر الاجداد" بھی 'انفاس العارفین کاایک جزوہے۔شاہ صاحبؒ کی ان تصانیف سے مواد لیکر مولوی محمد رحیم بخش دہلوی مرحوم نے ایک مفصل اور مستقل کتاب 'حیات ولی' کے نام سے تحریر کی جو مندرجہ بالا مأخذ کے ساتھ دوسری معاصر تاریخوں اور مضامین پر مشتمل اس سلسلہ میں ایک اہم تصنیف ہے۔[۱]

اگرچہ بقول مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ "حیات ولی میں دیگر کتابوں کے جو مضامین اضافہ کئے گئے ہیں ان میں صفحات تو علیحدہ رہے کتاب اور مصنف کا نام بھی کہیں نہیں ہے اس وجہ سے ہم صرف مأثر الاجداد پر ہی اکتفاء کریں گے۔[۲]

---

[۱] نوٹ: محمد رحیم بخش دہلوی نے اپنی تصنیف حیات ولی (مطبوعہ افضل المطابع) میں مندرجہ ذیل پیراگراف تحریر کیاہے:
"حیات ولی کے دوران تالیف میں علاوہ تاریخی سرمایہ کے خود شاہ ولی اللہ صاحبؒ اوران کے محترم خاندان کے تمام تراجم وتصنیفات کا سلسلہ میرے پیش نظر تھا۔ چونکہ تواریخ سے مجھے بہت کم مدد ملی۔ اسی لئے میں نے اکثر واقعات و روایات اسی سلسلہ سے منتخب کر کے حیات ولی میں درج کئے۔ اس بناء پر میں نے نہایت بھروسہ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جس قدر حالات وواقعات آپ اس میں پائیں گے غالبا نہایت درست اور نفس الامری ہوں گے اور میں آپ کو پورا اطمینان دلاتا ہوں کہ اس میں آپ کو ایک واقعہ بھی ایسا دستیاب نہ ہوگا جس کی مستند شہادت اور تاریخی ثبوت میرے پاس موجود نہ ہو۔" حیات ولی، صفحہ ۳۶۰

[۲] تاریخ دعوت وعزیمت، مصنفہ سید ابوالحسن علی ندوی، جلد ۵، صفحہ ۶۶، لکھنؤ ۱۹۸۹ء

سلسلۂ نسب

الامداد فی مآثر الاجداد میں جو شجرۂ نسب تحریر کیا گیا ہے اور جس کی تصدیق شاہ صاحبؒ کے خاندان کے ایک بزرگ شاہ ارزانی بدایونی کے نسب نامہ سے ہوتی ہے وہ اس طرح ہے:

شاہ ولی اللہ بن شیخ عبد الرحیم بن شہید وجیہ الدین بن معظم بن منصور بن احمد بن محمود بن قوام الدین عرف قاضی قادن بن قاضی قاسم بن قاضی کبیر عرف قاضی بدھا بن عبد الملک بن قطب الدین بن کمال الدین بن شمس الدین مفتی بن شیر ملک بن محمد عطا ملک بن ابو الفتح ملک بن عمرو الحاکم ملک بن عادل ملک بن فاروق بن جرجیس بن احمد بن محمد شہریار بن عثمان بن ہامان بن ہمایوں بن قریش بن سلیمان بن عفان بن عبد اللہ بن محمدؒ بن عبد اللہ بن عمرؓ بن الخطاب۔[1]

جیسا کہ اس شجرۂ نسب سے ظاہر ہے شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ عربی النسل اور فاروقی النسب ہیں اور تیتیسویں پشت پر آپکا نسب حضرت عمر فاروقؓ سے مل جاتا ہے اسی نسبت سے آپ کے اجداد میں عموماً اور آپ میں خصوصاً ان اقدار کا اثر بدرجہ اتم موجود ہے جو اس نسل کا خاصہ ہے۔ اور جو ان کو وراثت میں ملا ہے۔

اس نسب نامہ میں کئی ناموں کے ساتھ "ملک" خطاب آیا ہے شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں کہ یہ زمانہ قدیمی میں تعظیمی خطاب تھا جیسے ہمارے زمانہ میں "خان"۔[2]

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے عربی و قریشی النسل ہونے کا ثبوت تو مندرجہ بالا شجرہ سے ملتا ہے مگر ان کے کون سے بزرگ عرب سے ترک سکونت کر کے آئے اور کن وجوہات کی بنا پر ایسا ہوا اسکا کوئی ثبوت یا تحریر میسر نہیں نہ ہی اس بات کا کوئی تاریخی ثبوت ملتا ہے کہ سب سے پہلے بزرگ جو عرب سے نکلے انہوں نے کہاں سکونت اختیار کی۔ شاہ صاحب کی روایت کے مطابق صرف یہ پتا چلتا ہے کہ ہندوستان میں ان کے خاندان کے پہلے بزرگ جو تشریف لائے وہ شیخ شمس الدین مفتی تھے اور یہاں انہوں نے رہتک میں قیام اختیار کیا۔ حیات ولی کے مصنف محمد رحیم بخش نے خود شاہ صاحبؒ کی کتاب کے حوالہ سے تحریر کیا ہے کہ:

"چنانچہ آپ اس واقعہ کو اپنے پرزور قلم سے یوں تحریر فرماتے ہیں کہ 'یہ یقینی بات

---

[1] الامداد فی مآثر الاجداد مشمولہ انفاس العارفین، مصنفہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ، مترجمہ محمد فاروق القادری، صفحہ ۳۳۰، دہلی ۱۳۳۵ھ؛ تاریخ دعوت و عزیمت جلد ۵، صفحہ ۶۷

[2] تاریخ دعوت و عزیمت، صفحہ ۶۷، انفاس العارفین، صفحہ ۳۳۰

ہے کہ ہمارے اجداد عظام میں سب سے پیشتر حضرت شیخ شمس الدین مفتی ہندوستان میں تشریف لائے اور قصبہ رہتک میں بساست اختیار کی'۔"[۱]

رہتک کی تاریخ بیان کرتے ہوئے صاحب حیات ولی آگے لکھتے ہیں:

"رہتک ہانسی اور دہلی کے بیچ میں ایک قدیم شہر ہے جو دہلی سے تقریباً تیس میل کے فاصلہ پر قبلہ کی جانب واقع ہے۔ جب اسلامی فتوحات نے معراج ترقی پر قدم رکھا اور فاتحان اسلام کفار کے ممالک کو زیر وزبر کرتے ہوئے ہندوستان کی طرف بڑھے اور مشرقی سلطنتوں کا جلتا ہوا چراغ اسلام کی تیز فوجی ہوا سے گل ہو گیا تو بہت سے اشراف عرب اور سادات قریش اس شہر میں آبسے[۲]۔

اس تحریر سے یہ قطعی ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ آنے والے اشراف عرب خود عرب سے براہ راست آکر یہاں بسے یا شمس الدین ان اشراف عرب میں شامل تھے۔

مولانا مظاہری اپنی تصنیف میں شاہ صاحب کے نسب نامہ کے ناموں میں خالص عجمی (ایرانی) ناموں مثلاً ہمایوں، شہریار، جرجیس نام ہونے سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پانچ چھ پشتوں کے بعد اس خاندان نے ملک عرب کی سکونت ترک کر دی تھی۔ آگے وہ لکھتے ہیں کہ "صاحب حیات ولی کا خیال ہے کہ وہ (یعنی شمس الدین مفتی) عرب سے ہندوستان آئے جس پر انہوں نے کوئی تاریخی ثبوت نہیں پیش کیا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ صاحب حیات ولی کا محض ظن و قیاس ہے کیوں کہ سلسلۂ نسب کے جن ناموں کو ہم نے بنیاد بنا کر ان کے عجم میں سکونت پذیر ہونے پر استدلال کیا ہے وہ شمس الدین مفتی سے بہت پہلے گذر چکے ہیں۔[۳]

بہر حال شاہ صاحبؒ کے اجداد نے کبھی بھی عرب سے ترک سکونت کیا ہو اور شمس الدین مفتی عرب یا اس کے علاوہ کسی اور ملک سے ہندوستان آئے ہوں اس پر اتفاق رائے ہے کہ وہ سب سے پہلے بزرگ تھے جنہوں نے ہندوستان میں سکونت اختیار کی۔

---

۱ حیات ولی، مصنفہ رحیم بخش دہلوی، صفحہ ۲

۲ ایضاً

۳ الامام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، مصنفہ مولانا عبدالقیوم مظاہری، صفحہ ۵، کانپور، ۱۹۶۷ء

شیخ شمس الدین مفتی :

شیخ شمس الدین مفتی حضرت عمر فاروقؓ کی انیسویں پشت میں تھے۔ ان کے آباؤ اجداد کے حالات جن میں چند عجمی نام بھی شامل ہیں تاریخ کی روشنی میں نہیں چونکہ انکے والد شیر ملک اور دادا عطا ملک کے حالات تاریکی میں ہیں اسلئے ہمارا تذکرہ بھی جناب شمس الدین مفتی بن شیر ملک سے شروع ہوتا ہے۔[1]

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ شمس الدین مفتی کے والد اور دادا بلکہ ان کی پانچ پشت تک کے بزرگوں کے ناموں کے ساتھ ملک کا خطاب موجود ہے جو بقول شاہ صاحبؒ "زمانہ قدیم میں تعظیمی لقب تھا جیسے ہمارے زمانہ میں خان" لیکن یہ لقب عرب میں رائج نہ تھا بلکہ ایران اور ماوراء النہر و ترکستان میں تھا اسکے علاوہ ان سے اوپر کی پیڑھیوں میں عجمی نام مثلاً جرجیس، شہریار بھی ملتے ہیں اس سے اس بات کو تقویت ملتی ہے کہ شاہ صاحب کے اجداد عرب سے ترک سکونت کر کے ان ممالک میں گئے اور وہیں سے شیخ شمس الدین مفتی ہندوستان آئے اور یہاں رہتک میں سکونت اختیار کی۔

شیخ شمس الدین مفتی کے ہندوستان آنے کی کیا وجوہات تھیں اور وہ کس دور میں یا کس بادشاہ کی حکومت میں ہندوستان آئے اس کی کوئی قطعی تاریخی شہادت نہیں ملتی۔ لیکن مختلف مصنفین نے مختلف قیاس آرائیاں کی ہیں مثلاً تاریخ دعوت جلد پنجم میں مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اس ضمن میں لکھا ہے کہ :

> "ان واسطوں اور پشتوں کی تعداد اور ان کی طبعی اور تقریبی عمروں کے حساب سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ شمس الدین مفتی ساتویں صدی کے آخر یا آٹھویں صدی ہجری کے اوائل میں ہندوستان آئے ہوں گے۔[2]

آگے چل کر مصنف نے ان کے ہندوستان آنے کی وجہ کی طرف اس طرح اشارہ کیا ہے:

> "تاریخ فیروز شاہی اور دوسری تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں عراق، ایران و ترکستان کے شریف نجیب خاندان اور ذی علم و کمال خانوادے کثرت سے ہندوستان آئے جہاں ترکی النسل مسلمانوں کی حکومت تھی جنہوں نے تاتاری حملہ آوروں کو ہندوستانی سرحدوں سے پسپا اور اس ملک کو ان کی غارتگری سے محفوظ کر دیا۔ بلکہ اسے ایک وسیع مدرسہ بنا دیا جہاں جا بجا درس کے حلقے یاد الٰہی و تزکیہ نفس کے مرکز اور اہل قلم اور اہل

---

[1] حیات ولی، صفحہ ۴

[2] تاریخ دعوت و عزیمت، صفحہ ۶۷، جلد ۵

تحقیق کے لئے سکون واطمینان کیساتھ کام کرنے کے مواقع تھے۔"[۱]

مولانا مظاہری نے اپنی کتاب "الامام ولی اللہ محدث دہلوی" میں شمس الدین مفتی کے ہندوستان آنیکی ایک اور وجہ تحریر کی ہے۔ انکا قول ہے

"شمس الدین مفتی حدیث و تفسیر میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ فقہ میں ان کی بصیرت اور لیاقت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ شاہ ہند نے افتاء کے کام کے لئے غیر ملک سے انکو بلوایا تھا اس کے علاوہ رموز تصوف و سلوک سے خوب واقف تھے' صاحب تصوف و کرامت اور غالب گمان ہے کہ خانوادہ چشتیہ کے مشائخ میں سے تھے۔"[۲]

صاحب حیات ولی نے اپنے تذکرہ میں ان حالات کو یہ کہہ کر چھوڑ دیا ہے اور آگے بڑھ گئے ہیں :

"مجھے بافسوس کہنا پڑتا ہے کہ واجب الاحترام شیخ کے ابتدائی حالات باوجود تحقیقات کے کہیں سے دستیاب نہیں ہوئے اور اگر ہوئے بھی تو ایسے سلسلہ سے ہوئے جن پر میں پورا یقین اور کافی بھروسہ نہیں کر سکتا۔ لہٰذا میں یقین واعتبار سے گرے ہوئے حالات کو بالکل چھوڑتا اور ان حالات کو قلمبند کرتا ہوں جو مجھے قدیم تذکروں اور معتبر مورخوں سے تحقیق ہوئے ہیں۔"[۳]

شیخ شمس الدین کے ظاہری و باطنی علوم:

حیات ولی میں شیخ شمس الدین مفتی کے صاحب علم بزرگ ہونے کے بارے میں اس طرح تحریر ہے :

"جناب شمس الدین مفتی کی تاریخی زندگی میں جو بات سب سے زیادہ قابل نوٹ ہے وہ یہ ہے کہ آپ جیسے تفسیر وحدیث وفقہ کے علوم میں اجتہاد کا درجہ رکھتے اور ماہرین فن کے زمرے میں شمار کے جاتے تھے ویسے ہی علم ادب اور انشاء پردازی میں ضرب المثل تھے۔ علاوہ ازیں آپ کا برتر وپاک نفس روز اول سے باطنی علوم کا بھی حصہ رکھتا تھا۔ آپ کی محتاط زندگی اور اتقاء وپرہیزگاری اور عام اخلاق کی شہرت کا جادو رہتک کے تمام باشندوں پر اپنا پورا

---

۱ تاریخ دعوت وعزیمت، صفحہ ۶۸، جلد ۵

۲ الامام ولی اللہ محدث دہلویؒ، صفحہ ۶

۳ حیات ولی، صفحہ ۵

اثر ڈال چکا تھا اس وجہ سے ہر گلی کوچہ میں آپ کی معاشرتی زندگی کی تہ دل سے داد دیجاتی اور بچہ بچہ کی زبان پر آپکا نام بڑی وقعت سے لیا جاتا تھا۔"[۱]

منصب قضاء:

جیسا کہ مختلف تحریروں سے ظاہر ہے شمس الدین مفتی کے ہندوستان آنے کا ایک مقصد منصب قضاء وافتاء ان کے سپرد کرنا تھا اسی لئے انکو حکومت وقت کی جانب سے یہ عہدہ عطا کیا گیا اور مفتی کا لقب ان کے نام کے بعد بجائے ملک تجویز ہوا۔ چنانچہ صاحب حیات ولی تحریر کرتے ہیں :

"اس عہد کی تمام اسلامی مجلسوں میں آپکی عزت و توقیر ہوتی تھی اور مذہبی تقدس اور دینی اقتدار کیوجہ سے آپ کے سامنے سلاطین وقت کی گردنیں جھکتی تھیں۔"[۲]

اس زمانہ میں جو صاحب علم و فضل مسلمان اس شہر (رہتک) میں قیام کرتا تھا اس کو قضاء واحتساب کا عہدہ اور شہر کا نظم و نسق بھی سپرد ہو جاتا تھا لیکن اس زمانہ میں اسکو قاضی و محتسب کے لقب یاد نہیں کرتے تھے۔

شیخ شمس الدین مفتی کے انتقال کے بعد ان کی اولاد میں سب سے بزرگ فرد کمال الدین مفتی، ان کے بعد انکے صاحبزادہ قطب الدین، ان کے بعد ان کے فرزند عبد الملک ان عہدوں پر فائز رہے اور ان ذمہ داریوں کو پورا کرتے رہے۔[۳]

ابتک عہدۂ قضاء جو ایک اعلیٰ عہدہ تھا کسی ایک خاندان کے لئے مخصوص نہ تھا بلکہ مسلمانوں میں جو شخص نیک طینت پاکیزہ نفس صاحب کمال اور خداداد فہم و بصیرت کا حامل ہوتا وہی لوگوں میں اپنی مقبولیت اور ذاتی وجاہت و عزت و شرف کی بدولت اس باعزت عہدہ پر فائز کیا جاتا لیکن ان حضرات کے بعد یہ عہدہ اس خاندان کے لئے مخصوص کر دیا گیا۔ جو اس بات کا پختہ ثبوت ہے کہ فاروقی النسب خاندان کے لوگ نسلاً بعد نسلٍ ان خصوصیات کے حامل پائے جاتے رہے جن کا تقاضا یہ عہدہ اور اس کی ذمہ داریاں کرتی تھیں چنانچہ شیخ شمس الدین مفتی کے بعد ان کی قابل ولائق اولاد میں بھی یہ عہدہ کئی نسلوں تک باقی رہا۔

---

۱ حیات ولی، صفحہ ۷
۲ ایضاً، صفحہ ۷
۳ تاریخ دعوت و عزیمت، جلد ۵، صفحہ ۶۹

قیام مدرسہ:

شیخ شمس الدین مفتی کے علم و بزرگی کا ایک اور نتیجہ ایک مدرسہ کی شکل میں بر آمد ہوا۔ چنانچہ آپ نے تبلیغ دین و علم کی خاطر ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی جس میں لوگوں کو کلام ربانی کی تلقین و تعلیم دی جائے۔ اور اس ظلمت کدۂ کفر و جہالت میں زیادہ سے زیادہ نور اسلام کی ترویج ہو سکے۔ گو یہ مدرسہ بڑے پیمانہ پر نہیں تھا اور نہ ہی اس کے وسائل وسیع تھے اسلئے یہ مدرسہ زیادہ نہ چل سکا۔ لیکن اس کے محدود وسائل کو دیکھتے ہوئے اور اسوقت کی حالت کا جائزہ لیتے ہوئے بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مفتی صاحب اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے اور انہوں نے علم کی جو شمع روشن کی اسکا نور ان کی آنیوالی نسل تک پھیلا اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی شکل میں علم کے اسی نور نے ایک مینارۂ نور کی شکل اختیار کر لی۔ جس سے ایک عالم روشن ہو گیا۔

شمس الدین مفتی کی ایک کرامت:

شیخ شمس الدین ایک صاحب کرامت بزرگ تھے اور ان کی کرامت ان کے انتقال کے بعد اس طرح عیاں ہوئی کہ ان کی وصیت کے مطابق ان کے ورثاء نے انکا جنازہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق نماز جنازہ ادا کرنے کے بعد مسجد کے اس مخصوص حصہ میں جہاں وہ عبادت کیا کرتے تھے رکھ دیا اور وہاں سے ہٹ گئے۔ واپس آنے پر دیکھا تو وہاں جنازے کا نام و نشان بھی نہ پایا۔ لوگوں کو از حد تعجب ہوا اور وہ وہاں سے چلے گئے۔ اگر چہ اس واقعہ کی تصدیق کسی قدیم و جدید مستند تاریخ سے نہیں ہو سکی لیکن بقول صاحب حیات ولی :

> ''میں نے خاص حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب (پدر بزرگوار شاہ ولی اللہؒ) کے واقعات میں لکھا دیکھا ہے کہ جب آپ یہ حکایت سنتے تو نہایت وثوق کیساتھ اس کی تصدیق فرماتے۔ چنانچہ فاضل اجل جناب شاہ ولی اللہ صاحب اپنی ایک قیمتی تصنیف میں یوں تحریر فرماتے ہیں کہ : 'میرے محترم بزرگوار جب یہ حکایت سنتے تو بلا تردد اس کی توثیق کرتے اور فرماتے تھے کہ مجھے اپنے حافظہ پر پورا بھروسہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ میں اپنی یاد میں کبھی غلطی نہیں کرونگا'۔''[1]

---

[1] حیات ولی، صفحہ ۸

شجرۂ اولاد شیخ شمس الدین مفتی[1]

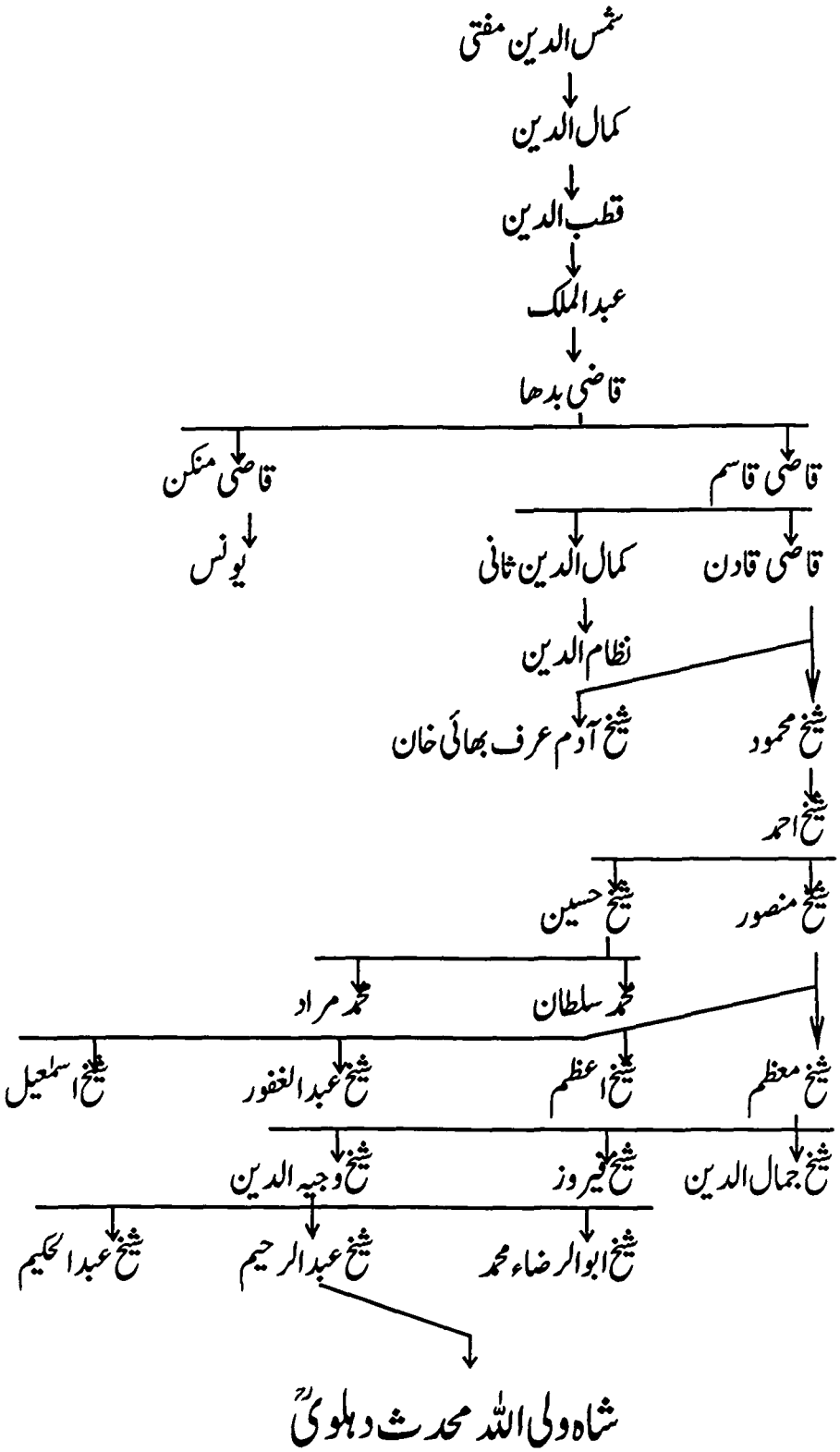

---

[1] حیات ولی، مصنفہ محمد رحیم بخش دہلوی، مطبوعہ افضل المطابع، صفحہ ۴، مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ

شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی کتاب انفاس العارفین میں اپنے والد محترم شیخ عبد الرحیم اور دادا شیخ وجیہ الدین کے بارے میں نسبتاً تفصیل سے لکھا ہے لیکن ان سے اوپر کی پشتوں کے بارے میں اختصار سے کام لیا ہے۔ صرف چیدہ چیدہ واقعات جوان کو معتبر ذرائع سے حاصل ہوئے وہی تحریر فرمائے ہیں۔ اس کے علاوہ ان بزرگوں کے حالات وواقعات صرف بالواسطہ ہی مل پائے ہیں۔

ان تمام بیانوں اور تحریروں میں جو بات مشترک ہے وہ یہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے اجداد جنکا ذکر یکے بعد دیگرے کیا گیا ہے سب کے سب نیک پرہیز گار شریفانہ عادات اور مہذبانہ اخلاق رکھنے والے باعلم و عمل حضرات تھے اور وہ عوام وخواص میں مشہور و مقبول تھے۔

اسکے ساتھ ہی ایک بات قابل ذکر اور ہے کہ شمس الدین مفتی کے بعد شاہ عبد الرحیم تک تصوف وسلوک کا دامن اس برگزیدہ خاندان کے ہاتھوں سے نہیں چھوٹا خواہ وہ منصب قضاء پر فائز ہوں یا فوج کے سپاہی اور سپہ سالار۔ البتہ شاہ عبد الرحیم سے پہلے تصوف وسلوک کو ثانوی درجہ حاصل تھا۔ اس خاندان میں حکمت وطبابت کا کام بھی ہوتا تھا۔ چنانچہ شاہ عبد العزیز فرماتے ہیں۔

حکمت ہم در خاندان مامعمول بود چنانچہ جد بزرگوار وعم فقیر دوامی کردند والد ماجد موقوف ساختہ [1]	ہمارے خاندان میں حکمت بھی ہوتی تھی چنانچہ دادا صاحب اور چچا دوا کرتے تھے لیکن والد ماجد (شاہ ولی اللہ) نے اسکو موقوف کردیا۔

شیخ کمال الدین:

شیخ شمس الدین مفتی کے انتقال کے بعد ان کی اولاد میں سب سے بزرگ فرد شیخ کمال الدین مفتی اپنی عادات، خصلات، پرہیز گاری، تقویٰ، اخلاق وعلم میں اپنے والد کے قدم بقدم تھے۔ حصول علم، ریاضت ومجاہدات، خوش خلقی جو اس خاندان کی اقدار تھیں وہ شیخ کمال الدین میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اسی بناء پر مفتی کا عہدہ جوان کے والد کے پاس تھا اس پر انکا تقرر کیا گیا۔

شیخ کمال الدین مفتی کے انتقال کے بعد ان کے فرزند قطب الدین اس معزز عہدہ سے ممتاز کئے گئے۔ بقول صاحب حیات ولی

"افسوس کہ اس مقدس شخص کے تفصیلی حالات باوجود تحقیق کے ہمیں کہیں سے دستیاب نہیں ہوئے۔"[2]

---

[1] ملفوظات شاہ عبد العزیز مترجمہ مولوی محمد علی و مفتی انتظام اللہ شہابی، صفحہ ٦٩ ١٩٦٠ء

[2] حیات ولی، صفحہ ١٠

شیخ قطب الدین کے بعد ان کے بڑے بیٹے شیخ عبد الملک جانشین ہوئے اور یہ منصب انکو تفویض کیا گیا۔

شیخ عبد الملک:

شیخ عبد الملک بڑے ہوشمند اور ذہین وطباع شخص تھے جن کی نیک نفسی اور پاکیزہ زندگی سے اس خاندان کی شہرت میں اضافہ ہوا۔ موصوف نے دینی اور عصری تعلیم اپنے ہی خاندان کے ایک فاضل عالم سے حاصل کی۔ اسکے بعد علم حدیث حاصل کیا آپ کو کلام الٰہی کی تلاوت سے بہت شغف تھا اور وہ تلاوت کلام پاک نہایت ترتیل اور خوش الحانی سے کرتے۔ جس سے حاضرین ان کی نکتہ آفرینی اور انداز بیان سے بیحد متاثر ہوتے۔ شیخ صاحب ایک نہایت پراثر مقرر اور واعظ بھی تھے اور وحدت پرستی اور اسلام کے ارکان پر کاربند رہنے کے سلسلہ میں آپ اپنے وعظ میں بہت زور دیتے اور بیجا وبے ہودہ رسم ورواج اور بدعات کے خلاف نہایت سختی سے مہم چلاتے تھے۔ شیخ عبد الملک کی عمر زیادہ نہیں ہوئی اور عین عالم شباب میں انتقال ہو گیا۔

شیخ عبد الملک کے زمانہ تک اس خاندان فاروقی کی خصوصیات علم وعمل کا اظہار جب نسلاً بعد نسلٍ ہوا تو کلیۃً یہ قانون نافذ ہو گیا کہ قضاء وافتاء کے معزز عہدے اسی شریف وبزرگ خاندان کے ساتھ مخصوص ومحدود ہوں کیوں کہ اس زمانہ کے لوگوں کو یہ بات یقینی طور پر معلوم ہو گئی تھی کہ فطرت نے جو عزت وشرف اس نجیب خاندان کو دیا ہے دوسرے کو کبھی نصیب نہیں ہو سکتا۔[1]

قاضی بدھا:

شیخ عبد الملک کے بعد قضاء کا عہدہ مخصوص ہو جانے پر ان کے فرزند جناب قاضی بدھا نے ریاست مورثہ اور خاندانی حقوق وتعلق کو محفوظ رکھنے کے لئے منصب قضاء اختیار کیا اور مدت العمر مخلوق خدا کے امور کے متکفل اور نگراں رہے۔[2]

قاضی بدھا نہایت فیاض اور خوش اخلاق تھے۔ ہر شخص بغیر کسی ذریعہ تعارف کے ہر وقت ان سے مل سکتا تھا۔ ان کو اپنے عہدہ یا خاندانی وجاہت کی بنا پر کسی قسم کا کوئی کبر یا غرور نہ تھا۔

قاضی بدھا کے انتقال کے بعد انکے دو فرزند باقی رہے۔ ایک قاضی قاسم جو اپنے والد کے انتقال کے بعد ان کے جانشین اور خلیفہ مقرر ہوئے۔ اور دوسرے شیخ منکن جو انتہا سے زیادہ علمی لیاقت اور باطنی

---

[1] حیات ولی، صفحہ ۱۲

[2] انفاس العارفین، صفحہ ۲۳۱

قابلیت رکھتے تھے جن کے بعد ان کے صرف ایک فرزند یونس نامی رہ گئے جو بڑے ہو کر نہایت قابل اور فخر خاندان قرار پائے۔ چونکہ سیرت، صورت اور اخلاق وعادات میں اپنے والد قاضی منکن اور دادا قاضی بدھا سے ملتے جلتے تھے۔ اسلئے لوگ ان کی اور بھی وقعت وقدر کرتے تھے۔

قاضی قاسم کے انتقال کے بعد ان کے دو فرزند قاضی قادن اور شیخ کمال الدین باقی رہے بڑے ہونے کی وجہ سے قاضی قادن قاضی قاسم کے جانشین ہوئے قاضی قادن کو اگرچہ اسی نام سے یاد کیا جاتا ہے لیکن غالباً ان کا نام عبدالقادر یا قوام الدین ہوگا جو عرف عام میں قادن ہو گیا اور قاضی کے عہدہ پر فائز ہونے کیوجہ سے قاضی قادن کے نام سے یاد کئے جاتے ہوں گے۔

شیخ کمال الدین جو قاضی قادن کے چھوٹے بھائی تھے اور جو ان اطراف میں علم وفضل کی بڑی شہرت رکھتے تھے ان کے یہاں ایک فرزند پیدا ہوئے جن کا نام نظام الدین رکھا گیا ان کی نسل سے بھی بڑے عالی وقار حوصلہ منداور دقیق النظر حضرات پیدا ہوئے۔[1]

قاضی قادن کے انتقال کے بعد آپ کی یادگار میں دو فرزند باقی رہے۔ ایک شیخ محمود دوسرے شیخ آدم جو بھائی خاں کے نام سے مشہور ہوئے۔

شیخ محمود اپنے معزز اور واجب الاحترام قبائل میں بڑے نجیب وشریف اور ممتاز شخص گنے جاتے تھے۔ شیخ محمود کی شادی سونی پت کے سادات میں آفریدہ نامی خاتون سے ہوئی جن سے ایک صاحبزادہ شیخ احمد پیدا ہوئے۔ شیخ محمود نے جو شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے جد خاص ہوتے تھے، عہدۂ قضاء کو ترک کر دیا اور سلطنت کے کاموں میں مشغول ہوگئے اور فوجی ملازمت اختیار کرلی۔ فاروقی خون ان کی رگوں میں گردش کر رہا تھا۔ لہٰذا دینی حمیت اور جوش کے اظہار کے ذریعہ انہوں نے اپنی خداداد شجاعت اور حیرت انگیز فطری بہادری میں بڑی شہرت حاصل کی۔ یہی جوش وجذبہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے پوتے اسمٰعیل شہیدؒ کے اس جہاد کی شکل میں ظاہر ہوا جو انہوں نے سکھوں کے خلاف کیا جس میں انہوں نے دینی حمیت کا پورا اظہار کیا۔ صاحب حیات ولی کے مطابق :

> "قدیمی تذکروں میں آپ کی بابت لکھا ہے کہ اگر شیخ محمود کے ظاہری احوال پر سرسری اور اجمالی نظر ڈالی جاتی ہے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ جسقدر خاص رہتک شہر اور اس کے اضلاع میں صدیقی گذرے ہیں سب میں آپ ہی کا نمبر اول ہے۔"[2]

---

[1] حیات ولی، صفحہ ۱۵

[2] حیات ولی، صفحہ ۱۷

شیخ احمد نے بچپن میں رہتک کی سکونت ترک کردی تھی رہتک سے نکل کر شیخ عبدالغنی بن شیخ عبد الحکیم کے ساتھ سونی پت میں اپنی ننہال میں بود وباش اختیار کی۔ شیخ عبدالغنی نے اپنی لڑکی سے انکا عقد کردیا اور مدت تک شیخ احمد شیخ عبدالغنی کی تربیت میں رہے لیکن جوانی کے عالم میں ہی سونی پت سے ان کی طبیعت اچاٹ ہوگئی اور وہ دوبارہ رہتک آگئے اور قلعہ رہتک سے باہر مکان تعمیر کر کے اپنے اہل وعیال و متعلقین کے ہمراہ قیام کیا۔

شیخ عبدالغنی جو شیخ احمد کے خسر تھے اور جن کی تربیت میں شیخ احمد نے اپنا بچپن اور جوانی کا کچھ حصہ گذارا انکا بہت بڑا اثر شیخ پر پڑا۔ شیخ عبدالغنی کا تعلق حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے نسبی نہ سہی لیکن صہری ضرور تھا۔ لہٰذا ان کی شخصیت اور ان کی تربیت کا اثر شیخ احمد اور ان کی اولاد پر ہوا اس کا اثر شاہ ولی اللہؒ تک بھی ضرور پہنچا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے دو رشتہ بنائے ہیں نسبی اور صہری (فجعله' نسباً وصهراً) [1] یعنی اپنے آباء واجداد سے تعلق اور اپنی سسرال سے تعلق اور اس کی اولاد پر ان دونوں تعلقات کا اثر ہونا فطری بات ہے۔ اسی لئے ضروری ہے کہ اس ضمن میں شیخ عبدالغنی کا تذکرہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے اجداد کے ساتھ کیا جائے۔

شیخ عبدالغنی ایک بڑے زبردست علامہ اور فاضل اجل تھے۔ آپ کی محتاط زندگی تبحر علمی، زہد و پرہیزگاری، متواضعانہ اخلاق، شائستہ وزیبا عادات کی شہرت ایک عالم میں پھیل گئی اور ہندوستان کا ہر شخص آپ کو ولی کامل سمجھتا تھا۔ جلال الدین محمد اکبر جیسا پرشکوہ اور جابر بادشاہ آپ کی عظمت وجبروت اور جاہ وجلال کو تسلیم کرتا اور برسر دربار نہایت عقید تمندی کیساتھ تعظیم دیتا تھا۔

شیخ عبدالغنی کی خوش اخلاقی، طرز معاشرت، تقویٰ، عبادت وریاضت کا اثر نہ صرف بادشاہ پر پڑا بلکہ ارکین سلطنت اور فوج کے بکثرت آدمی آپ کے معتقد ہوگئے بادشاہ کی مجلس شوریٰ میں اکثر اوقات آپ کو بلایا جاتا اور بادشاہ اہم معاملات میں آپ سے مشورہ کرتا۔ لیکن اکبر کے خیالات اور معاملات میں رفتہ رفتہ جو تبدیلی آئی اور وہ جس طرح دین سے منحرف ہوا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یک لخت شیخ صاحب نے دربار اکبری سے اپنا رشتہ قطعاً منقطع کردیا۔

مہم چتوڑ کے سلسلہ میں امام ناصر الدین شہید ابن محمد باقر کی روحانی امداد اور چتوڑ کی فتح کی خوشخبری جب شاہ عبدالغنی نے اکبر بادشاہ کو بھیجی تو فتح چتوڑ کے بعد بادشاہ نے بارہ گاؤں کا پروانہ مزار امامؒ کے نام کر کے شیخ عبدالغنی کے حوالہ کردیا۔ [2]

---

[1] القرآن سورة الفرقان الاية ۵۴

[2] انفاس العارفین، صفحہ ۳۳۴، حیات ولی، صفحہ ۲۱-۲۲

شیخ احمد نے اپنے آباءاجداد کی اقدار اور اپنے خسر کی تربیت کا خاطرہ خواہ فائدہ اٹھایا۔ لیکن ان کی باقی زندگی کے بارے میں حالات کسی تذکرہ میں دستیاب نہیں۔

شیخ احمد کے بعد ان کے دو فرزند رہے۔ ایک شیخ منصور دوسرے شیخ حسین۔ شیخ منصور شجاعت علم اور دیگر صفات میں اپنے آباءاجداد کے نقش قدم پر چلتے تھے۔ ان کی پہلی شادی ان کے ماموں شیخ عبداللہ بن شیخ عبدالغنی کی صاحبزادی سے ہوئی جن سے ان کے دو صاحبزادے ہوئے۔ شیخ معظم اور شیخ اعظم۔ پھر اس بیوی کے انتقال کے بعد دوسری شادی کی ان سے بھی دو لڑکے ہوئے جن کے نام شیخ عبدالغفور اور شیخ اسمٰعیل تھے۔ شیخ معظم حضرت شاہ ولی اللہ محدثؒ کے پردادا تھے۔

شیخ حسین خوشحال اور صاحب حیثیت تھے ان کے دو فرزند محمد سلطان اور محمد مراد ہوئے۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے رسالہ امدادفی مآثرالاجداد میں تحریر کیا ہے۔

> "والد بزرگوار (شیخ عبدالرحیم) نے محمد مراد کو خود دیکھا تھا اور ان کی طاقت و قوت کے عجائبات کا مشاہدہ کیا تھا۔ انکا قول تھا کہ 'میں نے محمد مراد کو اپنی آنکھ سے دیکھا کہ اسی سال کی عمر میں وہ دینار (اشرفی) کو اپنے انگوٹھے اور انگشت شہادت (چٹکی) سے مسل کر دوہرا کر دیتے تھے'۔
>
> وہ جب والد صاحب (عبدالرحیم صاحب) کو بچپن میں دیکھتے تھے تو کہا کرتے تھے کہ اس لڑکے کو دیکھ کر میرے دل و جگر پر ایسی ہیبت اور رعب چھا جاتا ہے جیسے اس کے دادا شیخ معظم کو دیکھ کر چھا جاتا تھا۔"[1]

حضرت شاہ اللہ دہلویؒ نے اپنے اجداد کے تذکرہ میں اپنے پردادا شیخ معظم اس کے بعد اپنے دادا شیخ وجیہ الدین اور والد بزرگوار شاہ عبدالرحیم کے تذکرے زیادہ تفصیل سے کئے ہیں۔ اسی کو بنیاد بنا کر صاحب حیات ولی نے بھی ان بزرگوں کا تذکرہ اسی انداز سے کیا ہے۔ کیوں کہ شاہ ولی اللہ کی تربیت اور علمی اور روحانی ترقی میں ان بزرگوں کا معتدبہ حصہ ہے اسلئے اس تحقیقی مقالہ میں بھی انکا تذکرہ تفصیل سے کرنا مناسب ہے۔

شیخ معظم:

شیخ معظم اسم بامسمیٰ اور باہیبت و وجاہت بزرگ تھے۔ شجاعت کا بڑا جوہر رکھتے تھے تعلیمی لحاظ سے انکی تعلیم عام طرز پر ہوئی ان کی طبیعت فطرت فاروقی کی نسبت سے سپاہیانہ فنون کی تحصیل

---

[1] انفاس العارفین، صفحہ ۳۳۳، حیات ولی، صفحہ ۲۵

و تکمیل کی جانب متوجہ ہوئی گو طرز معاشرت بالکل درویشانہ تھا لیکن طبیعت میں سپاہیانہ جوش اور جذبۂ شجاعت بدرجہ اتم تھا جس کا مظاہرہ بچپن میں ہی ہوا۔ اس سلسلہ میں دو واقعات قابل ذکر ہیں جن کا تذکرہ الامداد (انفاس العارفین) اور حیات ولی میں کیا گیا ہے۔

(۱) شاہ ولی اللہ اپنے والد شاہ عبدالرحیم کی زبانی بیان کرتے ہیں کہ شیخ منصور کی ایک راجہ سے جنگ ہوئی اس وقت شیخ معظم کی عمر بارہ سال تھی لیکن لشکر کا خیمہ شیخ معظم کے سپرد کیا گیا۔ گھمسان کے رن میں مشہور ہو گیا کہ شیخ منصور شہید ہو گئے یہ اطلاع پاکر شیخ معظم ذرا نہ گھبرائے بلکہ جذبۂ شجاعت اور بڑھ گیا اور انہوں نے تنہا بڑھ کر راجہ کے ہاتھی پر حملہ کر دیا اور تلوار سے اس کی سونڈ کاٹ دی۔ بے جگری اور شجاعت کا یہ مظاہرہ دیکھ کر راجہ بہت متاثر ہوا اور ان سے بہت احترام سے پیش آیا اور اس غضب کا سبب پوچھا۔ راجہ نے شیخ معظم کو تسلی دی کہ ان کے والد زندہ ہیں اور پھر اس نے شیخ منصور سے کہلوایا کہ اس لڑکے کی خاطر میں نے صلح کر لی اور شرائط منظور کر کے واپس چلا گیا۔

(۲) دوسرا واقعہ شاہ صاحبؒ نے اپنے والد کی زبانی سنا تھا جس کو انہوں نے شیخ معظم کے تعلقہ شکوہ پور کے ایک بوڑھے دہقان سے سنا تھا جو اس وقت وہاں موجود تھا کہ ایک مرتبہ تیس مسلح ڈاکوؤں نے اس گاؤں پر حملہ کر کے اسکی املاک و مویشی لوٹ لئے۔ شیخ معظم کو جب اطلاع دی گئی تو وہ دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔ اطلاع پاکر انہوں نے کسی سراسیمگی اور عجلت کا اظہار نہیں کیا بلکہ اطمینان سے کھانا کھا کر ہاتھ منہ دھو کر خلال کیا اس کے بعد ملازمین کو حکم دیا کہ ہتھیار لائیں اور گھوڑا تیار کریں۔ اس کے بعد تن تنہا جا کر ان ڈاکوؤں کو عقب سے جالیا، جب کہ وہ اطمینان سے اپنے گڑھ میں داخل ہو چکے تھے، اور وہاں جا کر انکو للکارا۔ شیخ معظم کی ہمت اور اطمینان قلب کا اتنا گہرا اثر پڑا کہ باوجود باجمیعت اور مسلح ہونے کے وہ ڈاکو گھبرا گئے اور مطیع ہو کر گاؤں میں آئے اور چوری سے توبہ کی اور سارا مال واپس کیا۔

ان دونوں واقعات سے شیخ معظم کے کردار اور عالی ہمتی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف بلند حوصلہ تھے بلکہ ان کو وہ قلبی اطمینان بھی حاصل تھا جو خداوند تعالیٰ پر مکمل ایقان اور بھروسہ سے پیدا ہوتا ہے۔

شیخ معظم کی شادی اپنی ننہال سونی پت کے ایک معزز اور نجیب سید خاندان میں ہوئی ان کے خسر سید نورالجبار ایک عالم باعمل سید بزرگ تھے جن کی ذاتی و آبائی فضیلت اور زہد و تقویٰ کی شہرت دور دور تک تھی۔

سید عبد الجبار کی صاحبزادی کے بطن سے شیخ معظم کے تین فرزند ہوئے جن کے نام شیخ جمال الدین، شیخ فیروز اور شیخ وجیہ الدین تھے۔ شیخ وجیہ الدین حضرت شاہ ولی اللہ کے جد امجد تھے جن کا تذکرہ شاہ صاحب نے کیا ہے۔

شاہ صاحب کے دادا شیخ وجیہ الدین شہید:

شاہ صاحبؒ نے اپنے حقیقی دادا شیخ وجیہ الدین کے حالات نسبتاً زیادہ تفصیل سے لکھے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ان میں تقویٰ، ورع اور شجاعت کی خصلتیں اور صفات جمع تھے شاہ صاحب نے لکھا ہے "میرے والد (شاہ عبد الرحیم) فرماتے تھے کہ 'میرے والد (شیخ وجیہ الدین) نے دن رات میں قرآن مجید کے دو سپارے پڑھنے کا وظیفہ مقرر کر رکھا تھا جس کو وہ سفر حضر اور چستی و کسل مندی دونوں حالتوں میں ترک نہیں کرتے تھے۔ جب عمر زیادہ ہوئی اور بصارت کمزور تو خط جلی کا قرآن مجید اپنے ساتھ رکھتے تھے سفر میں بھی اپنے سے جدا نہ کرتے'۔" مزاج میں احتیاط و تقویٰ اتنا زبرست تھا کہ شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں والد صاحب فرماتے تھے کہ لشکر کے ساتھ چلنے میں وہ کبھی کسی کے کھیت میں اپنے گھوڑے کو گھسنے نہیں دیتے تھے خواہ تمام لشکر کاشت کی ہوئی زمین میں گھوڑے دوڑاتا ہو۔ اس کے لئے انہیں بعض اوقات جانے پہچانے راستہ سے ہٹ کر لمبا پھیر کھا کر چلنا پڑتا۔ ایک دفعہ کسی لڑائی میں شیخ وجیہ الدین کا ساز و سامان گم ہو گیا اور کھانے پینے کی چیزیں دستیاب نہ ہونے کی بناء پر دو تین فاقوں کی نوبت آ گئی ایسے میں ساتھی گاؤں کے مویشیوں کو پکڑ کر زبردستی ان سے اپنی غذا (دودھ گوشت) حاصل کر لیتے لیکن انہوں نے اس بات سے پرہیز اختیار کیا۔ فاقوں کیوجہ سے جب قوت بالکل جاتی رہی اس وقت چابک سے زمین کرید رہے تھے کہ کچے چنوں کی ایک مقدار نکل آئی انکو بھگو کر ابال کر کھایا کہ گری پڑی چیز کا کوئی مالک نہیں ہوتا سوائے اس کے جو اس کو پالے۔

شیخ وجیہ الدین اخلاقی اعتبار سے اتنے نرم خو اور منکسر المزاج تھے کہ اتنے متورع اور بزرگ ہونے کے باوجود عام لوگوں بلکہ ملازمین پیشہ اور کام گاروں مثلاً خدام، ملازمین، گھسیاروں اور بھوسہ چارہ بیچنے والوں تک کے ساتھ ایسی نرمی اور انصاف کا سلوک کرتے کہ بہت کم متقی لوگوں کو ایسا برتاؤ کرتے دیکھا گیا۔

شاہ عبد الرحیم کا قول ہے کہ 'میرے والد علوم باطنی میں بھی درک رکھتے تھے چنانچہ ایک سفر میں میرے والد نے کسی ولی کی ولایت کے بعض ایسے شواہد ملاحظہ کیے کہ انہوں نے اس سے بیعت کر لی اور

اشغال صوفیہ میں مصروف ہوگئے۔ کم گوئی اور کم آمیزی کو اپنا شعار بنالیا اور اس سلسلہ میں انہوں نے ایسا کمال دکھایا کہ اس زمانہ کے صوفیاء میں اسکی نظیر نہیں ملتی۔[۱]

حیات ولی میں رحیم بخش صاحب لکھتے ہیں کہ :

"اس امر میں ہماری واقفیت بالکل محدود ہے اور کسی مستند شہادت کی رو سے یہ کہہ دینا مشکل ہے کہ آپ (شیخ وجیہ الدین) شاہان مغلیہ میں کس تاجدار کے عہد حکومت میں فوج میں بھرتی ہوئے اور کس زمانہ میں فوجی سلسلہ اختیار کیا لیکن بعد کے حالات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس وقت سلاطین تیموریہ کا دسواں تاجدار ابو المظفر شاہ شہاب الدین محمد شاہجہاں بادشاہ تخت پر جلوہ افروز تھا۔"[۲]

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ والد صاحب ان کی شجاعت کا بہت ذکر کیا کرتے تھے۔ کبر سنی کے باجود اورنگ زیب عالمگیر کی فوج میں شامل ہو کر انہوں نے ۱۰۶۹ھ میں شاہ شجاع کی فوجی بغاوت فرو کرنے کے سلسلہ میں بڑے بڑے معرکوں میں حصہ لیا۔ جب شاہ شجاع کے ہاتھیوں نے حملہ کیا تو اچھے اچھے آزمودہ کار سورماؤں کے پیر اکھڑ گئے لیکن یہ شیخ وجیہ الدین کی بہادری اور بے جگری تھی کہ انہوں نے گھوڑے پر سوار ہو کر ان زرہ پوش ہاتھیوں کی سونڈیں مستک سے الگ کردیں نتیجہ یہ ہوا کہ یہی ہاتھی چنگھاڑتے ہوئے پلٹ کر اپنی فوج کو ہی روندتے ہوئے بھاگے اور فوج کو کچل دیا۔ اس طرح آپ کی بہادری نے جنگ کا پانسہ پلٹ دیا۔[۳]

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ جوانی میں شاہجہاں کی فوج میں بھرتی ہوئے تھے اور کبر سنی میں اورنگ زیب عالمگیر کی جانب سے لڑائیوں میں حصہ لیا چنانچہ ان کی بے مثل شجاعت اور ضرب المثل بہادری کی حکایتیں اس درجہ مشہور ہو گئیں کہ جہاں کہیں ان کی دینی خدمات اور علمی صلاحیتوں کا ذکر ہوتا ہے وہاں شجاعت و بہادری کا بھی ضرور ذکر ہوتا ہے۔[۴]

ان کی طبیعت میں فیاضی اور سیر چشمی اتنی زبردست تھی کہ جنگ برادران اور خروج بنگالہ میں جب شاہ شجاع کی افواج کے مقابلہ میں ان کی وجہ سے عالمگیر کو فتح ہوئی تو فتح کے بعد شاہ نے چاہا کہ منصب میں اضافہ کردے۔ انہوں نے ازروئے استغناء قبول نہیں کیا۔[۵]

---

۱ انفاس العارفین، صفحہ ۳۳۸، تاریخ دعوت و عزیمت، صفحہ ۷۳

۲ حیات ولی، صفحہ ۳۸

۳ الامام ولی اللہ محدث دہلویؒ، صفحہ ۹

۴ حیات ولی، صفحہ ۳۸

۵ تاریخ دعوت و عزیمت، صفحہ ۷۳

بسااوقات شیخ وجیہ الدین نے اپنے خاص رفقاءاور احباب کیساتھ اپنی جان پر کھیل کر حق دوستی ادا کیا۔اس سلسلہ میں صاحب حیات ولی نے شیخ عبدالرحیم کی زبانی انکے والداور سید حسین کی دوستی اور ساتھ ساتھ مختلف مہمات میں شرکت کے کئی واقعات تفصیل سے لکھے ہیں جن سے ان کی حق رفاقت میں اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر اپنے دوست کی جان بچانے کا تذکرہ کیا ہے۔ان برادرانہ تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"سید حسین اور شیخ صاحب کا دلی تعلق اس لحاظ سے قابل ذکر ہے کہ ان میں بالکل ویسے ہی باہمی تعلقات پائے جاتے تھے جیسے فطرتاً بھائی بھائی میں پائے جاتے ہیں۔ قریباً تمام معاشرتی امور اور تمدنی احوال میں سید صاحب کا تعلق شیخ صاحب سے بالکل برادرانہ اور عزیزانہ تھا۔" [1]

شیخ وجیہ الدین کی بے مثال خصوصیات میں ان کی دلسوزی، مہربانی، ایفائے عہد کی خصوصیات کی ایک بیحد روشن مثال مندرجہ واقعہ کی شکل میں قابل ذکر ہے جس کا تفصیلی ذکر انفاس العارفین میں شاہ ولی اللہ نے کیا ہے اور اس کو صاحب حیات ولی نے بھی تفصیلاً بیان کیا ہے وہ واقعہ اس طرح ہے۔

ایک معرکہ میں شیخ صاحب کے ہاتھوں تین سگے بھائی جو قوم سے راجپوت تھے یکے بعد دیگرے مارے گئے۔راجپوت ایک بہادر قوم ہوتی ہے۔فتح کے تین دن بعد ایک ضعیف راجپوت بڑھیا اس بہادر کو تلاش کرتی اپنے دشمنوں کے خیموں تک آئی جس نے اس کے تینوں بہادر سورما بیٹوں کو ہلاک کیا تھا۔ شیخ صاحب سے مل کر اس نے ان کی بہادری کی بہت تعریف کی اور اپنے گھر بلایا۔ شیخ صاحب نے بڑھیا کو بہت دلاسا دلایا اور دلسوزی کا اظہار کیا اور اس کے ساتھ چلنے کو تیار ہوگئے لیکن ساتھیوں نے اس ڈر سے کہ بڑھیا نہ جانے اپنے بیٹوں کے ہلاک کرنے والے کے ساتھ کیا سلوک کرے ان کو اس ارادہ سے باز رکھا لیکن شیخ صاحب نے بڑھیا سے اس کے گھر آنے کا وعدہ کر لیا چند دنوں بعد جب لوگ اس بات کو بھول گئے تو موقع پاکر شیخ صاحب اپنے وعدہ کی پاس داری میں تن تنہا اس بڑھیا کے گھر جا پہنچے۔ بڑھیا بھی شریف اور بہادر خاندان سے تعلق رکھتی تھی اس نے ان کے ساتھ نہایت شفقت و محبت کا سلوک کیا اور تواضع میں کسر نہ چھوڑی غرضیکہ اس بڑھیا نے ان کو اپنا منہ بولا بیٹا بنالیا اور تمام عمر دونوں میں ماں بیٹے کے تعلقات برقرار رہے۔

شیخ عبدالرحیم کا قول ہے کہ میں بارہا اس بڑھیا کے مکان میں گیا ہوں۔ میں اسکو دادی کہتا تھا اور

---

[1] انفاس العارفین، صفحہ ۳۳۹-۳۴۱، حیات ولی، صفحہ ۳۹-۴۶

حقیقت یہ ہے کہ میں نے بچپن میں اپنی دادی کو نہیں دیکھا اسلئے مجھے معلوم نہ تھا کہ اس بڑھیا کے علاوہ میری کوئی اور دادی ہے۔ [۱]

شیخ وجیہ الدین کی شادی شیخ رفیع الدین محمد کی دختر نیک اختر سے ہوئی شیخ رفیع الدین محمد قطب العالم ابن شیخ عبد العزیز شکر بار کے صاحبزادے تھے۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ان کے اور ان کے خاندان کے حالات میں رسالہ " النبذة الا بریزیة فی اللطیفة العزیزیه" تحریر کیا ہے جو مجموعہ انفاس العارفین میں شامل ہے۔ اس شادی سے ان کے تین لڑکے ہوئے۔

(۱) شیخ ابوالرضاء محمد (۲) شیخ عبدالرحیم (۳) شیخ عبدالحکیم

شیخ وجیہ الدین کی شہادت:

شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنے والد ماجد کی زبانی شیخ وجیہ الدین کی شہادت کا واقعہ بڑی تفصیل سے تحریر کیا ہے۔ شیخ عبدالرحیم کا بیان ہے کہ شہادت سے کچھ روز پہلے ایک رات میرے والد تہجد کی نماز پڑھ رہے تھے۔ آپ نے ایک سجدہ اتنا طویل کیا کہ مجھے گمان ہونے لگا کہ شاید سجدہ میں ہی ان کی روح پرواز کر گئی اور ان کا انتقال ہو گیا۔ انہیں جب اس حالت سے افاقہ ہوا اور سجدہ سے سر اٹھا کر نماز ختم کی تو میں نے ان سے سجدہ کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے جواب میں بتایا کہ مجھے غیبت ہوئی اور اسی حالت میں شہیدوں کے حالات پر مجھے مطلع کیا گیا۔ میں نے نہایت الحاح کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے اپنی شہادت کی درخواست کی اور اس وقت تک اس میں مصروف رہا جب تک میری دعا منظور نہ کرلی گئی۔ اس پر مجھے اشارہ ہوا کہ میں دکھن کی طرف سفر کروں جہاں میری جائے شہادت ہے۔ شاہ عبدالرحیم کا کہنا ہے کہ میں والد بزرگ کی زبانی یہ الفاظ سن کر زار زار رو رہا تھا۔ رنج سے میرا برا حال تھا مگر آپ نہایت خوش آئند تبسم سے مجھے تسلی دے رہے تھے۔

چنانچہ باوجود اس کے کہ وہ فوج کی ملازمت ترک کر چکے تھے اور جنگ وجدل سے ہاتھ اٹھا چکے تھے انہوں نے گھوڑا خریدا اور سامان حرب مہیا کر کے دکھن کیطرف کوچ کیا۔ انکا خیال تھا کہ دکھن میں انکا مقابلہ راجہ سیوا سے ہوگا جو مسلمانوں سے جنگ کر رہا تھا۔ لیکن برہان پور پہنچ کر آپ پر منکشف ہوا کہ مقام شہادت پیچھے رہ گیا۔ چنانچہ واپس لوٹے واپسی میں ایک متقی اور نیک جماعت تاجر پیشہ لوگوں کی ساتھ ہو گئی اور ہندیا کے راستہ شمالی ہندوستان میں داخلہ کا ارادہ کیا۔ جب یہ قافلہ نونبریا جو دریائے نربدا سے دو

---

[۱] انفاس العارفین، صفحہ ۳۴۱-۴۲، حیات ولی صفحہ ۴۷-۴۸

تین منزل ہندوستان کی طرف ہے پہنچ کر ایک سرائے میں مقیم ہوا تو ایک بوڑھا جاسوس جو بھیس بدل کر ان کے ساتھ ہو لیا تھا ان سے کہنے لگا کہ آپ الگ رہیں آپ کو کوئی نقصان نہ ہوگا ہمارے ساتھی اس قافلہ کو لوٹنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ شاہ وجیہ الدین نے اپنی فطرت کے مطابق اپنے ساتھیوں سے علیحدگی اور دغابازی پسند نہ کی اور تاجروں کی جماعت کی حفاظت میں اپنی جان کی بازی لگا کر ان ڈاکوؤں کا مقابلہ کیا۔ مقابلہ میں آپ کو بائیس زخم آئے اور سر تن سے جدا ہو گیا اور اس طرح آپ نے شہادت پائی۔ اور اسی جگہ مدفون ہوئے۔

شاہ عبدالرحیم کہتے ہیں کہ جس دن والد بزرگ شہید ہوئے اسی دن کے آخری حصہ میں آپ مثالی جسم میں متمثل ہو کر میرے سامنے آئے اور اپنے زخم دکھائے۔ میں گھبرا کر اٹھا اور ایصال ثواب کی غرض سے صدقہ دیا۔ میرا ارادہ ہوا کہ آپ کے جسد کو وہاں سے منتقل کردوں لیکن دوبارہ پھر خواب میں ظاہر ہو کر آپ نے مجھے اس ارادہ سے باز رہنے کی تلقین کی اسکی وجہ سے میں نے ارادہ ترک کر دیا۔[1]

مولانا مظاہری نے اپنی کتاب میں اس واقعہ کو تحریر کیا ہے۔ مقالات طریقت کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ آپ کا مزار بھوپال کے متصل موضع دوراہہ کے قبرستان میں ہے اور سرسرائے کے دروازہ پر مدفون ہے۔[2]

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنے والد شیخ عبدالرحیم کے نانا اور ان کے خاندان کے بزرگوں کے حالات کے بارے میں تحریر کیا ہے۔ اس خاندان کا شجرہ نسب مندرجہ ذیل ہے۔

شیخ طاہر

↓

شیخ حسن — فرزند (حالات نامعلوم) — فرزند (حالات نامعلوم)

↓

شیخ محمد المعروف بہ خیالی — شیخ عبدالعزیز شکربار — فرزند (حالات نامعلوم) — فرزند (حالات نامعلوم)

↓

شیخ قطب العالم — فرزند (حالات نامعلوم) — فرزند (حالات نامعلوم)

↓

شیخ رفیع الدین محمد (خسر شیخ وجیہ الدین، نانا شیخ عبدالرحیم)

اس خاندان کے بزرگوں کا تذکرہ اس تحقیق کے دائرہ کار سے باہر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ

---

[1] انفاس العارفین، صفحہ ۳۴۵-۴۶

[2] مقالات طریقت مرتبہ عبدالرحیم ضیاء صفحہ ۵، حیدر آباد ۱۲۹۲ھ

ایک نہایت بزرگ خاندان تھااور حضرت شاہ ولی اللہ کے خاندان سے صہراً (سسرالی رشتہ سے) متعلق تھا لیکن شاہ ولی اللہ کی ظاہری تربیت میں اس کا اثر نہیں تھا۔ اسلئے ان بزرگوں کے حالات کا تذکرہ مختصراً کیا جائیگا۔ (یہ تذکرہ حیات ولی اور انفاس العارفین سے اخذ کیا گیا ہے)

شیخ عبدالعزیز شکر بار جو اس خاندان کے ایک منفرد بزرگ تھے حضرت شاہ ولی اللہ نے اپنے رسالہ کا عنوان انہیں کے نام نامی پر "النبذة الابريزية فى اللطيفة العزيزية" رکھا ہے۔

شیخ طاہر:

خاندان رفیع الدین کے مورث شیخ طاہر کا اصل وطن اوچ ہے۔ ابتدائے عمر میں ان کی زندگی سیر وشکار میں گذرتی تھی اور تحصیل علم سے بھی دور رہتے تھے۔ مگر ایک دن اپنی ہمشیرہ کو ایک آیت قرآنی کا مفہوم نہ بتاپانے کی غیرت ان کی عزت نفس کو برانگیختہ کرنیکا باعث بنی اور وہ اسی وقت وطن سے تحصیل علم قرآن کی نیت سے نکل پڑے اور تھانیسر اور اس کے بعد بہار پور پہنچے جو اس زمانے میں علماء کا مرکز تھا اور وہاں علوم ظاہری وباطنی کی تحصیل فرمائی۔ قاضی بہار نے ان کے علم وفضل اور وجاہت کو دیکھ کر اپنی دختر سے انکا نکاح کردیا۔ آخری عمر میں شیخ نے اپنے بیٹوں کے ساتھ جون پور میں رہائش اختیار کی اور وہیں انتقال ہوا۔

شیخ حسن:

شیخ حسن نے ۹/سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا اور اٹھارہ سال کی عمر میں علوم دینی سے فراغت حاصل کر کے درس وتدریس میں مشغول ہوگئے۔

شیخ حسن کی تربیت شیخ طاہر کے سایۂ عاطفت میں ہوئی شیخ حسن سید حامد راجی شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے بیعت ہوئے اور علوم باطنی اور طریقت میں دستگاہ حاصل کی سید حامد راجی سلسلۂ چشتیہ کے بزرگ تھے جن کا سلسلۂ خلافت مشہور ومعروف واسطوں سے ہوتا ہوا شیخ نظام الدین اولیاء تک پہنچتا ہے۔ شیخ حسن سلطان سکندر کے زمانہ میں دہلی تشریف لائے اور ۹۰۹ھ میں منڈل کے محل میں بحالت وجد انتقال فرمایا۔ کتاب مفتاح الفیض جو علم وسلوک میں تصنیف کی گئی۔ شیخ کی بڑی یادگار ہے جس سے آپ کے باطنی علوم اور بے مثال روحانی جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔

شیخ محمد خیالی:

شیخ محمد خیالی کی شہرت اگرچہ زیادہ تر علم سلوک میں ہے لیکن آپ فقہ، حدیث اور ادب و کلام میں بھی اجتہاد کا درجہ رکھتے تھے۔ گو ابتداء میں آپ اپنے والد بزرگوار کے مرید تھے مگر آپ پر ارتباط قادریہ غالب آیا اور اسی زمانہ میں حصول علم و تکمیل فن کی غرض سے دہلی اور بعد میں ملک عرب کا سفر کیا اور حرم مدینہ پہنچ کر سالہا سال ریاضت شاقہ میں زندگی بسر کی۔ آخر عمر میں حاجی عبدالوہاب بخاری کے ہمراہ ہندوستان واپس آئے اور دہلی میں انتقال فرمایا اور والد ماجد کے پہلو میں دفن ہوئے۔ [۱]

شیخ عبدالعزیز شکر بار:

حضرت شاہ ولی اللہ نے اس خاندان کے سب سے مشہور بزرگ کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے اور اپنے رسالہ کو بھی انہیں کے نام سے معنون کیا ہے۔ شیخ عبدالعزیز ایک مقدس اور فقیر طبیعت بزرگ تھے جن کی ذاتی شرافت و نجابت، محتاط اور پرہیزگار زندگی نے ان کو دور دور تک مشہور کر دیا۔ نزہۃ الخواطر جلد ۴ چار میں درج ہے کہ شیخ عبدالعزیز عباسی جونپوری ثم دہلوی (۸۹۸ھ-۹۷۵ھ) کا شمار کبار مشائخ چشتیہ میں ہے۔ شیخ قاضی خاں ظفر آبادی اور شیخ تاج محمود جونپوری سے طریقہ چشتیہ میں اجازت لی۔ موصوف بے نفسی اور تواضع کا پیکر تھے اور اخلاق عالیہ سے متصف، وحدۃ الوجود کا مذاق رکھتے تھے۔ خطوط میں اپنے نام سے پہلے "ذرہ ناچیز" لکھا کرتے تھے۔ عجیب اتفاق ہے کہ اسی سے ان کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔ [۲]

صاحب حیات ولی لکھتے ہیں کہ شیخ عبدالعزیز نے حاجی عبدالوہاب بخاری سے خرقہ سہروردیہ اور شیخ بہاؤاللہ قادری سے خرقہ قادریہ زیب تن کیا۔

شیخ عبدالعزیز راہ سلوک میں بے حد مستعد تھے اور جو ریاضت اور مجاہدات آپ نے جوانی میں اپنے اوپر لازم کئے ان کو آخر عمر تک نہایت مستعدی سے ادا کیا۔ آپ نیک دل، فیاض طبع، عمدہ اخلاق کے پیکر اور الوالعزم بزرگ تھے۔ آپ نے ۶ جمادی الآخر ۹۷۵ھ کو انتقال فرمایا۔

شیخ قطب العالم:

شیخ عبدالعزیز کے انتقال کے بعد آپ کی اولاد میں شیخ قطب العالم بلحاظ فضل و کمال، عقل و دانش اور

---

۱ حیات ولی، صفحہ ۸۳-۸۴

۲ تاریخ دعوت و عزیمت، صفحہ ۷۳، جلد ۵

فیاضی اور جود و سخا میں سب سے ممتاز تھے۔ علم حاصل کرنے کا ذوق تو ان کو تھا ہی تربیت بھی شاہ عبدالعزیز جیسے شفیق باپ اور استاد کی پائی۔ لیکن مختلف علوم انہوں نے اپنے اپنے فنون کے عالموں سے حاصل کئے اور فقہ و حدیث، صرف و نحو، کلام و ادب میں کمال حاصل ہو گیا۔ ساتھ ہی مجلسی علوم و آداب کے حصول کے لئے بھی طبیعت نہایت موزوں واقع ہوئی تھی۔ ابتداء میں اپنے والد ماجد کے تصرف کے باوجود صوفیانہ طریقہ وجد و سماع وغیرہ کی طرف راغب نہیں تھے۔ بعد ازاں خواجہ محمد باقی کے فیض صحبت میں طریقہ نقشبندیہ پر کاربند ہوئے۔

شیخ رفیع الدین:

شیخ قطب العالم کے چند فرزند تھے لیکن سب سے افضل اور عمر میں سب سے بڑے شیخ رفیع الدین محمد تھے جو شیخ عبدالرحیم کے نانا تھے۔ آپ علوم ظاہری و باطنی کے جامع اور کتب تصوف کے ماہر تھے۔ تصوف کے رموز و کنایات کو بیان کرنے پر کامل دسترس رکھتے تھے۔ پہلے پہل اپنے والد گرامی سے طریقہ چشتیہ قادریہ میں بیعت کی اور شیخ نجم الحق کی صحبت سے فیض حاصل کیا۔ اس کے بعد اپنے والد کی ترغیب پر خواجہ محمد باقی باللہ کی صحبت اختیار کی اور ان کی نسبت غالب آ گئی۔

خواجہ محمد باقی رفیع الدین محمد پر بے حد مہربان تھے اور وہ بھی خواجہ کے حکم کی تعمیل کرتے جب شیخ رفیع الدین کی دوسری شادی شیخ محمد عارف بن شیخ غفور اعظم پوری کی لڑکی سے طے پائی تو انہوں نے بغیر خواجہ کی شرکت کے محفل نکاح میں جانے سے انکار کر دیا اور ان کی شرکت پر ہی یہ نکاح ہوا۔ شاہ ولی اللہ تحریر فرماتے ہیں "کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کہتا ہے کہ حضرت والد بزرگوار (شاہ عبدالرحیم) کی والدہ اسی خاتون کے بطن سے پیدا ہوئیں" [1]

انفاس العارفین میں شامل رسالہ "العطیة الصمدیة فی انفاس المحمدیه" میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنے نانا شیخ محمد پھلتی کا تذکرہ کیا ہے۔ شیخ محمد پھلتی کے آباء و اجداد بھی بڑے مرتبہ کے لوگ تھے اور دین و دنیا میں ایک عزت و وقار کے مالک تھے۔ ان کے اجداد میں شیخ احمد بن شیخ یوسف سلطان سکندر کے زمانہ میں گزرے ہیں۔ سلطان سکندر نے ان سے متاثر ہو کر انہیں معاش کے لئے بارہ کے علاقہ میں چند مواضعات ہدیۃً بطور جاگیر دیئے تھے۔

اسی بناء پر قصبہ پھلت کو انہوں نے اپنی مستقل قیام گاہ اور وطن کے طور پر اختیار کر لیا اور ان کے بعد ان کی آل اولاد بھی وہیں بس گئی۔

---

[1] انفاس العارفین، صفحہ ۳۵۴

شیخ محمد پھلتی کا شجرہ مندرجہ ذیل ہے:[1]

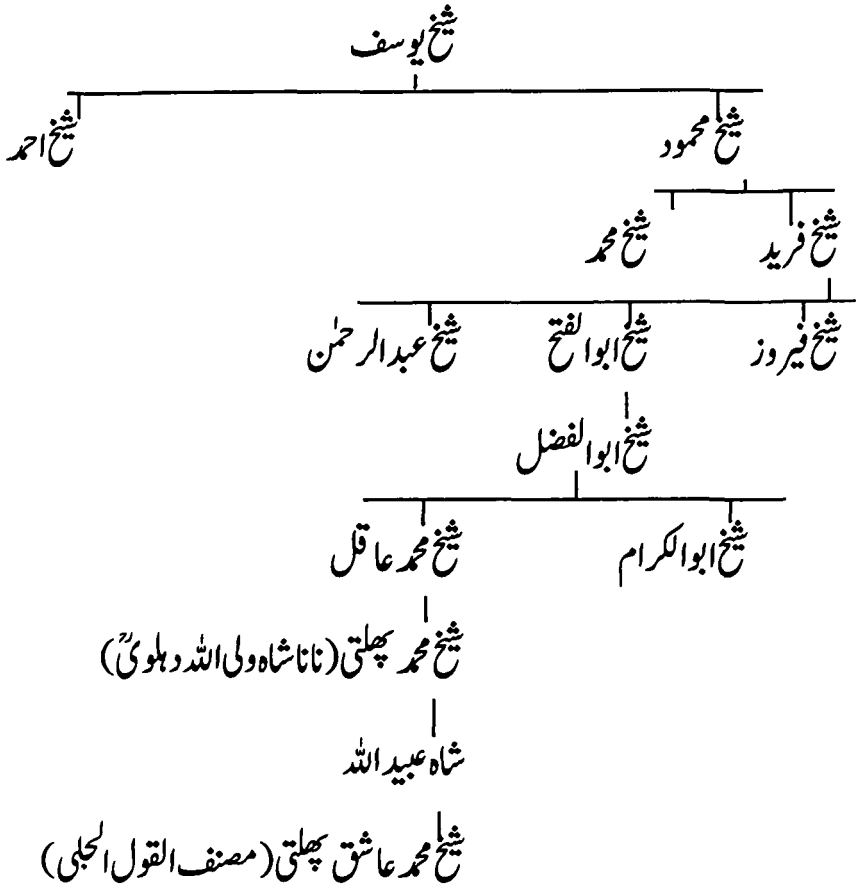

شیخ محمد صاحب کے والد شیخ محمد عاقل جود و سخا، زہد و تقویٰ، طالب علموں اور مسکینوں کی رعایت و امداد اور علمی کارناموں کے لئے مشہور تھے۔ حالانکہ وہ اپنے والد ابوالفضل کے چھوٹے بیٹے تھے لیکن اپنے بڑے بھائی کے مقابلہ میں اسی جود و سخا اور اطعام مساکین کی وجہ سے وہ اپنے والد کے خلیفہ اور سجادہ نشین ہوئے۔ واقعہ یہ ہوا کہ شیخ ابوالفضل کے انتقال کے بعد ان کے بڑے بیٹے ابوالکرام جو ملازم پیشہ تھے سجادہ نشینی کے لئے کوشاں ہوئے۔ مگر شیخ ابوالفضل کی روحانیت کی طرف سے اشارہ ملا کہ وہی سجادہ نشین ہوگا جو کل صبح کے وقت فلاں درخت کے نیچے کھانا تقسیم کرتا ہوا پایا جائے۔ دوسرے دن لوگ جب اس درخت کے پاس گئے تو دیکھا کہ محمد عاقل غریبوں کو کھانا تقسیم کر رہے ہیں۔ چنانچہ متفقہ طور پر ان کو سجادہ نشین منتخب کر لیا گیا۔

شیخ ابوالفضل بذات خود رضائے الٰہی، ترک دنیا، تدریس علوم دینیہ اور اعمال سلوک و طریقت میں کامل تھے۔ آپ نے طویل عمر پائی۔ شاہ ولی اللہ رقمطراز ہیں:

"فقیر (ولی اللہ) نے عین العلم (مصنفہ شیخ ابوالفتح والد شیخ ابوالفضل: جو سلوک کی ایک

---

[1] حیات ولی، صفحہ ۱۰۵

مستند کتاب ہے) کا نسخہ جس پر شیخ ابوالفضل نے اپنے قلم سے حواشی لکھے ہیں، دیکھا ہے اس کتاب کے حواشی کی خوبی ان کی تحقیق و تدقیق پر دلیل ہے۔"[1]

شیخ محمد عاقل جود و سخا کے ساتھ ساتھ وظائف پر سختی سے کاربند رہتے اور ترک دنیا میں بہت بلند مقام کے مالک تھے۔ آپ کے سب سے بڑے فرزند شیخ محمد پھلتی تھے۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ شیخ محمد صاحب جو شاہ ولی اللہ کے نانا تھے۔ انہوں نے نارنول میں ایک مشہور درسگاہ میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد شاہ صاحب کے چچا شیخ ابوالرضاء محمد کی، ان کے بعد اپنے داماد اور شاہ صاحب کے والد شیخ عبدالرحیم کی صحبت میں رہ کر علوم ظاہری و باطنی حاصل کیے۔ اسی دوران راہ معرفت و سلوک میں توفیق و اشارہ پاکر سالہا سال معرفت کی طلب میں پوری مستعدی سے گامزن ہوئے اور وطن سے نکل کر علمائے کاملین کی صحبتوں میں حاضر ہو کر فیض حاصل کیا۔ اس کے بعد تکمیل مراتب کے بعد پھر وطن مالوف (پھلت) واپس آئے اور علم ظاہری و باطنی کے درس میں مشغول ہو گئے۔

شیخ محمد صاحب، جود و سخا، ترک حظ نفس، توکل و قناعت، اور زہد و تقویٰ اور پابندیٔ قوانین شرع میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ آپ کے چہرے سے نورانی عظمت و جلال برستا تھا۔ جس کو دیکھنے سے دلوں پر عظمت نما ہیبت طاری ہو جاتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود ان کی طبیعت میں حد درجہ انکساری اور تواضع تھی۔ اس کے علاوہ وہ اپنے اساتذہ اور شیوخ کا حد درجہ احترام و اعزاز کرتے اور ان کو راضی رکھنے کی کوششوں میں لگے رہتے تھے[2]۔

شیخ محمد صاحب کے تلامذہ و مریدین کی ایک طویل فہرست ہے۔ شیخ صاحب کا انتقال ۸/ جمادی الاول ۱۲۲۵ھ کو ہوا۔ آپ کے کئی صاحبزادے تھے۔ مگر شاہ عبیداللہ (شاہ ولی اللہ کے ماموں اور بعد میں خسر) عمر میں سب سے بڑے اور عظمت و بزرگی میں سب سے بلند مرتبہ آپ کے جانشین ہوئے۔

ان بزرگ حضرات کے تذکرہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شاہ ولی اللہ کی جو قابلیت اور شہرت چار دانگ عالم میں پھیلی اس میں ان کی ذاتی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی بڑا حصہ تھا کہ آپ کے خاندان (والد اور والدہ دونوں جانب سے) میں انتہائی بزرگ کاملین گزرے ہیں جن کی قوت تاثیر اور افادہ و افاضہ اور برکات ان کی زندگی ہی میں نہیں ان کی وفات کے بعد ان کے ورثاء کی زندگیوں تک میں ظاہر ہوئے۔

---

[1] انفاس العارفین، صفحہ ۳۶۰

[2] انفاس العارفین، صفحہ ۳۶۲، حیات ولی، صفحہ ۹۳

اس باب کے آخری حصہ میں ہمارا موضوع ایسی شخصیات کا تذکرہ ہے جن کا براہ راست اثر شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی زندگی تعلیم و تربیت اور کردار پر پڑا۔ یہ شخصیات شاہ صاحب کے والد بزرگوار شاہ عبدالرحیم اور عم محترم شیخ ابوالرضاء محمد کی تھیں۔ جن کی گودوں میں شاہ صاحب کا بچپن گزرا، جن کی تربیت اور نگرانی بلکہ شاگردی میں شاہ صاحب نے تعلیم حاصل کی اور جن کے فیضان کا براہ راست اثر ان کے پورے کردار پر پڑا۔

شاہ صاحب کے چچا اپنے بھائی شیخ عبدالرحیم سے کافی بڑے تھے۔ اور ابتداء میں شیخ عبدالرحیم کی اتالیقی آپ ہی کے سپرد تھی۔ اسی لئے وہ اپنے چھوٹے بھائی کے لئے مثل والد تھے اور استاد کی حیثیت سے بھی قابل عزت تھے۔ جو علمی کمالات شیخ عبدالرحیم کو حاصل ہوئے وہ اگر سچ پوچھا جائے تو اسی تعلیم و تربیت کا اثر تھا جو شیخ ابوالرضاء محمد کے سایہ عاطفت میں ان کو حاصل ہوئی۔

شاہ ولی اللہ نے انفاس العارفین میں ابتدائی دو رسالے انہیں بزرگوں کے تذکرہ کے لئے لکھے ہیں۔ رسالہ "بوارق الولایہ" شاہ عبدالرحیم کے حالات، ملفوظات، کشف و کرامات اور معمولات کے بارے میں ہے اور رسالہ "شوارق المعرفہ" شیخ ابوالرضاء محمد کے اوصاف و حالات کے بارے میں ہے۔ شاہ صاحبؒ نے انفاس العارفین کا آغاز ہی اپنے والد گرامی کے تذکرہ سے کیا ہے۔

شیخ ابوالرضاء کیوں کہ بڑے تھے اور شاہ عبدالرحیم کے اتالیق بھی رہ چکے تھے اس لئے سب سے پہلے ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اگرچہ ایک دوسرے اصول کے تحت شاہ ولی اللہ نے ان کا تذکرہ دوسرے نمبر پر کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> "اگرچہ اصولی طور پر اس حصہ کو پہلے پیش کرنا چاہئے تھا مگر سند اور صحت کے لحاظ سے اسے دوسرے نمبر پر رکھا گیا ہے۔ اس لئے کہ حصہ اول کی اکثر روایات (در تذکرہ والد ماجد) ایسی ہیں جو فقیر (شاہ ولی اللہ) نے بغیر کسی واسطہ کے سنی اور دیکھی ہیں اور اس دوسرے حصہ کی اکثر باتیں فقیر کو ایک یا دو واسطوں سے ملی ہیں"[1]

T. 6251

شیخ ابوالرضاء محمد:

حضرت شیخ ابوالرضاء محمد کے حالات کا پہلا اور مستند ترین ماخذ شاہ صاحبؒ کی تصنیف "شوارق المعرفہ" ہے جو انفاس العارفین میں شامل رسالہ ہے۔ اسی سے متمتع ہوتے ہوئے محمد رحیم بخش دہلوی

---

[1] انفاس العارفین، صفحہ ۱۹۲

نے اپنی تصنیف حیات ولی میں ان کے حالات تحریر کیے ہیں۔ بعد میں متعدد تصانیف میں ان کتابوں کے حوالے سے ان کے حالات، ملفوظات اور کشف و کرامات تحریر کیے ہیں۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنی کتاب تاریخ دعوت و عزیمت جلد پنجم میں ان کا ذکر الگ سے کیا ہے جو ان کے حالات زندگی پر مختصر مگر مکمل روشنی ڈالتا ہے۔

"شیخ ابوالرضاء محمد حضرت شیخ وجیہ الدین کے فرزند اکبر اور شاہ صاحب کے بڑے چچا ہیں۔ شاہ صاحب نے انفاس العارفین میں اپنے والد بزرگوار کے بعد ان کا مستقل تذکرہ لکھا ہے ان کو امام الطریقۃ والحقیقۃ کے بلند الفاظ سے یاد کیا ہے۔"[۱]

شیخ ابوالرضاء محمد کی تاریخ و سن پیدائش کا کسی تذکرہ یا آپ کی زندگی کے حالات و واقعات میں واضح ذکر نہیں لیکن ان کی عمر اور سن وفات سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ واضح رہے کہ ان کی سن وفات میں بھی کتب میں اختلاف ہے جس کو آگے بیان کیا جائے گا۔ لیکن ایک بات یقینی ہے کہ آپ ابوالمظفر شہاب الدین محمد شاہ جہاں بادشاہ کے دور حکومت میں پیدا ہوئے تھے۔

بقول شاہ صاحب شیخ ابوالرضاء محمد نے تمام ظاہری علوم حافظ بصیر سے حاصل کئے جو عہد شاہجہاں میں ایک بڑے نامور عالم و فاضل تھے لیکن ان کے علوم زیادہ تر وہبی تھے۔[۲]

آپ نے اپنے والد کی اجازت سے اس زمانہ کے امراء سے ملنا جلنا شروع کیا۔ اور شاہی دربار سے ایک معزز عہدہ بھی آپ کے نامزد ہو گیا تھا مگر دفعۃً جاذبۂ توفیق الٰہی سے آپ کی فطری استعداد ظہور پذیر ہوئی اور آپ نے گوشہ نشینی، تجرید تام، توکل کلی اور عمل بالسنہ کو اپنا شعار بنالیا اور یک لخت لوگوں حتیٰ کہ عزیز و اقارب تک سے ملنا ترک کر دیا۔ یہاں تک نوبت آئی کہ زوجہ محترمہ کو بھی حکم الٰہی (ان کنتن تردن الحیاۃ الدنیا و زینتھا فتعالین امتعکن و اسرحکن سراحا جمیلا۔[۳]) (ترجمہ: تم اگر دنیاوی زندگی کا عیش اور اس کی بہار چاہتی ہو تو آؤ میں تم کو کچھ مال و متاع (دنیوی) دے دوں اور تم کو خوبی کے ساتھ رخصت کروں) اور سنت رسولؐ کے مطابق کہہ دیا کہ تم کو اختیار ہے کہ اگر فقر و فاقہ برداشت کر سکتی ہو تو ہمارے ساتھ رہو ورنہ میکہ چلی جاؤ۔ مگر زوجہ محترمہ نے بھی ازواج مطہرات کی سنت پر عمل کرتے ہوئے فقر و فاقہ کے ساتھ آپ کی معیت کو ترجیح دی۔[۴]

۱۔ تاریخ دعوت و عزیمت، صفحہ ۷۶، جلد ۵
۲۔ حیات ولی، صفحہ ۱۷۸
۳۔ القرآن، سورۃ الاحزاب، الآیۃ ۲۸
۴۔ انفاس العارفین، صفحہ ۸۶-۸۸، تاریخ دعوت و عزیمت، صفحہ ۷۷

شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ اکثر ان پر دو دو تین تین فاقے ہو جاتے۔ لیکن بعد میں محض فضل الٰہی سے بغیر کسی ظاہری سبب وذریعہ کے برکت ہوئی اور اس نے اپنے بندوں کو آپ کی طرف متوجہ کر دیا اور آپ کی رہائش اور معاش میں تمام و کمال توسیع ہو گئی۔

تصوف اور سلوک کی راہ میں آپ کو سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ سے نسبت خاص حاصل تھی اور سید علی المرتضیٰ سے محبت خاص اور مناسبت بالاختصاص حاصل تھی۔[1]

اورنگ زیب عالمگیر نے کئی مرتبہ زیارت کا ارادہ کیا مگر قبول نہیں کیا۔ دولتمندوں کی طرف بالکل توجہ نہیں کرتے تھے البتہ پیائی کرنے والوں، جوتا بنانے والوں اور ایسے ہی کمتر پیشہ وروں کی طرف متوجہ ہوتے اور حقیر سے حقیر ہدیہ تک قبول فرما لیتے۔

آپ کا چہرہ سفید براق نورانی تھا۔ آپ دراز قد تھے۔ چھدری داڑھی گورا رنگ تھا۔ انتہائی خوش گفتار اور نرم کلام تھے۔ شاہ صاحب نے آپ کے تعارف میں قوی العلم، فصیح اللسان، عظیم الورع، وسیع المعرفہ کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ آپ جید عالم، حد درجہ متقی اور ماہر علوم معرفت تھے۔

فضل و کمال کے اعتبار سے ابوالرضاء محمد بڑے پائے کے بزرگ تھے۔ آپ کو علوم عقلی و نقلی پر عبور تھا۔ اشغال و اوراد سے وقت نکال کر علمی مباحث میں بھی شریک ہوتے۔ ابتداء میں طلباء کو ہر قسم کے علوم کا درس دیتے تھے اور لوگ ان کی تقریر سننے کے شوق میں اکٹھے ہو جاتے تھے۔ لیکن آخر میں سوائے تفسیر بیضاوی اور مشکوٰۃ شریف کے اور کسی علم کا درس دینا پسند نہ کرتے کیوں کہ آخر زمانہ میں آپ کی طبیعت تمام علوم رسمیہ سے ہٹ کر صرف حدیث و قرآن ہی کی طرف مائل ہو گئی تھی اور انہیں دونوں علوم سے خاص دلچسپی تھی۔ آپ عموماً جمعہ کی نماز کے بعد وعظ کہتے اور تین حدیثیں زبانی سناتے تھے پھر فارسی اس کے بعد ہندی (ریختہ: اردو) میں ان کا ترجمہ کرتے تھے اور ان احادیث کے مطالب پر روشنی ڈالتے تھے لیکن اعتدال اور اختصار کے ساتھ آپ کی آواز میں بے حد درد تھا اور تقریر بے حد اثر انگیز ہوتی تھی۔ جس سے سامعین بہت متاثر ہوتے تھے۔

شیخ صاحب وحدۃ الوجود کے قائل تھے اور اس بارے میں صاحب تحقیق تھے۔ صوفیاء کے متعلق ملفوظات کی خوب شرح کرتے تھے۔ آپ مستجاب الدعوات تھے۔ شاہ صاحب نے آپ کے کشف و کرامات کے متعدد واقعات تحریر کئے ہیں اور تفصیل سے آپ کے ملفوظات درج کئے ہیں۔[2]

---

[1] انفاس العارفین، صفحہ ۸۶-۸۸، تاریخ دعوت و عزیمت، صفحہ ۷۷

[2] حیات ولی، صفحہ ۸۹-۹۰

آپ سنت نبوی کی رعایت واہتمام میں انتہائی احتیاط سے کام لیتے تھے اور کبھی کسی سنت کو ترک نہیں کرتے تھے۔اسی سلسلہ میں ایک عادت کا تذکرہ حیات ولی میں کیا گیا ہے:

"جب مسجد میں تشریف لاتے تو دروازہ پر تھوڑی دیر خاموشی کے ساتھ توقف کرتے اور بایاں پاؤں جوتے سے نکال کر اس پر رکھ لیتے بعد ازاں دایاں قدم مسجد میں داخل کرتے اور اس صورت سے مقصود یہ تھا کہ ذیل کی دونوں حدیثوں پر عمل واقع ہو۔

حدیث اول: لکن الیمنیٰ اولھما تنعل و آخرھما تنزع (لیکن دونوں پیروں میں سے پہلے دائیں طرف سے جوتی پہنے اور دونوں میں سے دائیں طرف سے آخر میں اسے اتار دے)

حدیث دوم: کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یحب التیامن فی شانہ کلہ (حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہر بات کو دائیں جانب سے کرنا پسند فرماتے تھے) یعنی مسجد میں دایاں قدم پہلے داخل فرماتے تھے۔"[1]

صاحب حیات ولی نے شاہ ولی اللہ کی شوارق المعرفہ سے اخذ کر کے شیخ ابوالرضاء محمد کی تعرف و کشف کے متعدد واقعات اور ان کے مکتوبات و ملفوظات و مسودات کا نمونہ تحریر کیا ہے۔ جو کافی طویل ہے۔[2]

شیخ کا انتقال:

شیخ محمد ظفر رہتکی کا بیان ہے کہ جناب شیخ صاحب ابتدائی زمانہ میں اکثر اوقات فرمایا کرتے تھے کہ ہماری عمر پچاس ساٹھ سال کے درمیان ہوگی۔ چنانچہ جب آپ نے اپنی عمر کے پچاس مرحلے طے کر لئے تو مجھے شیخ کا وہ قول یاد آیا اور ہمیشہ یہی خطرہ پیش نظر رہا۔

جب شیخ صاحب کی عمر پچپن سال کی ہوئی تو ۱۷ر محرم ۱۱۰۰ھ کو مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد آپ نے سفر آخرت اختیار کیا۔ صاحب حیات ولی نے آپ کا سن وفات ۱۱۰۰ھ تحریر کیا ہے اور وقت بعد مغرب لکھا ہے لیکن مولانا ابوالحسن ندوی نے انفاس العارفین صفحہ ۱۵۵، کے حوالہ سے یہ سن ۱۱۰۱ھ لکھا ہے۔ بعض احباب نے فی البدیہہ آپ کی تاریخ وفات "آفتاب حقیقت" سے نکالی ہے۔ جس کا حوالہ حیات ولی میں بھی ہے اور اس سے ابجد کے حساب سے ۱۱۰۲ھ نکلتا ہے۔ (۱+۸۰+۴۰۰+۱+۲+۸+

---

[1] حیات ولی، صفحہ ۱۹۱-۲۰۴

[2] ایضاً

۱۰۰+۱۰+۱۰۰+۴۰۰= ۱۱۰۲ھ) مولانا عبدالقیوم مظاہری نے اپنی کتاب "الامام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ" صفحہ ۱۶ میں آپ کی تاریخ وفات کے بارے میں لکھا ہے کہ "آپ کی وفات ۱۷ر محرم الحرام ۱۱۰۱ھ یا ۱۱۰۳ھ بعد نماز عصر ہوئی اور دہلی میں مدفون ہوئے۔"[۱]

آپ کی عمر کے بارے میں بھی مختلف قیاسات ہیں۔ صاحب حیات ولی نے صفحہ ۱۷۸ میں نوٹ (۱) میں لکھا ہے:

"مگر آپ کے واقعات انتقال پر نظر ڈالنے اور انہیں پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے جو آپ کے مرض موت سے متعلق بیان کئے گئے ہیں کہ آپ ۱۰۴۵ھ میں پیدا ہوئے کیوں کہ آپ کا انتقال محرم کی ۱۷ر تاریخ ۱۱۰۰ھ میں ہوا اور انتقال کے وقت آپ کی عمر ٹھیک پچپن سال کی تھی۔ حسابی قاعدہ سے جب پچپن سال ۱۱۰۰ھ میں سے تفریق کئے جائیں تو باقی ۱۰۴۵ھ رہتے ہیں اس لئے آپ کا سن ولادت ٹھیک ۱۰۴۵ھ ہے۔ واللہ اعلم"[۲]

لیکن اگر سن وفات ۱۱۰۱ھ لیا جائے جیسا انفاس العارفین کے حوالہ سے لکھا گیا ہے تو پچپن سال کی عمر پانے سے سن پیدائش ۱۰۴۶ھ نکلتا ہے اور اگر آفتاب حقیقت سے تاریخ نکالی جائے تو سن پیدائش ۱۰۴۷ھ نکلے گا۔ اور اگر سن وفات ۱۱۰۳ھ ہو تو سن پیدائش ۱۰۴۸ھ ہو گا۔ واللہ اعلم۔

آپ نے اپنے بعض مکتوبات اور ملفوظات کے علاوہ ایک رسالہ "اصول الولایۃ لاہل العنایہ" چھوڑا جو آپ کی علمی اور روحانی بلندیوں پر شاہد ہے۔ آپ کے کئی صاحبزادہ تھے لیکن ان میں سے صرف ایک صاحبزادہ شیخ فخر العالم کا نام ملتا ہے جو عمر میں سب سے بڑے اور مکتوبات کے جامع تھے۔

شاہ صاحب کے والد محترم شیخ عبدالرحیم:

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنے والد محترم شیخ عبدالرحیم صاحب کے حالات و کمالات میں ایک مفصل کتاب تحریر فرمائی ہے جس کا نام "بوارق الولایہ" ہے یہ کتاب انفاس العارفین کا جزو اول ہے۔ شیخ عبدالرحیم کی زندگی ابتداء ہی سے جس دینی اور علمی ماحول میں گزری اور جو میراث ولایت ان کو اپنے اجداد پدری و مادری سے ملی اس کے اثر سے بچپن ہی سے ان کی طبعیت دین کی طرف مائل اور دنیا کی دولت و عزت سے اچاٹ تھی۔

شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے کہ میرے والد فرماتے تھے کہ "شیخ رفیع الدین (جو والد صاحب کے نانا تھے)

---

۱ الامام ولی اللہ محدث دہلویؒ، صفحہ ۱۶

۲ حیات ولی، صفحہ ۱۷۸

نے آخری عمر میں جب اپنا اثاثہ اپنے ورثاء میں تقسیم کیا تو اپنی سب سے چھوٹی ناکتخدا لڑکی کو (جو بعد میں والدہ شیخ عبدالرحیم ہوئیں) بجائے زر و دولت دینے کے مشائخ کرام کا شجرہ اور خاندانی اوراد و فوائد طریقت پر مشتمل ایک چھوٹا سا رسالہ عنایت کیا۔ شیخ کی رفیقہ حیات نے کہا کہ "یہ بچی ابھی غیر شادی شدہ ہے اسے تو جہیز اور اسباب خانہ داری چاہئے نہ کہ رسائل تصوف!" فرمایا "یہ رسائل ہمیں مشائخ سے میراث میں ملے ہیں۔ اس بچی کے بطن سے اس معنوی میراث کا مستحق پیدا ہوگا۔ ہم نے یہ روحانی میراث اسی کے لئے دی ہے۔ باقی رہے اسباب خانہ تو وہ خدا میسر کردے گا۔" بعد میں جب میں (شیخ عبدالرحیم) پیدا ہوا اور ہوش سنبھالا تو میری والدہ نے وہ رسائل مجھے دے دیئے اور میں نے ان سے فائدہ حاصل کیا۔"[1]

بچپن سے ہی آپ نیک سیرت اور پاک طینت تھے۔ چوتھے سال میں شیخ وجیہ الدین نے قرآن مجید پڑھانا شروع کردیا۔ جلد ہی قرآن مجید کی تعلیم پوری کر کے صرف و نحو اور عربی دینی کتب کی تعلیم شروع کردی اور آٹھ سال کی عمر تک ان مروجہ کتابوں کو ازبر کرلیا۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ انفاس العارفین میں تحریر کرتے ہیں کہ آپ نے (شاہ عبدالرحیم صاحب نے) فرمایا کہ "میں نے عربی کے ابتدائی رسائل سے لے کر شرح عقائد اور حاشیہ خیالی تک کی جملہ کتب اپنے بھائی شیخ ابوالرضاء محمد دہلوی سے پڑھی ہیں۔ اور شرح مواقف و دیگر کتب کلامیہ و اصولیہ میر زاز اہد ہروی (مشہور بہ میر زاہد) سے پڑھی ہیں۔ ان کی مجھ پر خصوصی توجہ تھی یہاں تک کہ اگر میں کسی دن کہتا کہ آج میں نے مطالعہ نہیں کیا ہے تو فرماتے کہ ایک دو سطر پڑھ لو تاکہ ناغہ نہ ہو۔ "ایشاں با من التفات بسیار کردند، اگر گفتم کہ امروز مطالعہ نکردہ ام می گفتند یک یا دو سطر خوانند کہ ناغہ نہ شود" معقولات میں میر زا زاہد کا جو مقام ہے وہ اہل علم سے پوشیدہ نہیں لیکن یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ تفسیر و فقہ سے بھی واقفیت رکھتے تھے اور کبھی کبھی ان علوم کا درس بھی دیا کرتے تھے۔

شیخ عبدالرحیم صاحب دس سال کی عمر میں صرف و نحو، ادب و کلام، اصول معقول حکمت وغیرہ تمام علوم رسمیہ کی تکمیل کر چکے تھے۔ جب گیارہویں سال میں قدم رکھا تو فقہ و حدیث کی تعلیم میں مصروف ہوئے۔ جب ان کی عمر بارہ سال کی ہوئی تو وہ علم حدیث و فقہ کی تکمیل کر چکے تھے چنانچہ جب دینیات سے فارغ ہوئے تو لوگ ان کے پاس تحصیل علوم کے لئے آنے لگے، اس کے بعد تیرہ سال کی عمر میں ہی باطنی علوم اور سلوک و طریقت کی طرف متوجہ ہوگئے۔

---

[1] انفاس العارفین، صفحہ ۳۶

شاہ عبدالرحیم کو اس لحاظ سے مادر زاد ولی کہا جاسکتا ہے کہ ان کی پیدائش سے پہلے ان کے نانا شیخ رفیع الدین نے ان کو اجازت عطا کر دی تھی۔ شاہ ولی اللہ تحریر کرتے ہیں:

"تأدب شیخنا عبدالرحیم علیٰ روح جده لابیه الشیخ رفیع الدین محمد و اجازه قبل ان یولد بسنین بطریق خرق العادة"

ہمارے شیخ عبدالرحیم نے اپنے نانا شیخ رفیع الدین محمد سے روحانی تربیت حاصل کی اور انہوں نے بطور خرق عادت (کرامت) آپ کی پیدائش سے دو سال قبل اجازت مرحمت فرمائی"[1]

اساتذہ شیخ:

شیخ عبدالرحیم کے اندر خداداد استطاعت اور علم و کمالات حاصل کرنے کا ذوق اور جذبہ فطری طور پر عطا کیا گیا تھا۔ اس ذوق کو جلا دینے اور بلندیوں پر پہنچانے میں ان اساتذہ کرام اور ماہرین و کاملین فن نے مدد دی جن سے شیخ کا واسطہ پڑا۔

اول تو خود شیخ کے والد شیخ وجیہ الدین اور بڑے بھائی شیخ ابوالرضاء محمد دینی اور مروجہ علوم عقلی و نقلی کے استادوں میں تھے جنہوں نے بالکل شروع سے شیخ عبدالرحیم کی تعلیم کی ابتدا کی۔ ان کے علاوہ خود شاہ عبدالرحیم کا قول ہے کہ:

"جب میں نو دس برس کا تھا تب ہمارے محلّہ میں ایک بزرگ خواجہ ہاشم بخاری آکر رہے۔ وہ مجھ پر اکثر توجہ فرماتے کچھ دن بعد فرمایا کیوں کہ تم اچھی استعداد رکھتے ہو، ہم چاہتے ہیں کہ اشغال صوفیہ میں سے کسی شغل کو اپنا مطمع نظر بناؤ"[2]

چنانچہ خواجہ ہاشم نے شیخ کو استکتاب کا طریقہ تلقین کیا۔ یعنی تختی یا کاغذ پر اسم ذات "اللہ" مسلسل لکھنے کو کہا تاکہ کثرت نگاہ کے سبب قوت متخیلہ میں جاگزیں و پیوست ہو جائے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ "مجھ پر اس کا ایسا غلبہ ہوا کہ میں نے ملا عبدالحکیم کا حاشیہ نقل کرنا شروع کیا تو پورے ایک جزو پر لاشعوری طور پر اسم ذات لکھتا چلا گیا۔" شاہ عبدالرحیم کو اس سلسلہ میں رویائے صادقہ سے بھی مدد ملی۔ اسی دور حیات میں شیخ نے حضرت زکریا علیہ السلام کو خواب میں دیکھا جنہوں نے ان کو اسم ذات کی تعلیم فرمائی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی جنہوں نے نفی و اثبات کا طریقہ تعلیم فرمایا۔ مقالات طریقت

---

[1] القول الجمیل فی بیان سواء السبیل، مصنفہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ، صفحہ ۱۲۸، (ب ت)

[2] انفاس العارفین مترجمہ محمد فاروق القادری، صفحہ ۵

میں ہے کہ آپ ائمہ طریقت شیخ عبدالقادر جیلانی اور خواجہ نقشبند کی ارواح سے بھی خواب میں مستفید ہوئے اور اجازت روحانی حاصل کی۔ [۱]

شاہ عبدالرحیم اکثر خواجہ باقی باللہ کے صاحبزادہ شیخ عبداللہ المشہور بہ خواجہ خورد کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے کیوں کہ خواجہ خورد شیخ رفیع الدین محمد کے شاگرد تھے۔ اس لئے ان سے شیخ کے خاندانی تعلقات تھے۔ اسی وجہ سے وہ آپ پر بہت شفقت فرماتے تھے اور نصائح سے مستفید کرتے۔ چنانچہ ان کے مشورہ اور حکم کے مطابق شاہ عبدالرحیم نے حافظ سید عبداللہ (خلیفہ حضرت آدم بنوریؒ) سے رابطہ پیدا کیا اور ان سے بیعت ہو کر ان کے فیض سے باریاب ہوئے۔ حیات ولی میں شاہ عبدالرحیم کا یہ قول نقل کیا گیا ہے:

"واجب الاعتصام سید اس فقیر پر نہایت مہربانیاں فرماتے تھے اور اکثر کہا کرتے تھے کہ تم ابھی بچہ ہی تھے اور اپنے ہمر عمروں میں کھیلتے پھرتے تھے۔ اسی وقت سے ہماری طبیعت تمہاری طرف مائل تھی۔ میں اللہ پاک سے دعا کیا کرتا تھا کہ خداوند اس بچہ کو اپنے اولیاء کے زمرے میں داخل کر اور اس کا کمال میرے ہاتھ سے ظاہر کر۔ سو خدا کا شکر ہے کہ اس کا نتیجہ ظہور میں آگیا۔" [۲]

گو کہ روحانی طور پر شاہ صاحب نے خواجہ خورد سے بیعت نہیں کی مگر اپنے تعلق کی بناء پر اکثر ان کے پاس جاتے اور ان سے فیض حاصل کرتے تھے۔ جس زمانہ میں اپنے بھائی ابوالرضاء محمد سے شرح خیالی پڑھتے تھے ایک موقعہ پر سبق میں کسی اختلاف رائے کی بناء پر ان سے پڑھنا چھوڑ دیا جب ایک روز خواجہ خورد کے پاس گئے تو انہوں نے کتاب کے بارے میں سوال کیا اور اصرار کیا۔ جب صورت حال کا ان کو علم ہوا تو یہ کہا کہ شرح خیالی ہم سے پڑھ لیا کرو۔ اگرچہ بظاہر صرف تین دن تک یہ سلسلۂ تعلیم رہا اور چوتھے دن بقول خود شاہ عبدالرحیم:

"جب میں کتاب لیکر خدمت اقدس میں حاضر ہوا تو فرمایا چونکہ تمہارے محترم اور بزرگ نانا شیخ رفیع الدین نے مجھے تین ہی سبق پڑھائے تھے اسلئے میں بھی تمہیں تین روز سے زیادہ درس نہیں دوں گا" [۳]

لیکن اس مشکل کا حل بھی انہوں نے یہ کیا کہ شیخ عبدالرحیم کو مسجد فیروز شاہ لے گئے اور ایک خاص

---

۱ مقالات طریقت، مرتبہ عبدالرحیم ضیاء، صفحہ ۵، حیدر آباد ۱۲۹۲ھ
۲ حیات ولی، صفحہ ۱۲۵
۳ حیات ولی، صفحہ ۱۲۷

مقام پر بٹھا کر مطالعہ کی ہدایت کی۔ شاہ صاحب کا قول ہے کہ جب کبھی کوئی مشکل پیش آتی تو شیخ (خواجہ خورد) کے بتائے ہوئے مقام پر جا کر مطالعہ کرتا اور مشکل مقام خود بخود پانی ہو جاتا۔ یہ تعجب کے ساتھ دیکھا جاتا تھا کہ اگر میں اس معین مقام سے ایک بالشت کے فاصلہ کا بھی تفاوت کرتا تو وہاں یہ بات میسر نہ ہوتی۔"[۱]

حافظ سید عبداللہ کی وفات کے بعد شاہ عبدالرحیم نے سلسلۂ ابوالعلائیہ احراریہ کے ایک بلند مرتبہ خلیفہ شیخ ابوالقاسم اکبر آبادی سے رجوع کیا۔ واضح رہے کہ حضرت امیر ابوالعلیٰ کا طریقہ تصوف شریعت نبویؐ کے اتباع اور طریق محمدیؐ کی پیروی کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔

جادۂ طریقت پر انہوں نے کسی چیز کا بھی اضافہ نہیں کیا اور اس جادۂ نبوی سے وہ سر مو انحراف نہیں فرماتے تھے۔ خلیفہ ابوالقاسم کو شاہ عبدالرحیم کے جد مادری شیخ عبدالعزیز شکر بار سے بھی خصوصی نسبت تھی اسلئے خلیفہ صاحب شاہ عبدالرحیم کی تعظیم اور خصوصی خیال کرتے تھے۔[۲]

صاحب حیات ولی نے اسی سلسلہ میں ایک اور واقعہ تحریر کیا ہے :

> خلیفہ ابوالقاسم نے شاہ عبدالرحیم کو ایک بزرگ سید عظمت اللہ کے پاس بھیجا۔ سید صاحب کے دریافت کرنے پر جب انکا تعلق شیخ عبدالعزیز شکر بار سے ظاہر ہوا تو سید صاحب نے کچھ امتحان لینے کے بعد کچھ تبرکات اور امانت شیخ صاحب کے سپرد کی اور بتایا کہ شیخ عبدالعزیز نے سید صاحب کے جد امجد کو وہ چیزیں سپرد کی تھیں اور وصیت کی تھی کہ اگر ان کی اولاد میں کوئی شخص ملے تو وہ اس کے سپرد کریں۔ چنانچہ سید صاحب نے شیخ عبد الرحیم کے سر پر عمامہ باندھا اور وہ تبرکات سپرد کر کے اجازت عامہ عنایت فرمائی۔[۳]

شاہ عبدالرحیم فقہ حنفی کے جید علماء میں شمار کئے جاتے تھے لیکن بعض مسائل میں اپنے وجدان یا حدیث کے مطابق کسی دوسرے مسلک فقہی کو بھی ترجیح دیتے تھے۔ ان مستثنیات میں قراۃ فاتحہ خلف الامام وفی الجنازہ بھی شامل ہیں۔

تمام اساتذہ ظاہری و باطنی کی زیر تربیت رہنے کی وجہ سے شیخ عبدالرحیم ہر طرح کی خوبیوں سے متصف ہو گئے تھے۔ وہ ایک زبردست عالم دین، بلند پایہ فقیہ اور اعلیٰ درجہ کے صوفی و صافی بزرگ تھے جن کی دوررس عقابی نگاہوں نے امت کے مستقبل کو بھانپ کر محنت کا ایک خاکہ تیار کیا جس کی خانہ پری

---

۱ حیات ولی، صفحہ ۱۲۷
۲ تاریخ دعوت و عزیمت صفحہ ۸۲
۳ حیات ولی، صفحہ ۱۴۳

کرنے سے ان کے خیال میں امت مرحومہ کے مسائل بڑی حد تک حل ہو سکتے تھے۔ اس سلسلہ میں ان کے تین کام جو انہوں نے انجام دیئے قابل ذکر ہیں۔

(۱) تدوین فتاویٰ عالمگیری میں مدد

(۲) مدرسہ رحیمیہ کا قیام

(۳) تربیت خلف الرشید شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

(۱) تدوین فتاویٰ عالمگیری

انفاس العارفین میں شاہ ولی اللہ رقمطراز ہیں کہ "حضرت والد ماجد فرماتے تھے کہ شہنشاہ عالمگیر کے زمانہ میں فتاویٰ عالمگیری حکم شاہی سے جب تدوین و ترتیب و نظر ثانی کے مراحل سے گذر رہا تھا تو کچھ تحریری کام شیخ حامد کے سپرد بھی ہوا جو مرزا محمد زاہد کے مدرسہ میں ہمارے شریک درس تھے۔ یہ علمی خدمت ملنے پر وہ میرے پاس آئے کہ تم بھی میرے ساتھ اس کام میں تعاون کرو تمہارے نام اتنا روزینہ مقرر ہو جائیگا۔ میں نے قبول نہ کیا۔ والدہ ماجدہ نے یہ قصہ سنکر انتہائی ناگواری کا اظہار کیا اور مجھے اس کام پر آمادہ کرنے کے لئے بہت مبالغہ سے کام لیا۔ مجبور ہو کر ایک مقررہ وظیفہ پر میں اس کام میں مشغول ہو گیا۔"[۱]

انفاس العارفین کے اس تذکرہ کے علاوہ بھی اس بات کے ثبوت ملتے ہیں کہ فتاویٰ عالمگیری کو ترتیب دینے والے علماء کی جماعت میں شاہ عبدالرحیم بھی شامل تھے۔

"الثقافة الاسلامية فی الهند" کے مصنف مولانا سید عبدالحی حسنی نے اپنی اس تصنیف میں بڑی تحقیق کے بعد فتاویٰ عالمگیری کے مرتبین کے نام درج کئے ہیں جن کی تعداد بیس ہوتی ہے۔ شاہ عبد الرحیم بھی جو ملک کے ممتاز ترین فقہ حنفی کے عالم و صاحب درس فقیہ تھے اس جماعت کے ایک رکن تھے۔ اس جماعت کے نگراں کار اور صدر شیخ نظام الدین برہان پوری تھے۔ سلطان اورنگزیب عالمگیر نے اس کام پر دو لاکھ روپیہ صرف کئے۔[۲]

اورنگ زیب عالمگیر کو اس کتاب کی ترتیب و تدوین کا بڑا اہتمام تھا اور مدون شدہ اور نظر ثانی کیا ہوا حصہ روزانہ بادشاہ کے سامنے پڑھا جاتا اور وہ خود بغور اس کو سنکر اس کی تصحیح کیا کرتے تھے۔ ملا نظام جو سر رشتۂ تدوین تھے روزانہ بادشاہ کو ایک دو صفحہ سنایا کرتے تھے۔ ایک دن ملا حامد کے ذمہ جو حصہ تھا اسکی نظر

---

۱ انفاس العارفین، صفحہ ۷۴

۲ الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند، مصنفہ سید عبدالحی حسنی، صفحہ ۱۱۱، دمشق ۱۹۵۸ء

ثانی کرتے ہوئے شیخ عبدالرحیم کی نظر ایک ایسی عبارت پر پڑی جس میں کسی مسئلہ میں دو مختلف کتابوں کی عبارتوں کو گڈمڈ کر کے مسئلہ کو بجائے حل کرنے کے گنجلک بنادیا گیا تھا۔ آپ نے فوراً شیخ حامد کو فتاویٰ عالمگیری کے مؤلف کی اس لغزش کی طرف متوجہ کیا اور فرمایا کہ "میرے مطالعہ کے مطابق یہ مسئلہ دو کتابوں میں دو مختلف انداز سے بیان ہوا ہے۔ مؤلف فتاویٰ نے دونوں عبارتوں کو اکٹھا کر دیا ہے جس کی وجہ سے صورت مسئلہ کچھ سے کچھ ہو گئی ہے۔" چنانچہ شیخ عبدالرحیم نے اس مقام پر مسودہ کے حاشیہ پر عربی کی یہ عبارت لکھ دی۔

من لم يتفقه في الدين قد خلط فيه، هذا غلط وصوابه كذا

(دین کی واقفیت نہ ہونیکی بنا پر اس میں گڑبڑ ہو گئی ہے یہ غلط ہے اور صحیح اس طرح ہے)

جب ملا نظام نے بادشاہ کے سامنے یہ حصہ پڑھا تو روانی میں متن کے ساتھ اس حاشیہ کو ملا کر پڑھ گئے لیکن بادشاہ جو پوری توجہ سے سن رہے تھے چونک پڑے اور ٹوک کر فرمایا "ایں عبارت چیست؟" ملا نظام نے کیوں کہ اس پر غور نہیں کیا تھا اسلیئے گھبرا کر انہوں نے عرض کیا کہ "کل اسکو مطالعہ کر کے تفصیل سے عرض کروں گا" دربار سے واپسی پر ملا نظام نے شیخ حامد سے جواب طلب کیا کہ یہ حصہ میں نے تمہارے اعتماد پر چھوڑ دیا تھا۔ تمہاری غفلت کیوجہ سے مجھے خفت اٹھانی پڑی۔ شیخ حامد نے اس وقت تو کچھ نہیں کہا لیکن جب شاہ صاحب سے ملاقات ہوئی تو ان سے اس کی شکایت کی۔ شیخ صاحب نے دونوں کتابیں جو اس مسئلہ کا ماخذ تھیں کھول کر شیخ حامد کے سامنے رکھدیں اور بتایا کہ کس طرح دونوں کی عبارتوں کو خلط ملط کرنے سے خلل پیدا ہو گیا تھا اور اس طرح اس ابہام کو دور کیا جو اس خلط مبحث سے پیدا ہو گیا تھا۔ شاہ ولی اللہ اپنے والد کا قول نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "اس دن کے بعد مفتیان کرام کا یہ گروہ مجھ سے حسد کرنے لگا"۔[1]

دوسری جانب جب خلیفہ ابوالقاسم شیخ کے سرکاری کام سے وابستہ ہونے اور اسکا معاوضہ لینے پر واقف ہوئے تو فرمایا کہ یہ ملازمت ترک کردو شیخ نے عرض کیا کہ والدہ ماجدہ ناراض ہوتی ہیں آپ ایسی دعا کردیں کہ یہ ملازمت خود بخود چھوٹ جائے تاکہ والدہ صاحبہ بھی ناراض نہ ہوں۔ چنانچہ خلیفہ صاحب نے دعا کی۔

ایک دن اچانک بادشاہ نے تدوین فتاویٰ کے تمام ملازموں کی فہرست طلب کی اور بغیر وجہ بتائے شاہ عبدالرحیم کا نام اس فہرست سے قلم زد کردیا۔ اور حکم دیا۔ "اگر خواستہ باشد ایں قدر زمین بدہید" یعنی

---

[1] انفاس العارفین، صفحہ ۷۵، حیات ولی، صفحہ ۱۵۴

اگر چاہیں تو اسی قدر زمین دیدی جائے۔ فرمان شاہی کے بموجب جب آپ سے رائے لی گئی تو باوجود تنگی معاش کے آپنے جو جواب دیا وہ آپ کے توکل کا آئینہ دار ہے۔ فرماتے ہیں "قبول نکردم و شکرانہ بجا آوردم حمد خدائے تعالیٰ گفتم" یعنی میں نے اسے قبول نہ کیا اور اللہ تعالیٰ کا شکر اور حمد بجالایا گویا نوکر چھوڑدی، جاگیر کو نظرانداز کیا اور صبر و شکر کے گوشۂ عافیت کو اختیار فرمایا۔[1]

(۲) مدرسۂ رحیمیہ کا قیام:

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی جس مدرسہ میں درس حدیث دیا کرتے تھے اس کی ابتداء دراصل ان کے والد شاہ عبدالرحیم نے کی تھی۔ حدیث وفقہ میں کمال حاصل کرنے کے بعد شیخ عبدالرحیم نے درس حدیث دینا شروع کردیا تھا۔ صاحب حیات ولی لکھتے ہیں۔

"ہر وقت آپ کی درس گاہ میں طالبان حدیث کا ایک جم غفیر اور مجمع کثیر لگا رہتا تھا۔"

ایک فاضل اجل ہمعصر شیخ عبدالرحیم کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "شاہ عبد الرحیم صاحب جنہوں نے پہلی ضرورت ہندی مسلمانوں میں علم نبویؐ کی اشاعت میں دیکھی، واقعی ایک برتر الہامی خیال تھا جو بجلی کی طرح آپ کے دماغ میں کوندا، شاہ عبدالرحیم صاحب نے مدرسہ رحیمیہ کی بنیاد ڈالی اور اس میں علم حدیث کی تعلیم دینی شروع کی۔ اس تعلیم نے چند سال میں اپنا قیمتی اثر مسلمانوں پر ڈالا اور جوق در جوق طلباء آپ سے حدیث سیکھنے آنے لگے۔"[2]

یہ مدرسہ پرانی دہلی میں اس محلّہ میں جواب مہندیان کہلاتا ہے واقع تھا۔ شاہ ولی اللہ نے حجاز سے واپس آنے کے بعد اسی مدرسہ میں درس دینا شروع کیا تھا بعد میں اس میں اضافہ ہوا جس کا ذکر آئندہ باب میں کیا جائیگا۔

(۳) تربیت خلف الرشید شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ:

شاہ عبدالرحیم جس پائے کے بزرگ تھے اگر اپنی مدت عمر میں اور کچھ نہ بھی کرتے صرف اپنے صاحب زادہ کو اس طرح کی تعلیم و تربیت سے نوازتے جیسا کہ انہوں نے ان کیساتھ کیا تو انکا صرف یہی کارنامہ ان کے لئے کافی تھا۔ کیوں کہ شاہ ولی اللہ جیسی زمانہ ساز شخصیت کی اولیں تعلیم و تربیت اسی شفیق

---

[1] انفاس العارفین، صفحہ ۷۴، تذکرہ شاہ ولی اللہ، مصنفہ منظور نعمانی، صفحہ ۲۰۷، کراچی ۱۹۵۹ء

[2] حیات ولی، صفحہ ۱۴۸

بزرگ کی مرہون منت ہے جس نے ولی اللہ کو سچ مچ ولی اللہ بنادیا۔ عالم اسلام پر اللہ تعالیٰ کا احسان عظیم تھا کہ اس نے حضرت شاہ ولی اللہ جیسا عظیم مصلح اور مجدد پیدا فرمایا اور شیخ عبدالرحیم جیسا شفیع معلم اور مربی ان کی تربیت و تعلیم کے لئے مہیا کر دیا۔

شاہ عبدالرحیم جہاں ایک مہربان باپ اور مشفق استاد تھے وہیں آپ بہترین مربی بھی تھے۔ آپ نے شاہ ولی اللہ کی تعلیم و تربیت میں تدریج کا خاص خیال رکھا۔ چار سال کی عمر ہو جانے پر تعلیم کی ابتداء کلام پاک کی تعلیم سے کی۔ سات سال کی عمر میں مسجد لیجانا شروع کیا۔ اسی سال کے آخر میں آپنے فارسی اور عربی کے ابتدائی رسائل پڑھانا شروع کر دیا۔ صرف و نحو میں جب انکو کمال حاصل ہو گیا تو شاہ عبد الرحیم نے معقولات کی طرف متوجہ کیا۔

زیادہ تر کتابیں آپ کو آپ کے والد شیخ عبدالرحیم نے ہی پڑھائیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی زندگی میں انہیں کی تعلیم و تربیت کا رنگ غالب تھا۔ ان کتابوں میں حدیث، تفسیر، فقہ و اصول فقہ، منطق، علم کلام، طب، فلسفہ، نحو، معانی، ہیئت و حساب، علم حقائق، خواص اسماء و آیات، غرض ہر جہت علم ظاہری و باطنی شامل تھی۔ گویا کہ شیخ عبدالرحیم اس عظیم عمارت کے معمار تھے جس کے سایہ تلے ہزاروں لاکھوں لوگوں نے سکون تلاش کیا اور پایا۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو شاہ عبدالرحیم کا یہ عظیم کارنامہ ہے کہ انہوں نے شاہ ولی اللہ جیسی شخصیت کو اپنی خداداد محنت و کاوش سے تیار کیا جنہیں بجا طور پر ملت کی ڈگمگاتی کشتی کا ناخدا اور بھٹکتی ہوئی امت کا خضر راہ کہا جا سکتا ہے۔

اس حقیقت سے کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شاہ ولی اللہ کی یہ ساری عظمت شاہ عبدالرحیم کی روحانی تربیت اور فیضان نظر کا نتیجہ ہے۔ شاہ عبدالرحیم نہ صرف یہ کہ ایک صاحب دل بلند مرتبہ صوفی تھے بلکہ جید عالم دین اور نامور محدث تھے۔ مصنف "حیات ولی" کا بیان ہے:

> "ہندوستان میں جس معزز اور بزرگوار نے سب سے پیشتر حدیث کے درس و تدریس کی بنیاد ڈالی اور جس مشہور محدث نے اس غریب علم کے شائع کرنے اور پھیلانے میں کوشش بلیغ کی وہ شیخ عبدالرحیم صاحب تھے۔"[1]

صاحب "نزہۃ الخواطر" کا بیان ہے:

"قد وقع الاتفاق علی کمال فضله بین اهل العلم و المعرفة و انتهی الیه

---

[1] حیات ولی، صفحہ ۱۶۱

الورع و التواضع و الاشتغال بخاصة النفس"[1]

مولانا عبید اللہ سندھی کا بیان ہے:

"شاہ ولی اللہ کی فکری تربیت اور ان کی علمی اساس میں ہم ان کے والد شاہ عبدالرحیم صاحب کو اصل مانتے ہیں۔ شاہ عبدالرحیم نے خود اپنے نامور صاحبزادے کو تعلیم دی تھی۔ چنانچہ انہوں نے شاہ ولی اللہ کو قرآن کا ترجمہ تفسیروں سے الگ کر کے پڑھایا اور اسی طرح قرآن کا اصل متن ان کے لئے قابل توجہ بنایا۔ پھر آپ نے وحدۃ الوجود کے مسئلہ کو صحیح طور پر حل کیا اور اسے اپنے صاحبزادے کے ذہن نشین کرایا، نیز شاہ عبدالرحیم ہی نے حکمت عملی کو اسلامی علوم میں ایک باوقار اور اہم مقام دیا اور صاحبزادے شاہ ولی اللہ کو اس کی خاص طور سے تلقین کی۔ الغرض یہ تین چیزیں قرآن کے متن کو اصل جاننا، وحدت الوجود کا صحیح حل اور اسلامی علوم میں حکمت عملی کی غیر معمولی اہمیت شاہ ولی اللہ کے علوم میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں اور یہ تینوں کی تینوں شاہ عبدالرحیم کی تربیت کا نتیجہ ہیں۔"[2]

شیخ عبدالرحیم کے عام اخلاق و معمولات:

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی انفاس العارفین میں لکھتے ہیں کہ والد ماجد خصائل حمیدہ اور اخلاق ستودہ کے جامع تھے۔ آپ کے مزاج میں استغناء بہت تھا یہی وجہ ہے کہ امراء و وزراء سے ملنا پسند نہ کرتے اور ان کی محفلوں میں جانا معیوب سمجھتے لیکن اگر اس کے باوجود کوئی امیر ان کی مجلس میں آجاتا تو اس سے خوش اخلاقی سے پیش آتے اگرچہ ایسا رویہ نہ ہوتا کہ خوش آمد معلوم ہو۔ آپ کے اخلاق وسیع اور فیاضانہ تھے۔ نخوت و غرور نام کو نہ تھا۔ علم اور علماء کی انتہائی تعظیم کرتے ان کے مکان پر جا کر ملاقاتیں کرتے اگر کسی کی بیماری کا حال سنتے تو فوراً عیادت کو جاتے۔ آپ کا طرز معاشرت انتہائی سادہ تھا۔ جو سامنے آیا کھالیا جو میسر ہوا پہن لیا۔ اپنے ہمعصروں سے دوستانہ ملتے۔ بزرگان دین اور صوفیائے کرام سے دلی عقیدت مندی کا اظہار کرتے۔ خویش و اقرباء سے حسن سلوک، غرباء کی امداد اور مہمانوں کا اکرام و تواضع خاص و عام میں مشہور تھی۔ ہر حال میں آثار نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا تتبع کرتے۔ استقامت کی بات یہ ہے کہ ساری زندگی بلا عذر شرعی جماعت فوت نہیں ہوئی۔ بچپن و جوانی تک میں کبھی منہیات کی طرف میلان نہیں ہوا۔ اوقات نماز کے علاوہ بکثرت نوافل پڑھا کرتے اور تہجد کے پابند تھے۔ باوجود پابندی شریعت زاہد خشک

---

[1] نزہۃ الخواطر، مصنفہ حکیم محمد عبدالحئی حسنی، صفحہ ۴۵، جلد ۶۔ حیدر آباد ۱۹۷۸ء

[2] شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ مصنفہ مولانا عبید اللہ سندھی صفحہ ۱۹۲-۱۹۳، ۱۹۴۴ء

بھی نہ تھے۔ بلکہ ہر بات میں متوسط اور میانہ رو تھے۔ نہ راہبوں کی طرح ترک دنیا اور ترک لذات نہ مطلق العنانوں کی طرح ایسا تساہل کہ ترک اعمال کا باعث ہو۔ ہمیشہ شریفانہ لباس پہنتے جس میں کسی قسم کا تکلف نہ پایا جائے نرم و سخت کا اعتبار نہ تھا۔

شیخ خود فرمایا کرتے کہ جب سے میں نے دنیا کو ترک کیا ہے اس وقت تک اپنے لئے بازار سے نہ تو کسی قسم کا لباس ہی خریدا ہے نہ عمامہ نہ جوتا بلکہ جس چیز کی ضرورت پڑی خدا تعالیٰ نے اپنی قدرت سے فوراً مہیا کر دی۔

آپ میں وہ تمام خصلتیں مجتمع تھیں جو ایک پاکباز دیندار ولی کامل میں ہونی چاہیں روزانہ معمولات میں درود شریف، نفی واثبات جہری و مخفی، اسم ذات کا ذکر شامل تھا۔ مشکوٰۃ شریف، تنبیہ الغافلین اور غنیۃ الطالبین سامنے رکھ کر وعظ فرماتے آخر میں تفسیر کا سلسلہ بھی شروع کیا تھا۔

ازواج اور اولاد:

شیخ عبدالرحیم کے دو نکاح ہوئے پہلا نکاح والد صاحب شیخ وجیہ الدین کی زندگی میں ہوا جس سے ایک صاحبزادہ صلاح الدین پیدا ہوئے۔ دوسرا نکاح کبر سنی میں بعض بشارات غیبی کی بناء پر شیخ محمد پھلتی کی صاحبزادی سے ہوا جن سے دو صاحبزادہ پیدا ہوئے۔ شاہ ولی اللہ اور شاہ اہل اللہ۔

وفات:

۷۷ر سال کی عمر میں رمضان میں آخری بار روزے رکھے۔ اسی دوران ہلکی تبخیر ہو گئی مگر روزے قضاء نہیں کئے، نہ ہی شب بیداری یا کسی دوسرے معمول میں فرق آیا۔ جب شوال کا مہینہ آیا تو بیماری میں اضافہ ہو گیا اشتہا ختم ہو گئی اور امید زیست منقطع ہو گئی۔ مگر اس کے بعد طبیعت نے سنبھالا لے لیا۔ اوائل صفر میں مرض پھر عود کر آیا۔ حتیٰ کہ ۱۲ر صفر المظفر ۱۱۳۱ھ بروز چہار شنبہ اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔ یہ فرخ سیر کی حکومت کا آخری دور تھا۔ آپ کے انتقال کے بعد فرخ سیر پچاس دن قید رہا اور شہر میں بڑا اضطراب رہا۔

شاہ عبدالرحیم کی سن ولایت کا صراحتاً کہیں ذکر نہیں ملتا لیکن چونکہ انہوں نے ۱۱۳۱ھ میں وفات پائی اور ۷۷ر برس کی عمر ہوئی اسی لئے سن ولادت ۱۰۵۴ھ ہونا چاہئے۔

تذکرہ اجداد کا مقصد

شاہ ولی اللہ نے اپنے اجداد خصوصاً والد محترم شاہ عبدالرحیم اور عم محترم شیخ ابوالرضاء محمد کے بارے میں تین رسالہ جات تصنیف کئے۔ جو بوارق الولایہ، شوارق المعرفہ اور الامداد فی مآثر الاجداد کے نام سے ان کی تصنیف انفاس العارفین میں شامل ہیں۔ ان تصنیفات سے انکا کیا مقصد تھا اور کس طرح وہ مقصد حاصل ہوا جب تک اس سوال کا جواب مہیا نہ ہو ان تصانیف کا جواز مہیا نہیں ہو سکتا۔

بوارق الولایہ کے آخر میں شاہ صاحب کی ایک تحریر موجود ہے جس سے ان تصنیفات کا ایک مقصد خود انہیں کی زبانی سامنے آتا ہے۔ شاہ صاحب تحریر کرتے ہیں۔

"حضرت والا جب صاحب فراش ہوئے تو اس فقیر کو فرمایا قلم دوات لاؤ میں چاہتا ہوں کہ اپنے خاص نکات معرفت تحریر کردوں۔ میں نے دو چار مرتبہ قلم دوات پیش کی مگر آپ میں لکھنے اور املا کرانے کی طاقت نہ رہی تھی آپ کی وفات کے بعد میرے دل میں حضرت والا کے حالات لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ تحریر کے دوران اکثر حالات میرے دل میں ایسے پختہ ہو جاتے گویا یہ تمام واقعات میرے سامنے ہوئے ہیں اور انہیں دنوں چند مرتبہ خواب میں دیکھا گویا میں اپنی تحریریں حضرت والا کو سنا رہا ہوں اور وہ پورے ذوق کیساتھ سن رہے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ سارے مسودات مکمل طور پر محفوظ ہو گئے۔ میرا غالب گمان ہے کہ آپ جو کچھ لکھوانا چاہتے تھے اس میں سے کوئی چیز باقی نہیں رہی جو حیطۂ تحریر میں نہ آگئی ہو۔"[1]

اس تحریر کے پڑھنے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ گویا یہ بھی شاہ عبدالرحیم کی تربیت اولاد کا ہی حصہ تھا جس کو وہ آخری پند و نصیحت کے طور پر اپنے لائق فرزند کے حوالے کرنا چاہتے تھے مگر عمر نے وفا نہ کی۔ لیکن اس لائق فرزند نے ان کی یہ حسرت اپنی تحریروں کے ذریعہ پوری کردی۔

تذکرۂ اجداد سے شاہ صاحب کے خاندان کی تین خصوصیات نمایاں ہوتی ہیں :

(۱) علم دین، ورع تقویٰ، قضاء و افتاء کیساتھ ساتھ باطنی اور روحانی سلسلوں سے اس خاندان کا عمومی واسطہ و تعلق:

اسلاف کے کارناموں اور خصوصیات کا لازمی اثر ان کے اخلاف پر پڑتا ہے۔ ان خصوصیات اور

---

[1] انفاس العارفین، صفحہ ۱۴۷

شخصیات سے نسلی تعلق اور نسبت سے جو اثرات مرتب ہوئے ان کا حاصل شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کے بیٹوں اور پوتوں کے کارہائے نمایاں کی شکل میں ظاہر ہوا۔

(۲) انساب کی حفاظت:

خاندانی شجروں کی نگہداشت اور اسلاف کے حالات وواقعات کو ضبط تحریر میں لانے کا معیار واہتمام جو بلاد عربیہ اور دیگر قدیم تہذیبوں کی خصوصیت رہی ہے اور جس کا رواج دیار عجم کی طرف ہجرت کر کے آئی ہوئی اقوام میں نہ صرف باقی رہا بلکہ نسب کی حفاظت کے اس جذبہ میں مزید شدت وغلو پیدا ہو گیا۔ اس کی وجہ دیار غیر میں اپنی انفرادیت اور خصوصیات نسلی، تہذیبی اور اخلاقی کو باقی رکھنے کا جذبہ تھا۔ اس جذبہ کا اظہار خود حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اپنی تصنیف "المقالۃ الوضیۃ فی النصیحۃ والوصیۃ" میں اس طرح کیا ہے:

"وصیت ہفتم: ما مردم غریبیم کہ در دیار ہندوستان آبائے ما بغربت افتادہ اند۔ و عربیت نسب و عربیت لسان ہر دو فخر ما است کہ ما را بسید اولین و آخرین و افضل انبیاء والمرسلین و فخر موجودات علیہ و علی آلہ الصلوات والتسلیمات نزدیک می گرداند۔ شکر ایں نعمت عظمیٰ آں است کہ بقدر امکان عادات و رسوم عرب اول کہ منشاء آں حضرت است صلی اللہ علیہ وسلم از دست ندہیم و رسوم عجم و عادت ہنود را در میان خود نگزاریم"[1]

[ہم پردیسی لوگ ہیں جو ہمارے آباء واجداد دیار ہندوستان میں غربت کی حالت میں آئے (یعنی ہجرت کی) اور نسب اور زبان کی عربیت دونوں ہمارے لئے باعث فخر باتیں ہیں جو ہم کو سید الاولین والآخرین، افضل الانبیاء فخر موجودات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک کرتی ہیں۔ اس نعمت عظمیٰ کے شکر کا تقاضہ ہے کہ ہم بقدر امکاں ان عادات اور عربی رسوم و روایات کو جو کہ منشائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اپنے ہاتھ سے نہ جانے دیں اور ہنود (اہل ہند) اور عجمیوں کی عادتوں اور طور طریق (رسومات) کو اپنے اندر نہ پھیلنے دیں۔]

اسی وصیت کے آخر میں شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ:

"سعید از ما کسے است کہ بلسان عرب و صرف و نحو و کتب ادب مناسبت پیدا کند و حدیث و قرآن را ادراک نماید..... و ما را لا بد است کہ بحرمین محترمین رویم و روئے خود را بر آن آستانہائے مالیم سعادت ما ایں است و شقاوت ما در اعراض ازیں"[2]

---

[1] مجموعہ وصایا اربعہ، صفحہ ۵۱۔
[2] مجموعہ وصایا اربعہ، صفحہ ۵۳

["ہم میں وہ خوش نصیب ہے کہ جس کو عربی زبان وادب اور صرف ونحو وکتب عربی سے مناسبت پیدا ہو جائے اور قرآن وحدیث سے واقفیت حاصل ہو.....
اور ہمارے لئے لازمی بات ہے کہ ہم حرمین شریفین کا رخ کریں اور اپنا چہرہ ان مبارک آستانوں پر ملیں (یعنی وہاں حاضری دیں اور قلبی وابستگی رکھیں) ہماری نیک بختی (سعادت) اس میں ہے اور ہماری بد بختی (شقاوت) اس سے روگردانی اور انحراف میں ہے"]

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان خاندانوں میں نسلی خصوصیات صدیوں تک قائم رہیں اور عجمی اور غیر اسلامی معاشرہ اور تہذیب میں مدغم ہو کر فنا نہ ہوئیں۔

(۳) شجاعت اور تہوّر:

شاہ صاحبؒ کے خاندان میں اس نسلی خصوصیت کا اظہار نسلاً بعد نسلٍ نہایت شدت اور وضاحت سے ہوتا ہے۔ شجاعت و بہادری کی یہ خصوصیات جن کو عربی میں "فروسیہ" (شہ سواری) اور "فتوہ" (مردانگی) کے الفاظ سے ادا کیا جاتا ہے نسل عرب اور قبیلہ قریش کی مخصوص نسلی روایات میں سے ہیں۔ ان کا تذکرہ ان خصوصیات کو زندہ اور باقی رکھنے میں زبردست مددگار ہوتا ہے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ کے اسلاف اور اخلاف دونوں میں ان خصوصیات کا تذکرہ اور اثر واضح طور پر ملتا ہے۔ جس کے نمونے شاہ معظم اور شیخ وجیہ الدین کے حالات میں مل چکے ہیں اور آئندہ ان کا ظہور شاہ صاحبؒ کے پوتے مولانا شاہ محمد اسمٰعیل شہید کی زندگی میں دیکھنے میں آئے گا۔

اس کے علاوہ خود شاہ صاحبؒ نے اپنی تصنیف میں لکھا ہے:

ان اوراق کی علت غائیہ یہ ہے کہ اس سے واقف ہونے والا ضروری نسب پر مطلع رہے جس کا صلہ رحمی سے تعلق ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔[1]

"و قد قال النبی صلی الله علیه وسلم تعلموا من انسابکم ما تصلون به ارحامکم فان صلة الرحم محبة فی الاهل مثراة فی المال منشاة فی الاثر".

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نسب کا وہ حصہ معلوم رکھو جس سے صلہ رحمی کر سکو کیوں کہ صلہ رحمی سے رشتہ داروں میں محبت مال میں برکت اور اثرات میں مضبوطی آتی ہے۔

---

[1] انفاس العارفین۔ صفحہ ۳۳۳

باب سوم

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ :

حالات زندگی، نسب، پیدائش، عادات واطوار، تعلیم وتربیت، اخلاف، اساتذہ وتلامذہ

سوانحی مآخذ

شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی سوانح کے اولین ماخذ خود انکی تحریریں ہیں انفاس العارفین، فیوض الحرمین، الدر الثمین، انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ میں اس بارے میں کافی مواد مل جاتا ہے بلکہ انفاس العارفین میں ایک رسالہ "الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف" کے نام سے انہوں نے اپنے احوال وسوانح کے طور پر تحریر کیا۔ اسکے علاوہ اپنے اساتذہ، سفر حجاز اور تعلیم کے بارے میں ایک رسالہ "انسان العین فی مشائخ الحرمین" کے نام سے تحریر کیا۔ دیگر ماخذ میں سب سے مستند اور قدیم ماخذ شاہ صاحب کے ماموں زاد بھائی اور برادر نسبتی، ہم عمر وہم سبق اور بعد میں شاگرد اور خلیفہ شاہ محمد عاشق پھلتی کی تصنیف "القول الجلی فی ذکر آثار الولی" ہے۔ یہ رسالہ شاہ محمد عاشق نے حضرت شاہ ولی اللہؒ کی زندگی میں انکے اشارہ اور ایماء پر تحریر کیا اور جسکی اصلاح شاہ صاحبؒ نے اپنے قلم سے کی۔ القول الجلی کے مقدمہ میں شاہ محمد عاشق نے لکھا ہے: "گیارہ شعبان ۱۱۴۴ھ کی رات کو منزل رابغ میں (یہ مقام مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ کے درمیان واقع ہے) حضرت (یعنی شاہ ولی اللہؒ) نے فرمایا 'اگر کوئی میرے بیان کیے ہوئے معارف اور حقائق کو اسطرح لکھ لے کہ لوگ سمجھ سکیں تو وہ فوائد واسرار کا مشاہدہ کریگا'۔ یہ سن کر میں نے اسی وقت سے کچھ لکھا اور پھر باقاعدہ ۱۵ شعبان کو مکہ مکرمہ میں اس کام کو شروع کیا اور اسکا نام 'القول الجلی فی ذکر آثار الولی' رکھا"[۱]

حکیم محمود برکاتی کے مطابق:

"یہ رسالہ ۱۹ویں صدی کے اواخر تک تو دستیاب تھا۔ مولوی رحمان علی اور نواب صدیق حسن خان نے اپنی کتابوں میں اسکے اقتباس دیے اور اس سے استفادہ کیا مگر اب عرصہ سے نایاب ہے"[۲]

بقول حافظ تقی انور علی کاکوری:

"اب اس کتاب کا کامل نسخہ تکیہ کاظمیہ قلندریہ کاکوری کے علاوہ غالباً دوسری جگہ نہیں ہے۔ خدا بخش لائبریری میں ناقص نسخہ ہے"[۳]

خود شاہ صاحب نے الجزء اللطیف میں اس کتاب کے حوالہ سے یہ الفاظ تحریر کیے ہیں:

والدین وجماعت از صلحاء مبشرات بسیار در — والدین اور کئی صلحاء نے اس فقیر کے حق میں

---

۱ اردو ترجمہ وشرح مترجمہ مولوی حافظ تقی انور علوی کاکوروی صفحہ ۱۶-۱۷۔
۲ شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان مصنفہ حکیم محمود احمد برکاتی صفحہ ۷، دہلی ۱۹۹۲ء
۳ القول الجلی صفحہ ۱۷۔

حق ایں فقیر قبل ولادت و بعد ازاں دیدند۔ چنانچہ بعض اعزاخوان واجلہ خلاں تفصیل آں واقعات باو قائع دیگر در سالہ مضبوط نمودہ اندو آں رابہ "قول جلی" مسمی کردہ اند۔ جـــزاہ اللہ خیر الجزاء واحسن الیہ والٰی اســـلافہ واعقابہ وادخلـــہ الٰی ما یتمناہ من دینہ ودنیاہ"

میری ولادت سے قبل وبعد بہت سی بشارتیں پائی تھیں چنانچہ ایک عزیز ترین بھائی اور محترم دوست نے ان بشارتوں اور دوسرے حالات زندگی کو ایک رسالہ میں قلمبند کردیا ہے اور اسکا نام "قول جلی" رکھا ہے۔ [۱]

اس بات کو مولوی رحیم بخش دہلوی نے اپنی تصنیف "حیات ولی" میں بھی شاہ صاحب کی اسی تحریر کے حوالے سے مختلف الفاظ میں تحریر کیا ہے لیکن خود رحیم بخش صاحب کو اپنی کتاب کی تصنیف کے زمانہ میں قول جلی کا نسخہ دستیاب نہیں ہوسکا جس کا تذکرہ انھوں نے اپنی کتاب میں بھی کیا ہے۔ [۲]

قول جلی کا طرز تحریر معارف اور حقائق کے بیان پر مبنی ہے اور واقعات کے بیان کے ساتھ ساتھ شاہ صاحبؒ کے مکاشفات، روحانی احوال اور فلسفیانہ اور عارفانہ خیالات کی ترجمانی کرتا ہے جو دراصل اس کتاب کی تصنیف کا اصل مقصد تھا۔ لیکن جو شخص اس کوچہ کا سالک نہ ہو اور ان معارف سے نابلد ہو اسکے لیے یہ تحریر ناقابل فہم حد تک مشکل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ مختلف مصنفین نے اگرچہ اس کتاب سے استفادہ ضرور کیا ہے مگر اس طرز کو نہیں اپنایا۔

مولانا حکیم محمود احمد برکاتی نے اپنی تالیف "شاہ ولی اللہ اور انکا خاندان" میں حیات شاہ ولی اللہ کے مآخذ کی ایک فہرست مرتب کی ہے جسمیں ۳۵ مختلف معاصر مصنفین اور انکی کتابوں کی تفصیل بیان کی ہے۔ ان کتابوں میں رحیم بخش دہلوی کی "حیات ولی" نواب صدیق حسن خان کی "اتحاف النبلاء" و "ابجد العلوم" اور مولانا محمد محسن ترہتی کی "الیانع الجنی" شامل ہیں جو شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر نہایت نفیس پیرائے میں تفصیلی روشنی ڈالتی ہیں۔

اسکے علاوہ شاہ صاحبؒ کے احوال وسوانح کے سلسلے میں انکے صاحبزادہ شاہ عبدالعزیز کے ملفوظات بھی قابل لحاظ اور اہم مآخذ کے طور پر استعمال کئے جاتے ہیں۔ حکیم برکاتی نے ملفوظات شاہ عبدالعزیز میں جہاں جہاں شاہ ولی اللہ کا ذکر آیا ہے اس کو ترتیب سے جمع کردیا ہے۔

---

[۱] انفاس العارفین صفحہ ۱۹۴

[۲] حیات ولی صفحہ ۲۱۷

شاہ عبدالعزیز دہلوی کے تذکرہ نگاروں نے بھی شاہ ولی اللہ دہلوی کا ذکر اپنی تصنیفات میں کیا ہے۔

شیخ عبدالرحیم ضیاء نے اپنی کتاب "مقالات طریقت" میں نہ صرف شاہ ولی اللہ دہلویؒ بلکہ ان کے اجداد کا بھی ذکر کیا ہے، یہ کتاب بھی ایک مستند ماخذ ہے۔[۱]

حالات زندگی

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے حالات زندگی میں جو موضوعات زیر بحث مقالہ کیلئے ضروری ہیں انمیں آپکا نسب، پیدائش، عادات واطوار، تعلیم وتربیت، سفر حرمین اور اخلاف کے علاوہ آپ کے اساتذہ اور تلامذہ کا تذکرہ بھی ضروری ہے جیسا کہ ابتدا میں تحریر کیا جاچکا ہے یہ تمام عناصر آپکی علمی وادبی زندگی پر اثرانداز ہوئے اور انکی بدولت آپکے قلم سے وہ جواہر پارے وجود میں آئے جو آج تک مرجع خاص وعام ہیں۔

نسب:

شاہ صاحبؒ سلسلہ پدری کے اعتبار سے فاروقی اور سلسلہ مادری کے اعتبار سے صدیقی ہیں، آپکے والد شاہ عبدالرحیم کا سلسلہ نسب بتیسویں پشت میں حضرت عمر فاروقؓ سے ملتا ہے اور آپکے نانا شیخ محمد پہلتی کا سلسلہ حضرت ابو بکر صدیقؓ سے ملتا ہے۔ اس طرح شاہ صاحبؒ نجیب الطرفین، عربی النسل اور صحیح النسب تھے۔ ان کے وسیع اور متنوع کاموں میں یہ نسبتیں اور ان کے شرف کا احساس یقیناً داخل ہوگا، نفسیات (Psychology) علم الحیاۃ (Biology) اور نسلی اصول وتجربات (Genetics) کے لحاظ سے اور جدید سائنسی تجربات کی روشنی میں یہ احساس ہر طرح قرین قیاس ہے۔

صحیح بخاری شریف کی روایت ہے:

"الناس معادن کمعادن الذهب والفضة خیارهم فی الجاهلیة خیارهم فی الاسلام اذا فقهوا" الحدیث[۲]

لوگ ایسے ہی کانیں ہیں جیسے سونے چاندی کی کانیں ہوتی ہیں ان میں جو جاہلیت کے دور میں بہتر تھے وہ اسلام میں بہتر ہیں بشرطیکہ دین کی سمجھ حاصل کریں)

---

۱ مقالات طریقت مصنفہ عبدالرحیم ضیاء صفحہ ۴-۷، حیدر آباد ۱۲۹۳ھ

۲ الصحیح البخاری للامام بخاری، باب المناقب، کتاب الانبیاء، صفحہ ۳۲۵، جلد ۲، دہلی ۱۹۸۳ء

پیدائش :

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ۴ شوال ۱۱۱۴ھ مطابق ۲۱ فروری ۱۷۰۳ء بروز بدھ اپنے نانیہال قصبہ پہلت ضلع مظفر نگر میں پیدا ہوئے اپنی تصنیف الجزء اللطیف میں رقمطراز ہیں :

"میری ولادت بروز بدھ ۴ شوال ۱۱۱۴ھ بوقت طلوع شمس ہوئی" [۱]

القول الجلی اور حیات ولی جو شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے تذکرہ کے لئے الجزء اللطیف کے بعد اولین ماخذ شمار کئے جاتے ہیں اس کی تصدیق کرتے ہیں [۲]

مگر خود الجزء اللطیف میں شاہ صاحب نے تحریر کیا ہے:

"بعض احباب نے میری تاریخ پیدائش "عظیم الدین" سے نکالی ہے [۳]

صاحب مقالات طریقت نے آپ کی ولادت کا سن ۱۱۱۵ھ اور تاریخی نام "عظیم الدین" تحریر کیا ہے۔ [۴]

سن پیدائش میں اس فرق کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ابجد کے حساب سے "عظیم الدین" سے سن پیدائش ۱۱۱۵ھ نکلتا ہے مگر کیونکہ شوال کے بعد ۱۱۱۴ھ میں صرف ۲ ماہ کا عرصہ رہ گیا تھا لہذا تاریخی نام نکالنے میں اس کا خیال نہ کرتے ہوئے "عظیم الدین" سے سن پیدائش ۱۱۱۵ھ کا تعین کر دیا۔

ان کی ولادت سے قبل انکے والد نے خواب میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کو دیکھا جنہوں نے انکو فرزند کی بشارت دی اور فرمایا اسکا نام میرے نام پر قطب الدین احمد رکھنا۔ اسوقت شیخ عبدالرحیم کی عمر ساٹھ سال تھی اور بسبب کبر سنی آپ اور آپ کی اہلیہ اول متجرد زندگی گزار رہے تھے۔ اسلئے انکا گمان ہوا کہ یہ بشارت انکے بڑے لڑکے صلاح الدین کے واسطے سے ہے کہ انکے لڑکا ہوگا۔ لیکن حضرت خواجہ نے اسکی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ لڑکا تمہارے ہی صلب سے پیدا ہوگا۔ اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد ہی شیخ عبدالرحیم کو نکاح ثانی کی خواہش ہوئی اور میاں شیخ محمد قدس سرہ (جو آپکے خلیفہ بزرگ تھے) کی بڑی صاحبزادی فخر النساء سے آپنے نکاح ثانی فرمایا۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی والدہ نہایت نیک، پاکباز، علوم شرعیہ کی عالمہ باعمل خاتون تھیں۔ شیخ محمد عاشق پھلتی جو انکے سگے بھانجے تھے اپنی تصنیف میں لکھتے ہیں :

---

۱ انفاس العارفین، صفحہ ۴۰۳

۲ القول الجلی، صفحہ ۱۱، حیات ولی صفحہ ۴۱۹

۳ انفاس العارفین صفحہ ۴۰۳

۴ مقالات طریقت صفحہ ۸

والدہ شریفہ شاں کہ بعلم شریعت از تفسیر وحدیث عالمہ وبآداب طریقت متادّبہ وباسرار حقیقت عارفہ و بمصداق اسم خود فخر النساء بودند[۱]

آپ کی والدہ ماجدہ علوم شریعت تفسیر وحدیث کی عالمہ، آداب طریقت سے آراستہ اور اسرار حقیقت کی معرفت رکھنے والی اور اپنے نام کے مثل فخر النساء یعنی اسم بامسمیٰ تھیں۔

جس وقت شاہ ولی اللہؒ کی ولادت ہوئی وہ واقعہ انکے والد کو یاد نہ رہا اور آپکا نام ولی اللہ رکھ دیا بعد ازاں جب بشارت مذکورہ انکو یاد آئی تو قطب الدین احمد بھی نام رکھا گیا۔

شاہ ولی اللہؒ کی پیدائش سے قبل اور بعد میں چند ایسے مبشرات اور واقعات رونماء ہوئے جنکی بناء پر نو مولود کی آئندہ جلیل القدر زندگی اور کارہائے نمایاں کیطرف اشارے ملتے ہیں۔ خود شاہ صاحب نے اپنے والد ماجد شیخ عبدالرحیم کی سوانح بوارق العولائیہ میں انکا تذکرہ کیا ہے۔ نیز قول جلی کے مصنف نے بھی ان واقعات کو بیان کیا ہے۔

ایک واقعہ یہ بھی ہوا کہ ایک رات شیخ عبدالرحیم تہجد کی نماز ادا کر رہے تھے اور انکی پابند شرع اور متقی بیوی بھی انکے قریب ہی نماز میں مصروف تھیں بعد نماز جب دونوں نے آسمان کی جانب دعا کیلئے ہاتھ بلند کئے ناگاہ دونوں ہاتھوں کے درمیان غیب سے دو اور ہاتھ ظاہر ہوئے جو دعا کیلئے اٹھے ہوئے تھے۔ والدہ ماجدہ یہ دیکھ کر متعجب ہوئیں تو والد صاحب نے فرمایا کہ یہ دونوں ہاتھ ہمارے اس فرزند کے ہیں جو عنقریب عرصہ وجود میں قدم رکھے گا۔ وہ بھی ہمارے ساتھ اس نماز نیز ہماری دعا میں شریک ہے اور بعجز وانکسار آمین کہ رہا ہے۔ خود شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد فقیر پیدا ہوا اور جب ساتویں سال میں قدم رکھا والدین کے ساتھ نماز تہجد شریک ہوا اور اسی وضع سے دونوں ہاتھ حضرات والدین کے ہاتھوں کے درمیان دعا کے واسطے اٹھائے۔ اسپر جناب شیخ عبدالرحیم صاحب نے فرمایا:

هـذا تاويل رؤياى من قبل. قد جعلها ربى حقا[۲]

آپ کے والدین یہ دیکھ کر وہ واقعہ یاد کرتے اور اللہ کا شکر ادا کرتے۔[۳]

اسی طرح جبکہ ابھی شاہ صاحب رحم مادر میں تھے آپکے والد قریب ہی کہیں کھانا کھا رہے تھے ایک سائلہ نے اللہ کے نام پر روٹی کا ٹکڑا مانگا حضرت کے والد ماجد نے پہلے خادم کے ہاتھ نصف روٹی بھیجی مگر پھر راستہ ہی سے خادم کو لوٹا کر بقیہ روٹی بھی حوالہ کی اور فرمایا کہ میرا یہ لڑکا جو شکم مادر میں ہے کہ رہا ہے

---

۱ القول الجلی، صفحہ ۱۰

۲ القرآن، سورہ یوسف الآیۃ ۱۰۰

۳ القول الجلی، صفحہ ۱۰، حیات ولی صفحہ ۲۱۹

کہ راہ خدا میں پوری روٹی دینا چاہئے نصف پر اکتفانہ کرنا چاہئے۔[۱]

حیات ولی میں بوارق الولایہ کے حوالہ سے اس روایت میں اتنا اور اضافہ ہے کہ والد صاحب نے گھر میں جتنی روٹی تھیں سب اس محتاج کو راہ خدا میں دیدیں۔

ان دو واقعات سے نہ صرف یہ کہ نو مولود کے عظیم مستقبل کی نشان دہی ہوتی ہے بلکہ آنجناب کے والدین کی روحانی قوت اور ان کے گھرانہ کے پاکیزہ اور مذہبی ماحول کا بھی بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

اس کے علاوہ شاہ صاحب کے بچپن کے متعدد ایسے واقعات ہیں جن سے اس ننھے بچے کو موھوبہ من اللہ و ودیعت کردہ علوم اور طبیعت کی فطری نظافت اور عقل سلیم کی جانب اشارے ملتے ہیں۔

زمانہ طفولیت سے ہی آپ نہایت نفاست پسند تھے اور جبکہ ابھی گود میں ہی تھے کپڑوں کے میل کچیل، ناپاکی اور بدبو سے پریشان ہو جایا کرتے یہاں تک کہ اگر گود میں لینے والے کے کپڑے بھی میلے ہوتے تو اظہار ناگواری میں رونے لگتے اور بہلانے پر بھی نہ بہلتے۔ ایک بار شیخ عبدالرحیم (والد بزرگوار) کے کپڑے میلے تھے جب انہوں نے آپکو گود میں لیا تو دامن پکڑ کر بدلنے کا اشارہ کیا اور جبتک کپڑے بدل نہ لئے گئے آپنے رونا اور بلکنا بند نہ کیا۔ جب والد صاحب نے صاف کپڑے زیب تن کئے ان پر نظر پڑتے ہی آپ کھل کھلا اٹھے۔[۲]

آپکو ودیعت کردہ علم لدنی کا ایک واقعہ سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے

اخوند محمد دلیل جو ایک عارف و فاضل آدمی تھے آپکے والد کے مخصوص احباب میں تھے وہ آپکے جد سے روایت کرتے ہیں کہ آپ چار سال کے تھے جمعہ کا دن تھا سب لوگ وضو کرنے لگے آپ سب سے پہلے وضو کر کے اس پالکی میں آبیٹھے جو آپکے جد کیلئے آئی تھی مگر کچھ دیر بعد اتر کر چلدئے۔ پوچھنے پر کہا وضو ساقط ہو گیا دوبارہ کرنے جاتا ہوں جب پوچھا گیا کہ معلوم بھی ہے وضو کن کن وجوہات سے ساقط ہوتا ہے تو آپنے وہ تمام نواقض وضو جو احادیث میں وارد ہوئے ہیں اور امام شافعی نے اپنے مذہب میں انکو اختیار کیا ہے شرح وبسط سے بیان کردئے جبکہ ابھی حدیث شریف پڑھنے یا سننے کا کوئی سوال ہی نہ تھا گویا کی ماں کے پیٹ سے اس کا علم لیکر آئے ہوں۔[۳]

آپکی صغر سنی میں اپنے زمانہ کے مشہور نقشبندی صوفی شیخ فیروز شاہ آپکے والد ماجد سے ملاقات کو آئے اور دونوں بزرگوں میں حق تعالی کی دنیا میں رویت بصری پر بحث چھڑ گئی اپنی کمسنی کے باوجود آپنے

---

۱ القول الجلی، صفحہ ۱۱
۲ القول الجلی، صفحہ ۱۲-۱۳
۳ القول الجلی، صفحہ ۱۶-۱۷

شیخ فیروز شاہ کو مخاطب کر کے ایسی بات فرمائی کہ یک بیک شیخ خاموش ہو گئے اور بحث ختم ہو گئی۔ آپ نے کہا کہ "ہماری نگاہ انتہائی کمزور و ضعیف ہے اپنے پیچھے کی کوئی چیز نہیں دیکھ سکتی اور دور والی اگرچہ وہ سامنے ہو لیکن بُعد مسافت کیوجہ سے نہیں دکھائی دے سکتی بلکہ جو سر پر ہو اس کو بھی نہیں دیکھ سکے گی اور اپنے نفس سے زائد آنکھ کے قریب کوئی چیز نہیں ہے جب اس کو ہی نہیں دیکھ سکتے تو ان کمزوریوں کے باوجود کیا امکان ہو سکتا ہے کہ لطیف والطف کا معائنہ کیا جائے" پھر آپ نے ترقیات (روحانی) کے بارہ میں جو ادنیٰ سے اعلیٰ کیطرف تھیں اسطرح بیان فرمایا کہ شیخ مطمئن ہو گئے وہ اکثر فرماتے تھے کہ میں نے مادر زاد ولی اگر کسی کو دیکھا تو اس بچہ کو دیکھا۔ [۱]

اسکے علاوہ طالبعلمی کے زمانہ میں بھی متعدد مرتبہ آپکی زبان سے ایسے دقیق و عمیق مسائل کے جوابات شافی و کافی نکلے جو اس عمر کے طالبعلم کیلئے ناممکنات میں سے تھے جسکی تعلیم بھی ابھی ابتدائی مرحلہ میں ہو۔ مصنف قول جلی نے ایسے کئی واقعات کا ذکر کیا ہے۔ ہمارے موضوع کے لئے اتنا بیان کافی ہے۔ جس سے بخوبی اسبات کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ آپکے قلم سے جو ادبی و علمی شاہپارے نکلے وہ آپکی کاوش کے ساتھ ساتھ تائید خداوندی اور فطری لیاقت اور خداداد ذہانت کا بھی نتیجہ تھے۔

عادات واطوار:

شاہ صاحبؒ کا بچپن دراصل آپکی آئندہ زندگی اور اسکے کارناموں کا ایک آئینہ ہے جس میں انکے تابناک مستقبل کی جھلک صاف طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ آپکی فطری اور طبعی خصوصیات' آپکا عالمانہ اور عاملانہ ماحول اور آپکی تربیت ان تینوں چیزوں نے مل کر ایسی فضا قائم کر دی جس میں رہ کر آپکا بچپن' لڑکپن اور پھر جوانی ایک خاص سانچہ میں ڈھل گئے تھے۔

بچپن سے ہی آپ نہایت متین' سنجیدہ اور متفکر مزاج لیکر پیدا ہوئے تھے۔ رحیم بخش دہلوی نے اس سلسلہ میں اپنی کتب میں لکھا ہے:

> "شاہ صاحبؒ کا زمانہ طفولیت اور بچپن کی سکوت خیز صورت ایک قیافہ شناس اور تجربہ کار نظر کیلئے ایک عظیم الشان واقعہ کی پیشنگوئی کرتی تھی۔۔۔۔۔اسی کمسنی اور نو عمری کے زمانہ میں آپکو ایک ایسا وحشت آمیز تفکر لاحق رہتا تھا کہ دیکھنے والے حیرت زدہ ہو جاتے تھے۔ مسکینی غریبی' کم گوئی' آہستگی سے بات کرنا' گردن جھکا کر جواب دینا اور ہر بات پر بجا درست

---

[۱] القول الجلی صفحہ ۱۶-۱۷، رود کوثر مصنفہ شیخ محمد اکرام صفحہ ۵۴۲، دہلی، ۱۹۸۷ء

کہنا یہ تمام خاصیتیں جو عموماً بچوں میں بہت کم دیکھی جاتی ہیں محترم و بزرگ شاہ صاحبؒ میں موجود تھیں۔"[۱]

آگے لکھتے ہیں:

چونکہ شاہ صاحبؒ میں تہذیب اور اخلاق کا مادہ نیچرل (Natural) تھا اسلئے نشست و برخاست کے آداب اور گفتگو کرنے کے طریقے خود بخود اسی کمسنی میں حاصل ہو گئے تھے۔ آپکا عام قاعدہ تھا کہ جب بڑی عمر والے سے گفتگو کرتے خواہ وہ کسی رتبہ اور درجہ کا آدمی ہو تا ہمیشہ گردن جھکا کے آنکھیں نیچی کر کے کرتے اور جب کوئی بات دریافت کی جاتی تو نہایت متانت اور سنجیدگی سے جواب دیتے البتہ ہمعصروں سے دل کھول کر باتیں کرتے لیکن انکے ساتھ بھی تہذیب و شائستگی کے درجہ سے تجاوز نہ کرتے اور خلاف ادب کبھی کوئی بات نہ کرتے"۔[۲]

مقالات طریقت میں عبدالرحیم ضیاء نے شاہ صاحبؒ کے بچپن میں تعلیم حاصل کرنیکی کیفیت اسطرح بیان کی ہے:

"آپ سبق پڑھتے وقت روبقبلہ دوزانو مؤدب بیٹھتے تھے اور ہر روز عادت تھی کہ صبح کو غسل کر کے نیا یا دھویا ہوا لباس پہنتے تھے نظافت کو بہت دوست رکھتے تھے۔ مزاج میں ضبط اس طور تھا کہ آپکو مدت تک خارش کی شکایت تھی تو شب کو سونے کے وقت جسم کھجلاتے تھے اور کوئی وقت کسی نے آپکو کھجلاتے نہ دیکھا"۔[۳]

یہ ضبط نفس اور پابندی اوقات تمام عمر آپکی عادت ثانیہ رہیں۔ آپکے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز اپنے ملفوظات میں لکھتے ہیں:

"مثل والد ماجد شخصے کم بنظر آمد۔ سوائے علوم و کمالات دیگر در ضبط اوقات۔ چنانچہ بعد اشراق کہ می نشست تا دوپہر زانو بدل نمی کرد و خارش نمی نمود و آب دہن نمی انداخت"[۴]

(والد ماجد جیسا کوئی شخص کم ہی نظر آتا ہے علوم و کمال میں بھی اور ضبط اوقات میں بھی۔ چنانچہ اشراق کے بعد جو بیٹھتے تو دوپہر تک نہ پہلو بدلتے، نہ کھجلاتے اور نہ تھوکتے۔)

---

۱ حیات ولی، صفحہ ۲۲۱
۲ ایضا، صفحہ ۲۲۲
۳ مقالات طریقت، صفحہ ۸
۴ ملفوظات عزیزی صفحہ ۵۳

فطرتاً شاہ صاحبؒ نہایت حلیم الطبع اور سادہ مزاج تھے۔ عام طور پر بچوں کی طرح کبھی ضد نہ کرتے جو مل گیا کھالیا جو میسر ہوا پہن لیا۔ لڑائی جھگڑوں سے کلیتہً پرہیز کرتے اور کبھی کسی سے سخت کلامی سے پیش نہ آتے۔

اپنی فطری متانت کی بناء پر بچپن میں بچوں کے کھیل کود سے دور ہی رہتے اور بیکار کاموں سے بچتے تھے۔ لیکن بہر حال بچہ ہی تھے کبھی بچوں کے ہمراہ سیر و تفریح کیلئے بھی چلے جاتے۔ آپکے والد شیخ عبدالرحیم کی نظر ہمیشہ اس ہونہار بچہ پر رہتی اور وقتاً فوقتاً نصیحتوں سے نوازتے رہتے۔ اسی سلسلہ میں ایک مشہور واقعہ قابل غور ہے جو آپکی نیک سیرت اور فطری سعادت کیطرف اشارہ کرتا ہے۔

ایک بار چند برابر کے بچوں کے ہمراہ کسی باغ میں کھیلنے کودنے چلے گئے۔ جب وہاں سے لوٹے تو والد محترم نے شفقت کے ساتھ سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر سوال کیا کہ "آج اتنی دیر میں تم نے کیا حاصل کیا" اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ ہم نے تو اتنی دیر میں اتنا ذکر کیا۔ اتنی بار درود شریف پڑھا اور اتنی عبادت کی جو آخرت تک باقی رہنے والی چیزیں ہیں"۔ یہ الفاظ اگرچہ ایک چھوٹے بچہ کے لیے اسکے فہم و فراست اور عقل و علم سے بلند تھے مگر شاہ صاحب معمولی بچہ نہ تھے۔ والد بزرگوار سے یہ الفاظ سننے پر آپ فرط ندامت سے پسینہ پسینہ ہوگئے اور اسکے بعد اس نصیحت کو گانٹھ میں باندھ لیا اور پھر کبھی اسطرح غفلت کا اظہار آپ سے نہ ہوا اور آپ کبھی ایسے سیر سپاٹے کیطرف راغب نہیں ہوئے۔[۱]

تعلیم و تربیت:

شاہ ولی اللہ دہلویؒ بچپن سے ہی سلیم الطبع، ذہین اور سنجیدہ مزاج تھے۔ ابتدا ہی سے آپکا حافظہ اس بلا کا تھا فوراً پیش شدہ مسئلہ کو جانچ لیتے اور یاداشت کی بناء پر تمام پہلوؤں کا ذہنی جائزہ لیکر مسئلہ کا شافی حل بیان کردیتے تھے۔ ایسی فطرت کیساتھ شیخ عبدالرحیم جیسے شفیق اور نادر روزگار والد کی تربیت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ جنہوں نے اپنی صحبت اور تربیت سے ان خصوصیات کو ایسی جلا بخشی کہ شاہ ولی اللہ کا نام چار دانگ عالم میں روشن ہو گیا بچپن سے ہی آپ نے نہ صرف علوم شرعیہ، علوم مجلسی اور علوم ظاہری کی تعلیم حاصل کی بلکہ مراقبہ و مکاشفہ اور احکام طریقت اور علم سلوک کے باریک مسائل پر غور و فکر اور ان علوم میں کمال حاصل کرنے میں بھی پوری توجہ صرف کی۔ چنانچہ جہاں آپ ایک عالم، ماہر علوم دینیہ و شرعیہ اور علوم ظاہری ہوئے وہیں علم طریقت کا تاج بھی آپ کے سر پر رکھا گیا۔ جہاں علم حدیث و تفسیر آپکے سامنے پانی تھا وہیں آپکی روشن ضمیری اور روحانی جوہر بھی تربیت یافتہ ہوکر انتہائی ترقی کی منزلوں کو پار کر گئے۔

[۱] انفاس العارفین، صفحہ ۱۳، تاریخ دعوت و عزیمت، صفحہ ۱۰۳

جب آپکی عمر پانچ سال کی ہوئی آپکے والد محترم نے آپکو قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے مکتب میں بٹھادیا۔ آپکی قوت حفظ اور ذوق و شوق کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ دو سال میں آپ نے قرآن مجید ختم کرلیا۔ اسکے ساتھ ہی اس چھوٹی عمر میں جو بچوں کی کھیل کود کی عمر ہوتی ہے آپنے بقدر ضرورت ارکان و فرائض کا علم بھی حاصل کرلیا۔ [۱]

شاہ عبدالرحیم کو اپنے ہونہار خلف کی صلاحیتوں کا بخوبی احساس تھا اور انہوں نے اسی انداز سے انکی تربیت کی۔ کمسنی کی عمر میں ذہنی صلاحیتیں بھی بہت نرم اور Receptive ہوتی ہیں اور ان پر جو نقوش ثبت کردیئے جائیں وہ گویا نقش کالحجر ہو جاتے ہیں۔ یہ عمر بچے کے مستقبل کیلئے بنیاد کا درجہ رکھتی ہے اور ظاہر ہے کہ بنیاد مضبوط ہو تو عمارت یقیناً مضبوط ترین ثابت ہوتی ہے۔ بڑی عمر کی تعلیم و تربیت اگرچہ پوری طرح غیر مفید نہیں کہی جاسکتی مگر کردار اور زندگی پر اسکے اثرات کے اعتبار سے بچپن کی تربیت سے کہیں کمتر ہوتی ہے۔ یہی فلسفہ ہے جو فطری اعتبار سے دین اسلام کا پہلا پتھر (cornerstone) ہے اور کمسنی میں بچوں کی نگہداشت اور انکے دینی شعور کو بیدار اور پختہ کرنے کے لئے ضروری سمجھا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث پاک میں اسی امر کے طرف اشارہ فرمایا ہے:

"عن عمر و بن شعیب عن ابیه عن جده قال " قال رسول الله صلی الله علیه وسلم مروا اولادکم بالصلوٰة وهم ابناء سبع سنین واضربو هم علیها وهم ابناء عشر سنین وفرّقو ا بینهم فی المضاجع" [۲]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنی اولاد کو سات سال کی عمر میں نماز کا حکم دو اور اس (کے ترک) پر انکو مارو جب وہ دس سال کے ہو جائیں اور جدا کرو انکو بیچ خواب گاہوں کے۔

ظاہر ہے کہ نہ سات سال کی عمر میں اور نہ ہی دس سال کی عمر میں نماز فرض ہوتی مگر یہ حکم محض تربیت اولاد اور انکو دینی فرائض واحکام کی پابندی پر کاربند کرنے کے واسطے ہے اور یہ اسی لئے ہے کہ اس عمر کی عادات پختہ عمری میں اور زیادہ راسخ ہو کر زندگی کا ایک حصہ بن جاتی ہیں۔

شاہ عبدالرحیم اس فلسفہ سے پوری طرح واقف تھے چنانچہ انہوں نے ان ہی خطوط پر شاہ ولی اللہ کی تربیت کی چنانچہ سات سال کی عمر میں آپنے انہیں اپنے ساتھ مسجد میں لیجانا شروع کردیا۔ الجزء اللطیف میں

---

[۱] حدائق الحنفیہ مصنفہ مولوی فقیر محمد جلیمی ثم لاہوری، صفحہ ۴۴۷، لکھنؤ ۱۹۰۶ء

[۲] المشکوٰۃ المصابیح مرتبہ ولی الدین محمد بن عبداللہ، کتاب الصلوٰۃ، صفحہ ۱۷۴، امرتسر ۱۳۵۰ھ

شاہ صاحب خود تحریر فرماتے ہیں

"پانچ سال کی عمر میں مکتب میں بیٹھا اور سات سال کا تھا کہ والد بزرگوار نے مجھے نماز کیلئے کھڑا کر دیا اور روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ رسم سنت (ختنہ ابراہیمی) کی ادائیگی بھی اسی ساتویں سال ہوئی۔[۱]

قرآن مجید کی تعلیم مکمل ہونے کے فوراً بعد یعنی سات سال کی عمر میں والد بزرگوار نے شاہ صاحب کو مروجہ عربی و فارسی کی تعلیم دینی شروع کر دی۔ چنانچہ دس سال کی عمر تک آپ نے ابتدائی عربی فارسی رسالے پڑھ لیئے اور کافیہ ختم کی۔ آپ فرماتے ہیں:

"دس برس کا تھا تو شرح ملا جامی پڑھتا تھا۔ اسی دوران مجھ پر مطالعہ کی راہ کھلی"[۲]

صاحب حیات ولی نے آپکے بارے میں لکھا ہے:

"دس سال کی عمر میں صرف و نحو پر آپکو اس درجہ اقتدار ہو گیا تھا کہ بڑے بڑے صرفی و نحوی جو کتاب کے کیڑے کہلائے جاتے تھے اور جنہوں نے ان علوم میں نہایت عزت و وقعت کے ساتھ شہرت و ناموری کے تمغہ حاصل کیے تھے آپ سے مسائل صرفیہ و نحویہ میں گفتگو کرتے جھجکتے تھے اور جسوقت آپ انکی باریکیاں بیان کرتے اور مطالب حل کرنے کی طرف متوجہ ہوتے تو وہ آپ کی حذاقت و ذہانت پر عش عش کرنے لگتے اور آپکے زور سمند کی باگیں ہزاروں کوششوں کے بعد بھی نہ روک سکتے"[۳]

قول جلی میں شاہ محمد عاشق پھلتی انھیں دنوں کا ایک واقعہ نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں

چھ سات سال کی عمر میں آپ صرف میں کتاب زنجانی پڑھتے تھے اثنائے درس حضرت بزرگ قدس سرہ یعنی والد بزرگوار شیخ عبدالرحیم نے آپ کو کچھ مشکل چیزیں بتائیں اور فرمایا کہ ملا سعد الدین تفتازانی نے ان چیزوں کے جوابات دیے ہیں اور بالکل جدید معنی بیان کیے ہیں جو دوسروں نے بیان نہیں کیے۔ آپ نے فرمایا کہ ان کے جوابات تو بہت آسان ہیں اور بہت واضح طور پر سب بیان کر دیے۔ جب حلقہ درس میں شریک لوگوں نے ملا سعد الدین تفتازانی کے جوابات تلاش کر کے نکالے تو وہ بجنسہ وہی تھے جو آپ بلا تامل بیان کر چکے تھے۔ تمام حاضرین آپکی استعداد علمی اور فہم و لیاقت نیز وسیع النظری اور حدید الذہنی پر متعجب ہوئے۔[۴]

---

۱ انفاس العارفین، صفحہ ۴۰۴
۲ ایضاً، صفحہ ۲
۳ حیات ولی، صفحہ ۲۲۲
۴ القول الجلی صفحہ ۱۹-۲۰

مروجہ تعلیم کے علاوہ شاہ صاحب نے اپنے والد سے دینی تعلیم بھی حاصل کی۔ چنانچہ "الجزء اللطیف" میں ذکر کرتے ہیں کہ:

"علم حدیث میں کتاب البیع سے کتاب الآداب تک کا حصہ چھوڑ کر باقی مکمل مشکوٰۃ، صحیح بخاری کتاب الطہارۃ تک، شمائل ترمزی مکمل، تفسیر مدارک وبیضاوی کے کچھ حصے اسی پندرہ سال کی عمر میں والد صاحب سے پڑھے۔ اللہ تبارک تعالیٰ کے عظیم احسانات میں سے مجھ پر ایک یہ احسان ہے کہ چند مرتبہ والد بزرگوار سے مدرسہ میں قرآن عظیم کے معنی، شان نزول اور کتب تفاسیر کیطرف رجوع کرتے ہوئے کلام قدسی میں تدبر حاصل کرنیکا موقعہ ملا جس سے معانی قرآن کا ایک دروازہ کھل گیا جو میرے لیے ایک عظیم فتح تھی اور اس پر خدائے قدوس کا لاکھ لاکھ شکر ہے" [۱]

علوم دینی (قرآن وحدیث) کی تکمیل کے ساتھ ہی شاہ صاحب نے علوم عقلیہ اور علوم شرعیہ مثلاً فلسفہ، فقہ، اصول فقہ، منطق، علم کلام، طب، ہیئت، وحساب وغیرہ کی تعلیم بھی حاصل کی۔ شاہ صاحبؒ نے الجزء اللطیف میں اپنے پڑھے ہوئے نصاب کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

" فقہ میں شرح وقایہ اور ہدایہ کا اکثر حصہ، اصول فقہ میں حسامی اور توضیح وتلویح کا کچھ حصہ، منطق میں شرح شمسیہ مکمل اور شرح مطالع کا ایک حصہ، کلام میں شرح عقائد مکمل اور خیالی کے حاشیہ کے ایک حصہ کے ساتھ شرح کا کچھ حصہ، سلوک میں رسائل نقشبندیہ اور ایک حصہ عوارف کا، حقائق میں شرح رباعیات مولانا جامی، لوائح، مقدمہ شرح لمعات اور نقد النصوص خواص اسماء وآیات میں والد بزرگوار کا خاص مجموعہ جسکی انہوں نے چند بار اجازت دی، طب میں موجز القانون، حکمت وفلسفہ میں شرح ہدایہ الحکمت وغیرہ، نحو میں کافیہ اور اس پر شرح ملا جامی، معانی میں مطول کا بڑا حصہ اور مختصر المعانی میں اتنا حصہ جس پر ملازادہ کا حاشیہ ہے اور ہندسہ وحساب میں بعض مختصر رسائل" [۲]

اس تفصیل کو بیان کرنے کے بعد شاہ صاحبؒ نے آگے تحریر کیا ہے:

"اس حصول علم کے دوران ہر فن کے کئی قیمتی نکات میرے ذہن میں پیدا ہوتے تھے جو مزید غور وفکر سے کئی اور راہیں سمجھاتے تھے"

---

[۱] انفاس العارفین صفحہ ۳، تاریخ دعوت وعزیمت صفحہ ۹۹

[۲] ایضاً، صفحہ ۴۰۵

مولوی رحیم بخش رقم طراز ہیں:

"شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ جب میں یہ کتابیں پڑھ چکا تو اب میرا ذہن اس درجہ فراخ ہو گیا اور نظر ایسی وسیع ہو گئی کہ ہر فن کے دقیق و غامض مسئلے ادنیٰ توجہ کیساتھ حل ہونے لگے اور علوم کے مقامات مشکلہ بالکل پانی ہو گئے۔ اسی اثناء میں چند مرتبہ مدرسہ قرآن میں گیا جو خاص والد بزرگوار کی درسگاہ تھی۔ اور جسکی بنیادیں آپ نے اپنے ہاتھوں سے ڈالی تھیں۔ چونکہ آپ کو مجھ سے انتہا درجہ کی محبت تھی اسلئے چند دنوں آپ نے قرآن مجید کا ترجمہ مجھے پڑھایا اور وہ ربانی اسرار اور الہامی نکات جو قرآن کے لفظ لفظ میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں ان پر تنبیہ کی۔ حقیقت میں اسی فیض کا کرشمہ تھا جو تمام علوم میں مجھے دفعتہً کمال حاصل ہو گیا"۔ [۱]

شاہ عبدالرحیم جو آپکے شفیق باپ کے علاوہ حقیقی استاد بھی تھے اپنے ہونہار اور ذکی فرزند کی صلاحیتوں کا پورا خیال رکھتے تھے۔ انکی تعلیم کے سلسلہ میں انہوں نے جس نصاب کا انتخاب کیا تھا وہ رائج الوقت تو تھا ہی اسمیں شاہ صاحبؒ کے اپنے اجتہاد کا بھی بہت بڑا دخل تھا۔ آپ خوب سمجھتے تھے کہ کونسی کتاب اور کونسا علم اس قابل فخر طالبعلم کیلئے بہتر ہو گا اور کس طور پر اسکی تعلیم اسکے لیے نافع ثابت ہو گی۔

ساتویں صدی ہجری سے جو نصاب درس ہندوستان کے مدرسوں میں رائج تھا اور جسمیں پہلے نویں اور پھر دسویں ہجری میں ایران کے علماء متاخرین مثلاً جلال الدین محقق دوانی، میر صدرالدین شیرازی اور میر غیاث الدین منصور اور مرزاجان کی تصنیفات کا اضافہ ہوا شاہ عبدالرحیم نے اپنی حقیقت پسند طبیعت کے اعتبار سے اور شاہ ولی اللہ کی صلاحیتوں کے اعتبار سے ان میں سے کئی کتابوں کو (جن میں اکثر مضامین مکرر تھے یا غیر ضروری لمبی تصریحات شامل تھیں) حذف کر دیا۔ مثلاً نحو میں لب اللباب (مصنفہ قاضی ناصرالدین) ارشاد (مصنفہ قاضی شہاب الدین دولت آبادی) کے بجائے صرف کافیہ اور شرح جامی پڑھائی گئی۔ جو اس موضوع پر بنیادی کتب تھیں اور بقیہ شاگرد کی اپنی قابلیت اور استعداد پر چھوڑ دیا گیا کہ وقت بھی برباد نہ ہو اور اصل علم بھی حاصل ہو جائے۔ اسی طرح اصول فقہ میں منار اور اسکے شروح اور اصول بزدوی کے بجائے حسامی اور توضیح و تلویح کے کچھ حصہ کی تعلیم دی گئی اور تفسیر کشاف ترک کر دی گئی۔ حدیث میں "مشارق الانوار" شامل نہیں۔ ادب میں مقامات حریری جیسی مشہور عام کتاب شاہ صاحب کے نصاب درس میں نظر نہیں آتی۔

---

[۱] حیات ولی صفحہ ۲۲۷

لیکن اسکا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ شاہ صاحبؒ نے عربی ادب وزبان کا مطالعہ نہیں کیا یا قدیم کلاسیکی عربی ادب یا معاصر ادب پر انکی نگاہ نہیں تھی۔ شاہ صاحب کی عربی تصنیفات خصوصاً "حجۃ اللہ البالغہ" اس بات کی گواہ ہیں کہ انکو عربی زبان وادب اور اسکی تحریر وانشاء پر نہ صرف قدرت تھی بلکہ وہ ایک ایسے طرز واسلوب کے بانی ہیں جو انکے علمی مضامین اور مقاصد کی شرح اور اسے بیان کرنے کیلئے موزوں ترین اور بہترین اسلوب ہے۔ دراصل شاہ صاحبؒ نے جو علمی تربیت اور تعلیم بچپن اور نو عمری میں اپنے والد سے حاصل کی اس نے انکو آئندہ کیلئے اس طور پر تیار کر دیا کہ بعد کی زندگی میں انہوں نے جو بھی کمال حاصل کیا وہ گویا اسی تربیت اور تعلیم کا نتیجہ تھا۔ شاہ صاحب کی تعلیم کا عمل ایک مسلسل عمل تھا جو انکی تمام عمر جاری رہا اور جیسا کہ آگے بیان کیا جائے گا انہوں نے بطور خود عربی ادب اور نثر و نظم کی ان قدیم معیاری کتابوں اور ان کے علاوہ ان دوسری اصناف ادب کا مطالعہ کیا جو عجمی عربی کے اثرات سے محفوظ اور کلاسیکی طرز سلاست وحلاوت کا نمونہ تھیں۔ شاہ صاحبؒ کو اپنے آئندہ قیام حجاز میں اسکے کافی مواقع میسر آئے جسکا انہوں نے بھرپور فائدہ اٹھا کر وہ ادب تخلیق کیا جسکی دھوم آجتک علمی وادبی حلقوں میں ہے۔

اسی قیام وسماعت کا نتیجہ تھا کہ وہ عربی زبان کو عربی انداز میں لکھنے پڑھنے اور بولنے لگے اور عربی ادب میں صاحب طرز ہو گئے۔

روحانی تربیت:

چودہ سال کی عمر میں جب شیخ عبدالرحیم نے شاہ ولی اللہؒ کی مروجہ تعلیم مکمل کرادی تو انکی روحانی تربیت اور ترقی کی طرف توجہ کی۔ اس تربیت کا پہلا مرحلہ ذہنی سکون اور یکسوئی قلب ونگاہ ہے اسکا بہترین نسخہ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تجویز کیا ہے وہ نکاح ہے جسکو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سنت فرمایا ہے۔ حدیث میں ہے۔

النکاح من سنتی فمن رغب عن سنتی فلیس منی. (الحدیث)[1]

یہ عمل انسان کے اطمینان قلب یکسوئی اور کردار اور اخلاق کی مضبوطی کے لئے کتنا ضروری ہے اسکا اندازہ مندرجہ ذیل احادیث سے ہوتا ہے:

" حدثنا ابو بکر بن ابی شیبه و ابو کریب قالاحدثنا ابو معاویه عن الاعمش عن عمارة بن عمیر عن عبدالرحمان بن یزید عن عبدالله قال قال لنا رسول الله صلی الله علیه وسلم یا معشر الشباب من استطاع منکم الباءة فلیتزوّج فانه اغض

[1] الصحیح البخاری للامام ابی عبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری، باب النکاح، صفحہ ۱۱۶، جلد ۶، استنبول

للبصر واحصن للفرج ومن لم يستطع فعليه بالصوم فانه و جاء،، [۱]

"حدثنا سفيان بن وكيع نا حفص بن غياث عن الحجاج عن مكحول عن ابى الشمال عن ابى ايوب قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اربع من سنن المرسلين الحيآء والتعطر والسواك والنكاح،، [۲]

ازدواج:

چنانچہ ۱۱۲۸ھ میں ۱۴ سال کی عمر میں شیخ عبدالرحیم نے شاہ ولی اللہ کی شادی آپکے ماموں شیخ عبیداللہ صدیقی پھلتی کی صاحبزادی سے طے کردی۔ شاہ صاحب کی پہلی اہلیہ کانام فاطمہ تھا۔ [۳]

شاہ صاحب اپنی سوانح میں لکھتے ہیں:

"والد بزرگوار کو میری شادی کے بارے میں بڑی جلدی تھی جب میرے سسرال والوں نے سامان شادی وغیرہ کے مہیانہ ہونے کا عذر کیا تو والد بزرگوار نے انھیں لکھ بھیجا کہ اس عجلت میں بھی ایک راز ہے،، [۴]

شاہ صاحب نے خود اور انکے سوانح نگاروں نے انکی تقلید میں عام طور پر اس راز کو اس طرح فاش کیا ہے کہ اگلے دو سالوں میں شاہ صاحب کی سسرال اور خود انکے خاندان میں یکے بعد دیگرے مختلف بزرگوں کا انتقال ہو گیا تھا۔

پہلے ۱۱۲۸ھ میں ہی شاہ صاحب کی خوش دامن یعنی عبیداللہ پھلتی کی زوجہ محترمہ، پھر چند دنوں بعد شاہ صاحب کی زوجہ کے نانا/نانی رحلت کر گئے۔ انکے کچھ ہی دنوں بعد ۱۱۲۹ھ میں شاہ صاحب کی سوتیلی والدہ یعنی آپکے والد کی پہلی بیوی اور آپکے علاتی برادر کلاں شیخ صلاح الدین کی حقیقی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ بلکہ دو سال کے اندر اندر اوائل ۱۱۳۱ھ میں خود شیخ عبدالرحیم صاحب نے بھی اس دنیا سے کوچ کیا۔ اسلئے یہ خیال پیدا ہوا کہ شادی میں جلدی کا راز یہی تھا کہ اگر شادی جلدی نہ ہو جاتی تو اسکو بہت دنوں کیلئے ملتوی کرنا پڑتا۔

رحیم بخش دہلوی نے اس بارے تحریر کیا ہے:

"دو ڈھائی سال کے اندر جناب شاہ ولی اللہ صاحب کو ایسے جان فرسا حوادث پیش آئے جنسے

---

۱ الصحیح المسلم للامام مسلم بن حجاج بن مسلم القشیری، باب النکاح، صفحہ ۵۴۸، جلد ۳، قاہرہ

۲ جامع الترمذی، باب النکاح، صفحہ ۱۲۸، جلد ۱، دہلی

۳ حیات ولی، صفحہ ۲۲۳، شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان، صفحہ ۹۷۔

۴ انفاس العارفین، صفحہ ۴۰۴

آپ بہت ہی مضمحل ہو گئے اور آپکا تمام اطمینان وجمیعت پریشانی وبے اطمینانی سے بدل گیا ۔۔۔۔۔سچ پوچھئے تو شاہ صاحب نے بڑے ہی استقلال اور جوانمردی سے کام لیا۔ آپ نے کسی بات کا کچھ بھی خیال نہیں کیا اور تمام تعلقات سے منھ موڑ کر اپنی اسی ہی دھن (علمی ذوق) میں محو رہے" [1]

لیکن کسی سوانح نگار نے ایک دوسرے اور بہت اہم نکتہ کیطرف اشارہ نہیں کیا۔ یہ صحیح ہے کہ ان خاندانوں کے ان چند بزرگوں اور قریبی عزیزوں کے انتقال سے شادی میں تھوڑا التوا ہو سکتا تھا لیکن صرف ایک یہی وجہ نہیں ہو سکتی جسکو شیخ عبدالرحیم جیسے متقی اور صاحب نسبت بزرگ نے اپنے ۱۴ سالہ بیٹے کی شادی میں عجلت اور وہ بھی غیر معمولی عجلت کیلئے مصلحت اور راز سے تعبیر کیا ہو۔ یہ تو کچھ اور ہی گہری بات ہو سکتی تھی جسکو شیخ صاحب نے ظاہر کرنا مناسب نہ سمجھا مگر اسکی وجہ سے عجلت کی۔

دراصل کتابی تعلیم مکمل ہونے کے بعد شیخ عبدالرحیم چاہتے تھے کہ اپنے انتقال سے پہلے اپنے عزیز بیٹے اور ہونہار شاگرد کو وہ روحانی ورثہ بھی سپرد کر دیں جو انھوں نے اپنے اجداد سے حاصل کیا تھا۔ اس روحانی تعلیم وتربیت کے لئے جس سکون اور یکسوئیِ قلب ونظر کی ضرورت تھی وہ ایک مطمئن ازدواجی زندگی سے ہی حاصل ہو سکتا تھا۔ آنحضرتؐ کی حدیث بھی یقیناً ان کے پیش نظر ہو گی جس میں غض بصر کے لئے نکاح کرنے کی ترغیب دی گئی ہے اسی لئے آپ نے مناسب سمجھا کہ روحانی تربیت کے حصہ کے طور پر اس فرض سے بھی فارغ ہو جائیں تاکہ حکم اور سنت نبوی کی پیروی بھی ہو جائے لیکن چونکہ انکو اپنی روحانی قوت سے الہامی طور پر ان پے در پے حادثات وواقعات کا پیشتر اندازہ ہو گیا تھا اسلئے انھوں نے اس فرض کی ادائیگی میں اتنی جلدی کی۔

ہمارے اس نظریہ کی توثیق خود شاہ ولی اللہ کے خیالات سے ہوتی ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ کی جلد دوم میں نکاح کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے آپ نے پہلے تو مسلم شریف کی اس حدیث کو نقل کیا جو نکاح کے مصلحت کے بارے میں ہے یعنی یا معشر الشباب الخ (اے نوجوان لوگو تم میں سے جو نکاح کی استطاعت رکھتا ہو اس کو چاہئے کہ وہ شادی کر لے کیونکہ یہ نگاہ کو پست کرتی ہے اور شرمگاہ کو محفوظ کرتی ہے۔ اور جس کو استطاعت نہ ہو وہ روزہ رکھے کیونکہ وہ اس کے لئے خصیؔ کرنا ہے)

پھر فرماتے ہیں :

"اعلم ان المنی اذ اکثر تولده فی البدن صعد بخاره الیٰ الدماغ فحبب الیه

---

[1] حیات ولی، صفحہ ۲۲۴

النظر الیٰ المرأة الجمیلة وشغف قلبه حباً.....واکثر مایکون ذٰلك فی الشباب وهذا حجابٌ عظیم من حجب الطبیعة یمنعه من الامعان فی الاحسان ویهیجه الیٰ الزنا ویفسدعلیه الاخلاق ویوقعه فی مهالك عظیمة من فساد ذات البین فوجب اماطة هذا الحجاب فلااحسن له من ان یتزوج "[1]

"جان لو کہ مادۂ منویہ جب بدن میں اس کی تولید بڑھ جاتی ہے تو اس کے بخارات دماغ کو چڑھ جاتے ہیں تو اس کو خوبصورت عورت کی طرف دیکھنا اچھا لگتا ہے اور وہ اس کی محبت میں مبتلا ہو جاتا ہے..... اور ایسا اکثر جوانی میں ہوتا ہے اور یہ طبیعت کی رکاوٹوں (حجابوں) میں ایک بہت بڑا حجاب (رکاوٹ) ہے جو اس کو بھلائی اور احسان کی صفات پر غور کرنے سے روکتا ہے اور زنا کی طرف اس کو راغب کرتا ہے اور اس کے اخلاق کو بگاڑتا ہے اور باہمی جھگڑے اور فساد سے اس کو بڑی بڑی ہلاکتوں میں پھنسا دیتا ہے۔ اس لئے اس رکاوٹ کو دور کرنا ضروری ہے..... تو اس کے لئے نکاح سے بہتر کوئی شکل نہیں"۔

اس نظریہ کے مطابق نظر اور اخلاق کو سدھارنے اور تربیت دینے کے لئے نکاح بہترین علاج اور تدبیر ہے کیونکہ یہ انسان کو اخلاق کی گراوٹ اور دوسری مہلکات سے محفوظ رکھتا ہے اور اس کو دین اور احسان (جو سلوک اور روحانی ترقی کے لئے ضروری ہے) کی جانب متوجہ کرتا ہے۔ یقیناً یہ مصلحت بھی شاہ عبدالرحیم کے پیش نظر ہوگی جس کی بنا پر آپ نے شاہ صاحب کی شادی میں جلدی کی اور یہ راز تھا جس کو انہوں نے ظاہر نہیں کیا۔

اس نظریہ کے مطابق شاہ صاحب کی شادی کو بھی انکی تربیت کا ایک حصہ کہا جاسکتا ہے۔ یقینی طور پر انکی اہلیہ کی عمر اسوقت اس سے بھی کم رہی ہوگی۔ ظاہر ہے اتنی چھوٹی عمر میں شادی کی کوئی اور دوسری مصلحت سمجھ میں نہیں آتی۔

چودہ سال کی ہی عمر میں شاہ صاحب نے والد صاحب سے بیعت کرلی اور انہوں نے شاہ صاحب کو اشغال صوفیہ خاص طور پر مشائخ نقشبندیہ کے اشغال کی تعلیم دینا شروع کردی۔ والد صاحب کی توجہ اور تلقین سے ایک سال کے اندر یعنی ۱۵ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے شاہ صاحب نے آداب طریقت کا وافر حصہ حاصل کرلیا اور اسطرح وہ علوم ظاہری کے ساتھ علوم باطنی سے بھی آراستہ ہوگئے۔

اپنی خودنوشت میں تحریر فرماتے ہیں:

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۲۹۲-۲۹۳

"پندرہ برس کی عمر میں والد بزرگوار سے بیعت کر کے اشغال صوفیہ خصوصاً مشائخ نقشبندیہ کے اشغال میں مصروف ہو گیا اور انکی توجہ و تلقین سے بہرہ ور ہوتے ہوئے ان سے آداب طریقت کی تعلیم اور فرقہ صوفیا حاصل کر کے اپنے روحانی سلسلہ کو درست کر لیا۔ اسی سال بیضاوی شریف کا کچھ حصہ پڑھا۔ خلاصہ یہ کہ اس علاقہ کے تمام علوم متداولہ سے پندرہ برس کی عمر میں فراغت حاصل کر لی" [۱]

اس موقع پر شیخ عبدالرحیم نے بڑی خوشی کا اظہار کیا اور ایک دعوت طعام منعقد کی جسمیں عوام و خواص سب شریک ہوئے۔ اسی تقریب میں شیخ صاحب نے آپکے سر پر دستار فضیلت باندھی، اجازت درس دی اور علم و عمر میں ترقی کی دعا کی۔ مجلس میں جس قدر علماء و مشائخین موجود تھے سب نے متفقہ الفاظ میں اس زور سے شیخ صاحب کو مبارکباد دی کہ ساری مجلس گونج اٹھی۔

رحیم بخش دہلوی لکھتے ہیں:

"حقیقت میں ضعیف والد کیلئے اس سے زیادہ اور کیا خوشی اور فخر کا باعث ہو سکتا ہے کہ اسکی نوجوان اولاد اسکی زندگی میں ایک ایسی قابلیت پیدا کرے جس پر اس زمانہ کے بڑے بڑے علماء و فضلاء کو فخر و ناز ہو۔ چونکہ جناب شیخ عبدالرحیم جو مجتہد فن اور باطنی فیض سے مالامال تھے اس وجہ سے وہ اپنے فرزند رشید کی قدر و منزلت کو خوب جانتے تھے اور انہیں یقینی طور پر معلوم تھا کہ عنقریب ایک وہ زمانہ آنے والا ہے جسمیں اسکے اقبال کا سورج تمام دنیا میں اپنی روشنی پھیلائیگا اور اسکی علمی فیاضیاں اہل دنیا کو مالامال کر دینگی۔" [۲]

حضرت شاہ ولی اللہ کی تعلیم و تربیت محض کتابی اور روحانی علم کے حصول پر مشتمل نہ تھی شیخ عبدالرحیم ہمہ وقت اپنے شاگرد کو ایسی نصیحتیں کیا کرتے تھے جن پر انکے مستقبل کی عمارت قائم کی جاسکے۔ شاہ صاحب نے اپنی تصانیف میں ان نصائح کا اکثر ذکر کیا۔

ایک روز ظہر کے وقت شاہ ولی اللہ کیطرف متوجہ ہوئے اور فی البدیہ دو رباعی اشعار پڑھے۔

گر تو راہ حق بخواہی اے پسر
خاطر کس رامر نجان الحذر
در طریقت رکن اعظم رحمت است
ایں چنیں فرمود آں خیر البشر

---

[۱] ترجمہ انفاس العارفین، صفحہ ۴۰۴

[۲] حیات ولی، صفحہ ۲۲۶

اور فرمایا کہ "دوات قلم لاؤ اور اسکو لکھ لو۔ کیونکہ حضرت حق سبحانہ کیطرف سے اس کا القاء کیا گیا ہے تاکہ میں تجھ کو وصیت کروں۔" [۱]

ایک موقع پر شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس فقیر کو مجلس صحبت میں حکمت عملی اور آداب معاملہ بہت سکھایا کرتے تھے۔ انمیں سے جو کچھ حافظہ میں ہے یہ ہے کہ فرماتے تھے [۲]

"مجلس میں برائی مت کر کہ اہل پورب ایسے ہیں اور اہل پنجاب ایسے ہیں شاید محفل میں کوئی باحمیت فرد اسی قوم کا ہو تو اسے برا لگے اور صحبت منغض ہو جائے"

فرماتے تھے:

"کوئی بات جمہور کے مخالف عام مجلس میں ہرگز زبان پر مت لاؤ گو کہ وہ بات نفس الامر میں صحیح ہی کیوں نہ ہو کہ وہ اسپر انکار کر دیں اور صحبت منغض ہو جائے"

فرماتے تھے:

"آدمی کا لباس ایسا ہونا چاہیے کہ اسکی صنعت و کمال پر مشعر ہو مثلاً جو آدمی دانشمند ہے اسے چاہیے کہ دانشمندوں کا لباس پہنے اور انہیں کے آئین کے ساتھ زندگی گذارے اور جو فقیر ہے اسکو چاہیے کہ فقیروں کا لباس پہنے اور انہیں کے طریقہ پر زندگی بسر کرے۔

جن لوگوں کا مرتبہ تیرے مرتبہ سے فروتر ہے اگر وہ ابتدا بالسلام کریں تو اسکو نعمت جان اور اللہ کا شکر بجالا اور روبرو منبسط ہو (یعنی انکے سامنے اظہار خوشی کر) جو مرتبہ میں کم ہوں ان سے ہمیشہ سلام میں سبقت کرنا اور خوش اخلاقی سے پیش آنا اور انکی خیریت اور احوال دریافت کرنا اور اسکو معمولی بات نہ سمجھنا۔ خوباں دراین معاملہ تقصیر می کنند۔"

ایک روز شاہ صاحب کو مخاطب کر کے فرمایا:

"بات کہنے راستہ چلنے بیٹھنے اٹھنے میں اقویا (مضبوط، قوی) کی رسم و عادت پر کام کرے اگرچہ تو ضعیف ہی کیوں نہ ہو۔ اور اگر کوئی عیب یا جبن (بزدلی) یا بخل ناگاہ تجھ سے سرزد ہو جائے تو اسکے کتمان یا اخفاء میں کوشش کرنا چاہیے اور خود کو بتکلف صفت مقابل ظاہر کرنا چاہیے تاکہ نفس اس ادب کے ساتھ خوگر ہو جائے۔ اگر تجھ سے شجاعت یا سخاوت یا فتوت ظہور میں آئے تو چاہیے کہ ابنائے روزگار اسکو تجھ سے دیکھیں۔ [۳]

---

۱ انفاس العارفین، صفحہ ۱۸۵
۲ ایضاً صفحہ ۱۸۶
۳ ایضاً صفحہ ۱۸۷

غرضکہ ایسی نصیحتیں شاہ صاحب کی تربیت کا ایک مسلسل حصہ وجزو تھیں اور شاہ صاحب کی سیرت واخلاق میں انہیں چیزوں کا پرتو تھا۔

شاہ صاحب نے قرآن مجید کی ابتدائی تعلیم بالترجمہ اپنے والد محترم سے لی جس سے انکو قرآن فہمی میں مدد ملی فن قرأت و تجوید کی تکمیل قاری مولانا محمد فاضل سندھی سے کی جو دہلی کے شیخ القراء کہے جاتے تھے اور اپنے زمانہ کے ماہر فن شمار کئے جاتے تھے "فتح الرحمٰن" فارسی تفسیر کے مقدمہ میں شاہ صاحب نے تحریر کیا ہے:

" قال العبد الضعيف ولى الله بن عبد الرحيم عفى عنه قرأت القرآن كله من اَوله الى آخره برواية حفص عن عاصم على الصالح الثقة حاجى محمد فاضل السندهى ١١٥٤ھ، قال تلوته من اوله الى آخر ه برواية حفص على الشيخ عبدالخالق المنوفى شيخ القراء بمحروسة دلّى "[1]

پندرہ سال کی عمر میں جب شیخ عبدالرحیم نے تمام علوم ظاہری و باطنی کی تعلیم و تربیت سے اپنے خلف سعید اور شاگرد عزیز کو مشرف کردیا اور اجازت درس و خرقہ صوفیا عطا کردیا تو آپنے اپنی فطری ذہانت اور اللہ تعالیٰ کیطرف سے عنایت کی ہوئی فہم و فراست کو کام میں لاتے ہوئے اجازت و سند حاصل کرنے کے بعد خود بغیر استاد کے کتابوں کا مطالعہ شروع کردیا اور نہایت سخت محنت کرنے لگے ایک سال کی کڑی محنت سے تمام پڑھے ہوئے علوم از سر نو دیکھ ڈالے اور اس محویت اور استغراق کے ساتھ کہ بقدر ضرورت کچھ کھالیتے یا تھوڑا آرام کرلیتے ورنہ رات دن بجز کتب بینی کے دوسرا کام نہ تھا۔ اس طرح یہ زمانہ گویا کہ ان علوم وفنون کو تازہ کرنے کا زمانہ تھا جنکی بنیاد آپ کے والد نے ڈالی تھی۔

اجازت بیعت و وفات شاہ عبدالرحیم:

اللہ تعالیٰ کو جس بندے سے جو کام لینا ہوتا ہے وہ جب مکمل ہو جاتا ہے تو اس دنیا میں اسکی مدت عمر تمام ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کیطرف سے حیات جاودانی کی طرف بلاوا آجاتا ہے۔

شیخ عبدالرحیم سے اللہ تعالیٰ کو جو خاص کام لینے تھے ان میں مدرسہ رحیمیہ کا قیام اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تربیت تھی یہ شیخ عبدالرحیم کی روحانی فراست تھی کہ شاہ صاحب کی تربیت اور انکی ازدواجی زندگی کو یکسو و مطمئن کردینے میں آپنے جلدی کی اور اسوقت کے زوال پذیر ہندوستانی معاشرہ میں جن مجتہدانہ کارناموں کی اشد ضرورت تھی ان کے واسطے اپنے صاحبزادے کو پوری طرح تیار کردیا اور

---

[1] مقدمہ فتح الرحمٰن فی ترجمۃ القرآن ص ۱۰

ساتھ ہی ساتھ اس ادارہ کی بنیاد بھی ڈال دی جس میں اس اعلی خاندان کے اس خلف صادق نے اپنی عمر کے آخری حصہ میں مدرسہ و خانقاہ کی بساط جما کر اپنی بیدار مغزی، روحانی قوت، دور بین نگاہ اور علمی قابلیت کا سکہ جما کر دین کی وہ خدمت کی جسکی مثال تاریخ ملت میں شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔

جب یہ سب کچھ ہو گیا جو اللہ کو منظور تھا تو شیخ عبدالرحیم کو اسکی جانب سے حکم واپسی ملا، مسلسل صدمات طرح طرح کے امراض جن میں بڑھاپا اور درازی عمر ایک مستقل مرض تھا جسکی وجہ سے اٹھنا بیٹھنا چلنا پھرنا دشوار ہو گیا تھا اور قویٰ کی کمزوری نے شیخ صاحب کو یہ احساس دلا دیا کہ اب ان کا آخری وقت نزدیک ہے ساتھ ہی انکو یہ قلبی اطمینان بھی حاصل تھا کہ اللہ تعالیٰ نے جو خدمت انکے سپرد کی تھی وہ احسن طریقہ پر انجام دے چکے ہیں لہٰذا ایک روز شاہ ولی اللہ کو اپنے پاس بلایا اور اجازت بیعت وارشاد عطا فرمائی۔

شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں :

"میں اپنی عمر کے سترہویں سال میں تھا کہ والد بزرگوار بیمار پڑ گئے اور اسی علالت میں رحمت خداوندی کی آغوش میں چلے گئے۔ اپنے مرض الموت کے دوران مجھے بیعت وارشاد کی اجازت عطا فرمائی اور یہ جملہ کہ "یدہ کیدی" (اس کا ہاتھ 'دست بیعت' میرا ہاتھ ہے) دوبار ارشاد فرمایا۔ میرے نزدیک سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ والد بزرگوار ساری زندگی مجھ سے راضی رہے اور اسی عالم میں اس دنیا سے رخصت ہوئے مجھ پر انکی اس قدر توجہ تھی کہ کسی باپ کو اپنے بیٹے پر نہیں ہو سکتی، میں نے کسی ایسے والد استاد یا مرشد کو نہیں دیکھا جو اپنے فرزند، شاگرد اور مرید کیساتھ ایسی شفقت سے پیش آتا ہو جس شفقت کیساتھ والد بزرگوار مجھ سے پیش آتے تھے **اللھم اغفرلی ولوالدی وارحمھما کما ربیانی صغیرا**" [1]

اسی وقت شیخ عبدالرحیم نے مدرسہ رحیمیہ و خانقاہ کا انتظام بھی شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے سپرد کر دیا اسکے بعد آپکے امراض میں دن بہ دن اضافہ ہوتا گیا حتی کہ ۱۲ر صفر ۱۱۳۱ھ بروز بدھ اس مرتاض اور فقید المثال عالم نے اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی "**انا للہ و انا الیہ راجعون**" [2]

خود شاہ صاحبؒ الجزء اللطیف میں تحریر فرماتے ہیں :

"جب میں والد گرامی کے مزار مبارک پر مراقبہ کرتا تو مسائل توحید حل ہو جاتے، جذب کا

---

[1] انفاس العارفین، صفحہ ۴۰۶، ۴۰۵

[2] انفاس العارفین، صفحہ ۴۰۶، قول الجلی، صفحہ ۲۲، مقالات طریقت، صفحہ ۸

راستہ کھل جاتا سلوک سے وافر حصہ میسر آتا اور وجدانی علوم کا ذہن میں ہجوم لگ جاتا۔" [۱]

گویا اسطرح پدری تربیت اور تعلق روحانی والد بزرگوار کی وفات کے بعد بھی جاری رہا صرف اسکی کیفیت اور حقیقت بدل گئی۔

درس و تدریس:

شیخ عبدالرحیم کی وفات تک شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی زندگی کا ابتدائی حصہ جس کی مدت تقریباً ۱۷ سال ہے والد بزرگوار کی سرپرستی میں انکی تعلیم و تربیت کا دور اول تھا۔

والد ماجد کے انتقال کے بعد انکی اجازت اور خاندانی طریقہ کے مطابق آپ اپنے والد کے قائم کردہ مدرسہ رحیمیہ میں درس و تدریس میں مشغول ہوگئے اگرچہ شاہ صاحب نے اپنے والد بزرگوار کی زندگی ہی میں تدریس کی ابتداء کردی تھی مگر والد مرحوم کی وفات کے بعد زیادہ احساس ذمہ داری کے ساتھ اس میں منہمک ہوگئے وہ لکھتے ہیں :

"بعد از وفات حضرت ایشان فقیر دوازدہ سال کم و بیش بدرس کتب دینیہ و عقلیہ مواظبت نمود و در ہر علمے خوض واقع شد" [۲]

والد کی وفات کے بعد کم و بیش بارہ سال دینیات و معقولات کی کتابوں کے درس و تدریس کی پابندی کی اور ہر علم میں گہرائی و گیرائی پیدا ہوئی"

مولوی رحیم بخش اس دور کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" والد ماجد کے انتقال کے بعد آپ نے کتب دینیہ و عقلیہ کا درس دینا شروع کیا تقریباً بارہ سال تک علوم کے درس میں مصروف رہے اور علم نبوی کی اس درجہ اشاعت کی کہ اسکا ذوق و شوق سرگرم طبیعتوں میں حد سے زیادہ بڑھ گیا۔ قرآن و حدیث کی اشاعت و تشہیر میں جو آپنے کوشش کی اسکے احسان سے ہندوستان کبھی سر نہیں اٹھا سکتا" [۳]

"جوق در جوق لوگ آنے شروع ہوئے سینکڑوں طالب علم مستفیض ہونے لگے" [۴]

اسی دوران شاہ صاحب نے تصنیف کا کام بھی اس طرح شروع کردیا کہ ترجمہ قرآن جو اپنے ماموں زاد بھائی، شاگرد اور خلیفہ محمد عاشق پھلتی کو پڑھاتے تھے اسکو قلم بند کرنا شروع کیا اور ایک حصہ سفر حج سے

---

۱ انفاس العارفین، صفحہ ۴۰۶

۲ الجزء اللطیف، صفحہ ۱۹۵۔

۳ حیات ولی، صفحہ ۲۲۸

۴ شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان، صفحہ ۴۳

پہلے انہیں بارہ برسوں میں لکھ ڈالا گو کہ اس کی تکمیل ۱۱۵۱ھ میں سفر حج سے واپسی پر ہوئی۔

دراصل اسی بارہ سالہ دور درس و تدریس نے شاہ صاحب کو آئندہ زندگی میں آنے والے دور تصنیف و تالیف کیلئے تیار ہونے میں بیحد اہم کردار ادا کیا ہے جسنے ولی اللہ کو شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ بنادیا اسی زمانہ میں آپکو مختلف علوم و فنون میں نہایت غور و فکر کا موقع ملا آپنے مذاہب اربعہ کے فقہ اور انکے اصول کا غائر نظر سے مطالعہ کیا علم حدیث کی طرف خاص توجہ دی ہمہ وقت تحصیل علم میں مشغول رہتے غذا کی مقدار نہایت کم ہو گئی تھی آرام بھی برائے نام فرماتے تھے اس شدید محنت اور لگن کا جو نتیجہ ہوا اسکو بیان کرتے ہوئے رحیم بخش دہلوی نے تحریر کیا ہے:

"جب آپکے علم کا چشمہ نمودار ہوا تو خاص اس فن (علم حدیث) کی بڑی ترقی ہوئی اور تمام ہندوستان حدیث و تفسیر سے بھر گیا علماء کے ہر حلقہ میں حدیث کا چرچا ہونے لگا" [1]

اسی بارہ سالہ دور تفکر و تدبر میں آپنے اپنے ملک ہندوستان کے حالات کا عام طور پر اور شہر دہلی اور اطراف کے حالات کا خاص طور پر جائزہ لیا حکومت و ملت اسلامیہ جس طرح موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا تھی اور دینی و اخلاقی زبوں حالی و پستی کا جو دور دورہ تھا اسکو آپکے باشعور قلب نے پورے طور پر محسوس کیا جسکا اظہار آپنے اپنی تصنیفات میں کیا۔

طریقہ تعلیم:

شاہ صاحب کے زمانہ میں ہندوستان میں جو درس نظامی رائج تھا (اور جس کی آخری شکل ابتک مدارس عربی میں رائج ہے) اسمیں قرآن و حدیث کی تعلیم، ترویج و اشاعت کو اتنا دخل نہ تھا جتنا علوم عقلیہ، منطق، فلسفہ وغیرہ کو تھا۔

اگرچہ شاہ صاحب نے اسی طریقہ کے مطابق اپنی ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی لیکن خود انہوں نے اس مروجہ تعلیم کے برخلاف دوسرا ہی طریقہ اختیار کیا جو انکی نظر میں اس ذہنی اور فکری انقلاب کیلئے موزوں ترین تھا جو وہ اس مادّی پستی اور اخلاقی و مذہبی افراتفری اور بیگانگی کے دور میں خالص قرآن و حدیث کی اشاعت و عمل کے ذریعہ لانا چاہتے تھے۔

چنانچہ اپنی کتاب "المقالۃ الوضیۃ فی النصیحۃ والوصیۃ" میں وصیت ششم کے تحت انھوں نے اس نصاب تعلیم کا تذکرہ کیا ہے جسکے مطابق وہ اپنے شاگردوں کو تعلیم دیا کرتے تھے شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں :

---

[1] حیات ولی ص ۲۳۰

" طریقہ تعلیم علم چنان کہ بہ تجربہ محقق شدہ آں است۔۔۔۔۔۔۔۔الخ" [۱]

طریقہ تعلیم تجربہ سے جو تحقیق ہوا ہے وہ یہ ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔الخ

اس طریقہ تعلیم کے مطابق پہلے آپ علوم عربیہ (صرف ونحو) کے ابتدائی رسائل بخوبی طالب علم کو حفظ کرادیتے اس کے بعد کوئی حکمت یا تاریخ کی کتاب بزبان عربی پڑھاتے تاکہ عربی لغات وادب میں استعداد پیدا ہو جائے۔ اسکے بعد براہ راست علم حدیث کا درس شروع کرادیتے اس سلسلہ میں مؤطا امام مالکؒ سے ابتدا کرتے کیونکہ آپکے نزدیک:

"مؤطا بروایت یحییٰ بن یحییٰ مصمودی بخوانند وہرگزان را معطل نہ گذراند کہ اصل علم حدیث است وخواندن آن فیض بہادارد ومارا سماع جمیع آن مسلسل ست " [۲]

مؤطا ابن مالکؒ بروایت یحییٰ بن یحییٰ مصمودی پڑھائیں اور اسے ہرگز نہ چھوڑیں کیونکہ یہ اصل علم حدیث ہے اور اسکے پڑھنے سے بہت فیض حاصل ہوتا ہے اور مجھے اسکا سماع مسلسل ہے "

اس کے ساتھ ہی آپ قرآن مجید کی تعلیم اسطرح دیتے کہ اس کو بالترجمہ مگر بلا تفسیر پڑھاتے البتہ جہاں کہیں مشکل قاعدہ نحوی یا شان نزول کی ضرورت پیش آتی اسے بخوبی حل فرمادیتے اسطرح قرآن مجید کو روانی سے باترجمہ سمجھ کر پڑھنے سے قرآن مجید کے تمام علوم شاگرد پر آسان ہو جاتے۔ چنانچہ اسکے بعد آپ تفسیر جلالین (جو بہت مختصر مگر معتبر تفسیر سلفی ہے) پڑھاتے کہ طالبعلم کو علم تفسیر سے مناسبت پیدا ہو جائے اور مقصود تعلیم صرف ترجمہ نہ سمجھے۔ اسکے بعد آخر میں ایک وقت حدیث کی دوسری کتابیں مثلاً صحیحین بخاری ومسلم وغیرہ پڑھاتے اور اسکے ساتھ کتب فقہ، عقائد وسلوک اور دوسرے وقت کتب حکمت ودانشمندی مثلاً شرح ملا جامی وقطبی وغیرہ کی تعلیم دیتے اور گاہ بگاہ ایک روز مشکوٰۃ اور ایک روز طبی پڑھاتے کہ بہت نافع ہیں۔

اس طریقہ کا بڑا فائدہ یہ تھا کہ طالبعلم باوجود اسکے کہ علوم عقلیہ، فلسفہ وغیرہ سے روشناس ہوتے تھے مگر تمام علوم کا جائزہ صرف اور صرف قرآن وحدیث کی روشنی میں کر سکتے تھے جس سے اوہام باطلہ و شکوک وشبہات اور فلسفیانہ موشگافیوں کا بخوبی رد کرنے کی قابلیت پیدا ہو جاتی تھی اور آخری درجہ میں آیات واحادیث پر غور وفکر کر کے انکے صحیح مطالب سمجھ سکتے اور دوسروں کو تبلیغ کر سکتے تھے۔

---

[۱] مجموعہ وصایا اربعہ، صفحہ ۵۰

[۲] ایضا، صفحہ ۸۰

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی شخصیت انکے اخلاق و فیاضی اور رحیمانہ و شریفانہ برتاؤ انکی جانکاہ محنت و جفاکشی اور لگن اور ان سب باتوں کے ساتھ مندرجہ بالا طریقہ تعلیم اور نصاب کا اثر یہ ہوا کہ اس بارہ سالہ دور تدریس میں ملک کا گوشہ گوشہ حدیث و قرآن کا صداؤں سے گونج اٹھا لا حاصل ولا طائل فلسفیانہ موشگافیوں اور بے کار عقلی بحثوں اور ہر طرح کی تاویلات و تحریفات کا زور گھٹ گیا اور لوگ فقہ، اصول فقہ اور قرآن و حدیث سے استدلال و استخراج مسائل کیطرف متوجہ ہونے لگے۔

اس دور میں مدرسہ رحیمیہ میں بظاہر تعلیم و تدریس اور انتظام کی مکمل ذمہ داری صرف شاہ صاحب کے کاندھوں پر تھی۔ اس دور کے کسی دوسرے معلم مدرسہ کا نام کسی ذریعہ سے علم میں نہیں آتا لیکن شاہ صاحب کے تذکرہ نگاروں نے جس طرح طلباء کی کثرت کا ذکر کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ شاہ صاحب کے دو ایک معاون اور ہوں۔

سفر برائے حصول درجات:

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی روحانی ترقی کیلئے انتہائی درجہ کی محنت کی اور اپنے اعمال اوراد اور اذکار کے ذریعہ سلوک کے اعلیٰ مراتب و درجات حاصل کئے۔ آپکے خلیفہ 'دوست' بھائی' شاگرد اور محبّ شاہ محمد عاشق پھلتی نے اپنی تصنیف "القول الجلی" میں تفصیل سے انکا ذکر کیا ہے۔ اسی سلسلہ میں انہوں نے ایک واقعہ سفر بیان کیا ہے۔ اگرچہ اور کسی تذکرہ نگار نے کہیں اسکا تذکرہ نہیں کیا مگر کیونکہ شاہ صاحب کے درجات و مراتب کی بلندی کے ضمن میں اس واقعہ کا بھی ایک حصہ ہے اس لئے اسکا ذکر بھی انکی اس ترقی کے بیان کیلئے ضروری جسکے نتیجہ میں شاہ ولی اللہ کا نام چار دانگ عالم میں روشن ہو گیا۔

بقول صاحب القول الجلی:

> "حضرت اقدس کا سن شریف بیس سال کا تھا کہ ایک روز بلا کسی سابقہ ارادہ وخیال کے دل میں اسرار منزل میں سفر کا شوق پیدا ہوا اور یار و دیار سے ہجرت کا عزم پختہ ہو گیا۔"[1]

اس بارے میں مصنف کی رائے یہ ہے کہ شاہ صاحب نے پوشیدہ طور پر عزم سفر بیت اللہ کیا تھا مگر جب آپنے دیکھا کہ آپکے اقرباء حتی کہ آپکی والدہ ماجدہ بھی آپکے اس ارادہ میں حارج ہیں اور نہیں چاہتیں کہ آپ اس پر آشوب زمانہ اور پر خطر ماحول میں کہیں سفر پر نکلیں اور سمندر کا سفر اختیار کریں۔ اسلئے وہ اسکی اجازت نہیں دے رہیں تو آپنے اس ارادے کو تمام لوگوں سے چھپایا اور دوسری طرف عزم سفر کا اظہار کیا۔

---

[1] القول الجلی، صفحہ ۳۶۔

اس سفر میں آپکے ہمراہ کافی اصحاب واحباب خاص تھے جو سب کے سب ایک خاص جذبہ ترقی درجات سے سرشار تھے۔اس سفر کے دوران شاہ صاحب نے انتہائی درجہ کے توکل الی اللہ کا اظہار کیا اور باوجودیکہ زاد راہ کی اتنی قلت تھی کہ گھر سے نکلتے وقت تین چار روپیہ سے زائد پاس نہ تھے، نہایت اطمینان قلب سے سفر پر روانہ ہوگئے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بھی اس عزم صمیم اور توکل کی برکت سے ایسا فیض نازل کیا کہ پورے سفر میں کہیں فاقہ نہ کرنا پڑا بلکہ دوران سفر سب لوگ بہترین مرغن غذائیں کھاتے رہے۔شاہ صاحب نے اس سفر کے سلسلہ میں کسی فرد واحد پر کوئی جبر نہیں کیا بلکہ یہی کہا جو بھی مشقت اور کلفت برداشت کرنیکی طاقت رکھتا ہو اور بہ رضا ورغبت اسکے لئے تیار ہو وہی اس سفر میں آپکی ہمراہی کرے۔ لیکن باوجود سفر کی تمام صعوبتوں اور تکالیف کے لوگوں نے آپکا ساتھ نہیں چھوڑا۔ خود حضرت شاہ صاحب سفر کی تمام مشقتوں میں اپنے ہمراہیوں کے ہمیشہ ساتھ رہتے اور سامان اٹھانے اور دیگر کام کرنے میں برابر شریک ہوتے اور راستہ چلنے میں تمام ساتھیوں سے آگے چلتے۔ جہاں قیام ہوتا چھوٹے بڑے کی کوئی تفریق نہ ہوتی تھی۔

دوران سفر سختی و آرام میں برابر حقائق و معارف بیان فرماتے رہتے اور باوجود نزاکت مزاج اتنی مشقت برداشت کرنے کے باوجود مزاج کی شگفتگی و تازگی میں ذرہ برابر بھی تبدیلی نہ آتی۔ دراصل آپکا یہ سفر حصول درجات کیلئے ہی تھا جو اس دوران آپکو بکمال حاصل ہوئے۔

اس سفر میں آپ کہاں کہاں سے گذرے اور کتنا وقت صرف کیا اس کی تفصیل نہیں ملتی تاہم جس وقت آپ معہ اپنے ہمراہیوں کے گجرات کے ساحل پر پہنچے تب جہازوں کی حجاز روانگی کا زمانہ ختم ہو چکا تھا اور کوئی سواری جانب حجاز جانے والی باقی نہیں رہی تھی چنانچہ آپنے چند دن شہر کھنبات میں قیام کیا۔اس قیام کے دوران مراقبہ میں آپکو وہ درجہ و مرتبہ حاصل ہوا کہ قلب میں اس کی وجہ سے ایک قسم کی ٹھنڈک اور طمانیت حاصل ہوئی جو غالباً اس سفر کا مقصد اصلی تھا اسکے ساتھ ہی آپنے اسی جگہ سے مزید سفر کا قصد ترک کر کے بغیر حج کئے ہوئے وطن واپسی کا عزم کیا اور واپس گھر لوٹ آئے۔

شاہ محمد عاشق تحریر کرتے ہیں کہ اس سفر سے واپسی کے وقت آپکو مقام مفہمیت و محدثیت عطا ہوا جیسا کہ حدیث نبوی میں ہے:

" کانوا فی الامم السابقة مفهمون و محدثون ان کان فی امتی احد یکون عمرؓ "[1]

(سابقہ امتوں میں مفہمین و محدثین ہوتے تھے۔اگر میری امت میں کوئی ہوتا تو وہ عمرؓ ہوتے۔)

---

[1] القول الجلی، صفحہ ۳۹۔

اس مقام اعلیٰ کے اسرار و علوم آپنے اپنی تصنیف تفہیمات الٰہیہ میں تحریر فرمائے ہیں۔

القول الجلی میں اس سفر کی تفصیل شاہ صاحبؒ کی روحانی فیض رسانی کے تناظر میں دی گئی ہے اور متعدد واقعات اس سلسلہ میں بیان کئے گئے ہیں اور ان واقعات اور حالات سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ ملک کے مختلف حصوں میں جہاں جہاں سے آپ گذرے مثلاً سندھ (ٹھٹہ) گجرات (احمد اباد۔ کھنبات) دہلی، شاہ جہاں آباد وغیرہ وہاں بکثرت لوگ آپکی صحبت اور تلقین و تعلیم سے مستفید اور حسب استعداد فیضیاب ہوئے۔

گویا کہ یہ سفر بھی آپکی تعلیم و تدریس اور فیض رسانی کے سلسلے ہی میں تھا جسمیں نہ صرف یہ کہ خود آپکی روحانی ترقی ہوئی بلکہ لوگ بھی اس سے فیضیاب ہوئے۔

سفر حج:

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے پہلا دور آپکا بچپن اور تعلیمی دور ہے جسمیں آپنے اپنے والد ماجد شیخ عبدالرحیم قدس سرہ سے تعلیم حاصل کی دوسرا دور والد صاحب کی وفات کے بعد کا وہ دور ہے جو آپنے مدرسہ رحیمیہ میں درس و تدریس میں گذارا، یہ بارہ سالہ دور جسکی ابتدا شیخ عبدالرحیم کی وفات یعنی ۱۱۳۱ھ (مطابق ۱۷۱۹ء) سے ہوئی اور جسکا اختتام ۱۱۴۳ھ (مطابق ۱۷۳۱ء) کو ہوا، شاہ صاحبؒ کی اصلی خدمات یعنی علمی، فکری، تجدیدی اور تصنیفی کارہائے نمایاں کے لئے گویا کہ ایک ٹریننگ پریڈ (Training Period) تھا جسمیں انہوں نے عملی اور علمی قابلیتوں کو سنوارا اور تحقیق و جستجو کے ساتھ تدریس و تعلیم کی صلاحیتوں کو بھی جلا بخشی اس دور کے بارے میں رحیم بخش دہلوی اپنی تصنیف میں لکھتے ہیں :

> ”اگرچہ اس بارہ سال کے عرصہ میں آپکی علمی مشق معراج کمال کو پہنچ گئی تھی اور دینی و عقلی معاملات میں حیرتناک ترقی پیدا ہو گئی تھی لیکن ابھی تک طبیعت مبارک میں وہی کرید چلی آتی تھی جو آغاز عمر میں تھی یعنی جہانتک ممکن ہو علم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تحصیل و تکمیل میں ترقی کرنا چاہئے اور اس علم کو ایسے عروج پر پہنچا دینا چاہئے جس سے زیادہ ممکن نہ ہو۔“[1]

اس تجسس سے شاہ صاحبؒ کی زندگی کے تیسرے اور انتہائی اہم دور کا آغاز ہوتا ہے یہ دور شاہ صاحب کا تصنیفی، مجددی اور دعوتی دور ہے جس میں آپکے قلم سے وہ شہ پارے وجود میں آئے کہ جن کی افادیت علمی، دینی، مجلسی اور سیاسی حلقوں میں انقلاب لانے کا باعث بن گئی۔

---

[1] حیات ولی، صفحہ ۲۳۱

اس دور کی ابتداء ۱۱۴۳ھ مطابق ۱۷۳۱ء میں شاہ صاحب کے حجاز مقدس اور وہاں دو سالہ قیام سے ہوئی یہ تاریخ ساز واقعہ (سفر حج) انکی کتاب زندگی کا ایک انتہائی اہم باب اور حد فاصل ہے حجاز کے اس طویل قیام میں انہوں نے ذہنی و علمی ارتقاء کے وہ منازل طے کئے جو بظاہر ہندوستان میں ممکن نہیں تھے اور وہ خزانہ علمی اپنے ساتھ لیکر جب وہ ہندوستان واپس آئے تو اسکی مدد سے انہوں نے ایسے کارہائے نمایاں انجام دئے جنکی چمک سے تمام ہندوستان منور ہو گیا بلکہ اسکی روشنی تمام عالم میں پھیل گئی۔

علم حدیث کے حصول کی تمنا شاہ صاحب کو شروع سے تھی چنانچہ کافی غور و خوض کے بعد آپ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اصل علم حدیث اسکے معدن یعنی حجاز جائے بغیر کلی طور پر حاصل ہونا ناممکن ہے اس کام کیلئے حرمین جیسی مرکزی جگہ اور شیوخ کاملین کی صحبت اور ان سے روایت حدیث کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ۔ اسکے ساتھ ہی آپکو حج اور زیارت حرمین خصوصاً سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں حاضری کا شوق پیدا ہوا اور آپنے دفعۃً سامان سفر مہیا کر کے اسطرف توجہ مبذول فرمائی اور ۸ ربیع الثانی ۱۱۴۳ھ کو سفر کا آغاز کیا، سفر حج کے وقت شاہ صاحب کی عمر تیس سال تھی شاہ صاحب الجزء اللطیف میں مختصراً اپنے اس سفر اور اسکے مقاصد کے بارے میں اسطرح رقمطراز ہیں :

"اس بارہ سال کے عرصہ کے بعد میرے سر میں حرمین شریفین کی زیارت کا سودا سمایا۔ ۱۱۴۳ھ کے اواخر میں حج کی سعادت سے مشرف ہوا اور ۱۱۴۴ھ میں مجاورت مکہ مکرمہ، زیارت مدینہ منورہ، شیخ ابو طاہر قدس سرہ اور دوسرے مشائخ حرمین سے روایت حدیث کا شرف حاصل کیا۔ اسی دوران حضرت سید البشر علیہ افضل الصلوٰۃ واتم التحیات کے روضہ مقدس کو مرکز توجہ بنا کر فیوض حاصل کئے۔ علمائے حرمین اور دیگر لوگوں کے ساتھ دلچسپ صحبتیں رہیں اور شیخ ابو طاہر سے خرقہ جامعہ حاصل کیا جو بلاشبہ تمام سلاسل کے خرقوں کا جامع ہے۔ اسی سال ۱۱۴۴ھ کے آخر میں دوبارہ فریضہ حج ادا کیا۔ ۱۱۴۵ھ میں عازم وطن ہوا اور اسی سال بروز جمعہ ۱۴ رجب المرجب صحیح سالم وطن پہنچ گیا۔ و اما بنعمة ربك فحدث"[1]

القول الجلی میں شاہ محمد عاشق پھلتی نے اس سفر کی کافی تفصیل بیان کی ہے۔ شاہ محمد عاشق کے والد شیخ عبید اللہ جو شاہ ولی اللہ کے بڑے ماموں تھے اور جو بعد میں انکے خسر بھی بن گئے معہ اپنے صاحبزادے محمد عاشق صاحب کے اس سفر میں از ابتدا تا انتہا شریک و شامل رہے۔ شاہ محمد عاشق نے القول الجلی کے مقدمہ

---

[1] انفاس العارفین، صفحہ ۴۰۶

میں لکھا ہے:

"مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ کے راستے میں حضرت شاہ ولی اللہ نے اپنے خاص اونٹ پر مجھ کو جگہ دی اور شغدف میں ساتھ رکھا"[1]

اور لکھتے ہیں:

"گیارہ شعبان ۱۱۴۴ھ کی رات کو منزل رابغ میں حضرت نے فرمایا اگر کوئی میرے بیان کئے ہوئے معارف اور حقائق کو اس طرح لکھ لے کہ لوگ سمجھ سکیں وہ فوائد واسرار کا مشاہدہ کرے گا"[2]

' القول الجلی فی ذکر آثار الولی' دراصل انہیں معارف وحقائق کا بیان ہے جو شاہ صاحب کی ایماء پر شاہ محمد عاشق پھلتی نے تحریر کیا۔

حضرت شاہ ولی اللہ کا سفر حج صرف سفر برائے حج وزیارت نہیں تھا بلکہ ایک کثیر المقاصد سفر تھا۔ اس سفر کے مقاصد میں ادائیگی فریضہ حج کے ساتھ ساتھ حصول علم حدیث' اہل زبان و علم مشائخین عرب سے ملاقات اور حدیث کے علوم کا تکملہ' سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں حاضری اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت سے براہ راست کسب فیض' مشاہدات باطنی اور معرفت حق شامل تھے۔ چنانچہ دو سال بعد جب آپ اس سفر سے واپس آئے تو آپ کے اندر ایک عظیم الشان انقلاب آچکا تھا اور آپ حقیقت میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ بن چکے تھے۔

خانہ کعبہ اور روضہ اطہر کے دوران قیام جو روحانی فیضان حاصل ہوا اسکو آپ نے فیوض الحرمین میں قلمبند کیا ہے، دیباچہ فیوض الحرمین میں فرماتے ہیں :

"اللہ پاک کی سب سے بڑی نعمت جس سے اسنے مجھے سرفراز فرمایا یہ ہے کہ ۱۱۴۳ھ اور اسکے بعد کے سال میں مجھے اپنے مقدس گھر کی اور اپنے نبی علیہ الصلوۃ والسلام کی زیارت کی توفیق عطا فرمائی لیکن اس سلسلہ میں اس نعمت سے بھی زیادہ بڑی سعادت جو مجھے میسر آئی وہ یہ تھی کہ اللہ پاک نے اس حج کو میرے لئے مشاہدات باطنی اور معرفت حق کا ذریعہ بنادیا اور اسی طرح اس نے نبی علیہ السلام کی زیارت کو میرے لئے بصیرت افروز بنایا، الغرض اس حج وزیارت کے ضمن میں مجھے جو نعمت عطا کی گئی وہ میرے نزدیک سب سے زیادہ بلند مرتبہ

---

[1] القول الجلی، صفحہ ۱۶۔

[2] ایضاً صفحہ ۱۷

ہے۔ اور اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اللہ پاک نے حج کے ان مشاہدات باطنی میں جو اسرار و رموز مجھے تلقین فرمائے ان کو ضبط تحریر میں لے آؤں نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت سے اپنی زیارت کے دوران جو کچھ میں نے استفادہ کیا اسے لکھ دوں تاکہ خود میرے لئے یاد داشت کا کام دے اور میرے دوسرے بھائیوں کو اس سے بصیرت حاصل ہو سکے۔"[۱]

روحانی کسب فیض کا سلسلہ جس کا تکملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اطہر پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے براہ راست تعلق کی شکل میں ہوا اور جسکی بناء پر بیشمار عنایات و کرامات آپؒ پر مبذول ہوئیں۔ دراصل اسکا آغاز آغازِ سفر سے ہی ہو گیا تھا۔ باوجود اس بات کے کہ دہلی سے سورت کا تمام راستہ خطرات سے پُر تھا اور بالخصوص مالوہ و گجرات مرہٹوں کی غارت گری کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ شاہ صاحب اس سفر میں جہاں کہیں بھی کسی ولی یا بزرگ کا مزار ہوتا وہاں جاتے اور نسبت حق سے کسب کرتے بلکہ اسکو ظاہر بھی کرتے تھے۔ چنانچہ پانی پت میں شاہ بو علی قلندرؒ اور شاہ شمس الدین ترکؒ و شاہ جلال قدس اللہ اسراہم کے مزارات پر، سرہند میں حضرت مجدد شیخ احمد سرہندی کے مزار پر، ملتان میں مخدوم بہاء الدین و شاہ رکن عالم کے مزارات پر حاضری دی۔ اس کے علاوہ جہاں جہاں سے آپ گذرے وہاں علماء و فضلاء سے ملاقاتیں کیں اور علماء و صوفیاء نے آپ سے آداب طریقت اور اشغال تصوف استفادہ کئے اور بیعت سے سرفراز ہوئے۔

اس وقت سورت ہندوستان کی بندرگاہ اور سمندری سفر کا نقطہ آغاز تھا۔ راستوں کا یہ حال تھا کہ بدامنی کی بناء پر رات کو اگر کوئی ساتھی کسی گاؤں یا آبادی میں چھوٹ جاتا تو شاہ صاحب: "یا بدیع العجائب" کا وظیفہ شروع کر دیتے تھے۔

سورت سے جدہ پینتالیس دن میں پہونچنا ہوا اس زمانہ میں جہاز کی یہ رفتار بھی انتہائی تیز سمجھی جاتی تھی ۱۵ر ذی قعدہ کو داخل مکہ مکرمہ ہوئے اور طلباء اور علماء کی درخواست پر مسجد حرام میں مصلیٰ حنفی کے پاس درس شروع کیا جس میں بہت ہجوم ہوا۔[۲]

صحن حرم میں عربی زبان میں علمی درس (اور وہ بھی اہل زبان فضلاء اور مشائخ کی موجودگی میں جہاں زبان یا معلومات کی ذراسی لغزش بھی قابل گرفت ہو سکتی تھی) آپکا وہ کارنامہ تھا جو آپکی قابلیت اور بزرگی کی دلیل تھا۔ اس سلسلہ میں شاہ محمد عاشق نے القول الجلی میں ایک واقعہ نقل کیا ہے جو آپکی

۱۔ دیباچہ فیوض الحرمین مترجمہ پروفیسر محمد سرور ص ۳-۴ لاہور ۱۹۴۷ء
۲۔ القول الجلی ص ۵۵

فصاحت وبلاغت اور ہمہ دانی کے اظہار کے لئے کافی ہے وہ لکھتے ہیں :

"مسجد نبوی کے مدرس شیخ طیب نے جو مشہور عالم نیز استاد شہر مدینہ تھے حضرت اقدس (شاہ ولی اللہ) کی دعوت کی جب آپ انکے مکان پر تشریف لے گئے اور محفل میں بیٹھے تو انہوں نے تمام علماء وفضلاء کی موجودگی میں آپ سے سوال کیا کہ تم عربی میں بات کر سکتے ہو۔ آپ نے بطور انکسار فرمایا کہ ہاں کچھ بول سکتا ہوں۔ پھر انہوں نے کہا کہ اکثر لوگ علمی تبحر اور حل مسائل کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن معقول کے بعض مسائل ایسے ہیں کہ اب تک ان کو کوئی قاعدہ سے بیان نہیں کر سکا ہے اور بے محل باتیں کرتا ہے جیسے تجدد امثال کا مسئلہ ہے کہ اشاعرہ عرض کے قائل ہیں اور اسکو جوہر میں شامل نہیں کرتے۔ اسکی تحقیق کیا ہے اور انکے درمیان اس اختلاف کا کیا سبب ہے؟ حضرت اقدس نے بزبان عربی ایسی فصاحت وبلاغت سے اسکی تشریح کی کہ وہاں موجود تمام فضلائے عرب آپکی فصاحت و بلاغت پر انگشت بدندان رہ گئے۔ اس کی تحقیق میں ایسے ایسے دقیق نکات بیان فرمائے جو ان کے میزبان کی سمجھ سے بالاتر تھے۔ انہوں نے ان باتوں کو غنیمت کبریٰ سمجھا' چہ جائیکہ دخل واعتراض کرتے۔ اس کے بعد ان کو کوئی علمی بحث حضرت اقدس کی خدمت میں کرنیکی جرأت نہ ہوئی۔" [۱]

اپنی ذاتی علمی قابلیت اور اظہار خیال کی صلاحیت اور اس پر بھرپور کمال حاصل ہونے کے باوجود شاہ صاحب کو اپنی ان صلاحیتوں پر ذرہ برابر غرور نہ تھا اور ان علماء سے آپکا رویہ منکسر المزاجی، نرمی اور اخلاق کا رہا اور آپ نے ہمیشہ خود کو طالب علم ہی سمجھ کر ان سے فیض حاصل کیا۔

حرمین میں آپکے اساتذہ و مشائخ کا تذکرہ ایک الگ موضوع ہے۔ اس جگہ یہ بات قابل ذکر ہے کہ بقول مصنف القول الجلی:

"چند روز میں حضرت اقدس اس ملک میں اتنے زائد معظم اور ہر دل عزیز ہو گئے کہ تمام اکابر آپکی صحبت کو غنیمت سمجھتے ہوئے نہایت تعظیم و تکریم کرتے تھے اور آپس میں کہتے تھے واللہ باللہ حضرت ہی تمام اہل مکہ میں سب سے زائد عالم بزرگ و برتر ہیں۔" [۲]

شاہ صاحب ۱۱۴۳ھ کے اواخر میں حجاز میں وارد ہوئے اور ذی الحجہ ۱۱۴۳ھ میں فریضۂ حج سے فارغ

---

۱ القول الجلی، صفحہ ۵۷

۲ ایضاً ص ۵۵

ہو گئے لیکن اسکے بعد آپنے کامل ایک سال یعنی ۱۱۴۴ھ حجاز میں گذارا جہاں آپنے اپنے ان تمام ارادوں کی تکمیل کی جنکی خاطر یہ سفر اختیار کیا تھا۔ چنانچہ بعد ادائے حج ربیع الاول ۱۱۴۴ھ میں برائے زیارت دربار سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں حاضری دی۔ دوران سفر مدینہ اور بعد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مطہرہ پر حاضری اور حرم شریف میں مواجہ شریف میں جلوس کے دوران بکثرت اسرار آپ پر منکشف ہوئے اور روحانی طور پر آپنے براہ راست سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسب فیض کیا جسکے نتیجہ میں آپ روحانی اور قلبی طور پر اتنے مطمئن و مملو ہو گئے کہ اسمیں کسی قسم کے اضافہ کی ضرورت باقی نہیں رہی اور گویا آپکو نفس مطمئنہ حاصل ہو گیا جسکے بارے میں قرآن مجید میں وارد ہے:

یاٰیتها النفس المطمئنة ارجعی الیٰ ربك راضية مرضية. [۱]

اے نفس مطمئنہ لوٹ اپنے رب کیطرف اس حالت میں کہ تو اس سے راضی ہے اور وہ تجھ سے راضی ہے۔

صاحب القول الجلی لکھتے ہیں کہ:

"آپ نے (شاہ صاحب نے) تحریر فرمایا کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بہ نفس نفیس سلوک کرایا اور بذات خود میری تربیت فرمائی۔ لہٰذا میں آپکا اویسی اور بلا واسطہ شاگرد ہوں" [۲]

مزید لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے مجھکو سلوک میں ایک طریقہ بواسطہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عطا فرمایا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح کریمہ نے مجھے بشارت دیتے ہوئے اس (طریقۂ سلوک) کی حقیقت پر اطلاع بخشی" [۳]

شاہ صاحب کے سفر حجاز کا ایک بڑا مقصد حصول علم حدیث اور تکمیل علم حدیث تھا۔ اسلئے جب آپ صاحب حدیث صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت باطنی سے فارغ ہو گئے اسکے بعد آپ نے اس مقصد کیطرف توجہ کی اور حرمین شریفین کے بڑے بڑے علماء و فضلاء سے ملے اور نئے نئے مشائخین سے ملاقاتیں کیں اور ہر طبقہ کے مشائخین سے استفادہ کیا۔ ان گرامی قدر علماء سے نہ صرف آپ نے تکمیل علم

---

۱ القرآن: سورۃ الفجر الآیۃ، ۲۷، ۲۸

۲ القول الجلی، صفحہ ۷۸

۳ ایضاً

حدیث کی بلکہ خرقہ صوفیہ بھی زیب تن فرمایا

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی زندگی کا جو دور انکے سفر حج و تکمیل تربیت کے بعد شروع ہوا وہ اولین دور سے بالکل مختلف تھا۔ سفر حج سے قبل کا دور شاہ صاحب کی تعلیم و تعلم کا دور تھا جسمیں انکی ذات بابرکات پہلے خود اپنی تربیت و تعلیم میں منہمک تھی اور پھر بارہ سال تک دوسروں کو بطور معلم تعلیم دینے میں مصرف رہی۔ لیکن جب آپ سفر حج سے واپس لوٹے تو آپکی شخصیت میں ایک واضح تبدیلی آچکی تھی جو حجاز میں آپکی جسمانی، روحانی اور عقلی تربیت کا نتیجہ تھی اور جس کے بعد آپ ایک محدث، مصنف، مجدد اور مجتہد کی شکل میں ہندوستان میں معروف ہوگئے۔ اور آپکے کارہائے نمایاں کے اثرات انتہائی دور رس ثابت ہوئے۔

عالی استعداد طلباء پر انکے اساتذہ و مشائخ کی گہری چھاپ ہوتی ہے اور اس اصول کے تحت آپکی تصنیفات، تحقیقات اور رجحانات پر ان اساتذہ کا شدید اثر تھا جنسے آپنے دورانِ قیام حجاز تعلیم حاصل کی یا جنکی صحبت میں آپنے اپنی باطنی تربیت مکمل کر کے خرقہ صوفیہ حاصل کیا۔

شاہ صاحب نے مشائخ واساتذہ حرمین کے تعارف و تذکرہ میں ایک مستقل رسالہ تصنیف کیا ہے جسکا نام "انسان العین فی مشائخ الحرمین" ہے۔ اس رسالے میں آپنے اپنے تمام مشائخ کا عموما اور اپنے استاد خاص شیخ ابو طاہر محمد بن ابراہیم الکردی المدنی کا مخصوص طور پر تذکرہ کیا ہے۔

اسکے علاوہ آپکے پھوپھی زاد بھائی اور شاگرد رشید شاہ محمد عاشق پھلتی نے اپنی تصنیف القول الجلی اور شاہ صاحب کے دیگر تذکرہ نگاروں خصوصا رحیم بخش دہلوی نے حیات ولی میں ان اساتذہ کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔ شاہ صاحب کے رجحانات اور تصنیفات کا جائزہ لینے کے لیئے ان اساتذہ کا ذکر بھی ضروری ہے جنکے زیر تربیت آپنے اپنی شخصیت کی تکمیل کی یا جنسے آپکو خرقہ سلاسل صوفیہ اور اسناد حدیث پہنچی ہیں اور جو بالواسطہ شاہ صاحب کی روحانی تربیت کا باعث بنے ہیں۔

شاہ صاحب کے اساتذہ میں چند وہ مشائخ ہیں جنسے آپنے بالمشافہ اجازت حدیث حاصل کی اور علم حدیث کی مختلف کتابیں پڑھیں اور سنیں اور سنا کر تصحیح کی ہے۔ اور اسکے ساتھ ہی عربی ادب و شاعری اور ساتھ ہی علوم باطنی کی سند بھی حاصل کی ہے۔ انکے علاوہ شاہ صاحب کے بالواسطہ اساتذہ وہ بھی ہیں جو آپکے ان اساتذہ کے مشائخ تھے جو اپنے دور میں کاملین شمار کیئے جاتے تھے اور جنکا تذکرہ انسان العین میں شاہ صاحب نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"فقیر ولی اللہ کہتا ہے کہ یہ چند کلمات جنھیں انسان العین فی مشائخ الحرمین کے نام موسوم کیا

گیا ہے حرمین شریفین کے بعض ان مشائخ صوفیا اور علماء محدثین کے حالات پر مشتمل ہیں جن سے اس فقیر کو خرقہ سلاسل صوفیاء اور اسناد حدیث پہنچی ہیں۔ جزاھم اللہ تعالیٰ عنی خیر الجزاء"[۱]

شاہ صاحب نے اپنے قیام حجاز میں جن علماء و مشائخ سے براہ راست علم حدیث و باطنی فیض حاصل کیا ان میں تین نام اہم ہیں:

(۱) شیخ وفد اللہ بن محمد بن محمد بن سلیمان المغربیؒ

(۲) شیخ ابو طاہر محمد بن ابراہیم کردی المدنیؒ

(۳) شیخ تاج الدین قلعی حنفیؒ

ان ہستیوں کے علاوہ جو شاہ صاحب کے دوران قیام حجاز وہاں موجود تھے اور اپنے فیوض و برکات سے لوگوں کو سیراب کر رہے تھے اور جن سے شاہ صاحب کا واسطہ پڑا چند اصحاب کبار وہ ہیں جو ان حضرات کے سلسلہ کے بزرگ گذر چکے تھے اور جن سے بواسطہ مشائخ مندرجہ بالا شاہ صاحب نے فیض حاصل کیا۔ ان حضرات کے مختصر حالات بھی انفاس العارفین میں موجود ہیں :

(۱) شیخ محمد بن محمد بن سلیمان المغربیؒ والد محترم شیخ وفد اللہؒ

(۲) شیخ ابراہیم کردیؒ والد محترم شیخ ابو طاہر محمد کردی المدنیؒ

(۳) شیخ احمد شناویؒ۔ المتوفی ۸/ذی الحجہ ۱۰۲۸ھ/۱۶۱۸ء مدفون جنۃ البقیع مدینہ منورہ

(۴) شیخ احمد قشاشیؒ۔ المتوفی دوشنبہ ۱۰۷۱ھ/۱۶۶۰ء مدفون جنۃ البقیع مدینہ منورہ

(۵) شیخ عبدالرحمٰن ادریسی مشہور بہ المحجوبؒ

(۶) شمس الدین محمد بن علاء بابلیؒ المتوفی ۱۰۷۷ھ/۱۶۶۶ء

(۷) شیخ عیسیٰ جعفری المغربیؒ المتوفی ۱۰۸۰ھ/۱۶۶۹ء

(۸) شیخ حسن عجمیؒ المتوفی ۱۱۱۳ھ/۱۷۰۱ء بمقام طائف

(۹) شیخ احمد نخلیؒ

(۱۰) شیخ عبداللہ بن سالم البصریؒ المتوفی ۴/رجب ۱۱۳۴ھ/۱۷۲۱ء

۱۔ شیخ وفد اللہ بن محمد بن محمد بن سلیمان المغربیؒ

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ حج و زیارت روضہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے فارغ ہونے کے بعد شیخ

---

[۱] انفاس العارفین، صفحہ ۳۷۴

وفداللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

شیخ وفداللہ اپنے زمانہ کے مسلم الثبوت محدث تھے حرمین شریفین کے بڑے بڑے مشائخ وعلماء انکی انتہائی عزت کرتے اور استاذ مانتے تھے آپنے اپنے والد محترم شیخ محمد بن محمد بن سلیمان المغربی سے تعلیم وتربیت حاصل کی جو اپنے دور کے چوٹی کے علماء میں سے تھے اسلئے ظاہر وباطن میں صاحب کمال تھے علم حدیث میں بہت مشہور تھے شاہ صاحب نے شیخ وفداللہ کا تعارف انکے والد کے ذریعہ ہی کرایا ہے چنانچہ لکھتے ہیں :

"اس فقیر (ولی اللہ) نے شیخ مذکور (محمد بن محمد بن سلیمان المغربیؒ) کے صاحبزادے وفداللہ سے ان تمام مرویات کی اجازت لی کیونکہ انہوں نے اپنے والد سے ان تمام مرویات کی قرأت سماعت اور اجازت حاصل کی تھی اس کے علاوہ میں نے مؤطا امام مالک بروایت یحییٰ بن یحییٰ بھی شیخ وفداللہ کے سامنے پڑھی اور انہوں نے مؤطا شیخ حسن عجمی اور دیگر مشائخ سے پڑھی تھی والحمدللہ" [1]

محمد رحیم بخش دہلویؒ نے حیات ولی میں شاہ صاحب کا ایک خط بزبان عربی جو انہوں نے شیخ وفداللہ کو تحریر کیا تھا نقل کیا ہے اس خط سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ شاہ ولی اللہ وفداللہ سے کس قسم کا تعلق رکھتے ہے اور ان سے کیا حاصل کیا۔

المکتوب السادس : من الشیخ العارف الی الشیخ وفداللہ المالکی المکی، بسم اللہ الرحمن الرحیم الحمد للہ و صلی اللہ علی سیدنا محمد والہ وسلم من الفقیر ولی اللہ بن عبدالرحیم العمری الدھلوی عفی عنہ سلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، اما بعد فالمامول من مکارم اخلاقکم ان تدعوا لنا فی مواضع الاجابۃ و اوقاتھا لدیننا ومعیشتنا واولادنا و اصحابنا وقد اخبرنی ولدکم الشیخ حسین انکم

شیخ عارف باللہ مولانا ولی اللہ کا خط شیخ وفداللہ مالکی مکی کے نام بسم اللہ الرحمٰن الرحیم خدا کو سب تعریف ہے اللہ تعالیٰ ہمارے سردار محمدؐ اور ان کی آل پاک پر رحمت وسلام نازل فرمائے فقیر ولی اللہ بن عبدالرحیم العمری الدہلوی کیطرف سے تم پر سلام اور خدا کی رحمت وبرکات کے بعد واضح ہو کہ آپ کے عام اخلاق وبزرگ عادات سے امید ہے کہ ہمارے دین ومعیشت اور اولاد واصحاب کیلئے اپنے اجابت کے اوقات و مواضع میں دعا کریں مجھے آپکے فرزند رشید شیخ حسین سے

[1] انفاس العارفین، صفحہ ۳۸۵، ۳۸۶

اجتمعتم فی صغرلکم بفرید عصره الشیخ محمد بن العلاء البابلی قدس الله سره فاجازکم بما تصح له روایته فان کان الأمر کذلك فهو اسناد عالی جدا فالمرجوا من جنابکم ان یشرحونا بالاجازة مجملة و مفصلة و یخبرونا باسانیدکم العالیة وفوائدکم المنتخبه و مسلسلاتکم المتصله لعل الله یجمعنی وایاکم فی مقام صدق فی زمرة اولیائه و حملة سنة رسوله صلی الله علیه وسلم والحمد لله رب العالمین والسلام ۔[1]

معلوم ہوا کہ آپ نے کم سنی کے زمانہ میں فرید عصر شیخ محمد بن العلا بابلی قدس اللہ سرہ سے ملاقات کی ہے اور انہوں نے آپ کو اپنی تمام مرویات صحیحہ کی اجازت عنایت کی ہے اگر حقیقت میں یہ واقعہ نفس الامری ہے تو وہ ایک نہایت ہی اعلی درجہ کی اسناد ہے مجھے آپ سے امید ہے کہ مجمل و مفصل اجازت سے اس فقیر کو معزز و ممتاز کرینگے اور اپنی اسانید عالیہ اور فوائد منتخبہ اور مسلسلات متصلہ سے اطلاع دینگے شاید خدا تعالی مجھے اور آپ کو مقام صدق میں اپنے اولیاء کے زمرہ میں اور اپنے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے حاملین کے گروہ میں جمع کرے والسلام۔

۲ ۔ شیخ ابو طاہر محمد بن ابراہیم کردی المدنیؒ :

شاہ محمد عاشق پھلتی نے ان الفاظ میں شیخ ابو طاہر سے شاہ صاحب کے حصول علم حدیث کو بیان کیا ہے۔

"حضرت اقدس (شاہ ولی اللہ) کی فطرت میں بچپن سے ہی علم حدیث کی خدمت کا جذبہ تھا اور مدینہ منورہ جو ان علوم کا سرچشمہ تھا آپ نے چاہا کہ جو عالی السند ہو اسی سے کتب حدیث کی روایت نیز سند حاصل کریں چنانچہ شیخ ابو طاہر کردی مدنی کیطرف جو ایک سن رسیدہ بزرگ تھے اور جامع علوم ظاہری و باطنی نیز ثقہ صوفی محدث تھے اور حرمین شریفین میں انکی ٹکر کا کوئی عالم نہ تھا رجوع فرمایا اور بخاری شریف کو پچاس مجالس میں از اول تا آخر سرسری پڑھا کچھ سماعاً کچھ قرأۃً اور پوری مسند دارمی شریف مسجد نبوی میں محراب عثمانی کے قریب آٹھ جلسوں میں سماعت فرمائی اور بقیہ کتابیں شروع سے پڑھ کر اجازت حاصل کی شیخ مذکور نے روز ختم بخاری شریف ایک خاص مجلس منعقد کی اور دعوت طعام دی اور آپکی از حد تعظیم و تکریم کی" [2]

---

[1] حیات ولی صفحہ ۲۸۸

[2] القول الجلی، صفحہ ۶۰

شیخ ابو طاہر ابتدائے عمر سے ہی تحصیل علم کی طرف راغب و متوجہ تھے اور بچپن سے ہی علماء کی صحبتوں اور مجلسوں میں بیٹھنا پسند کرتے تھے شیخ نے کتب عربیہ کی تعلیم سید احمد ادریس مغربی سے حاصل کی جو اپنے زمانے کے سیبویہ کہلائے جاتے تھے اور علوم عربیہ میں اجتہاد کا مرتبہ رکھتے تھے ادب و شاعری میں بے مثل لیاقت رکھتے تھے۔ اتقا و پرہیز گاری میں بیحد مشہور تھے۔ شیخ نے فقہ شافعی شیخ علی طولونی مصری سے، معقولات روم کے مشہور زمانہ متجر عالم منجم باشی سے اور علم حدیث اپنے والد بزرگوار شیخ ابراہیم کردی سے حاصل کیا۔ بعد تکمیل علوم ظاہری پہلے شیخ حسن عجمی کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے فیضیاب ہوئے اس کے بعد شیخ احمد نخلی اور شیخ عبداللہ البصری سے شمائل نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسند امام احمد تمام و کمال پڑھی جس میں صرف دو ماہ کا عرصہ لگا۔ تحصیل علم کا شیخ کو اتنا شوق تھا کہ اسکے واسطے ہمہ وقت تیار رہتے اور عربی و عجمی علماء میں کوئی فرق نہ کرتے۔ چنانچہ آپ نے حرمین شریفین میں ہندوستانی علماء سے بھی جو وقتاً فوقتاً حجاز میں آئے تھے حصول علم حدیث کیا اور ان بیرونی علماء و مشائخ سے بہت کچھ حاصل کیا۔ ان علماء میں ایک شیخ عبداللہ لاہوری تھے جو ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کی تمام کتابوں کی روایت بواسطہ شیخ عبداللہ لبیب کرتے ہیں۔ اسی طرح شیخ عبدالحق دہلوی کی کتابیں بھی آپ نے اسی واسطے سے پڑھیں۔ مولانا سیالکوٹی نے شیخ عبدالحق سے انکی کتابوں کی روایت کی اجازت لی تھی [۲]۔ مولانا سعید کوکنی سے شیخ ابو طاہر نے بعض عربی کتب اور فتح الباری مصنفہ شیخ ابن حجر عسقلانی کا چوتھائی حصہ پڑھا۔ [۳]

مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنی کتاب میں اس سلسلہ کو اسطرح لکھا ہے:

"شیخ عبداللہ لاہوری سے ملا عبدالحکیم سیالکوٹی اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی کتابوں کی روایت کی اجازت پائی شیخ سعید کوکنی سے بعض کتب عربیہ اور فتح الباری کا ایک ربع پڑھا" [۴]

شیخ ابو طاہر نہایت ثقہ اور متقی بزرگ تھے۔ علمی فضل و کمال کے علاوہ سلف صلاحین کے تمام اوصاف آپکے اندر تمام و کمال حد تک پائے جاتے تھے۔ شاہ ولی اللہ انفاس میں تحریر کرتے ہیں:

"بالجملہ متصف بود بصفات سلف صالح از ورع واجتہاد و طاعت واشتغال بعلم وانصاف در مذاکرہ۔ در ادنیٰ مراجعت تا تامل وافی نکردے و تتبع کتب نہ نمودے جواب ندادے" [۵]

فصاحت و بلاغت میں ضرب المثل اور نہایت مشہور تھے حدیث و فقہ اور استنباط مسائل پر گہری

۱۔ قال ابو طاہر قال عبداللہ لاہوری قال عبداللہ لبیب قال عبدالحکیم سیالکوٹی، قال عبدالحق محدث۔

۲۔ انفاس العارفین، صفحہ ۳۹۶-۳۹۸

۳۔ تاریخ دعوت و عزیمت، صفحہ ۱۱۰، جلد ۵

۴۔ انفاس العارفین، صفحہ ۳۹۸

نظر رکھتے مزاجاً نہایت نرم خو اور حلیم تھے رقیق القلب اسقدر تھے کہ احادیث کی تلاوت کے دوران کوئی اس قسم کی حدیث نظر سے گذرتی تو پرنم ہو جاتے اور آنسو آنکھوں سے رواں ہو جاتے نہایت متواضع اور منکسر المزاج تھے طرز معاشرت اور لباس وغیرہ تکلف و بناوٹ سے پاک تھا یہی وجوہات تھین جنکی بناء پر اہل عرب آپکی بیحد عزت کرتے۔

صاحب حیات ولی تحریر کرتے ہیں:

"حضرت شاہ ولی اللہ کا ایک مختصر آرٹیکل اس مقام پر قابل ذکر ہے آپ فرماتے ہیں کہ میں نے علماء حرمین کے اکثر حضرات سے ملاقات کی ہے اور اکثر فضلاء کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں لیکن میں نے کسی کو نہیں دیکھا کہ مکارم اخلاق کے ساتھ جامع علوم ہو بجز شیخ ابو طاہر بن ابراہیم کردی مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے ، شیخ کی فراست ودرایت حقیقت میں خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے جسے میں نے اپنی تالیفات میں بعض مقامات میں ذکر کیا ہے "[۱]

شیخ موصوف نہ صرف علوم ظاہری میں ملکہ رکھتے تھے بلکہ علوم باطنی سے بھی بخوبی آشنا تھے آپ اکثر اوقات طاعت الٰہی اور درس علوم میں مشغول رہنے کے باوجود اپنا کافی وقت کشف ومراقبہ میں گذارتے آپ خود صوفیاء کے بڑے معتقد تھے اور ان پر تنقید کرنے سے محترز رہتے۔

انسان العین میں شاہ صاحب نے اس بارہ میں لکھا ہے

"ایک دن احوال صوفیاء اور انکی باہم تردید و تنقید پر گفتگو چھڑ گئی تو شیخ ابو طاہر نے فرمایا کہ میں صوفیاء کے بارے میں کچھ کہنے سے بہت ڈرتا ہوں "۔[۲]

خود شیخ ابو طاہر شاہ ولی اللہ کی قدر و منزلت سے بخوبی واقف تھے۔ قدر جوہر شاہ داند یا بداند جوہری کے مصداق آپ بھی شاہ صاحب سے نہایت عزت و توقیر سے پیش آتے اور مشکل مسائل تصوف اور معانی و مطالب حدیث ان سے دریافت کرتے الیانع الجنی میں محسن بن یحییٰ الترہتی نے لکھا ہے:

" انه كان يسند عنّى اللفظ و كنت اصحح منه المعنى او كلمة تشبه ذلك "[۳]

شاہ ولی اللہ نے جب شیخ سے اجازت نامہ تحریر کرنے کی درخواست کی تو جو اجازت نامہ آپ نے تحریر کیا اسکے چند اشعار ان کے خیالات کی بخوبی ترجمانی کرتے ہیں شیخ نے لکھا:

---

۱ حیات ولی، صفحہ ۲۳۵

۲ انفاس العارفین، صفحہ ۳۹۹

۳ الیانع الجنی فی اسانید الشیخ عبد الغنی مصنفہ محمد محسن بن یحییٰ الترہتی، صفحہ ۱۱۷، ۱۲۸۶ھ

اجـزتك لكنى مثلـكم من يجيزنى ولم تستفد منـــى ولكـــن تفيدنى
واكثر ما ساويتنى فـيَّ انت فى غنىً عنه بـــــل فـــى جله انت فقنى
فكم حكمةٍ منكم تلقفتها ولم تستفد معشار ما قد افدتينى
وما كنتُ اهلا ان اجيزك انما دعوتَ فليت الله اذ دعوتنى

(میں نے آپ کو اجازت تو دی لیکن آپکی ذات وہ ہے جو مجھے اجازت دے اور آپنے مجھ سے استفادہ نہیں کیا بلکہ مجھے فائدہ پہنچایا ہے اور اکثر باتیں جن میں آپ نے مجھ کو اپنے برابر سمجھا وہ مجھ میں نہیں۔ بلکہ آپ برتر ہیں۔ پس کتنی حکمتیں میں نے آپ سے حاصل کی ہیں اور جو آپکو مجھ سے فائدہ پہنچا ہے وہ اسکا عشر عشیر بھی نہیں جتنا آپ نے مجھے فائدہ پہنچایا۔ اور میں اسکا اہل نہیں کہ آپکو اجازت دوں مگر کیونکہ آپنے مجھ سے کہا (اسلئے اجازت دیدی) یااللہ! کاش کہ میں آپ سے اسکی درخواست کر سکتا!)

ان اشعار کے تحریر کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ ابو طاہر شاہ صاحب کا کتنا لحاظ کرتے تھے اور انکی شخصیت کی بلندی کو کس حد تک سمجھتے تھے .

جب شاہ ولی اللہ رخصت ہو کر مکہ معظّمہ کو روانہ ہوئے تو شیخ صاحب نے اپنے گھر سے بہت دور تک آپکی مشائعت کی۔

شیخ ابو طاہر کی وفات رمضان المبارک ۱۱۴۵ھ میں، شاہ ولی اللہ کی حجاز سے واپسی کے ڈیڑھ دو ماہ بعد ہو گئی، شاہ صاحب نے شیخ کے صاحبزادہ کو ایک تعزیتی خط لکھا جس میں شیخ سے اپنے تعلقات کا تذکرہ کرتے ہوئے غمگین انداز میں ان سے رخصتی کا جو بیان کیا ہے وہ نہایت اثر انگیز ہے شاہ صاحب لکھتے ہیں :

" ولا انسیٰ منه انی لما جد بی الترحالی و فصلت العیر وقاربت الفصال ذکرت له کیت کیت ثم تمثلت له بهٰذا البیت :

نسیت کل طریق کنت اعرفه
الا طریقـــا یؤدینی لـــربعـکم

فاعز ورقت عیناه واحمرت وجنتاه حتی خنقته عبرة البکاء ثم بعد ذٰلك ابتهل فی الدعاء [1]

(میں اس وقت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا کہ جب میرے کوچ کا زمانہ قریب ہوا اور

---

[1] حیات ولی نقل مکاتیب شاہ: خط نمبر ۱، صفحہ ۲۸۱-۲۸۲، انفاس العارفین، صفحہ ۴۰۰

جدائی کی گھڑی سر پر آکھڑی ہوئی اور رخصتانہ ملاقات کے اثنا میں نے انکی مزاج پرسی کے بعد یہ شعر پڑھا :

"یعنی میں بجز ایک رستہ کے جو مجھے تمہاری زمین تک پہنچاتا ہے ان تمام رستوں کو بھول گیا جن سے میں اس سے پیشتر واقف تھا۔ تو آپکی پرنم آنکھوں سے آنسوؤں کی ندیاں بہنے لگیں اور دونوں رخسار سرخ ہوگئے یہاں تک گریہ سے آپکا حلق گھٹ گیا اس کے بعد آپ نے نہایت خلوص کیساتھ اس عاجز کیلئے دعا کی "۔

اس واقعہ کا تذکرہ شاہ صاحب نے انسان العین میں بھی کیا ہے۔

۳۔ شیخ تاج الدین قلعی حنفی:

شیخ تاج الدین قلعی حنفی مفتی مکہ تھے آپکے والد قاضی عبدالمحسن نے بچپن سے ہی آپکو مشائخ کی خدمت میں زانوئے ادب طے کرنے کیلئے بھیج دیا تھا جہاں آپ نے بہت سے علماء سے علم حدیث حاصل کیا نیز علوم وفنون مروجہ میں بھی کمال حاصل کیا۔ اہل مکہ آپکی بیحد عزت کرتے تھے آپ فقہ حنفی کے زبردست عالم اور دوسرے باز وشمار کئے جاتے تھے ابتدائی تعلیم سے فراغت کے بعد والد بزرگوار نے شیخ محمد بن محمد بن سلیمان مغربی کی مجلس درس میں بھیجا جہاں اس وقت سنن نسائی کا درس ہو رہا تھا شیخ مغربی نے کتاب کے ختم کے بعد تمام حاضرین کو جن میں شیخ تاج الدین بھی شامل تھے اجازت دی لیکن شیخ تاج الدین نے حدیث کی زیادہ تر کتابیں عبداللہ بن سالم بصری سے پڑھیں۔ صحیح بخاری و مسلم شیخ عجمی (یا عجیمی) سے پڑھیں اس کے بعد آپ نے شیخ صالح زنجانی کی خدمت میں رہ کر علم کی باریکیاں دریافت کیں، ان کے علاوہ شیخ احمد نخلی اور شیخ احمد قطان بھی آپکے استاد رہے، ان متبحر علماء کی صحبت میں شیخ تاج الدین علوم وفنون میں کامل ہوگئے.

شیخ مزاجاً بہت منکسر المزاج تھے چنانچہ جب آپکے استاد شیخ احمد قطان مالکی کا وصال ہوگیا تو تمام مشائخ نے ملکر آپ سے کعبہ کے سائے میں مصلیٰ مالکی پر بیٹھ کر شیخ قطان کی جگہ درس حدیث دینے کو کہا آپ نے اس منصب عظیم کیلئے اپنے آپ کو تیار نہیں سمجھا اور صاف انکار کردیا، لیکن پھر جب شیخ عبداللہ بصری، اور شیخ احمد نخلی جیسے علماء نے آپ سے پرزور انداز میں استاذ کی کرسی سنبھالنے کی سفارش کی اور مزید برآں یہ کہ شیخ حسن عجمی نے بھی آپ سے کہا تو آپ مجبور ہوگئے اور شیخ احمد قطان کی جگہ بیٹھ کر درس بخاری شروع کیا۔

شاہ ولی اللہ جب شیخ تاج الدین حنفی کی خدمت میں پہنچے تو بخاری شریف کا درس ہو رہا تھا تین دن آپنے برابر درس میں شرکت کی اور بخاری شریف کی سماعت کی اسکے علاوہ صحاح ستہ کے بعض مشکل مقامات اور مؤطا امام مالک اور مسند دارمی، کتاب الآثار اور مؤطا امام محمد کی بھی سماعت کی ان مجالس کے بعد شیخ تاج الدین نے تمام اہل مجلس کے ساتھ آپکو بھی ان کتابوں کی اجازت دی بلکہ شیخ صاحب نے ازراہ کرم خصوصیت کیساتھ شاہ صاحب کیلئے علیحدہ بھی تحریری اجازت نامہ لکھا۔

شیخ تاج الدین بڑے پائے کے عالم تھے اور متعدد علوم میں کمال کا درجہ رکھتے تھے تفسیر، حدیث، فقہ، سیر، ایام العرب کے گویا کہ حافظ اور عربی ادب میں ماہر فن تھے فصاحت و بلاغت کے متعلق بڑے بڑے شعراء کی غلطیاں بتادیتے تھے کہ یہاں اس طرح ہونا چاہئے شیخ میں وہ تمام خوبیاں اور کمال مجتمع تھے جو ایک نیکوکار عالم میں ہونے چاہیں مگر باوجود ان کمالات کے جنہوں نے مشائخ و علماء میں آپکا لوہا منوالیا تھا آپ نہایت سادہ مزاج تھے بناوٹ اور تکبر نام کو نہ تھا مذہبی عقائد میں مستحکم اور بزرگان دین سے خاص تعلق رکھتے تھے ۱۱۱۴ھ / ۱۷۰۲ء میں سفر آخرت کیا۔

وہ مشائخ جن سے شاہ صاحب کو بالواسطہ فیض حاصل ہوا:

انسان العین میں شاہ صاحب نے ان مشائخ کا تذکرہ کیا ہے جنکے فیض نسبت سے انکو خرقہ صوفیا اور اجازت حدیث ملی، ان میں دو اصحاب تو ان اساتذہ کے والد ہیں جن سے شاہ صاحب نے بلا واسطہ علم حاصل کیا یعنی شیخ ابراہیم کردی جو شیخ ابو طاہر کردی کے والد ماجد ہیں اور دوسرے شیخ محمد بن محمد بن سلیمان المغربی جو شیخ وفد اللہ کے والد محترم ہیں۔

شیخ ابو طاہر مدنی کے والد ماجد شیخ ابراہیم کردی محدث اور صاحب سلسلہ صوفی تھے (جن کا ذکر آگے آئے گا) عبدالرحیم ضیاء صاحب نے اپنی کتاب مقالات طریقت کے باب پنجم [۱] میں مختلف سلاسل صوفیاء کا تذکرہ کیا ہے جن سے شاہ صاحب کے صاحبزادہ شاہ عبدالعزیز کو شاہ ولی اللہ کے سلسلہ سے خرقہ و خلافت ملی انمیں اکثر سلاسل کی خلافت شیخ ابو طاہر مدنی کے ذریعہ شاہ ولی اللہ کو ملی ہے جسے شیخ نے حکم "ان تودوا الامانات الی اھلھا" [۲] کے مطابق شاہ صاحب کو دی اور کلاہ سلاسل و خرقہ، منبر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب آپ کے سر پر باندھا۔ یہ خرقہ واجازت شیخ ابو طاہر کو انکے والد شیخ ابراہیم کردی کے ذریعہ ان مشائخ و صوفیاء کرام سے حاصل ہوئی جن کے سلسلہ کا تذکرہ "الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ" میں

---

[۱] مقالات طریقت، صفحہ ۱۴۸-۱۹۲

[۲] القرآن، سورۃ النساء، الآیۃ، ۵۸

خود شاہ صاحب نے کیا ہے۔

ان سلاسل میں ، قادریہ (اکبریہ)، نقشبندیہ (جامیہ و کبرویہ)، سہروردیہ (کبرویہ، بزغشیہ)، مداریہ وغیرہ کا خرقہ خلافت شاہ ولی اللہ کو جس سلسلہ سے ملا ہے اس میں اول چار کڑیاں اسطرح ہیں۔

"خلافت ملی شاہ ولی اللہ کو اپنے استاد شیخ ابو طاہر مدنی سے، انکو اپنے والد شیخ ابراہیم کردی سے، انکو امام احمد قشاشی سے، انکو شیخ احمد شناوی سے۔۔۔ الخ [1]

دیگر سلاسل مثلاً شاذلیہ، شطاریہ، مدینیہ (مغاربیہ، عیدروسیہ) وغیرہ کا خرقہ شاہ صاحبؒ کو دیگر مشائخ کی نسبت سے ملا ہے۔ اس طرح دیگر مشائخ بھی شاہ صاحب کے ظاہری و باطنی شیوخ ہیں جنکا فیض سلسلہ بہ سلسلہ شاہ صاحب تک پہنچا یہ تمام حضرات بڑے پایہ کے بزرگ گذرے ہیں اور انکے روحانی اثرات نے شاہ صاحب کے باطن کو مزید جلا بخشنے کا کام انجام دیا اس لئے یہاں پر انکا مختصر تذکرہ موضوع کو واضح کرنے میں مددگار ثابت ہوگا۔

(۱) شیخ ابراہیم کردی:

شیخ ابراہیم کردی شاہ ولی اللہ کے استاد شیخ ابو طاہر المدنی الکردی کے والد محترم اور بالواسطہ سلسلۂ شیوخ کی پہلی کڑی ہیں آپ زبردست عالم اور عارف تھے اور فقہ شافعی و حدیث کے ساتھ ہی عربی ادب میں بھی پوری مہارت رکھتے تھے آپ فارسی، کردی، ترکی زبانیں بھی بخوبی جانتے تھے آپ نے اپنے وطن میں تکمیل علم کے بعد مزید علم حاصل کرنے کے واسطے سفر کا ارادہ کیا اور حج بیت اللہ کے ارادہ سے گھر سے نکلے تقریباً دو سال بغداد میں مقیم رہے جہاں شیخ عبدالقادر قدس سرہ کے مزار مبارک پر حاضری دیتے، وہیں سے آپ کو راہ معرفت کا ذوق پیدا ہوا چنانچہ آپ شام و مصر ہوتے ہوئے حرمین شریفین تشریف لائے یہاں آپکی ملاقات شیخ احمد قشاشی سے ہوئی شیخ قشاشی کی صحبت میں دونوں حضرات کو ایک دوسرے سے ایک خاص قسم کی انسیت اور روحانی رابطہ پیدا ہو گیا اور اس کی بدولت شیخ ابراہیم نے شیخ قشاشی سے خرقہ صوفیہ حاصل کیا اور حدیثیں روایت کیں اور انکی صحبت میں کمالات عالیہ پر ترقی کی۔

ایک مرتبہ شیخ قشاشی کی مجلس میں حدیث مبارکہ

" ما علیٰ احدکم ان یکون فی بیته محمد و محمد ان ثلثة"

کا ذکر ہوا شیخ ابراہیم کا قول ہے کہ "شیخ کی زبان سے یہ حدیث سنکر میرے دل میں یہ آیا کہ اللہ تعالیٰ مجھکو تین فرزند عطا کرے گا جن میں ہر ایک کا نام محمد ہوگا۔ ساتھ ہی یہ بھی خیال ہوا کہ ایک دوسرے سے کس

---

[1] الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ مصنفہ شاہ ولی اللہ دہلوی، مترجمہ سید ظہیر الدین، فصل اول، صفحہ ۱۶، ۱۹، ۱۹۹، دہلی، ۱۳۱۱ھ

طرح ممیز کیا جائیگا؟ شیخ قشاشی نے باطنی فراست سے میرا خیال تاڑ لیا اور فرمایا:

" تکنی احدکم ابا سعید والثانی ابا الحسن و الثالث ابا الطاهر "

چنانچہ ایسا ہی ہوا یہ تیسرے صاحبزادہ ابو طاہر مدنی شاہ ولی اللہ کے استاد تھے۔[۱]

شیخ ابراہیم علمی تبحر، زہد و تقویٰ، فہم و فراست کیساتھ ساتھ اخلاق حمیدہ مثلاً تواضع انکساری، حلم وغیرہ سے بھی بکمالہ متصف تھے۔

شاہ ولی اللہ انسان العین میں لکھتے ہیں :

"شیخ ابراہیم کی سیرت یہ تھی کہ وہ خود پسند فقہاء اور صوفیاء کیطرح بڑے بڑے عمامے لمبی آستینیں اور پھٹے پرانے لباس سے بیزار تھے آپ اہل حجاز کی طرح متوسط لباس پہنتے تھے جو مختصر سی پگڑی، اون کی دھاری دار عباء اور بڑے رومال پر مشتمل ہوتا آپ کبھی کسی محفل میں نمایاں جگہ بیٹھنے اور گفتگو میں پہل کرنے کے ذریعہ اپنی حیثیت کا اظہار نہیں فرماتے تھے اگر کوئی ان سے کسی مسئلہ کے بارے میں سوال کرتا تو توقف فرماتے یہانتک کہ تحقیق و انصاف کیساتھ اس اشکال کو حل کر دیتے۔"[۲]

آپکی تاریخ وفات اس زمانہ کے ایک خطیب نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول سے نکالی ہے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صاحبزادے ابراہیم کی وفات پر فرمایا تھا:

" واللہ انا علیٰ فراقك یا ابراهیم لمحزونون "

۱۰۷۱ھ / ۱۶۶۰ء

(۲) شیخ احمد قشاشی:

شیخ احمد قشاشی محمد بن یونس القشاشی المعروف بہ عبدالنبی بن شیخ احمد الدجانی کے فرزند ہیں شیخ یونس کو عبدالنبی اس لئے کہا جاتا تھا کہ وہ لوگوں کو اجرت دیکر مسجد میں بٹھاتے تاکہ وہ نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و صلوٰۃ پڑھیں اور قشاشی کا لقب اس لئے ملا کہ آپ خود کو پوشیدہ رکھنے کی خاطر مدینہ منورہ میں پرانے سامان مثلاً پرانے دوات قلم پرانی جوتیاں وغیرہ کم قیمت پر فروخت کرتے تھے عربی میں قشاشہ پرانے "سیکنڈ ہینڈ' سامان کو کہتے ہیں۔ آپکے والد بزرگوار شیخ محمد المدنی بھی بڑے عالم اور مرد صالح تھے شیخ احمد قشاشی علم حقیقت و شریعت کے امام تھے حقائق معرفت اور روحانیت کے بارے میں بھی آپکی گفتگو

---

۱ حیات ولی، صفحہ ۲۴۳

۲ انفاس العارفین، صفحہ ۳۸۸

آیات و احادیث سے مدلل ہوتی تھی آپ نے متعدد مشائخ وقت سے فیض صحبت حاصل کیا مگر خرقہ خلافت اپنے والد سے ہی حاصل کیا۔

شیخ احمد قشاشی تلاش مشائخ کے سلسلہ میں دور دراز کا سفر کرتے ہوئے جب جدہ پہنچے تو حالت کشف میں آپکو شیخ احمد شناوی کیجانب سے اشارہ ملا جس سے اندازہ ہوا کہ شیخ احمد شناوی مرتبہ تکمیل کو پہونچ گئے ہیں مگر ان سے اکتساب فیض کرنیوالا کوئی نہیں چنانچہ آپ فوراً شیخ احمد شناوی کی خدمت میں پہونچ گئے انہوں نے انکو دیکھتے ہی نہایت مسرت سے کہا :

" مرحبا بمن جاء یقتبس منّا علومنا "

اے ہمارے علوم کو حاصل کرنے کیلئے آنے والے خوش آمدید۔

حقیقت میں آپنے روحانی کمال شیخ احمد شناوی کے فیضان صحبت سے ہی حاصل کیا اور یہی وجہ تھی کہ آپ شیخ احمد شناوی کے معنوی فرزند کی حیثیت سے خود کو انکی جانب منسوب کرتے اور اس پر فخر کرتے تھے۔

شیخ احمد قشاشی کا طرز معاشرت نہ تو فقہائے زمانہ کے طرز پر تھا اور نہ زاہدان خشک کی وضع پر بلکہ عین سنت کے مطابق بناوٹ سے عاری سادہ مزاجی اور اعتدال پر منحصر تھا، آپ امراء کے یہاں کبھی نہ جاتے مگر اگر کوئی ملاقات کو آتا تو خوش خلقی اور بشاشت سے ملتے اور اسکی قدر و منزلت کے مطابق سلوک فرماتے قوم کے سردار کی عزت کرتے اور اسکو نیکی کی تلقین نرمی سے کرتے تھے۔

آپ نے ۹ ذی الحجہ ۱۰۷۱ کو مدینہ منورہ میں انتقال فرمایا اور جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔

(۳) شیخ احمد شناوی:

آپ" علی بن عبدالقدوس بن محمد عباس شناوی کے فرزند ہیں شیخ احمد اور انکے آباء واجداد اولیائے کبار میں سے گذرے ہیں شیخ نے علم حدیث شمس رملی اور اپنے والد بزگوار سے پڑھا اور سید غضنفر اور شیخ محمد بن ابی الحسن بکری سے حدیثیں روایت کیں خرقہ خلافت اپنے والد سے حاصل کیا اور اسکے بعد سید صبغۃ اللہ کی خدمت میں حاضر ہو کر انکے ہاتھوں سے بھی خرقہ خلافت پہنا فیض حاصل کیا اور انکے ممتاز خلیفہ ہوئے۔

آپ کا انتقال ۱۰۲۸ھ بمطابق ۱۶۱۸ء میں مکہ میں ہوا اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

(۴) محمد بن محمد بن سلیمان المغربی:

آپ مکہ مکرمہ میں شاہ ولی اللہ کے استاد شیخ وفد اللہ کے والد ماجد تھے شاہ صاحب نے انسان العین

میں شیخ وفد اللہ کا تذکرہ انکے قابل تعظیم والد شیخ محمد بن محمد بن سلیمان المغربی کے ضمن میں کیا ہے۔

شیخ محمد علم حدیث میں وہ مقام رکھتے تھے کہا کہ اہل حرمین کے استاد کہلائے جاتے تھے اور شیخ الحدیث کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے آپ حافظ حدیث ہونے کے ساتھ ساتھ علم وریاست اور دین ودنیا دونوں کے فنون کے جامع تھے۔ کتب حدیث کا تصحیح شدہ نسخہ بتونیہ جو آپ نے اسلامبول (استنبول) سے تین ہزار درہم میں خریدا تھا اس نسخہ کا حرمین میں تعارف آپ ہی کے ذریعہ ہوا اس نسخہ کو آپ اسقدر عزیز رکھتے کہ ایک مرتبہ جب مکہ مکرمہ میں سیلاب آیا اور حرم میں پانی بھر گیا تو آپنے اپنے اسباب کا خیال نہ کرتے ہوئے صرف اس نسخہ کو اپنے سر پر اٹھالیا اور اسکو سر پر رکھے ہوئے طواف میں مصروف ہوگئے تاکہ اسکو کوئی گزند نہ پہنچے جسطرح شیخ محمد علم روایت میں کمال رکھتے تھے اسی طرح تدبیر معاش میں بھی انکو کمال حاصل تھا جسکے ذریعہ سارے مکہ معظّمہ کا نظام کار انکے ہاتھوں میں آگیا تھا۔

علم شریعت کے ساتھ ہی شیخ موصوف علم طریقت کے اسرار ورموز سے بخوبی واقف تھے آپنے مشہور بزرگ شیخ ابومدین کے ہاتھ پر بیعت کی اور انسے خرقہ حاصل کیا، شیخ تاج الدین قلعی جو اس عہد کے فاضل اجل اور شاہ ولی اللہ کے استاد بھی تھے انکا قول ہے کہ شریعت وطریقت اور علم حدیث کے علاوہ شیخ محمد صناعات عجیبہ اور علوم غریبہ میں بھی ماہر فن تھے حدیث وتفسیر کے علاوہ انشاء پردازی اور فصاحت و بلاغت میں خاص مقام رکھتے تھے، ادب وشاعری میں بھی اپنی مثال تھے اللہ تعالیٰ کیجانب سے آپکو دولت و ثروت میں بھی وافر حصہ ملا تھا، اس تمول کیساتھ آپ اعلیٰ درجہ کے فیاض تھے آپنے اپنے صاحبزادہ شیخ وفد اللہ کو تمام مرویات کی اجازت دی جس کی اجازت شیخ وفد اللہ نے شاہ ولی اللہ کو دی۔

ان مشائخ وعلمائے کرام کے علاوہ شاہ ولی اللہ نے اپنی تصنیف "انسان العین" میں گیارہویں صدی ہجری کے متعدد علمائے کرام کا تذکرہ کیا ہے جو علم شریعت وطریقت، علم حدیث اور دیگر علوم وفنون میں صف اول کے لوگ شمار کئے جاتے تھے۔

(۵) سید عبدالرحمٰن ادریسی المحجوب:

ان ہی حضرات میں مغرب کے شہر مکناسہ کے سید عبدالرحمٰن ادریسی المحجوب تھے جو مصر روم اور شام ہوتے ہوئے حرمین تشریف لائے اور کئی برس یہاں قیام کیا اس کے بعد یمن تشریف لے گئے وہاں سے واپسی میں مکہ معظّمہ میں مستقلاً سکونت اختیار کرلی جہاں بہت سے لوگوں نے ان سے فیض حاصل کیا اور خرقہ، صوفیاء زیب تن کیا یہ بزرگ شیخ احمد قشاشی کے ہم عصر تھے انکا لقب المحجوب ہونے کی توجیہ یہ بیان

کی جاتی ہے کہ دوران سماع چہرے کو ڈھانپ لیتے تھے اور جب گرمی شوق کے آثار ظاہر ہوتے تو چہرے سے نقاب ہٹا لیتے اس وقت چہرے پر تجلیات اور انوار کے اثرات ظاہر ہوتے جنکا اثر اہل مجلس پر بھی پڑتا۔

(۶) شیخ عیسی المغربی:

آپکی پیدائش اور نشو و نما بھی مغرب میں ہوئی، مغرب کے مختلف ممالک میں دس سال تک علوم مروجہ میں تبحر حاصل کیا اسکے بعد قسطنطنیہ مصر اور حرمین کے علماء سے بھی روایت کی پھر مکہ مکرمہ کو مستقل وطن بنالیا آپنے مقالید الاسانید کے نام سے ایک معجم بھی تصنیف کی آپ ایک متقی عالم اور جمہور اہل حرمین کے استاذ اور حدیث و قرأت کے امام تھے آپ سلسلہ شاذلیہ سے باقاعدہ منسلک تھے آپکا انتقال ۱۰۸۰ھ میں ہوا۔

(۷) شمس الدین محمد بن العلاء بابلی:

آپ حافظ حدیث اور اپنے زمانہ میں مصر اور حرمین کے استاد تھے پسندیدہ اخلاق مثلاً تواضع اخلاق و محبت اور ذکاوت سے متصف تھے مؤطا، صحیح بخاری اور دیگر کتب حدیث میں آپکے پاس مسلسل اسناد تھیں قرآن مجید کی تلاوت آپکا معمول تھا آپ نے ۱۰۷۷ھ میں انتقال کیا۔

شیخ شمس الدین نے تصنیف و تالیف کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

" لا یؤلف احدتالیفا الا فی احد اقسام سبعة، اما ان یؤلف فی شئی لم یسبق الیه احد او شئی ناقص یتممه او شئی مغلق یشرحه او طویل یختصره دون اَن یبخل من معانیه بشئی او شئی مختلطا یرتبه او شئی اخطاء فیه مصنف قبله او شئی متفرق یجمعه و الا کا ن اضاعة الوقت ".

کسی کو کوئی تصنیف و تالیف نہیں کرنی چاہئے سوائے ان سات اقسام کیوجہ سے: اول یہ کہ کسی موضوع کے بارے میں لکھے جسکے بارے میں پہلے کسی نے کچھ نہ لکھا ہو یا کوئی موضوع ناقص ہو جسکی تکمیل کرے یا کوئی موضوع مشکل اور ناقابل فہم ہو جسکی تشریح کرے یا طویل ہو جسکا اختصار کرے لیکن معانی میں کمی نہ کرے یا کوئی چیز الٹ پلٹ ہو جسکو ترتیب دے یا کوئی موضوع جسمیں اس سے پہلے مصنف نے غلطی کی ہو یا کوئی چیز جو متفرق ہو اسکو جمع کرے انکے علاوہ اور کچھ (لکھنا) تضیع اوقات ہے۔

شاہ ولی اللہ کی تصانیف میں یہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو انکی اس تربیت کا نتیجہ ہیں جو ان شیوخ

اور علمائے کرام کی بالواسطہ (بذریعہ تصانیف، تلامذہ، یا اخلاف) یا بلاواسطہ صحبت سے آپکو میسر آئی، اسی بناء پر ان علماء اور شیوخ کا تذکرہ آپ نے 'انسان العین" میں کیا۔

(۸) شیخ حسن عجمی:

شیخ حسن عجمی ابو طاہر کردی کے استاد تھے اور شیخ قشاشی شیخ محمد بن العلاء بابلی شیخ عیسی مغربی جیسے بلند پایہ صوفیائے کرام کے ہم عصر تھے اور انمیں سے اکثر کی صحبت میں رہے آپ شیخ الحدیث جامع علوم وفنون اور فصاحت، ذکاوت اور تیزی فہم کے پیکر تھے شیخ یوں تو حنفی تھے مگر دوران سفر ظہر وعصر اور مغرب وعشاء میں جمع کرتے تھے اور فاتحہ خلف امام بھی پڑھتے تھے اور حنفی مسلک کی آسانیوں ورخصت کی تلقین کرتے تھے۔ [۱]

شاہ ولی اللہ تحریر کرتے ہیں :

"کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کہتا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ شیخ عجمی باوجود حنفی ہونے کے تمام امور میں ایک معین فقہی مسلک کی پیروی ضروری نہیں سمجھتے تھے بلکہ فریقین کے ہاں کسی حقیقت ممتنعہ کے ثابت ہونے یا نہ ہونے کی پرواکئے بغیر وہ تمام فقہی مکاتب سے اقوال لے لیا کرتے تھے واللہ اعلم" [۲]

آپنے ۱۱۱۳ھ میں طائف میں انتقال فرمایا اور حضرت ابن عباسؓ کے مزار کے قریب مدفون ہوئے۔

(۹) شیخ احمد نخلی:

شاہ ولی اللہ کو جن صوفیاء سے شطاریہ، مدینیہ، شاذلیہ وغیرہ کے سلسلوں میں خرقہ واجازت ملی ان سلسلوں میں شیخ احمد نخلی کا اسم گرامی بھی نظر آتا ہے جو شیخ ابو طاہر کردی کے استاد تھے یہ سلسلے اس طرح بیان کئے گئے ہیں :

"پس ملی خلافت اس طریقہ کی شاہ ولی اللہ کو شیخ ابو طاہر مدنی سے ان کو شیخ الحرام مکی شیخ احمد نخلی اور شیخ عبداللہ سالم البصری سے انکو شیخ عیسیٰ مغربی سے... [۳]

شیخ احمد نخلی علوم ظاہری وباطنی دونوں کے جامع تھے آپ متعدد مشائخ طریقت اور علماء شریعت کی

---

[۱] حدائق الحنفیہ، صفحہ ۴۵۶

[۲] انفاس العارفین، صفحہ ۳۸۹

[۳] مقالات طریقت، صفحہ ۱۷۹-۱۸۴

صحبتوں سے فیض یاب ہوئے آپنے سید عبدالرحمٰن المحجوب، سید محمد رومی جیسے صوفیائے کرام سے خرقہ خلافت حاصل کیااور محمد بن العلاء بابلی، شیخ عیسی مغربی جیسے محدثین علماء سے بخاری شریف اور مؤطا کی سماعت میں تسلسل حاصل کیا آپکا مشائخ کے کئی خانوادوں سے تعلق تھا آپ علم اور عالموں کی صحبت میں حاضری کی طرف مائل ہونے کیساتھ ہی صوفیا کرام سے عقیدت مندی اور انکے اعمال واوراد پر ثابت قدم رہے، آپکو مکہ مکرمہ میں خاص درجہ حاصل تھااور آپ کے ہم عصر اور مکہ کے عوام آپکو شیخ الحرام مکی کے خطاب سے مخاطب کرتے اور اپنے حق میں دعائے خیر کے طالب ہوتے، آپ برکت اور استجابت دعوات میں مشہور ومعروف تھے۔ [۱]

شیخ احمد نخلی نے عمر دراز پائی، آپکے صاحبزادہ شیخ عبدالرحمٰن نخلی کی روایت کے مطابق یہ واقعہ بھی ایک دوسرے بزرگ شیخ تاج سنبھلی کی دعاء اور کرامات کا نتیجہ تھا جسکی بناء پر انکے والد کی عمر میں اضافہ انکے دادا (یعنی شیخ احمد نخلی کے والد) کی عمر میں کمی کا باعث ہوگیا شیخ تاج سنبھلی کی دعاء کے نتیجہ میں شیخ احمد کی عمر نوے سال کی ہوئی جبکہ انکے والد اس دعا کے تین ماہ کے اندر وفات پاگئے۔

شیخ احمد نخلی طریقۂ نقشبندیہ کی طرف مائل تھے جسکی جانب رسول عربی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے خواب میں فرمایا تھا:

" هٰذه سجادة الشيخ تاج اجلس عليها "

(۱۰) شیخ عبداللہ بن سالم البصری ثم المکی:

شیخ عبداللہ نے نایاب کتب حدیث کی تلاش، جمع، ترویج واشاعت کا زبردست کام انجام دیا مسند احمد جسکا روئے زمین پر کوئی مکمل نسخہ ملنا محال تھا آپ نے مصر وشام وعراق وغیرہ کے علمی خزانوں اور ذخیرہ ہائے کتب سے اس کے پراگندہ اوراق جمع کئے اور انکو ایک مکمل نسخہ کی شکل میں مرتب کیااور تصحیح وتقابل کے بعد اسکو نقل مطابق اصل قرار دیکر اسکی اشاعت کی، اسکے علاوہ صحاح ستہ کی روشنی میں آپنے اصول وضع کئے اور انکے مطابق اسکے مختلف نسخوں کا مجموعہ مرتب کیا، نسخہ بنونیہ از سر نو بہتر انداز میں لکھا، آپنے صحیح بخاری شریف کی شرح بھی "ضیاء الساری" کے نام لکھنی شروع کی جس کو بڑھاپے اور کمزوری کی بناء پر مکمل نہ کرسکے، الغرض واقعتاً آپ اس آخری دور کے حافظ الحدیث تھے آپ نے بھی طویل عمر پائی اور ۴/رجب ۱۱۳۴ھ کو مکہ معظمہ میں انتقال کیا۔

---

[۱] انفاس العارفین، صفحہ ۳۹۲، حیات ولی، صفحہ ۱۵۶

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ۱۱۴۴ھ کا پورا سال اپنی باطنی تربیت اور ظاہری حصول علم کے واسطے علماء و شیوخ کی صحبت میں گذارا اور اساتذہ و شیوخ حرمین سے اکتساب فیض کیا اس دوران آپ نے مشہور خانوادہ ہائے صوفیاء سے خرقہ واجازت حاصل کی اور خود کو آنے والے زمانہ کی کارگذاریوں کیلئے تیار کیا انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ میں تحریر فرماتے ہیں :

"در عالم ظاہر ایں فقیر را از جہت بیعت و صحبت و خرقہ واجازت و تلقین اشغال ہمہ ایں امور یا بعض ایں امور با جمیع خانوادہ ہائے طریقہ کہ امروز بروئے زمین مشہور اند یا اکثر آنہا ارتباط واقع شدہ است والحمد للہ از انجملہ درین رسالہ سند خانوادہ ہائے مشہورہ می نویسد بالجملہ طریقہ قادریہ مشہور ترین طرق است در عرب و ہندوستان و نقشبندیہ در ہندوستان وماوراء النہر شہرت تمام دارد ودر حرمین شریفین نیز شائع شدہ وچشتیہ در ہندوستان بسیار مشہور است وسہروردیہ در نواحی خراسان و کشمیر و سندھ وکبرویہ در توران وکشمیر وشطاریہ در ہندوستان وشاذلیہ در مغرب ومصر وسودان و مدینیہ فی الجملہ در مغرب وعیدروسیہ در حضر موت انتہی"[1]

اس ظاہری دنیا میں اس فقیر نے ان معاملات یا انمیں سے بعض معاملات میں بیعت، صحبت، خرقہ واجازت و تلقین اشغال طریقت کے تمام خانوادوں (سلسلوں) سے جو روئے زمیں پر مشہور ہیں یا ان میں سے اکثر سے تعلق پیدا کیا ہے اور الحمد للہ اس سلسلہ میں تمام خانوادوں سے سند حاصل کی ہے بالجملہ تمام طریقوں میں طریقہ قادریہ عرب اور ہندوستان میں مشہور ترین ہے، نقشبندیہ ہندوستان اور ماوراء النہر میں شہرت رکھتا ہے اور حرمین شریفین میں بھی رائج ہے اور چشتیہ ہندوستان میں بہت مشہور ہے سہروردیہ نواحی خراسان کشمیر وسندھ اور کبرویہ توران اور کشمیر میں اور شطاریہ ہندوستان وشاذلیہ مغرب ومصر وسوڈان اور مدینیہ تمام مغرب اور عیدروسیہ حضر موت میں رائج ہیں"۔

چنانچہ جو خرقہ شیخ ابو طاہر نے مدینہ منورہ میں آپ کو عنایت کیا وہ حقیقت میں بالواسطہ و بلا واسطہ تمام صوفیاء کے خرقوں کا جامع وحاوی تھا۔

حضرت شاہ ولی اللہ اس ظاہری و باطنی فیضان سے خاطر خواہ حظ وافر حاصل کرنے کے بعد ۱۱۴۴ھ کے ذی الحجہ میں دوسرے حج کیلئے تیار ہوئے ۱۵ر شعبان ۱۱۴۴ھ کو مکہ معظّمہ پہنچکر عمرہ فرمایا ماہ رمضان

---

[1] الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ، فصل اول، صفحہ ۹

المبارک میں متعدد عمرے کئے اور آخر عشرہ میں بیت اللہ کے سامنے مسجد حرام میں اعتکاف کی نیت سے قیام کیا، اسی دوران جو فیوض ظاہری و باطنی آپ حاصل کرتے رہے انکو بیان کرنے کے لئے آپنے رسالہ فیوض الحرمین تصنیف کیا جسمیں وہ تمام حالات و حقائق و معارف و اسرار جو حرمین شریفین میں آپ پر وارد ہوئے تھے تحریر کئے۔ بعد ازاں حج ثانی فرما کر وطن کے جانب قصد مراجعت کیا۔

ہندوستان اس زمانہ میں ایک نازک دور سے گذر رہا تھا۔ یہاں امن و امان کے حالات نہایت غیر تسلی بخش بلکہ خطرناک تھے۔ سلطنت مغلیہ زوال پذیر تھی غیر ملکی طاقتوں کا اثر و رسوخ روز بروز بڑھتا چلا جارہا تھا۔ دین اور دینی مراکز کی حالت انتہائی خستہ ہو چکی تھی۔ حدیث اور قرآن کی اشاعت و رغبت کے بجائے بدعات میں روز افزوں اضافہ ہو رہا تھا اور ان سب حالات کا حضرت شاہ ولی اللہ کو بخوبی علم تھا۔ دوسری جانب فن حدیث کی طرف شاہ صاحب کا خصوصی لگاؤ' حرمین شریفین میں اسکی تعلیم و تدریس و اشاعت کے آسان مواقع' علماء و مشائخ کی صحبتوں سے کسب فیض اور طلباء کو مستفید کرنے کا امکان جو دنیا کے کونے کونے سے مرکز عرب کیجانب چلے آتے تھے اور ان سب باتوں سے بڑھ کر جوار نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت و سعادت شاہ ولی اللہ کو عرب میں روکنے اور مستقلاً ہجرت کی نیت سے قیام کرنیکا محرکات تھے اور اسکا سبب بھی۔ لیکن ان باتوں کے باوجود آپنے ہندوستان واپس آنے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلہ کے نتیجہ میں شاہ صاحب کے ہاتھوں وہ کارہائے نمایاں انجام پذیر ہوئے جنکا اللہ تعالیٰ نے انکے ذریعہ ظہور انکے لیے مقدر اور باعث خیر رکھا تھا۔ اللہ تعالیٰ کو ہندوستان بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے لئے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی صورت میں ایک مجتہد اور مجدد بھیجنا تھا اسکے واسطے خود اللہ تعالیٰ نے مبشرات (سچے خواب) کے ذریعہ آپکو اسکا اشارہ فرمایا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی بشارت دی جسکی بناء پر شاہ صاحب نے مکہ معظمہ میں قیام پر وطن واپسی کو ترجیح دی۔

مدینہ طیبہ میں دیگر بشارات کے ساتھ ہی اس سلسلہ میں جو بشارت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو ہوئی اسکا حال خود آپنے فیوض الحرمین اور الدر الثمین میں تحریر کیا ہے:

" اِنّ مراد الحق فیك ان یجمع شملاً من شمل الا ئمة المرحومة بك" [1]	اللہ تعالیٰ کا ارادہ تمہارے بارے میں ہو چکا ہے کہ تمہارے ذریعہ امت مرحومہ کی ایک خاص شیرازہ بندی ہو

اسکے علاوہ قیام حجاز میں آپکو ایسے خواب نظر آئے جنکی بناء پر آپکے اس ارادہ میں پختگی آگئی۔ ان خوابوں کا تذکرہ بھی آپنے فیوض الحرمین میں کیا ہے۔ ایسے ایک خواب میں آپکو ہندوستان کی صورتحال

---

[1] فیوض الحرمین الدر الثمین ص ۳۱ الحدیث السادس

اور اسمیں آپکے رول اور مرتبہ کی جانب اشارہ کیا گیا تھا۔ ۱۲ ذیقعدہ ۱۱۴۴ھ شب جمعہ کو آپنے خواب میں دیکھا:

رائتنی فی المنام قائم الزمان اعنی بذالك ان الله تعالیٰ اذ اراد شیئاً من نظام الخیر جعلنی کالجارجةلاتمام مراده. و رایئت ان ملك الکفار قد استولیٰ علی بلا دالمسلمین، و نهب اموالهم و سبا ذریتهم واظهر فی بلدة اجمیر شعائر الکفر و ابطل شعائر الاسلام فغضب الله علی اهل الارض غضباً شدیداًورایت صورة هذا الغضب متمثلة فی الملأ الأعلی ثم ترشح الغضب الیّ فرایتنی غضبانا من جهة نفث من تلك الحضرة فی نفسی لا من جهة ما یر جع الیٰ هذا العالم.[1]

میں نے خود کو خواب میں دیکھا کہ میں قائم الزمان ہوں اسکا مطلب ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے کسی بھلائی کے نظام کو قائم کرنیکا ارادہ فرمایا تو مجھ کو اس ارادہ کی تکمیل کیلئے ایک آلہ وواسطہ بنالیا اور میں نے دیکھا کہ کفار کا بادشاہ مسلمانوں کے شہروں پر مسلط ہو گیا ہے اور ان کے اموال کو لوٹ لیا ہے اور ان کی آل اولاد کو گرفتار کرلیا ہے اور شہر اجمیر میں کفر کے شعار کا اعلان کردیا اور شعائر اسلام کو مٹادیا ہے پس اللہ تعالیٰ زمین والوں پر سخت ناراض ہوا ہے اور میں نے اس غیض و غضب کی صورت کو ملأ اعلیٰ میں متمثل ہوتے ہوئے دیکھا پھر وہ غضب میرے اندر اتر گیا پس میں نے خود کو غضبناک پایا اس وجہ سے کہ وہ میرے اندر حق تعالیٰ کیجانب سے بھر دیا گیا تھا اسکا منشا کوئی ایسی چیز نہیں جو اس دنیا سے تعلق رکھتی ہو۔

یہ خواب کافی طویل ہے۔ اسمیں اس جنگ کا بھی تذکرہ ہے. جو شاہ صاحب کی سرکردگی میں اسوقت تک جاری رہی جب تک کفار کا بادشاہ مفتوح و مقتول نہیں ہو گیا اور تب کہیں جاکر وہ غصہ ٹھنڈا ہوا گویا یہ خواب اس جدوجہد کی طرف ایک واضح اشارہ ہے جس سے ہندوستان پہنچکر شاہ صاحب کو سابقہ پڑنا تھا۔ یہ خواب ایک طرح کی پیشنگوئی بھی ہے. جسمیں شاہ صاحب کے جہاد بالقلم کی جانب اشارہ ہے۔

اس خواب کے علاوہ انھوں نے ایک خواب اور دیکھا جسمیں انکی علمی اور تصنیفی خدمات کیجانب نہایت واضح اشارہ کیا گیا ہے۔ اس خواب کا تذکرہ انھوں نے اپنی متعدد تصانیف مثلاً دیباچہ حجۃ اللہ البالغہ،

---

[1] ترجمہ فیوض الحرمین ص ۲۹۷-۲۹۸

الدر الثمین اور فیوض الحرمین میں کیا ہے۔ اس خواب کی تاریخ دس صفر ۱۱۴۴ھ تحریر فرمائی ہے۔

الدر الثمین میں تحریر فرماتے ہیں:

رایت فی المنام ان الحسین و الحسن رضی الله عنهما نز لافی بیتی و بید الحسن رضی الله تعالیٰ قلمٌ قد انکسر لسانه فبسط الی یده لیعطینی وقال هذا قلم جدی رسول الله صلی الله علیه وسلم ثم امسك بیده قال حتی یصلحه الحسینؓ فلیس ما اصلحه الحسینؓ کما لم یصلحه فاخذه الحسین رضی الله عنه و اصلحه ثم ناولنیه فسررت به ثم جیئ بردآء فخطط فیه خط اخضر و خط ابیض فوضع بین یدیهما فرفعه الحسین رضی الله عنه و قال هذا رداء جدی رسول الله صلی الله علیه وسلم ثم البسنیه فوضعته علی راسی تعظیما و حمدت الله تعالی [1]

میں نے خواب میں دیکھا گویا کہ حضرت حسین و حسن رضی اللہ عنہما میرے گھر تشریف لائے اور حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ایک قلم تھا جس کا نب ٹوٹا ہوا تھا اور انھوں نے اپنا ہاتھ میری بڑھایا کہ مجھے دیدیں اور کہا کہ یہ قلم میرے نانا رسول اللہ ﷺ کا ہے پھر کہا جبتک اس کو حسینؓ درست کرلیں کیونکہ جیسا اسکو حسینؓ درست کرسکتے ہیں کوئی نہیں کرسکتا، پس اسکو حسینؓ نے پکڑا اور درست کردیا پھر اسے مجھکو دیدیا پس میں اس (عطا) سے خوش ہوگیا۔ پھر ایک چادر لائی گئی جس میں سرخ اور سفید دھاریاں تھیں اسکو انکے سامنے رکھا گیا تب اسکو حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اٹھایا اور کہا 'یہ چادر میرے نانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے' پھر اسے مجھکو اڑھا دیا تب میں نے اسکو تعظیماً اپنے سر پر رکھا اور اللہ کا شکر ادا کیا۔

اس خواب کا تذکرہ کرنیکے بعد اپنی تصنیف الدر الثمین میں شاہ صاحب خود لکھتے ہیں:

" فمن یو مئذا نشرح صدری للتصنیف فی العلوم الشرعیه" [2]

لہٰذا شاہ صاحب نے اپنے بارے میں یہی طے کیا کہ وہ ہندوستان کو اپنی سرگرمیوں اور علمی و دینی خدمات کا مرکز بنائیں گے اور کون کہ سکتا ہے کہ شاہ صاحب کے اس عظیم الشان اور تاریخ ساز فیصلہ کے

---

[1] الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین، مصنفہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ، لائل پور ۱۳۸۶ھ ۲۹

[2] الدر الثمین ص ۲۹

پیچھے کوئی غیبی اشارہ مضمر نہ تھا۔

ذی الحجہ ۱۱۴۴ھ میں آپنے دوسرا حج کیا اور اسکے بعد وطن واپسی کیلئے تیاری شروع کر دی چند ہی روز بعد مکہ معظّمہ میں آپکی والدہ ماجدہ کی خبر وفات پہنچی چنانچہ بعد حج سب سے پہلے روانہ ہونیوالے جہاز سے آپ وطن کے لئے روانہ ہوگئے اور ۲۳ روز سمندر میں سفر کے بعد سورت کی بندرگاہ پہنچے اور وہاں سے دکن اور راجستھان (گوالیار) ہوتے اور بزرگان دین کے مزارات پر حاضری دیتے ہوئے ۱۴ رجب ۱۱۴۵ھ کو دہلی پہنچے۔

اس تمام سفر حج کے بارے میں شاہ ولی اللہ نے خود ایک نظم کہی ہے جس میں اس واقعہ کی تاریخ ظاہر کی گئی ہیں۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں:[۱]

زدہلی بر آمد ولی بہر حج
بہ ہشتم صباح ازر بیع دوم
ہزارو صدو چہل وسہ سال بود
کہ ایں داعیہ گشت بافعل ضم
(روانگی ۸ ربیع الثانی ۱۱۴۳ھ)
ولی چوں پس از حج بہ دہلی رسید
سر آمد سفر منقطع گشت رنج
بہ تاریخ رابع عشر از رجب
زسال وہزار و صدوچہل وپنج
(واپسی ۱۴ رجب ۱۱۴۵ھ)

شاہ صاحب کے دہلی واپس آنے پر حسب سابق طلباء اور معتقدین آپکی خدمت میں اکٹھے ہونے لگے اور آپنے پرانی دہلی کے مہندیون میں مدرسہ رحیمیہ میں درس وتدریس کی محفل پھر آراستہ کرلی اور حدیث کا درس دینے لگے۔ چند ہی دنوں میں طلباء کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ یہ جگہ ناکافی ثابت ہونے لگی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اسکا بھی بندوبست کر دیا اور بظاہر بے توفیق دکھائی دینے والے عیش کوش بادشاہ محمد شاہ (عرف رنگیلا) کے مقدر میں یہ توفیق لکھ دی گئی کہ اسنے شاہ صاحب کو شہر میں بلایا اور محلّہ کوچہ فولاد خاں عقب کلاں محل میں عالیشان مکان اس مقصد کیلئے شاہ صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا جہاں آپنے اپنی رہائش

---

۱ القول الجلی، صفحہ ۶۴

ومدرسہ کو منتقل کرلیااور وہاں درس شروع کردیا۔ یہ مدرسہ کسی زمانہ میں نہایت عالیشان اور خوبصورت تھا اور بڑادارالعلوم سمجھا جاتا تھا۔[۱]

مگر مدرس ولی اللہ جوحج کو جانے سے پہلے اس مدرسہ میں درس وتدریس کی خدمت انجام دیتے تھے اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی جوحج کے سفر سے واپسی کے بعد مسند درس پر متمکن ہوئے دونوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

حج کو جانے سے قبل شاہ صاحب نے اپنے والد صاحب سے تعلیم وتربیت حاصل کی تھی اور اپنی محنت اور لگن سے بذات خود اسکو جلا بخشی تھی۔ اسکے بعد شیخ عبدالرحیم کی وفات کے بارہ سال بعد تک درس وتدریس میں مشغول رہے۔ لیکن سفر حج کو جانے اور دو سال تین ماہ حجاز میں قیام کے دوران شاہ صاحب کی شخصیت میں زبردست تبدیلی آگئی تھی۔ اس سفر حج وزیارت کے ساتھ ساتھ آپنے اس وقت محدثین، علماء ومشائخ سے بھرپور استفادہ، اور سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار سے بھرپور روحانی استفاضہ کیا جنکی بدولت آپ دینی، روحانی اور علمی طور پر اپنے فرائض کی انجام دہی کے لیے پوری طرح تیار ہوگئے۔ فکر ونظر کی نئی راہیں ہموار ہوگئیں اور ایک نئے ادبی، علمی ودینی حلقہ سے آپ روشناس ہوئے۔ کتب اور مصنفین کے نئے حلقے سے آپکا تعارف ہوا جن سے آپ نے خاطر خواہ استفادہ کیا۔ اس نئے 'سروسامان' کے ساتھ جب آپ وطن واپس لوٹے تو آپکے ذمہ صرف تعلیم وتدریس کی ذمہ داری نہ تھی بلکہ تجدید واحیاء دین اور اصلاح ملت کا جو ہشت پہلو منصوبہ آپنے بنایا اسکا تقاضہ تھا کہ آپ اپنی جسمانی، روحانی، ذہنی اور دینی صلاحیتیں اور اوقات کار کا نہایت احتیاط اور منصوبہ بند طریقہ پر استعمال کریں اور کسی ایسے مشغلہ پر اپنی صلاحیتوں وطاقتیں صرف نہ کریں جسکی افادیت آپکی صلاحیت اور محنت کے مطابق نہ ہو بلکہ پوری طاقت سے وہ کارنامہ انجام دیں جسکے لیے اللہ تعالیٰ نے آپکو اہلیت اور توفیق سے نوازا تھا۔ چنانچہ تدریس وتصنیف میں سے آپنے تحریر وتصنیف کو ترجیح دی جسکے ذریعہ امت مسلمہ اور دین الٰہیہ کی خدمت کا زیادہ امکان تھا اور جو عرصہ دراز تک قائم رہنے اور اثرات خیر مرتب کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

حجاز مقدس سے واپسی پر آپکے اندر ایک خاص قسم کا تغیر پیدا ہوگیا تھا۔ علوم عقلیہ سے جو دلچسپی تھی وہ باقی نہ رہی انکی جگہ علوم باطنی، علوم حدیث اور علوم معارف نے لے لی، اس تبدیلی کا یہ نتیجہ ہوا کہ شاہ صاحب نے اپنے اوقات کار کو چند مخصوص کاموں کیلئے تقسیم کردیا آپکے چند منتہی طلباء شاہ محمد عاشق، اخون محمد سعید وغیرہ آپکے ساتھ نہ صرف شریک سفر تھے بلکہ انہوں نے شیوخ حجاز سے شرف اور استفادہ

---

[۱] تاریخ دعوت وعزیمت، صفحہ ۱۱۵

بھی کیا تھا آپنے مدرسہ رحیمیہ میں تدریس کا فریضہ معلمین کی ایک جماعت کے سپرد کردیا جو آپ ہی کے فارغ التحصیل تلامذہ اور شاگرد تھے ان معاونین میں شاہ محمد عاشق اور اخون محمد سعید کے علاوہ خواجہ محمد امین ولی اللّٰہی بھی تھے جو شاہ عبدالعزیز بن ولی اللہ محدث کے استاد تھے چوتھا نام شاہ ولی اللہ کے چھوٹے بھائی شاہ اہل اللہ کا ہے جو آپ سے چار سال چھوٹے تھے اور جنکو آپ سفر حج کیلئے تشریف لیجاتے ہوئے خرقہ اجازت بیعت وارشاد اور دستار فضیلت عطا کر گئے تھے۔[۱]

اسکے بعد آپنے مدرسہ سے اتنا ہی واسطہ رکھا کہ خود کو اسکی نگرانی اور سرپرستی کے علاوہ درس حدیث تک محدود کرلیا، مدرسہ کی مصروفیتوں اور تدریس کی ذمہ داریوں سے فارغ ہو کر آپنے خود کو فکر و تحقیق اور تصنیف و تالیف کیلئے وقف کردیا۔

شاہ عبدالعزیز نے اپنے والد شاہ ولی اللہ کی اس منصوبہ بندی اور تقسیم کار کا ذکر اپنے ملفوظ میں اسطرح کیا ہے:

"حضرت والد ماجد از ہر فن شخصے تیار کردہ بودند، طالب ہر فن باوے می سپردند و خود مشغول معارف گوئی و نویسی می بودند و حدیث می خوانید بعد مراقبہ ہر چہ بکشف می رسید می نگاشتند، مریض ہم کم می شدیدند۔[۲]

حضرت والد ماجد نے ہر فن کیلئے ایک شخص (شاگرد) تیار کیا تھا اور ہر فن کے طالب علم کو اس کے سپرد کردیا تھا اور خود حقائق و معارف بیان و تحریر کرنے اور حدیث شریف کا مطالعہ کرنے میں مشغول رہتے تھے۔ غور و خوض اور فکر و نظر کے بعد جو نتائج ہوتے ان کو قلم بند فرمالیتے تھے بیمار بھی کم ہوتے تھے۔

اس کے ساتھ ہی بیعت وارشاد کا سلسلہ بھی آخر عمر تک جاری رہا جسکے لئے آپ تمام سلسلوں سے صاحب اجازت تھے۔

شاہ ولی اللہ نے اپنے اوقات کار کی تقسیم کرنے کے بعد جس انہماک سے اپنے اوپر عائد شدہ ذمہ داریوں کو نباہا اسکی مثال مشکل سے ہی مل سکتی ہے شاہ عبدالعزیز ملفوظات میں لکھتے ہیں :

"مثل والد ماجد شخصے کم بنظر آمد، سوائے علوم و کمالات دیگر در ضبط اوقات ، چنانچہ بعد اشراق کہ نشست تا دوپہر زانو بدل نمی کرد وخارش نمی نمود و آب دہن نمی انداخت"[۳]

دیگر علوم و کمالات کے علاوہ ضبط اوقات میں بھی والد ماجد کی مثل کوئی شخص کم ہی نظر آتا ہے اشراق کے بعد (تحریر و تصنیف و دیگر امور میں مصروفیت کی وجہ سے) جو بیٹھتے، نہ تو پہلو بدلتے نہ کھجلی کھجلاتے نہ تھوکتے (بلکہ اپنے کام میں منہمک رہتے)

اپنی عمر کے آخری دور میں آپ بڈھانہ ضلع مظفر نگر میں مقیم تھے کہ مرض الموت میں مبتلا ہو گئے

---

۱ شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان، صفحہ ۴۴-۴۵

۲ ملفوظات شاہ عبدالعزیز، صفحہ ۴۰

۳ ایضاً، صفحہ ۴۳

قلت غذا کی وجہ سے نقاہت اور ضعف میں اضافہ ہو گیا، ۹ ذی الحجہ ۱۱۷۵ھ کو آپ کو بغرض علاج دہلی لایا گیا جہاں آپ نے اپنے خاص شاگرد اور مرید بابا فضل اللہ کشمیری کے مکان میں جو چوک سعد اللہ خان ، احاطہ مسجد روشن الدولہ میں واقع تھا قیام کیا.

آپ کی تیمارداری کے لئے آپ کے تین صاحبزادے شیخ محمد، شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین آپ کے پاس تھے انکے علاوہ آپ کے دو صاحبزادے شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالغنی بچے تھے جن کی عمر بالترتیب ۹ اور ۵ سال کی تھی ان کے علاوہ آپ کے خاص تلامذہ و مریدین شاہ محمد عاشق پھلتی، شاہ اہل اللہ (برادر وشاگرد) مولانا محمد فائق اور خواجہ محمد امین بھی آپ کے نزدیک تھے.

اسی دوران ایک مرتبہ شاہ عبدالعزیز سے (جو ظاہری و باطنی ہر لحاظ سے آپ کے حقیقی جانشین و خلیفہ ہیں) فرمایا: "ہمارے قبلہ گاہؒ (شاہ عبدالرحیم) نے جب اس عالم سے رحلت فرمائی تھی تو ہم تمہاری ہی عمر کے تھے اور میاں اہل اللہ (شاہ صاحب کے برادر خورد) رفیع الدین کی عمر کے تھے اور اکثر اوقات ہم مزار شریف پر انکی روحانیت کی طرف متوجہ ہو کر بیٹھتے تھے حقیقت کی راہ ہم پر کھل جاتی تھی" [۱]

محرم الحرام ۱۱۷۶ھ کی آخری تاریخ (۲۹ محرم) مطابق ۱۷۶۳ء بروز شنبہ (سنیچر) بوقت ظہر آپ کا انتقال ہو گیا انا للہ و انا الیہ راجعون .

حضرت شاہ عبدالرحیم کے مزار سے متصل مہندیان کے قبرستان میں آپکے جسد خاکی کو سپرد خاک کیا گیا تاریخ وفات متعدد لوگوں نے نکالی ہے ایک شخص نے کلام پاک کی اس آیت سے آپکی تاریخ وفات نکالی ہے:

نھی النفس عن الھوی

دیگر مادہائے تاریخ :

او بود امام اعظم دیں

۱۱۷۶ھ

آفتاب دین شد زیر زمین

۱۱۷۶ھ

آں ولی نقشبند ثانی بود

۱۱۷۶ھ

---

[۱] القول الجلی، صفحہ ۳۴۲

اخلاف شیخ:

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنے انتقال کے بعد اپنی تین یادگاریں چھوڑیں:

۱۔ اولاد صلبی

۲۔ تلامذہ و خلفاء (مریدین)

۳۔ تصانیف

یہ تینوں آپکے باقیات الصالحات تھے اور تینوں کی بناء پر آپکا نام اور اجر تا قیامت باقی رہے گا تاریخ میں آپکا مقام مختص کرنے کے سلسلہ میں ان تینوں کا اہم کردار ہے۔ اس لئے شاہ صاحب کے کسی آئندہ تذکرہ یا انکے کسی پہلو کو اجاگر کرنے کیلئے ان تینون کا حوالہ بھی لازمی ہے۔

اولاد صلبی:

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے معاملہ میں انتہائی خوش قسمت تھے آپ نیکوں اور نیک بختوں کی اولاد تھے خود بھی نیک اور ولی اللہ تھے اور آپکی تمام اولاد بھی نیک اور نیک نام ہوئی اور یہ سلسلہ آگے تک جاری رہا۔

شاہ صاحب کے پانچ صاحبزادے اور ایک صاحبزادی تھے ان میں سب سے بڑے صاحبزادے شاہ محمد آپکی پہلی بیوی فاطمہ کے بطن سے تھے جن سے آپکے والد نے آپکی شادی چودہ برس کی عمر میں کردی تھی یہ شادی ۱۱۲۸ھ / ۱۷۱۷ء میں ہوئی تھی شاہ محمد کی والدہ کے انتقال کے بعد شاہ صاحب نے ۴۳ سال کی عمر میں سیدہ ارادت بنت سید ثناء اللہ سونی پتی سے ۱۱۵۷ھ / ۱۷۴۶ء میں دوسرا عقد کیا جنکے بطن سے پانچ اولادیں ہوئیں۔ ان میں چار لڑکے شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالغنی اور بیٹی امۃ العزیز تھے، جنکی شادی شاہ صاحب کے ماموں زاد بھائی شاہ محمد عاشق کے صاحبزادہ محمد فائق سے ہوئی جن کی اولاد پھلت میں ہے۔[۱]

---

[۱] مقالات طریقت، صفحہ ۱۴-۱۵

شجرہ اولاد و احفاد حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

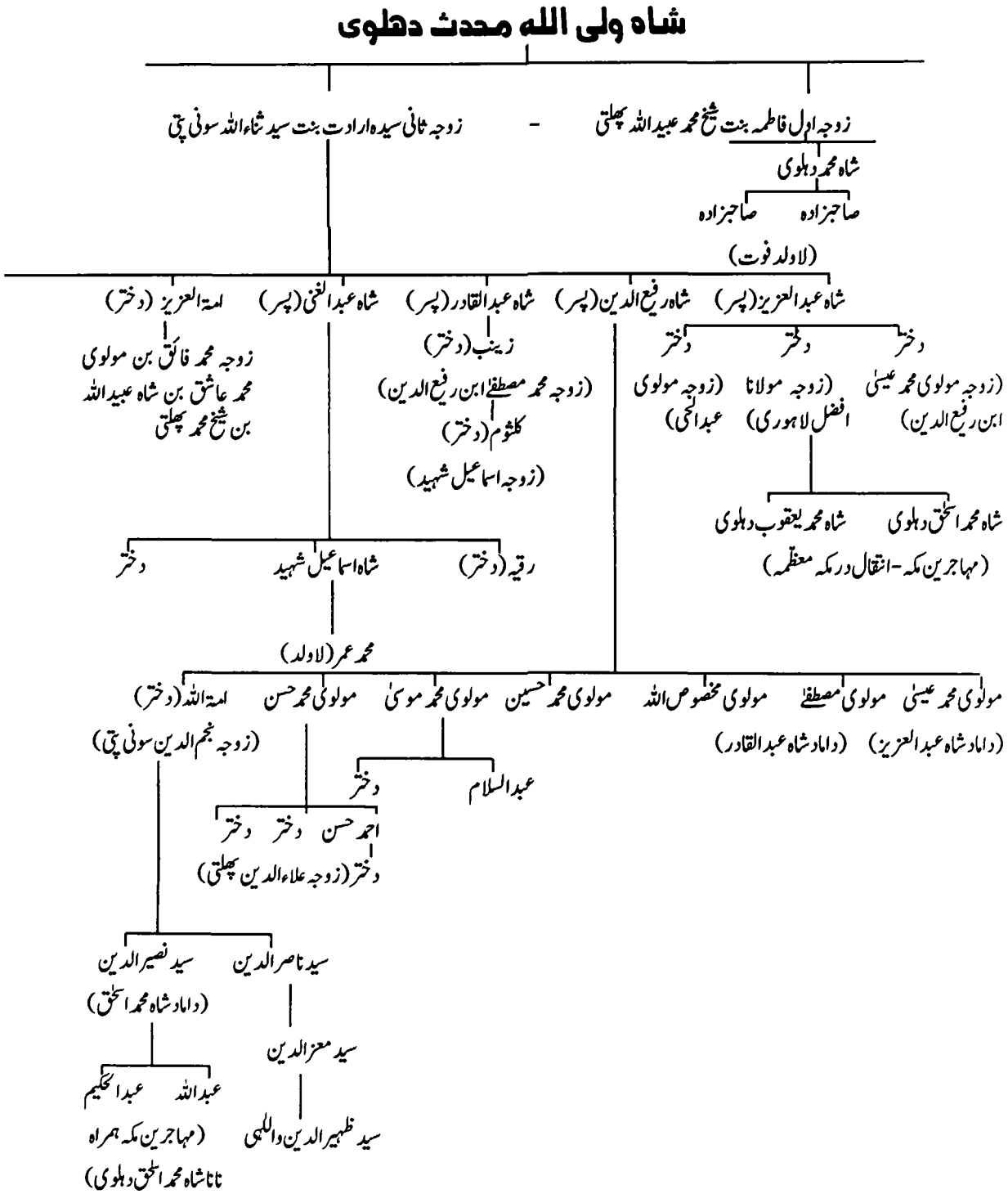

۱۔ شیخ محمد:

شیخ محمد شاہ صاحب کی پہلی بیوی کے بطن سے تھے اور اپنے اخیافی بھائیوں سے عمر میں کافی بڑے تھے، مولوی محمد محسن بن یحییٰ الترہتی لکھتے ہیں:

"وکان لعبد العزیز اخ اقدم منه سناً اسمه محمد وکان اخاه لا بیه . اخذ عن ابیه وهو ایضا قدیم الوفاة رحمهم الله تعالیٰ" [۱]

شاہ عبدالعزیز کے ایک بڑے بھائی تھے جو عمر میں انسے بڑے تھے۔ انکا نام محمد تھا۔ اور وہ انکے اخیافی بھائی تھے۔ انہوں نے اپنے والد سے تعلیم حاصل کی اور وہ شاہ عبدالعزیز سے قبل وفات پاگئے ان پر خدا کی رحمت ہو۔

شاہ محمد مجذوب شخص تھے۔ مقالات طریقت میں انکی اس کیفیت کے بارے میں ایک واقعہ درج ہے۔ ایک برہنہ مجذوب سے پرانی دہلی میں شاہ محمد کا مقابلہ ہو گیا تو انہوں نے مجذوب کی برہنگی پر اظہار ناگواری کیا۔ مجذوب نے کہا کہ آج میرا جی کسی بڑے مولوی پر سوار ہونے کو چاہتا ہے۔ اس پر آپ نے جواب دیا کہ آج میرا جی کسی بڑے فقیر کا گوشت کھانے کو چاہتا ہے۔ یہ مکالمہ رمزیہ تھا جسکا مطلب ایک دوسرے سے فیض حاصل کرنا تھا۔ اس پر مجذوب نے ایک شعر پڑھا:

کارے نساختیم و دمیدن گرفت صبح
اوجی چراغ خانہ با فسانہ سو ختیم

اسی وقت سے آپ پر جذب کی کیفیت طاری ہو گئی جو آخر تک رہی۔ [۲]

شاہ محمد کیوجہ سے شاہ ولی اللہ کی کنیت ابو محمد بھی ہے۔ چنانچہ "الارشاد الیٰ مہمات علم الاسناد" کے سرورق پر شاہ صاحب کی کنیت ابو محمد درج ہے اور حاشیہ میں تحریر ہے۔

"هوابو محمد وله ولد قبل مولانا عبدالعزیز فسمیٰ بمحمد .فکنی بابی محمد . [۳]

اور مولانا عبدالعزیز سے قبل انکے ایک صاحبزادے تھے۔ جن کا نام محمد تھا اس لئے انکی کنیت ابو محمد ہے۔

آپ کا قیام زیادہ تر دہلی میں رہتا تھا۔ والد مرحوم (شاہ ولی اللہ) کی وفات تک آپ دہلی ہی میں تھے۔

---

۱ الیانع الجنی فی اسانید الشیخ عبدالغنی، صفحہ ۱۰۹
۲ مقالات طریقت، صفحہ ۱۴
۳ الارشاد الیٰ مہمات علم الاسناد مصنفہ شاہ ولی اللہ دہلوی، صفحہ ۲۰، لاہور ۱۹۶۰ء

اسکے بعد کچھ دنوں کے لئے لکھنؤ چلے گئے۔ مکتوبات المعارف میں شاہ عبدالعزیز نے اپنے خطوط میں انکے لکھنؤ قیام کا ذکر کیا ہے۔

آخر میں اپنی ننھال پھلت اور بڈھانہ میں منتقل ہو گئے جہاں آپکی قدیمی جاگیر بھی تھی۔ آپکی شادی بھی ہوئی اور دو صاحبزادے بھی تولد ہوئے مگر ان سے نسل نہیں چلی۔ آپ کی وفات ۱۲۰۸ھ / ۱۷۹۴ء میں بڈھانہ میں ہوئی آپ اور آپکے دونوں فرزندوں کے مزارات بڈھانہ کی جامع مسجد سے متصل ہیں۔

۲۔ شاہ عبدالعزیز:

آپ حضرت شاہ ولی اللہ کی دوسری بیوی کے بطن سے ہیں۔ آپکی ولادت ۲۵ رمضان ۱۱۵۹ھ / ۱۷۴۶ء شب جمعہ میں ہوئی کہتے ہیں کہ اسی شب شب قدر بھی تھی چنانچہ آپ ختم قرآن (تراویح میں) اسی شب کو کرتے۔ آپ کا تاریخی نام غلام حلیم اور مشہور نام عبدالعزیز تھا اور ملأ اعلیٰ میں حجۃ اللہ۔ شاہ ولی اللہ کے انتقال کے وقت آپکی عمر ۱۶ سال چھ ماہ تھی ٹھیک اتنی ہی عمر شاہ ولی اللہ کی تھی جب انکے والد شیخ عبدالرحیم کا وصال ہوا تھا شاہ عبدالعزیز اپنے والد کے ظاہری و باطنی دونوں اعتبار سے حقیقی جانشین تھے شاہ صاحب کے سیوم کے دن شیخ عبدالعزیز کی دستار بندی ہوئی جسکے تین چار پیچ مولانا فخر الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے باندھے اس رسم میں مرزا مظہر جان جاناں علیہ الرحمۃ شریک تھے۔

شیخ عبدالعزیز نے علوم ظاہر و باطن اپنے والد سے حاصل کئے اور انکے وصال کے بعد اپنے ماموں اور شاہ صاحب کے خاص خلیفہ و برادر نسبتی شاہ محمد عاشق پھلتی سے انکی تکمیل کی بابا فضل اللہ کشمیری سے جو شاہ صاحب کے خاص تلامذہ میں سے تھے بعض کتب حدیث کی سند لی اور علم فقہ اپنے خسر مولوی نور اللہ بڈھانویؒ (جد مولوی محمد عبدالحیؒ) سے پڑھا۔

ان علوم شرعی و باطنی کے علاوہ شاہ عبدالعزیز نے علوم دنیاوی میں مختلف انواع کے علوم حاصل کئے یہاں تک کہ علم موسیقی میں آپکو ملکہ حاصل تھا اور اسکے فنی و علمی پہلوؤں پر آپ کی نظر تھی آپ مختلف گیتوں اور راگوں کو پہچانتے تھے اس کے علاوہ تاریخ جغرافیہ حساب جیسے خالص غیر مذہبی secular علوم میں بھی دستگاہ تھی. آپ خود فرماتے ہیں کہ جو علوم میں نے مطالعہ کئے اور اپنی استعداد کے مطابق مجھے یاد بھی ہیں ان کی تعداد ایک سو پچاس ہے ان میں سے نصف کے قریب ایسے علوم تھے جو امت اسلامی کی تخلیق تھے اور باقی نصف دوسری امتوں کے۔[۱]

---

[۱] رود کوثر، صفحہ ۵۸۸

ان علوم کے علاوہ آپنے مختلف فنون حرب وغیرہ بھی سیکھے مقالات میں ہے کہ آپنے تیر اندازی محمد شاکر سے اور شہسواری ملک بیڑا چابک سواراں محمد شاہ بادشاہ سے سیکھی اسکے علاوہ تیرنا بھی اول درجہ کا جانتے تھے آپکی شخصیت جامع کمالات اور یکتائے روزگار تھی امور مذہبی اور حدیث و تفسیر و فقہ کے علاوہ ادب میں بھی آپکی رائے کو بڑی وقعت سے دیکھا جاتا تھا مشہور ہے کہ شاہ نصیر دہلوی نے جب ذوق سے ناچاقی کیوجہ سے انکی غزل درست کرنے سے انکار کردیا تو ذوق تمام استادان ادب کو چھوڑ کر شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے غزل پر اصلاح لیکر بے جھجک اس غزل کو مشاعرہ میں پڑھا.

فیض ظاہر میں آپ اپنے والد شاہ ولی اللہ کے سلسلہ سے تمام صوفی سلسلوں سے منسلک اور اجازت یافتہ تھے لیکن فیض باطن آپنے عالم رؤیا میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حضور میں حاصل کیا اور ان سے بیعت کر کے فیضیاب ہوئے۔[1]

تعلیم و تربیت کے حاصل کرنے کے بعد آپنے والد محترم کی مسند درس وارشاد سنبھالی اور تقریبا ساٹھ سال اپنے زبان و قلم سے دین کی خدمت کرتے رہے آپنے علم حدیث شریف جسے شاہ ولی اللہ نے از سر نو ہند میں رائج کیا تھا اس کو ملک بھر میں عام کردیا ہندوستان کے اکثر محدثین کا سلسلہ اسناد آپ تک اور آپکے ذریعہ شاہ ولی اللہ تک پہنچتا ہے بدایوں کے کسی طالبعلم نے حدیث پڑھنے کا ارادہ کیا مگر ساتھ ہی یہ بھی خیال کیا کہ کسی ایسے استاد سے پڑھے جس کے سلسلے میں شاہ عبدالعزیز نہ ہوں، وہ عالم تمام ہندوستان میں گھوما مگر اسکو کہیں کوئی فرد واحد ایسا نہ ملا جو آپکے فیض سے خالی ہو کوئی ایک واسطہ سے کوئی دو یا تین واسطوں سے حضرت کا شاگرد ہی نکلا آپ عموما جمعہ اور منگل کو قرآن مجید کا درس بطور وعظ دیتے جس میں ہزاروں لوگ شرکت کرتے اور یہ آپکی کرامت تھی کہ دور و نزدیک سب لوگ برابر یکساں طور پر آپکی آواز سنتے اور وعظ کو سمجھتے تھے تربیت باطن میں آپ کسی ایک طریقہ پر بیعت نہ فرماتے۔ اپنے اعزہ مثلا مخصوص اللہ، شاہ اسمعیل، شاہ یعقوب، اور شاہ اسحٰق کو قادریہ میں بیعت کیا۔ امراء سلطنت کو چشتیہ میں اور دوسروں کو نقشبندیہ میں بیعت کرتے تھے۔

آپ کی متعدد تصنیفات و تالیفات ہیں مولانا برکاتی نے اپنی کتاب میں تقریباً تیس کتابوں کی فہرست دی ہے جو شاہ عبدالعزیز کے قلم سے نکلی ہیں، ان میں چند کتابیں تو انتہائی مقبول ہوئیں ایسی کتابوں میں "تحفہ اثنا عشریہ" جو رد شیعت میں ہے یہ کتاب اتنی مدلل اور مفصل ہے کہ اسکے رد کے لئے ہندوستان کے مانے ہوئے شیعہ علماء نے ایران و عراق کے علمائے شیعہ کو رقومات کے ساتھ اسکا نسخہ بھیجا

---

[1] مقالات طریقت۔ صفحہ ۳۰

مگر وہ بھی اسکار دنہ کر سکے، اس کتاب اور شیعت کے خلاف قلمی جہاد کے سلسلہ میں آپکے خاندان کو نجف خان کے زمانہ میں بڑے مصائب کا مقابلہ کرنا پڑا، شاہ صاحب کی جائدد واملاک ضبط ہوئی اور وہ شہر دہلی سے نکالے گئے چنانچہ اس ڈر سے تحفہ اثنا عشریہ کے شروع میں اور سرورق پر مصنف کا نام حافظ غلام حلیم ابن شیخ محمد قطب الدین ابن شیخ ابوالفیض دہلوی درج تھا، غلام حلیم شاہ عبدالعزیز کا تاریخی نام تھا جو مشہور نہ تھا اسی طرح شاہ ولی اللہ کا نام قطب الدین اور شیخ عبدالرحیم کی کنیت ابوالفیض تھی۔

اس کے علاوہ آپنے تفسیر فتح العزیز لکھنی شروع کی مگر پوری نہ کر سکے علمی اور تحقیقی کام کے علاوہ آپ کو عربی انشاء پردازی اور شاعری میں بڑا ملکہ تھا آپنے کئی عربی نظمیں لکھیں عم محترم شاہ اہل اللہؒ کو عربی میں منظوم خط لکھا اور دیگر منظومات اور قصیدے لکھے شاہ ولی اللہ کے قصیدہ پر بھی آپنے تضمین لکھی اس کے علاوہ فتاویٰ عزیزی اور ملفوظات بھی آپکی قابل قدر تحریریں ہیں۔

آپ حضرت شاہ ولی اللہ کے علوم و معارف اور انکے افکار و نظریات کے علم بردار تھے انکے شروع کئے ہوئے کام یعنی ترویج علم حدیث کو آپنے ایسے مقام پر پہنچادیا کہ سارا ہندوستان اس سے فیضیاب ہوا اور علم و تحقیق کا چرچا ہندوستان سے حجاز و شام و ترکی و ایران تک جا پہونچا۔

آپ کے شاگردوں میں شاہ رفیع الدین، شاہ محمد اسحٰق، مفتی صدرالدین، شاہ غلام علی، مولوی مخصوص اللہ مولوی عبدالحئی، مفتی الٰہی بخش کاندہلوی مولانا فضل حق خیر آبادی اور مولانا سید احمد بریلوی وغیرہ شامل ہیں جو خود صاحبانِ علم و فضل تھے اور آپ سے علم حاصل کر کے سرچشمہ فیض بن گئے۔ آپ کی وفات ۷ شوال ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۳ء بروز یکشنبہ طلوع آفتاب کے وقت ہوئی، مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ پچپن مرتبہ نماز جنازہ ہوئی۔

شاہ عبدالعزیز کی شادی مولوی نوراللہ بڈھانوی کی صاحبزادی سے ہوئی اور انکے بطن سے تین صاحبزادیاں تولد ہوئیں جو تینوں شاہ صاحب کی حیات میں ہی وفات پا گئیں، ان میں سے ایک شاہ رفیع الدین کے صاحبزادہ مولوی عیسیٰ صاحب، دوسری مولانا افضل لاہوری اور تیسری مولانا عبدالحئی صاحب کے عقد نکاح میں آئیں۔

۳۔ شاہ رفیع الدین:

آپ کی ولادت ۱۱۶۳ھ / ۱۷۴۹ء میں ہوئی۔ آپ شاہ عبدالعزیز سے ۴ سال چھوٹے تھے اور والد مرحوم کی وفات کے وقت آپ کی عمر صرف بارہ تیرہ سال کی تھی۔ اسوقت آپ میبذی پڑھتے تھے۔ آپ

نے تمام معقولات و منقولات کی تکمیل اپنے بھائی شاہ عبدالعزیز سے کی اور سلوک و تصوف شیخ محمد عاشق کی رہنمائی میں طے کیا۔ شاہ عبدالعزیز بڑھتے ہوئے امراض اور ان سے پیدا شدہ ضعف کی بناء پر درس و تدریس معذور ہوگئے اور انکی بینائی بھی جاتی رہی تو آپ نے انکی نیابت کی۔

مختلف علوم وفنون کا درس دیتے۔ جس فن کا درس شروع کرتے تو ایسا لگتا کہ اس فن میں ماہر اور یکتا ہیں. دینیات کے ساتھ ہی معقولات میں بھی کمال حاصل تھا۔ ملفوظات عزیزی میں شاہ عبدالعزیز کے کئی ملفوظات، شاہ رفیع الدین کی ریاضیات میں تبحر اور مہارت کے اعتراف کے بارے میں ہیں۔ ایک بار فرمایا۔ "فن ریاضی میں مولوی رفیع الدین کی مثال ہندوولایت میں نہیں ملے گی" [1]

شاہ رفیع الدین نے تدریس وافتاء کے علاوہ تصنیف و تالیف کیطرف بھی توجہ کی۔ اگرچہ انہوں نے کوئی ضخیم تصنیف نہیں لکھی بلکہ رسائل اور مختصرات کی شکل میں لکھا ہے مگر انکی تمام تصنیفات مواد کی نوعیت موضوعات کا اچھوتا پن اور نہایت پر مغز اور عالمانہ انداز بیان کیوجہ سے بہت قیمتی ہیں۔ اس پر مزید یہ ہے کہ آپکی تصنیفات عربی، فارسی اور اردو میں ہیں اردو میں قرآن مجید کا لفظی ترجمہ اپنی مثال آپ ہے۔ اگرچہ آپ اسکو پورا نہ کرسکے اور آپکے بعد دوسروں نے اسے پورا کر کے شائع کرایا۔ فارسی میں آپکی چودہ ۱۴ تصنیفات کی فہرست مولانا برکاتی نے اپنی کتاب میں دی ہے جنمیں ۹ رسائل شامل ہیں جنکا مجموعہ مولوی سید ظہیر الدین ولی اللہی نے مطبع احمدی سے شائع کیا۔ عربی میں نثر و نظم میں آپنے متعدد کتابیں لکھی ہیں [2]

۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۸ء میں دہلی میں ہیضہ کی وباء پھیلی۔ اس سے شاہ رفیع الدین متاثر ہوئے اور وہی آپکے لیے مرض الموت ثابت ہوا وقت وفات شاہ عبدالعزیز نے حفاظ کو سورہ یٰسین اور سورہ تبارک کی تلاوت کا حکم دیا۔ آپکی وفات کا آپکے بھائی شاہ عبدالعزیز پر بڑا اثر ہوا، شاہ صاحب کا آپ سے دلی تعلق تھا اور باوجود کمزور اور نابینا ہونے کے آپنے میت کو کاندھا دینے کی کوشش کی لیکن چارپائی نہ اٹھا سکے تو نہایت دلدوناند از میں فرمایا "چہ گویم من طاقتے ندارم"

تدفین کے بعد شاہ عبدالعزیز نے کہا:

"رفیع الدین سے میرا چار طرح کا رشتہ تھا ایک تو یہ کہ حقیقی بھائی، دوسرے قبلہ والد ماجد نے انتقال کے وقت انہیں میرے سپرد کیا تھا کہ یہ تیرا لڑکا ہے، تیسرے ہم دونوں نے

---

[1] ملفوظات عزیزی، صفحہ ۹۲

[2] شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان، صفحہ ۱۰۷-۱۱۰

ایک ہی دایہ کا دودھ پیا اور اس طرح یہ میرے دودھ شریک بھائی تھے اور چوتھے یہ کہ وہ میرے عزیز شاگرد تھے"۔[۱]

اور یہ بھی فرمایا:

"ہم چاروں (حقیقی) بھائیوں کی رحلت میں ترتیب معکوس (الٹی ترتیب) واقع ہوئی ہے سب سے پہلے چھوٹے بھائی مولوی عبدالغنی گئے انکے بعد انسے بڑے مولوی عبدالقادر گئے انکے بعد انسے بڑے رفیع الدین اب میری جوان سب سے بڑا تھا، باری ہے۔"[۲]

فاتحہ سوم میں مجمع کثیر ہو گیا اکیاسی بار کلام پاک پڑھا گیا شاہ اکبر ثانی بادشاہ کیجانب سے شہزادے سلیم وبابر وجواں بخت نے مجلس میں شرکت کی اور فاتحہ پڑھی۔

شاہ رفیع الدین سے شاہ ولی اللہ کی اولاد نرینہ کا سلسلہ چلا آپکے چھ بیٹے اور ایک بیٹی تھیں (۱) مولوی عیسی (۲) مولوی مصطفیٰ (۳) مولوی مخصوص اللہ (۴) مولوی محمد حسین (۵) مولوی محمد موسیٰ (۶) مولوی محمد حسن

۴۔ شاہ عبدالقادر

حضرت شاہ ولی اللہ کے چوتھے صاحبزادے اور اپنے حقیقی بھائیوں میں تیسرے بھائی شاہ عبدالقادر تھے آپ ۱۱۶۷ھ میں پیدا ہوئے اور اپنے والد ماجد شاہ ولی اللہ کی وفات کے وقت آپکی عمر ۹ سال کی تھی اور آپ "صرف میر" پڑھتے تھے والد کی وفات کے بعد آپنے تمام علوم ظاہر وباطن اپنے بڑے بھائی شاہ عبدالعزیز سے حاصل کئے شیخ عبدالعدل دہلوی سے بھی فیض حاصل کیا اور بیعت طریقت کی، آپ علم شریعت اور تصوف دونوں میں ایک مقام رکھتے تھے تقریباً بیس سال تک اکبر آبادی مسجد میں گوشہ نشیں رہے صرف ہفتہ میں اک روز مسجد سے اپنی صاحبزادی اور بھائی و استاد شاہ عبدالعزیز سے ملاقات کیلئے تشریف لیجاتے آپکے خورد ونوش کا انتظام شاہ عبدالعزیز کے پاس سے تھا۔

آپ اپنے حجرہ سے ہی درس و تدریس کا عمل جاری رکھتے بعد نماز اشراق کے چاشت تک چار سبق اور بعد ظہر تین سبق پڑھایا کرتے تھے، بعد عصر بیٹھتے جو کوئی آتا اسکو نصیحت اور وعظ فرماتے لیکن کسی سے بیٹھنے کو نہ کہتے، من جانب اللہ اتنا رعب تھا کہ رؤسائے شہر تک جب آپکی خدمت میں حاضر ہوتے تو دور دور مؤدب ہو کر خاموش بیٹھتے اور بات کرنے کی ہمت نہ کرتے۔

---

[۱] ملفوظات عزیزی، صفحہ ۱۶۱

[۲] ملفوظات عزیزی، صفحہ ۱۵۳

آپ بڑے صاحب کرامات بزرگ تھے دلی میں آپکی کرامات کا چرچا تھا مشہور ہے کہ آپ رمضان میں تراویح میں روزانہ ایک پارہ تلاوت کرتے مگر جب عید کا چاند ۲۹ کا ہوتا تو رمضان کی پہلی تراویح کو دو پارے تلاوت کرتے چونکہ آپکی اس کرامت کا بارہا تجربہ ہو چکا تھا لہٰذا شاہ عبدالعزیز پہلی تراویح کو کسی شخص کو بھیجتے کہ جاؤ دیکھ کر آؤ کہ آج میاں عبدالقادر نے کتنے پارے پڑھے، جب یہ پتہ لگتا کہ آج دو پارہ پڑھے تو فرماتے کہ عید کا چاند انتیس کا ہوگا اگرچہ ابر وغیرہ کیوجہ سے رویت کا فتویٰ نہ دیا جاسکے۔

عبدالرحیم ضیاء نے مقالات طریقت میں آپکی کئی کرامات کا ذکر کیا ہے۔

آپکا علمی فیض برابر جاری رہا۔ درس حدیث آپکا محبوب مشغلہ تھا اگرچہ آپ معقولات میں بھی کمال رکھتے تھے آپکے شاگردوں میں شیخ عبدالحئی بڈھانوی، شاہ اسمٰعیل شہید، شیخ فضل حق خیرابادی، شاہ محمد اسحٰق دہلوی وغیرہ جیسی ہستیاں شامل ہیں۔

آپکی مشہور تصنیف آپکا اردو ترجمہ قرآن ہے جو ۱۲۰۵ھ میں مکمل ہوا، یہ ترجمہ نہایت فصیح وبلیغ معانی خیز محاورے کے موافق مقبول و مشہور و مطبوع ہے، سر سید احمد خان لکھتے ہیں کہ عربی زبان سے اردو ترجمہ سب سے پہلے مولوی عبدالقادر اور مولوی رفیع الدین صاحب نے کیا جسکا تاریخی نام موضح قرآن ہے اور جو پہلی مرتبہ ۱۲۵۴ھ / ۱۸۳۸ء میں سید عبداللہ بن بہادر علی نے مطبع احمد ہگلی (بنگال) سے شائع کیا۔[۱]

آپکی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی صرف ایک صاحبزادی تھیں جنکی شادی مولوی محمد مصطفیٰ ابن شاہ رفیع الدین سے ہوئی ان سے ایک صاحبزادی ہوئیں جنکی شادی شاہ اسمٰعیل شہید سے ہوئی، ان سے ایک فرزند مولوی محمد عمر تولد ہوئے جو لاولد تھے مگر بڑے صاحب تصرف و کمال تھے۔[۲]

آپ نے تریسٹھ سال کی عمر پائی اور ۱۲۳۰ھ میں وفات ہوئی۔

۵۔ شاہ عبدالغنی:

یہ شاہ ولی اللہ کے سب سے چھوٹے صاحبزادہ تھے شاہ صاحب کے انتقال کے وقت انکی عمر صرف پانچ سال تھی اور اسوقت کلام پاک حفظ کرتے تھے آپنے بھی اپنے بھائی شاہ عبدالعزیز سے تعلیم وتربیت پائی جس کی بناء پر آپ جامع کمالات ہوگئے آپ علم حدیث و فقہ میں ماہرانہ بصیرت رکھتے تھے زہد واتقاء میں فرید عصر تھے وضع ولباس میں اپنے والد شاہ ولی اللہ سے بہت ہی مشابہ اور صاحب کشف و کرامات

۱۔ تذکرہ اہل دہلی، مصنفہ سر سید احمد خاں، صفحہ ۸، کراچی ۱۹۵۵ء

۲۔ مقالات طریقت، صفحہ ۲۲

تھے۔ [1]

آپکی شادی شاہ ولی اللہ کے ایک شاگرد شیخ علاء الدین پھلتی کی صاحبزادی فاطمہ سے ہوئی جنکے بطن سے ایک صاحبزادی رقیہ اور انکے بعد ۱۱۹۳ھ / ۱۷۷۹ء میں شاہ محمد اسمٰعیل پیدا ہوئے جو بعد میں اسمٰعیل شہید کے نام جانے گئے، شاہ اسمٰعیل کی شادی شاہ عبدالقادر کی نواسی اور شاہ رفیع الدین کی پوتی کلثوم سے ہوئی جس سے ایک فرزند محمد عمر پیدا ہوئے۔

آپ نے زیادہ عمر نہ پائی شاہ عبدالعزیز کے بھائیوں میں آپ اگرچہ سب سے چھوٹے تھے مگر سب سے پہلے آپکا انتقال ۱۲۰۳ھ / ۱۷۸۹ء میں ۳۲ یا ۳۳ سال کی عمر میں ہوا۔

تلامذہ و مریدین

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی زندگی کا ایک بڑا حصہ درس و تدریس، دعوت و ارشاد اور تصنیف و تالیف میں بسر ہوا، آپکا شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع تھا آپکے شاگرد پورے ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے بلکہ افغانستان، عرب اور دور دراز کے ممالک سے بھی تعلق رکھتے تھے شاگردوں کی مکمل فہرست کا پیش کرنا تو محال امر ہے مگر مختلف مصنفوں نے مشہور طلباء کا تذکرہ کیا ہے۔

آپکے معروف شاگردوں میں آپکے دو صاحبزادے شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین بھی ہیں جو آپکے وصال کے وقت بالترتیب ساڑھے سولہ سال اور ساڑھے تیرہ سال کے تھے مگر ابتدائی تعلیم آپ سے حاصل کی ان کے علاوہ شیخ محمد عاشق پھلتی، شاہ نور اللہ بڈھانوی، خواجہ محمد امین کشمیری، شاہ جمال الدین، شاہ ابوسعید بریلوی، مولانا ثناء اللہ پانی پتی، شاہ محمد نعمان، علامہ مرتضیٰ الحسینی الواسطی زبیدی کے علاوہ رفیع الدین بن فرید الدین محدث مرادابادی وغیرہ آپکے نہایت قریبی اور مشہور تلامذہ و خلفاء میں تھے۔

ان میں سے چند حضرات کا مختصر تعارف اس موضوع کیلئے مناسب ہوگا کیونکہ اس سے یہ پتہ چل سکے گا کہ آپ کی دی ہوئی تعلیم و تربیت اور صحبت کا اثر کتنا فیض رساں تھا اور اس نے آپ سے تعلق رکھنے والوں پر کتنا زبردست اثر ڈالا۔

۱۔ شیخ محمد عاشق پھلتی:

شیخ محمد عاشق سے شاہ ولی اللہ کے تعلق کی نوعیت ایک عزیز قریب، ایک دوست محبّ، بچپن کے ساتھی، شریک درس، شریک سفر و حضر، شاگرد، مسترشد اور خلیفہ کی تھی شاہ صاحب سے آپکی

---

[1] حیات ولی، صفحہ ۳۵۲

قرابتِ رشتہ تین اطراف سے تھی، شیخ محمد عاشق کے والد شیخ عبید اللہ حضرت شاہ ولی اللہ کے خسر تھے اور دادا شیخ محمد شاہ صاحب کے والد شیخ عبدالرحیم کے خسر تھے یعنی شیخ عبید اللہ شاہ صاحب کے ماموں اور شیخ محمد نانا تھے، شیخ عبید اللہ کی صاحبزادی فاطمہ سے شاہ صاحب کی پہلی شادی ہوئی اس طرح شیخ محمد عاشق شاہ صاحب کے سالے تھے اس کے علاوہ شیخ محمد عاشق شاہ صاحب کے سمدھی بھی تھے شاہ صاحب کی صاحبزادی امۃ العزیز شیخ محمد عاشق کے صاحبزادے محمد فائق کی زوجیت میں تھیں، شاہ ولی اللہ نے ایک رسالہ " العطية الصمدية في انفاس المحمدية " کے نام سے اپنے نانا کے احوال میں لکھا جو انفاس العارفین کے سات ابواب میں سے ایک ہے.

شاہ محمد عاشق کے اسلاف نسلاً صدیقی تھے جو کسی زمانہ میں حجاز سے آکر بارہ بنکی کے اطراف میں قریہ سدھور میں بس گئے تھے۔

شاہ ولی اللہ کی والدہ شیخ محمد کی صاحبزادی فخر النساء تھیں جو شیخ عبدالرحیم کی دوسری زوجہ تھیں جنسے انھوں نے ساٹھ سال کی عمر میں شادی کی۔ اسطرح شیخ عبدالرحیم کے گھر میں شیخ محمد عاشق کی پھوپھی (فخر النساء) اور شاہ ولی اللہ کے گھر میں انکی بہن فاطمہ تھیں۔

شاہ صاحب کا ننھال پھلت میں تھا جو دہلی سے ۶۰ میل دور ضلع مظفر نگر کا ایک قریہ ہے۔ شاہ صاحب یہیں پیدا ہوئے اور ابتدائی عمر میں انکا قیام عموماً اپنی ننھال ہی میں رہتا تھا۔ شیخ محمد عاشق جو شاہ صاحب سے چار سال چھوٹے تھے انکی شاہ صاحب سے جو انکے ماموں زاد بھائی تھے بچپن سے ہی دوستی تھی اور بچپن ساتھ ہی گذرا تھا۔ شیخ محمد عاشق نے اپنے قول جلی کے آخر میں اپنا احوال بیان کیا ہے اسکے مطابق انکی ولادت ۱۰ رمضان المبارک ۱۱۱۰ھ میں ہوئی(۱)۔ تاریخی نام محمد غازی ہے۔ بچپن میں کلام پاک اور ابتدائی نصاب اپنے جد مادری سے اور ابتدائی کتب فارسی و عربی (رسالہ میزان صرف و نصف بوستان سعدی) اپنے دادا شیخ محمد صاحب سے پڑھیں اسکے بعد معقولات و منقولات کی درسی کتابیں اپنے والد شیخ عبید اللہ اور چچا شیخ حسیب اللہ سے پڑھیں اسی زمانہ میں چچا صاحب کے فرمانے پر معارف و حقائق کو قلمبند کرنیکی ابتدا کی اور شیخ عبدالرحیم صاحب سے بھی فیض حاصل کیا اور انکی خدمت میں حاضر ہو کر انکے

---

(۱) قول جلی کے خود بیتی کے اس اندراج کے لحاظ سے شیخ محمد عاشق شاہ صاحب سے ۴ سال بڑے نظر آتے ہیں، اگرچہ دیگر واقعہ نگاروں نے شاہ صاحب کے اقوال کے حوالہ سے لکھا ہے کہ شیخ عاشق شاہ صاحب سے ۳-۴ سال چھوٹے تھے بہر حال یہ امر مسلمہ ہے کہ دونوں اصحاب تقریباً ہم عمر تھے اور ہم سبق اور جگری دوست بھی، اس کے باوجود شیخ محمد عاشق شاہ صاحب کا بہت ادب کرتے تھے اور ان کو ہمیشہ اپنے سے برتر سمجھتے تھے اور اپنا استاد اور مرشد بھی اور وہ آپ کو بڑے خطابات سے یاد کرتے تھے مثلاً ایک جگہ خود کو خاکسار اور شاہ ولی اللہ کو ولایت مآب، امام المحققین، وارث الانبیاء والمرسلین، شیخ الوقت، ولی الزماں حضرت اقدس دامت برکاتہم سے خطاب کیا ہے۔ القول الجلی ترجمہ تقی انور علوی، صفحہ ۶۵۷-۶۷۹۔

خطابات و معارف باطنی کے بیانات کی سماعت کی کیونکہ حضرت شاہ ولی اللہ بھی اپنے والد سے تعلیم و تربیت حاصل کر رہے تھے اور تقریباً ہم عمر تھے اور ہم سبق بھی اسلئے شاہ صاحب سے آپکی گہری دوستی اور رفاقت ہو گئی جسکو دیکھ کر شیخ عبدالرحیم بہت خوش ہوتے۔ شاہ ولی اللہ نے شیخ محمد عاشق کو جو اجازۃ عربی میں لکھا ہے اس میں تحریر کیا ہے:

"وکان سیدی الوالد ....رأنی وایاہ متحابین فی اللہ متجالسین للہ فیقول انی اراء ھما متحابین وانہ یسر فی ذلک" [۱]

شاہ صاحب خود فرماتے ہیں:

"روزے در اواخر ایام خود بایں فقیر وصلاح آثار محمد عاشق اشارہ کردہ والد ماجد فرمود ند کہ بایکدگر دوستی دارند۔ وایں دوستی سبب ابتہاج من می شود"۔ [۲]

والد ماجد نے اپنی زندگی کے اواخر ایام میں ایک روز اس فقیر اور محمد عاشق کی طرف اشارہ کر کے فرمایا یہ دونوں ایکدوسرے سے دوستی اور محبت رکھتے ہیں اور یہ دوستی میرے لئے خوشی اور مسرت کا سبب ہے

آگے فرماتے ہیں:

"سر ایں کلمہ من بعد بظہور پیوست کہ ایں عزیز بایں فقیر ارتباط طریقت پیدا کرد و متبع شد و امید آنست کہ ایں دوستی مثمر فوائد بسیار باشد" [۳]

اس بات کا بھید بعد میں یوں ظاہر ہوا کہ آنعزیز (شیخ عاشق) نے اس فقیر سے طریقت کا تعلق پیدا کیا اور اتباع کیا۔ امید ہے کہ یہ دوستی مزید فوائد کی صورت میں ثمر بار ہو گی۔ (پھلے گی پھولیگی)

بہر حال اسی دوران شیخ عبدالرحیم نے شیخ عاشق کو شاہ ولی اللہ کے سپرد کر دیا جنسے انھوں نے شرح تجرید مع حاشیہ قدیم "شمس بازغہ و محکم الاصول" اور "الافق المبین" جیسی کتابیں پڑھیں۔ اور بعض جزو صحیح مسلم شریف کے بھی پڑھے اور ساتھ ہی شغل طریقت بھی سیکھا اسی دوران شیخ صاحب نے شاہ صاحب سے بیعت بھی کر لی۔ وہ سفر و حضر میں شاہ صاحب کے ساتھ رہنے لگے۔ پہلے سفر میں جب شاہ صاحب گجرات تک جا کر واپس آگئے تھے تو شیخ عاشق بھی آپکے ساتھ تھے۔ اور القول الجلی میں

---

[۱] القول الجلی، اجازۃ ولی بحق شیخ محمد عاشق، صفحہ ۶۷۳

[۲] انفاس العارفین، صفحہ ۶۵

[۳] ایضاً، صفحہ ۷۶

اس سفر کا ذکر کیا ہے خود لکھتے ہیں:

"اس سفر سعادت میں رات و دن ایک گھڑی بھی دولت حضوری سے محروم نہ رہا"[۱]

شیخ صاحب شاہ صاحب کے اتنی قریبی اور ساتھی اور دوست ہونے کے باوجود انکا بڑا ادب کرتے تھے اور اگر چہ ابتدائے شعور سے شاہ صاحب سے خلوص و محبت انکے دل میں بیٹھ گئی تھی مگر آپ سے تعلق استاد و مرشد کا ہی رکھا۔

"مجھے یاد نہیں پڑتا کہ بچپن سے لیکر ابتک سوائے ادب و تعظیم کے کوئی ایسی بات جو عام طور پر لڑکوں (ہمعصروں) میں آپس میں ہوتی ہے آنجناب کی شان میں اس غلام سے صادر ہوئی ہو۔ بلکہ مجھے یاد ہے کہ کوئی ایسا حرف بھی جس سے آنجناب کی ہمسری اور آپکی بزرگی و تعظیم میں کمی یا کوتاہی مقصود ہوتی ہو کبھی زباں سے نہ نکلا اور نہ کوئی خطرہ جو آپکے کمال اعتقاد سے خالی ہو دل میں گذرا۔"[۲]

شاہ ولی اللہ بھی شیخ صاحب کو بہت عزیز رکھتے تھے اور انکو نہایت اچھے الفاظ میں یاد کرتے تھے۔ عربی کا ایک شعر جو اپنے خطوط میں آپ نے انکو لکھا وہ شاہ صاحب کے خلوص و محبت کی نشانی ہے۔ آپنے انھیں خطاب کرتے ہوئے لکھا:

انی و ان خاطبت الف مخاطب　　فانت الذی اعنی و انت المخاطب

(اگر میں ہزار لوگوں سے خطاب کروں (تو بھی) تم ہی ہو جنسے اس خطاب میں میرا مقصد ہوتا ہے اور تم ہی میرے مخاطب ہوتے ہو۔[۳])

شاہ ولی اللہ نے اپنی بیشتر کتابیں خصوصاً حجۃ اللہ البالغۃ، خیر کثیر، فیوض الحرمین وغیرہ شیخ محمد عاشق کی تحریک پر ہی تحریر کیں۔ پھر شیخ عاشق نے آپکی کتابوں کے مسودہ سے انکا مبیضہ کیا (یعنی انکو صاف کر کے لکھا اور نظر ثانی کی)

آپ کہتے ہیں:

"کتاب 'حجۃ اللہ البالغہ' جو آنجناب کی عمدہ تصنیفات میں سے ہے اور اسرار شریعت کے علم خاص میں ہے اسکے انتساب کو کمترین فدوی کے نام معنون فرمایا۔

انمیں سے بعض کتب و رسائل جو مرتب تھے مسودات سے نکال کر مبیضہ تیار کیا اور جب

---

۱ القول الجلی، صفحہ ۶۶۰

۲ ایضاً، صفحہ ۶۶۲

۳ ایضاً، صفحہ ۶۶۲

'خیر کثیر' کے مبیضہ سے مشرف ہوا تو سبقاً سبقاً اسکے رموز و نکات کو آنجناب سے حل کر کے تحریر کئے اور آپنے اسکو مدون کر کے خیر کثیر سے موسوم فرمایا"۔[۱]

جب شاہ ولی اللہ ۱۱۴۳ھ میں حج کو تشریف لے گئے تو آپکے ماموں (اور خسر) شیخ عبید اللہ اور انکے صاحبزادے شیخ محمد عاشق آپکے رفیق سفر تھے۔ اثنائے سفر اور دوران قیام مکہ معظمہ و مدینہ منورہ شیخ عاشق شب و روز آپکے ہمراہ رہے۔ یہاں تک کہ اونٹ پر ایک شغدف میں (اونٹ کی کاٹھی پر جو کھٹولے بندھے ہوتے ہیں انکو شغدف کہتے ہیں اور دو کھٹولوں پر دو افراد بیٹھے ہیں تاکہ بیلنس بنا رہے) ہمسفر ہوئے۔ ہر عمرہ، حج، اعتکاف، تعلیم و تعلم، مراقبہ، حاضری آستانہ نبوت غرض ہر جگہ شیخ آپکے ہمراہ رہے اور آپکے اقوال اور واردات قلب کو تحریر کرتے رہے۔ 'القول الجلی' انہیں بیانات، خطبات، اقوال و احوال کا تذکرہ ہے جو شیخ عاشق کے قلم سے مرقوم ہوئے اور شاہ صاحب کی تصحیح و توثیق کے بعد بصورت کتاب شائع ہوئی اس سفر کے دوران شاہ صاحب نے اپنے احوال اور کیفیات قلب کے بارے میں فیوض حرمین تصنیف کی جو آپنے شیخ عاشق ہی کی گذارش پر لکھی اور اس کا مبیضہ بھی شیخ عاشق نے ہی کیا، اسکے علاوہ شیخ عاشق کو جو سعادت نصیب ہوئی جس کے بارے میں لکھتے ہیں:

"حضرت اقدس (شاہ ولی اللہ) کے نئے و تازہ سلوک کے بعد بطریق اویسی حضرت خاتم الرسل صلوٰۃ اللہ و سلام علیہ کی روح کریمہ سے پہلا شخص جو آنجناب (شاہ صاحب) کے شرف بیعت سے مشرف ہوا یہی غلام تھا اور یہ دوسری بیعت تھی اور یہ بیعت شب قدر میں ثلث اخیر میں حجر کعبہ میں میزاب رحمت کے نیچے ہوئی فالحمد للہ علی ذلک"۔[۲]

حجاز میں بھی شیخ عاشق شاہ صاحب کے شریک درس رہے اور شاہ صاحب کے ساتھ صحیح بخاری و دارمی شریف و دیگر کتب شیخ ابو طاہر کردی مدنی سے پڑھیں اور سماعت کیں چنانچہ شیخ ابو طاہر کردی نے روایت حدیث کا اجازہ ۲۲ رجب ۱۱۴۴ھ کو شاہ ولی اللہ کو لکھ کر دیا اسمیں شیخ محمد عاشق اور ان کے والد شیخ عبید اللہ کو شامل کرتے ہوئے تحریر کیا۔

وكان ختمه بحضرة جماعة من الفضلاء منهم خاله المراقب فى الله الشيخ عبيدالله وابن خاله المذكور	صحیح بخاری سماعت و قرأت کا ختم کئی فضلاء کی موجودگی میں ہوا جن میں آپ کے ماموں مراقب فی اللہ شیخ عبید اللہ اور شیخ عبید اللہ

---

۱ القول الجلی، صفحہ ۶۶۴

۲ ایضاً، صفحہ ۶۶۵

الفاضل الاديب مرآة كماله و خدين جميل خصاله الذى لم يزل لسانه بذكرالله الواثق بالصمد الخالق مولانا محمد عاشق صانه من البوائق و رقاه الله على الر تب الكمال و صرف عنه كل فائق..... اجزت لسيدنا الشيخ ولى الله المذكور ... ولخاله وابن خاله الممجدين فى اعلى الستور ۔[۱]

کے صاحبزادہ فاضل ادیب، (شاہ کے) کمالات کا آئینہ، آپکی جیسی عمدہ عادات والے کے دوست جنکی زبان اللہ الواثق بالصمد الخالق کے ذکر میں مصروف رہتی ہے، مولانا محمد عاشق ہیں۔ اللہ انکو تمام آفات سے محفوظ رکھے اور اعلیٰ مراتب کمال پر پہونچائے اور ہر آسمانی مصیبت سے بچائے ..... میں نے سیدنا شیخ ولی اللہ مذکور .....انکے ماموں اور ماموں زاد بھائی کو جو غیب کے اعلیٰ مقامات میں معزز ہیں اجازت دی۔

اور پھر جب اس سفر کے بعد باطنی وقوعہ میں شاہ ولی اللہ نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی تو اسکے بعد شیخ عاشق نے تیسری مرتبہ آپ سے بیعت کی، ایک بار شیخ عاشق کیلئے اپنے قلم سے لکھا:

والذى نفسى بيده لانت احب و افضل و اوقع فى القلب فلعلك لا تعلم هٰذه الدقيقة او اغمضت عنها ولولاك ما كنا فلا كانت الدنيا ۔[۲]

اور قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے تم میرے نزدیک (میرے دل میں) سب سے زیادہ محبوب، افضل و برتر ہو شاید تم اس نکتہ کو نہ جانتے ہو یا اس سے چشم پوشی کرتے ہو گے کہ اگر تم نہ ہوتے تو ہم نہ ہوتے اور دنیا نہ ہوتی۔

ایک مکتوب میں شاہ صاحب نے لکھا ہے:

"جب بھی عزیز بھائی محمد عاشق کیطرف نگاہ اٹھتی ہے تو آنکھوں کو نئی ٹھنڈک حاصل ہوتی ہے"

شاہ ولی اللہ نے علماء و مشائخ کی موجودگی میں خرقہ جامعہ عطا کیا اور اجازت طرق ثلاثہ نقشبندیہ قادریہ و چشتیہ و دیگر مشائخ کے طرق پر شیخ عاشق کو دی اور دستار خلافت آپکے سر پر باندھی، اس اجازہ کو جو عربی میں ہے شیخ عاشق نے القول الجلی کے آخر میں جوں کا توں نقل کیا ہے، اس کافی طویل اجازہ میں شاہ صاحب نے شیخ صاحب کی تعریفیں کرتے ہوئے اور انکو اپنی تصانیف کا سبب بتاتے ہوئے لکھا ہے:

و هـو بحمدالله عتبة نصحى ووعاء

اور وہ بحمد اللہ میری نصیحت کا سراپا ہیں اور میرے

---

۱ اتحاف البغیہ از شاہ ولی اللہ، صفحہ ۱۸-۱۹، ماخوذ از برکاتی، صفحہ ۷۶-۷۷

۲ القول الجلی، صفحہ ۶۶۷

علمی وحافظ اسراری وناظور کتبی بل هو کان الباعث علی تسوید کثیر منها والمباشر لتبیضه و اظن ان علومی یبقیٰ فی الناس من جهته والله اعلم [۱]

علم کا برتن ہیں اور میرے رازوں کے محافظ ہیں اور میری کتابوں کے نگہباں میں بلکہ ان میں سے اکثر کی تصنیف کا باعث ہیں اور انکی تبیض (صاف کرنے) کے ذمہ دار ہیں اور میں گمان کرتا ہوں کہ میرے علوم لوگوں میں انکی کوششوں سے باقی رہیں گے واللہ اعلم.

شیخ محمد عاشق کی کتب میں انتہائی اہم کتاب "القول الجلی فی المناقب و آثار الولی" جو شاہ ولی اللہ کی ایک مبسوط اور مشرح سوانح ہے جو فارسی میں ہے اس کے علاوہ یہ کتاب بڑے دقیق اسرار و حقائق و معارف کا بیان بھی ہے جو لسان ولی اللہ سے نکلکر قلم عاشق پر آئے اور پھر کتاب کی شکل میں عوام الناس کے سامنے آگئے اس کتاب کا مخطوطہ خانقاہ قلندریہ کاکوری ضلع لکھنؤ میں محفوظ ہے اصل مخطوطہ کا عکس بھی شائع ہو چکا ہے اس کا اردو ترجمہ و شرح جناب مولوی حافظ شاہ تقی انور علوی کاکوروی نے کر کے شائع کرایا، اس کے تمام اقتباسات و حوالہ جات اسی ترجمہ سے ہیں.

آپکی دیگر تصنیفات میں ایک فارسی کتاب سبیل الرشاد ہے جو فن تصوف و سلوک پر ہے اس کتاب کا کوئی مخطوطہ محفوظ نہیں۔ صرف شاہ عبدالعزیز نے فتاویٰ میں سید الاستغفار کے سلسلہ میں اسکا ذکر کیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کے مکتوبات کو بھی آپ اور آپکے صاحبزادہ شیخ عبدالرحمٰن نے جمع کیا تھا۔ بلکہ شاہ صاحب کے علوم و معارف زیادہ تر آپ ہی کے ذریعہ محفوظ اور اشاعت پذیر ہوئے۔

اسکے علاوہ مقدمہ خیر کثیر کے نام سے آپنے شاہ صاحب کی تصنیف خیر کثیر پر حاشیہ لکھا اور اسکی تشریح کی جسکو تحریری شکل دی۔ اسکے علاوہ شاہ صاحب کی تحریر کردہ شرح مؤطا امام مالک عربی میں المسویٰ اور فارسی میں المصفیٰ کے مسودات کا مبیضہ آپنے شاہ صاحب کی وفات کے بعد کیا اور شاہ صاحب کی نایاب کتاب دعاء الاعتصام کی شرح لکھی جو اب نایاب ہے۔

شاہ محمد عاشق شاہ ولی اللہ کے اجل خلفاء میں تھے اور ارشاد و تزکیہ باطن کے فرائض بھی انجام دیتے رہتے تھے ۔ انکا وصال ۱۱۸۷ھ میں ہوا اور پھلت میں تدفین ہوئی جہاں ایک خانقاہ "خانقاہ شاہ محمد عاشق" کے نام سے مشہور ہے۔

---

[۱] القول الجلی، صفحہ ۶۷۵

(۲)شاہ نور اللہ پھلتی (بڈھانوی)

آپ حضرت شاہ ولی اللہ کے ارشد تلامذہ میں ہیں۔ تحریک ولی اللہی میں آپکو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ شیخ محمد عاشق نے قول جلی کے آخر میں شاہ صاحب کے خلفاء اور متبعین کا حال بیان کیا ہے اسمیں شاہ نور اللہ بڈھانوی کو شاہ صاحب کا بزرگ ترین خلیفہ اور قدیم اصحاب اور احباب کاملین میں سے ایک بتایا ہے۔

بچپن سے ہی شاہ نور اللہ اپنے حسن ادب کیوجہ سے شیخ عبد الرحیم کے نور نظر تھے۔ آپنے ابتدائی تعلیم شاہ ولی اللہ کی والدہ کے ماموں شیخ بدر الحق سے حاصل کی۔ آپ شیخ عبد الرحیم اور شیخ محمد کے شاگردوں میں تھے ان بزرگوں سے انھوں نے چند ابتدائی کتب پڑھیں۔ اسکے بعد بقیہ تعلیم شاہ ولی اللہ سے حاصل کی۔ ابتدائے طالبعلمی میں ہی آپ نے شاہ ولی اللہ سے بیعت کرلی اور اشغال طریقت میں سے ایک شغل میں مشغول ہوگئے اور شاہ صاحب کے حکم کے مطابق علم ظاہری کا درس ترک کر کے اور وظیفہ ظفر خانی (جو انکو روشن الدولہ ظفر خان کے مدرسہ سے ملتا تھا) کو چھوڑ کر تجرد تام اختیار کر کے اپنے مرشد کے حکم کے بموجب ترک دنیا کرلیا۔ مگر دل میں علوم رسمیہ کیطرف شغف تھا جسکی بناء پر علمی مذاکروں میں شرکت کرتے رہے۔ شاہ صاحب نے ان مجالس میں جانے پر پابندی لگادی۔ آپنے اس حکم کا بھی اتباع بلا چون وچرا کیا۔ اسی دوران شاہ صاحب نے پہلی مرتبہ سفر اختیار کیا شاہ نور اللہ آپکے ہمراہ تھے اور دوران سفر محنت شاقہ اور خدمت ہمراہیاں از قسم تیاری طعام، بار برداری، مریضوں کی تیمارداری، مختلف الطبع ہمسفروں کی دلجوئی بڑی بردباری، خندہ پیشانی اور صبر وشکر کے ساتھ انجام دیں یہ سفر آپکے لیے سخت مجاہدہ اور ایمان کی کسوٹی بن گیا جس پر تپ کر آپ کندن ہوگئے۔ واپسی سفر پر شاہ صاحب نے قصبہ بڈھانہ میں آپکو خرقہ خلافت عطا فرمایا پھر اسکے بعد علوم ظاہری کے درس کا حکم دیا اور رشد وہدایت کے کام پر مامور کیا۔ چنانچہ ایک عالم کے فیض تربیت وصحبت کی برکت سے آپ صحرائے جہالت سے نکل کر علم وفضل کی منزل اور راہ حق پر پہنچ گئے۔

اس روحانی وعلمی توجہ اور تربیت سے آپ کے مزاج میں ایک خاص قسم کی قناعت، بردباری، استغناء اور اعتدال پیدا ہوگیا. جو زندگی کے ہر شعبہ میں کارفرما رہا۔ آپ اتباع شریعت اور اشاعت علوم و معارف میں ممتاز تھے مگر دنیا اور اہل دنیا سے مستغنی اور بے پرواہ اور انکے معاملات میں مداخلت نہیں کرتے تھے۔

فقہ حنفی میں آپ شاہ عبدالعزیز کے استاد بھی ہیں اور انکے خسر بھی۔ آپکے صاحبزادہ مولانا عبدالحئی صاحب شاہ عبدالعزیز کے تلامذہ میں ایک مخصوص مقام رکھتے ہیں۔ شاہ صاحب کے علوم و معارف کی اشاعت میں آپکی کوششوں کا بڑا دخل ہے۔ شاہ صاحب نے جو اجازت نامہ لکھ کر دیا اسمیں آپکی علمی اور روحانی بلندیوں کی بڑی تعریف کی ہے۔

(۳) خواجہ محمد امین کشمیری:

آپ نسلاً کشمیری تھے۔ وہاں سے بسلسلہ تجارت نکلے اور لاہور پہنچکر چند روز قیام کیا اور پھر وہاں سے ہوتے ہوئے شاہجہاں آباد (دہلی) آگئے۔ یہاں پہنچکر خواجہ محمد ناصر نقشبندی کی رہبری میں شاہ ولی اللہ کی خدمت میں پہنچے اور جذب صحبت سے آپکے ہی ہو کر رہ گئے اور تمام کاروبار چھوڑ کر آستانہ شیخ کی مجاورت اختیار کرلی خواجہ محمد امین شاہ صاحب کے ارشد تلامذہ میں سے تھے انہوں نے آپ سے بیشمار ظاہری و باطنی فیوض حاصل کئے اور حدیث و تفسیر کی کتابیں پڑھیں شاہ صاحب کو آپ سے بڑا تعلق تھا، خواجہ محمد امین نے شاہ صاحب کے بعض خاص مسودات کو اپنی کاوشوں سے قبول خاص و عام کیا چنانچہ مسویٰ شرح احادیث مؤطا اور اس کا ترجمہ (جنکا مبیضہ شیخ محمد عاشق نے کیا تھا) کتاب قرۃ العینین ، رسالہ الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، فتح الخبیر، رسالہ الانصاف فی بیان سبب الاختلاف، رسالہ العقد الجید فی مسائل الاجتہاد والتقلید وغیرہ یہ سب ان کے حسن اہتمام سے منظر عام پر آئیں خواجہ محمد امین گویا اس بیت اشرف کے خادم ہی تھے اور اس بات سے شاہ ولی اللہ بہت متاثر ہوئے اور آپ نے بغایت بندہ نوازی فرمایا: "میں تم کو اپنے اعضاء کے مثل سمجھتا ہوں"

اس قدر و منزلت کے سبب آپ حضرت کے تمام مسترشدین میں سربلند ہوگئے۔

ایک موقعہ پر جب خواجہ صاحب نے اپنے لئے دعائے خیر کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا :

> " اب تم جداگانہ دعا کے محتاج نہیں رہے ہو تمہاری محبت مرکوز باطن ہو چکی ہے (دل میں گھر کر گئی ہے) اور جس چیز کے لئے اللہ تعالیٰ سے اپنے لئے درخواست کی جاتی ہے اس کے مثل تمہارے لئے بھی کی جاتی ہے اور جو دعا اپنے لئے کی جاتی ہے اسمیں تم بھی شامل و شریک ہو"۔ [۱]

آپکی وجہ سے شاہ ولی اللہ نے بعض رسائل تصنیف کئے، فارسی زبان میں جو اشعار رموز تصوف میں کہے گئے ہیں وہ شاہ صاحب نے آپ ہی کے التماس اور درخواست پر کہے ہیں رسالہ شفاء القلوب کی

---

[۱] القول الجلی، صفحہ ۶۱۲

تالیف صرف آپ کی وجہ سے ہوئی حضرت اپنے اشعار میں جہاں کہیں امین فرماتے ہیں دراصل وہاں آپ ہی کو مخاطب کرتے ہیں آپکے ذریعہ سے فکر ولی اللہی کو بڑا فروغ ہوا.

آپ شاہ عبدالعزیز کے اساتذہ میں ہیں انشاء پردازی میں بھی مشاق ہیں ایک رسالہ مرشد برحق کے فضائل میں تحریر کیا جس میں ولی اللہ کے فضائل و مناقب کو نہایت عقیدت اور حسن ادا سے بیان کیا ہے چند اشعار بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں:[۱]

خداوندا بآہ جان غمناک ☆ بہ چشم خوں فشاں وسینۂ چاک
بہ نام آں کہ جان خاک رہ اوست ☆ قلم شیدائے روئے چوں مہ اوست
بآں مہر سپہر رہ نمائی ☆ بآں اعجوبۂ وضع الٰہی

☆

بآں عکس جمال ذات مطلق ☆ چہ عکسے گشتہ اندر ذات ملحق
ابو الفیاض نام قد سیانش ☆ بنازم من ازیں تعظیم شانش
ذکی امتی گفتش پیمبر ☆ رسول مجتبیٰ آں بدر انور

☆

امام و مقتدا و قبلہ گاہم ☆ ولی اللہ شاہ دیں پناہم
تنم را خاک راہ ایں حرم کن ☆ سرم زیں خاکساری محترم کن

آپکی وفات ۱۱۸۷ھ میں ہوئی

۴۔ شاہ ابو سعید بریلوی:

مولانا عبیداللہ سندھی نے اپنی کتاب التمہید میں لکھا ہے "شاہ صاحب کے مکمل نظریہ کو سمجھنے والوں میں چار رفقاء سے زیادہ نہیں ہیں، (۱) انکے ماموں زاد بھائی شاہ محمد عاشق (۲) جمال الدین شاہ محمد امین ولی اللہی کشمیری (۳) شاہ نوراللہ بڈھانوی (۴) شاہ ابو سعید بریلوی "۔[۲]

ان میں تین کا تذکرہ ہو چکا چوتھے شاہ ابو سعید بریلوی ہیں، شاہ ابو سعید بن محمد ضیاء بن شیخ اجل علم اللہ حسنی نقشبندی بریلوی علمائے ربانیین میں سے تھے آپ رائے بریلی میں پیدا ہوئے ملا عبداللہ امیٹھوی سے تعلیم حاصل کی پھر اپنے چچا سید محمد صابر بن آیت اللہ نقشبندی سے بیعت ہو کر اذکار و اشغال صوفیہ

۱۔ قول جلی، صفحہ ۶۱۴

۲۔ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، مصنفہ مولانا عبیداللہ سندھی، صفحہ ۱۷۳-۱۷۴

میں مصروف ہوگئے اس کے بعد دہلی آکر شاہ ولی اللہ سے استفادہ کیا اور روحانی تعلق پیدا کر کے فیضیاب ہوئے، شاہ صاحب کے وصال کے بعد محمد عاشق پھلتی سے رجوع کر کے ان سے سلوک کے باقی مراحل طے کئے۔ [۱]

شیخ محمد عاشق پھلتی نے جو اجازت نامے لکھ کر دیا اس میں اس بات کا بھی ذکر کیا کہ شاہ ابو سعید شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے ساتھ رہے اور ان سے اشغال طریقت سیکھ کر ان پر مداومت کی جس کی برکت سے ان پر ظاہری و باطنی اسرار کے در وا ہوگئے۔

شاہ ابو سعید ایک باوقار کریم النفس، مہمان نواز، اور غریب پرور بزرگ تھے آپکا دستر خوان نہایت وسیع تھا۔ ۱۱۸۷ھ میں آپنے حج کے ارادہ سے سفر حجاز کیا اور حج کے بعد چھ ماہ مدینہ منورہ میں قیام کیا اور شیخ ابوالحسن سندھی الصغیرؒ کے حلقہ میں "مصابیح" کی سماعت کی، اس دوران آپنے مرقد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی حاضری دیتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار بھی کیا آپکے مرید و مجاز شیخ امین الدین بن حمید الدین علوی کاکوروی اپنے رسالہ میں لکھتے ہیں:

" شیخ ابو سعید فرماتے تھے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ منورہ میں بچشم سر دیکھا ہے"۔ [۲]

دوبارہ مکہ معظمہ پہنچ کر آپنے شیخ محمد میر داد انصاری سے "جزریۃ" پڑھی پھر طائف ہوتے ہوئے ہندوستان واپس آئے۔

آپ سید احمد شہید کے حقیقی نانا تھے خاندان ولی اللہی سے آپکے تعلقات کی خصوصی نوعیت کا اندازہ ان خطوط سے ہوتا ہے جو خود شاہ صاحب کے علاوہ شاہ اہل اللہ، شیخ محمد عاشق اور شاہ عبدالعزیز نے آپکے نام بھیجے ہیں، جن میں آپکے بلند مقام اور کمالات کا اعتراف ہے یہ مجموعہ مولوی سید ابوالقاسم ہنسوی کا مرتب کیا ہوا ہے اور مکتوب المعارف کے نام سے خاندانی ذخیرہ کتب میں محفوظ ہے۔

آپ نے ۹/رمضان المبارک ۱۱۹۳ھ کو وفات پائی اور تکیہ شاہ علم اللہ میں مدفون ہوئے آپکے متعدد مشہور و ممتاز خلفاء ہیں جنکا تذکرہ افادات مولانا امروہوی میں کیا گیا ہے۔ [۳]

ان چاروں اصحاب کے علاوہ بھی شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے شاگردوں کی ایک طویل فہرست ہے جنھوں نے شاہ صاحب سے فیض صحبت حاصل کیا۔

---

۱ ماہنامہ الرحیم مئی ۱۹۶۵ء، شاہ ولی اللہ اکیڈمی، حیدر آباد
۲ تاریخ دعوت و عزیمت، صفحہ ۳۹۳، جلد ۵
۳ مطبوعہ الرحیم مئی ۱۹۶۵ء، شاہ ولی اللہ اکیڈمی، حیدر آباد

باب چہارم

علمی وادبی خدمات

(عربی وفارسی)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی زندگی کا سب سے اہم دور آپکی حج سے واپسی اور آپکی وفات کے درمیان کے تیس (۳۰) سال ہیں۔ اس عرصہ میں آپ کے قلم سے وہ شاہکار وجود میں آئے جن سے آپکا نام رہتی دنیا تک روشن ہو گیا۔ آپنے اپنی تصنیفات کے ذریعہ وہ خدمات انجام دیں جنکے ذریعہ علوم دین کا چرچا عام ہو گیا۔ انتہائی محنت اور عرق ریزی کے بعد قرآن وسنت کی روشنی میں اسرار دین اور معرفت و مصالح احکام الٰہیہ کو ایسی خوش اسلوبی سے بیان کیا کہ متقدمین مصنفین کو یہ بات کم ہی نصیب ہوئی۔ شاہ صاحب کو اپنے مرتبہ کا بخوبی احساس تھا وہ اپنی ذمہ داریوں کو خوب سمجھتے تھے اور اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر بھی ادا کرتے تھے۔ الجزء اللطیف میں تحریر کرتے ہیں:

" 'واما بنعمت ربك فحدث'۔ خاکسار پر اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا انعام یہ ہے کہ اسنے مجھے 'خلعت فاتحیہ' سے نوازا اور اس آخری دور کا آغاز میرے ہی ہاتھوں کرایا اور مجھے اس طرف رہنمائی کی گئی کہ فقہ میں سے پسندیدہ مسالک کو یکجا کر کے فقہ، حدیث کی نئے سرے سے بنیاد رکھوں۔ اسی طرح اسرار حدیث' مصالح احکام' ترغیبات اور جو کچھ حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے ہیں اور جنکی آپنے تعلیم دی ہے، ان تمام کے اسرار و رموز کا بیان ایک مستقل فن ہے جسکے بارے میں اس فقیر سے زیادہ وقیع بات کسی اور سے نہیں بن آئی ہے۔ اور طریقہ' سلوک جو کہ خدائے بزرگ و برتر کے نزدیک بہت پسندیدہ ہے جسے اس دور میں رائج ہونا ہے وہ مجھے الہام کیا گیا جسے میں نے اپنے دو رسالوں "لمعات" اور "الطاف القدس" میں قلمبند کر دیا ہے۔ میں نے قدیم علمائے اہل سنت کے عقائد کو دلائل و براہین کی روشنی میں جس طرح ثابت کیا اور جس طرح انہیں معقولیوں کے شکوک و شبہات سے پاک کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب ان پر مزید بحث کی گنجائش ہی نہیں رہی۔

اور مجھے کمالات اربعہ یعنی 'ابداع' 'خلق' 'تدبیر' اور 'تدلی' جو اس دنیا کے طول و عرض میں موجود ہیں اور نفوس انسانیہ کی استعداد اور انکے کمال اور انجام کو جاننے کا علم عطا کیا گیا ہے۔ یہ دونوں علوم اس قدر اہم ہیں کہ اس فقیر سے پہلے کوئی انکی گرد تک نہیں پہنچا۔ اور حکمت عملی جسکے ذریعہ اس دور کی اصلاح کی جا سکتی ہے مجھے پوری طرح ودیعت کی گئی ہے اسکے ساتھ مجھے کتاب و سنت اور آثار صحابہ کے ذریعہ اس حکمت عملی کو مستحکم کرنے کی توفیق بھی بخشی گئی ہے۔

اگر میرا ہر بن موزبان بن جائے تو بھی میں کماحقہ 'اسکا شکر نہیں بجالا سکتا۔ والحمدللہ رب العالمین" [۱]

شاہ ولی اللہ نے جو تصنیفات تحریر کیں ان میں کونسی زبان استعمال کی 'ان تصنیفات کے موضوعات' تعداد اور انمیں سے کون سی تصنیفات ہمیں ملتی ہیں اور کن کا صرف نام ہی باقی رہ گیا ہے ان تمام کی تفصیل آپکی علمی وادبی خدمات کا جائزہ لینے کے سلسلہ میں مددگار ثابت ہوگی

(۱) زبان :

ہندوستان میں مسلمانوں کے دور حکومت میں درباری زبان فارسی تھی اور علمی ودینی زبان عربی۔ چونکہ لشکر میں ہر خطہ اور مذہب کے لوگ ہوا کرتے تھے اسلئے ان دونوں زبانوں اور دوسری دیسی زبانوں کے اختلاط سے اردو کا ارتقاء ہوا جو مقامی ہندی، عربی اور فارسی کی لغات ہندی گرامر اور فارسی رسم الخط کا مجموعہ تھی۔ اس زمانہ میں علوم کی تعلیم عموماً فارسی اور عربی میں ہی ہوا کرتی تھی۔ مدرسوں اور خانقاہوں میں خصوصاً اس تعلیم کے حلقے تھے۔

شاہ ولی اللہ نے اپنے دور تعلیم اور بعد میں دور تدریس میں ان دونوں زبانوں کا نہایت تندہی سے مطالعہ کیا تھا اور پھر دوران قیام حجاز میں عربی اور عرب علماء سے واسطہ پڑا جسکے نتیجہ میں عربی زبان وادب پر انکی گرفت انتہائی مضبوط ہوگئی۔

کسی زبان میں مہارت حاصل کرنے کے لئے اسکے قدیم کلاسیکی ادب کا مطالعہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ شاہ صاحب کو حجاز میں عربی ادب کے مطالعہ کے بہت مواقع میسر تھے ان کی جستجو' تحقیق کی فطرت اور خداداد ذہانت سے یہ بالکل بعید ہے کہ انہوں نے ان مواقع کا خاطر خواہ فائدہ نہ اٹھایا ہو۔ حجاز میں انکے اساتذہ اور وہ مشائخ جن سے انہوں نے بالواسطہ یا بلا واسطہ فیض حاصل کیا وہ سب عرب اور ماہرین علم و ادب تھے اور انکی صحبتوں سے انہوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

تالیف و تصنیف کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ متعلقہ زبان پر مکمل عبور حاصل ہو۔ تحریر و تقریر یہانتک کہ غور و فکر بھی اسی زبان میں ہو۔ انسان جس موضوع کو بیان کرنا چاہتا ہے اسکے بارے میں تخیلات بھی اسی زبان میں اسکے ذہن میں آئیں جس میں اسکو لکھنا ہو۔

اسوقت ہندوستان کی درباری اور علمی زبان فارسی تھی اسلیے شاہ صاحب نے اس زبان میں مہارت حجاز کے سفر سے پیشتر ہی حاصل کرلی تھی بلکہ اپنی تصنیف کا آغاز بھی فارسی ترجمہ قرآن سے کردیا تھا۔

---

[۱] انفاس العارفین، صفحہ ۴۰۶، ۴۰۷

تدریس کے دوران آپنے درس قرآن (معہ ترجمہ بلا تفسیر) کو جزو نصاب قرار دیا۔اور شاہ محمد عاشق کو ترجمہ قرآن پڑھانا شروع کر دیا اسی کے ساتھ ہی اس ترجمہ کو قلمبند کرنے کا خیال پیدا ہو گیا اور اس عرصہ میں زہراوین (سورہ بقر و نساء) کا ترجمہ ہو گیا۔اگرچہ اسکی تکمیل سفر حج کے بعد ۱۱۵۱ھ میں ہوئی اور ۱۱۵۶ھ میں خواجہ محمد امین نے اس ترجمہ کو رواج دیا۔ جسکا مطلب ہے کہ اسکو نصاب تعلیم کا جزو بنایا.

رحیم بخش دہلوی نے ایک فاضل ہم عصر (مرزا حیرت دہلوی) کے حوالہ سے اس حد تک تحریر کیا ہے کہ اسی ترجمہ کی وجہ سے دہلی کے ان کٹ ملانوں کی محفلوں میں ہلچل مچ گئی جو جہلاء اور عربی سے ناواقف سیدھے سادے مسلمانوں کو اپنی خود ساختہ 'علمیت' سے بہکاتے رہتے تھے۔ان لوگوں نے بدمعاشوں کو شاہ صاحب کے قتل تک پر ابھارا۔چنانچہ ایک روز مسجد فتحپوری میں جب آپ عصر کی نماز پڑھ رہے تھے تو یہ لوگ شور و غل کر کے آپ پر چڑھ دوڑے۔ آپ بدقت شورش سے بچ کر نکل آئے اور بعد میں اپنے اعزاء و اقرباء کے مشورہ سے ہندوستان سے ہجرت کر کے مکہ مکرمہ جانے کا ارادہ کر لیا۔[۱]

اس شورش کو شاہ صاحب کے سفر حجاز کے سبب کے طور پر بیان کرنا بالکل خلاف عقل اور انکی طینت فطرت اور خاندانی و ذاتی نجابت کے صریحاً خلاف ہے۔ کسی دوسرے تاریخی ماخذ سے اسکی تائید نہیں ہوتی صرف یہی بات قابل قبول ہے کہ فارسی ترجمہ قرآن کا کام شاہ صاحب نے سفر حج سے پیشتر ہی شروع کر دیا تھا اور اسکی تصدیق خود ان کی اس تحریر سے ہوتی ہے جسکو انہوں نے مقدمہ فتح الرحمٰن میں درج کیا ہے۔

جہاں تک عربی زبان میں تصنیف و تالیف کا سوال ہے اسکی ابتداء آپنے حجاز میں قیام کے دوران کر دی تھی آپنے اس زمانہ کی واردات قلب، کیفیات روحانی، مشاہدات حقائق باطنی مسائل الکلام اور مسائل تصوف کے بارے میں عربی میں فیوض الحرمین کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی اس کے علاوہ شیخ ابو طاہر مدنی کی فرمائش پر ایک رسالہ مبتدعہ کے رد میں شیخ کے نام سے معنون کر کے تصنیف کیا جسکا نام "المقدمۃ السنیۃ فی الانتصار للفرق السنیہ" رکھا یہ رسالہ دراصل حضرت مجدد الف ثانیؒ کے رسالہ رد روافض کا ترجمہ معہ اضافہ فوائد ہے دوسری تصنیف مسمیٰ بہ القول الجمیل فی بیان سواء السبیل ہے جس میں اذکار و اشغال تصوف و دیگر مشاہدات و اسرار جو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے استفاضہ کئے ہیں تحریر ہیں۔[۲]

---

۱ حیات ولی، صفحہ ۴۳۱، ۴۳۳

۲ القول الجلی، صفحہ ۶۲

۲۔ موضوعات:

شاہ ولی اللہ نے جن موضوعات پر قلم اٹھایا انکے ساتھ پورا انصاف کیا، اللہ تعالیٰ نے احیائے دین، اصلاح امت اور قوم کے فکر و عمل میں ایک نئی روح پہونکنے کا جو کام آپ سے لیا اس کا دائرہ کار انتہائی وسیع ہے اور اسی لحاظ سے آپکی تصانیف کے موضوعات میں بھی ایک تنوع پایا جاتا ہے جس کا احاطہ کرنا ایک مشکل کام ہے تاہم آپکی مجددانہ اور باعمل زندگی کو سمجھنے کیلئے ان موضوعات کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے جن پر آپنے قلم اٹھایا بقول عبدالرحیم ضیاء :

> " آپ علوم تفسیر، حدیث و فقہ، اصول و عقائد و آداب سلوک و علم حقائق اور الٰہیات میں وحید العصر تھے..... ترویج علوم ادیان اور تدوین اسرار معارف الٰہی اور تاویل مقطعات و ترجمہ، قرآن و تسہیل مطالب اور تطبیق منقول با معقول اور تبیین مسائل بعبارات مختصرۃ اور اشارات لطیفہ میں فرید الدہر تھے۔ دعوی بے دلیل باطل ہوتا ہے اس دعوی پر آپکی مصنفات دال اور مظہر کمال ہیں" [۱]

اس کے بعد انھوں نے شاہ صاحب کی تصنیفات کی ایک فہرست تحریر کی ہے جو ان تمام موضوعات پر حاوی ہیں.

شاہ صاحب اپنی تصنیفات میں جن موضوعات کو زیر بحث لائے ہیں ان کو اگر ہم علیحدہ علیحدہ بیان کریں تو انکی تفصیل کچھ اس طرح ہوگی:

۱۔ علوم قرآن: ترجمہ، تفسیر، تفہیم اور اس کے ذریعہ اصلاح عقائد.

۲۔ اشاعت حدیث و سنت: حدیث مبارکہ کی اہمیت اور فقہ و حدیث میں تطبیق.

۳۔ شریعت اسلامی اور اعمال و افعال دین کی تشریح، انکے اسرار و مقاصد کی وضاحت، منقول و معقول میں مطابقت.

۴۔ تاریخ اسلام : خلافت کی اہمیت، خلافت راشدہ کی ترتیب کا الہامی ثبوت اور رد رفض.

۵۔ ہندوستان میں حکومت اسلام اور مسلمانوں کے سماجی زوال کے اسباب کا جائزہ اور انکی اصلاح کا لائحہ عمل.

۶۔ امت کے مختلف طبقات کا فرداً فرداً احتساب اور دعوت اصلاح و انقلاب.

۷۔ باطنی علوم و اعمال اور فن تصوف کی صحیح تعبیر: شریعت اور طریقت (تصوف) کو جمع کرنے کی

---

[۱] مقالات طریقت، صفحہ ۹

غیر معمولی کوشش .

۸۔ واردات قلبی، مسائل تصوف اور مشاہدات حق کا بیان .

۹۔ سوانح: اسلاف، اساتذہ اور خود اپنی سوانح کا بیان

۱۰۔ ادبی علوم : نظم ونثر، مکتوبات، غزلیں، قطعات، قصائد نعتیہ وغیرہ.

ان موضوعات پر شاہ صاحب نے جو شاہکار تصنیف کئے ہیں اور خصوصاً عربی زبان میں جو کتابیں تحریر کی ہیں انکا ادبی پہلو سے جائزہ ہی ہمارے مقالہ کا اصل موضوع ہے اگرچہ خود شاہ صاحب کی شخصیت، جامعیت (جامع کمالات ہونا)، عالی ہمت، علمی فضل وکمال، خصوصی تعلیم وتربیت، آپکے آباء و اجداد کی عالی مقامی (نسبی مجد) اور آپکے عہد کے حالات وواقعات کا بیان اس سلسلہ میں لازمی جزو کی حیثیت رکھتا ہے.

۳۔ تعداد:

شاہ ولی اللہ کے قلم سے کتنی تصنیفات (بشکل کتب ورسائل) معرض وجود میں آئیں انکی تفصیل مختلف مآخذ میں دی گئی ہے بعض حضرات نے مختلف رسائل کو الگ تصنیف کے طور پر لکھا ہے اور بعض نے مجموعہ رسائل کو کتاب کی شکل میں مدون کر کے انکو ایک کتاب کی حیثیت دی ہے، اس طرح ان تصانیف کی تعداد میں اختلاف ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ آپکی تصانیف میں کچھ تو وہ ہیں جو بعد میں طبع ہو کر شائع ہوئیں، کچھ قلمی مخطوطات کی شکل میں ہیں مگر کچھ ایسی تصنیفات بھی ہیں جن کا صرف تذکرہ دوسری کتابوں میں ملتا ہے ان کا وجود واقعتاً نہیں ہے.

مقالات طریقت میں عبدالرحیم ضیاء نے آپکی جن تصنیفات کا ذکر کیا ہے انکی تعداد ۴۴ ہے فہرست کے آخر میں لفظ وغیرہا بھی تحریر ہے۔[۱]

حیات ولی حصہ چہارم کے باب اول کے آخر میں رحیم بخش دہلوی نے ایک فہرست مرتب کی ہے جس میں شاہ صاحب کی کتب، انکی زبان، موضوع اور مختصر کیفیت بیان کی ہے اس فہرست میں نمبر شمار کے اعتبار سے کل کتب ورسائل کی تعداد ۴۹ تحریر کی گئی ہے اس فہرست کے ابتداء میں وہ لکھتے ہیں :

"شاہ صاحب کی تصنیفات کثرت سے ہیں.... لیکن افسوس اور سخت افسوس یہ ہے کہ باوجود تحقیقات کے چند مشہور کتابوں کے علاوہ اور کسی کا پتہ نہیں چلتا، تاہم جو کتابیں اسوقت تک ہمیں دستیاب ہوئیں... ذیل کے نقشہ میں ہیں جن سے انکے مقاصد ومطالب کی مختصر

---

۱ مقالات طریقت، صفحہ ۹

کیفیت بھی معلوم ہوتی ہے۔ [۱]

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنی کتاب تاریخ دعوت وعزیمت کے حصہ پنجم میں باب دوازدہم میں تصانیف شاہ ولی اللہ کے عنوان سے جو فہرست حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کی ہے اس میں ان تمام چھوٹی بڑی کتب ورسائل کا ذکر ہے جو شاہ صاحب کی تصنیف کردہ ہیں انکی تعداد ۵۳ ہے۔ [۲]

مولانا حکیم محمود احمد برکاتی نے اپنی کتاب "شاہ ولی اللہ اور انکا خاندان" میں تصانیف شاہ ولی اللہ کے عنوان سے جو فہرست شائع کی ہے اس میں ۴۵ کتب ورسائل مطبوعہ ہیں اسکے علاوہ ۱۷ تصانیف غیر مطبوعہ ان میں ۱۳ رسائل وکتب کے بارے میں لکھا ہے کہ انکے صرف اسماء ہی معلوم ہیں نہ صرف یہ کہ طبع نہیں ہوئے بلکہ یہ تک معلوم نہیں کہ مخطوطات کی شکل میں کہاں کہاں پائے جاتے ہیں۔ فہرست میں انکا نمبر شمار پانچ سے سترہ تک دیا گیا ہے بقیہ وہ کتب ہیں جن کے مخطوطات مختلف کتب خانوں میں یا اشخاص کے پاس محفوظ ہیں۔ [۳]

مولانا نسیم احمد فریدی اپنی تحقیق وترجمہ کی ہوئی کتاب "نادر مکتوبات شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ" میں شاہ صاحب کی مختصر سوانح اور آپکی تصانیف کی ایک طویل فہرست دی ہے۔ اس فہرست میں تمام کتب ورسائل کو الگ الگ تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اسمیں کل ملا کر ۸۳ تصانیف شامل ہیں جسمیں ۵۸ مطبوعہ تصانیف ہیں جنکا سن اشاعت وغیرہ بھی موجود ہے اور ۲۰ مخطوطات کی شکل میں ہیں۔ بعض مخطوطات کے بارے میں یہ بھی تحریر ہے کہ وہ کہاں پائے جاتے ہیں اور بعض کے نام دوسری کتابوں کے حوالہ سے لکھ دیے ہیں۔ اسکے علاوہ ۵ کتابوں کے نام اضافات اور تحقیق طلب کے تحت دیے ہیں۔ کچھ شاہ صاحبؒ کی طرف منسوب کتب کے نام بھی الگ سے دیے ہیں۔ [۴]

اکثر مآخذ میں شاہ صاحبؒ کی عربی اور فارسی تصانیف کی ترتیب زبان کے لحاظ سے الگ الگ نہیں کی گئی بلکہ عربی کے بعد فارسی اور فارسی کے بعد عربی تصنیف کا ذکر ہے لیکن کیونکہ ہم کو آپکی عربی تصنیفات کا ادبی پہلو سے مفصل جائزہ لینا ہے اسلیے مناسب یہ ہے کہ آپکی عربی اور فارسی تصنیفات کو الگ الگ ترتیب سے لکھا جائے ساتھ ہی انکے موضوع کی بھی مختصر وضاحت کردی جائے۔ چنانچہ تصانیف کی ترتیب اسی لحاظ سے کی گئی ہے۔

---

۱ حیات ولی، صفحہ ۲۹۵-۳۱۷

۲ تاریخ دعوت وعزیمت، صفحہ ۳۹۸-۴۱۵

۳ شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان، صفحہ ۲۲-۲۵

۴ نادر مکتوبات شاہ ولی اللہ دہلوی، مترجمہ مولانا نسیم احمد فریدی، مظفر نگر ۱۹۹۸ء

عربی تصانیف

نمبر شمار	نام کتب	موضوع	مختصر تشریح	مطبوعہ نسخے
۱	الارشاد الیٰ مہمّات علم الاسناد	اصول حدیث وتاریخ	اساتذہ وشیوخ حجاز کے تذکرہ میں نہایت اہم اور بصیرت افروز رسالہ ہے۔	مطبع احمدی دہلی ۱۳۰۷ھ
۲	اطیب النغم فی مدح سیّد العرب والعجم	نعت	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں نعتیہ قصیدہ۔ بعض الفاظ کی خود ہی شرح کی ہے۔ یہ شاہ صاحب کی قادر الکلامی اور عشق نبوی کا بہترین نمونہ ہے۔	مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۱ء
۳	الانتباہ فی اسناد حدیث رسول اللہ	فن حدیث	فن حدیث فن حدیث سے متعلق نہایت اہم اور مختصر رسالہ ہے۔	حوالہ : مولانا مظاہری 'الامام ولی اللہ محدث دہلوی'
۴	الانصاف فی بیان سبب الاختلاف	علم فقہ وحدیث	صحابہ وتابعین اور انکے بعد ائمہ مجتہدین میں دینی مسائل کے بارے میں جو اختلاف پیدا ہوا اسکا راز اور اسکی تاریخ اس رسالہ میں بیان کی گئی ہے۔ تقلید 'غیر تقلید' عمل بالحدیث 'فقہا کے اختلافات فروعی اور انکا حل اور آپس میں تطبیق کے بارے میں سیر حاصل مواد ہے جسکے ذریعہ ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تقلید کہاں تک	مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۱ء مطبع صدیقی بریلی ۱۳۰۷ھ اردو ترجمہ عمدۃ المطابع لکھنؤ ۱۹۱۰ء

			معتبر ہے اور کس مقام پر غیر معتبر، قرآن وحدیث کی روشنی میں اسکی کیا اہمیت ہے ۔ تقلید کی تاریخ کیا ہے ان تمام سوالات کے جواب پیش کیے گئے ہیں اور اختلاف مسالک کی عادلانہ توجیہ ہے (اسکا اردو ترجمہ کشّاف کے نام سے ہوا۔ دوسرا ترجمہ وصّاف از عبدالشکور۔)	
۵	البدور البازغة	فلسفہ دین وکلام	اسکو حجۃ اللہ البالغہ کے خاص ابواب کا خلاصہ کہا جاسکتا ہے لیکن بعض مباحث نئے ہیں ۔اسمیں حجۃ اللہ کے مضامین کو فلسفیانہ اور کلامیانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے ۔ موضوعات کے تنوع کی وجہ سے حجۃ کے مقابلے میں وہ مضامین بھی آگئے ہیں جنکو دیگر علماء وحکماء نے بیان نہیں کیا۔	مجلس علمی ڈابھیل ۱۳۵۴ھ (ٹونک تصوف ۱۴ نمبر نسخہ مصنف سے نقل)
٦	تأويل الأحاديث فی رموز قصص الأنبياء	فن حدیث وقرآن	قرآن میں مذکور انبیاء کا حال۔ قصص قرآنی اور انکی روشنی اور نتیجہ میں اصول شرعیہ کا استخراج اور بہت سے نکات کی جانب اشارہ اس تصنیف کی خصوصیات ہیں۔(عبدالحی ۱۷۳)	ترجمہ اردو ۱۸۹۹ء مطبع احمدی دہلی ،شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدر آباد سندھ
۷	التفهيمات الالٰهيه	تصوف	شاہ صاحبؒ نے ذاتی علوم ومعارف کو بیان کیا ہے۔ یہ کتاب مشاہدات	مجلس علمی ڈابھیل ۱۹۳٦ء

			وواردات پر مبنی ہے۔ یہ گویا "کشکول ولی اللہی" ہے۔ سلوک و تصوف اور علوم شریعت سے متعلق اسمیں آپکے متفرق افادات ہیں بعض تفہیمات عربی اور بعض فارسی میں ہیں۔	
۸	چھل حدیث (الاربعین) بسندہ المتصل الیٰ علی بن ابی طالبؓ	حدیث	چالیس احادیث کا مجموعہ جو مدار ایمان ہیں۔ اسکی شرح التسخیر کے نام سے اردو نظم میں ہادی علی صدیقی لکھنوی نے لکھی ہے۔ یہ احادیث "جوامع الکلم" کا مصداق ہیں۔ (عبدالحیٔ، صفحہ ۱۴۶)	مطبع احمد ہگلی ۱۲۵۴ھ-۱۸۳۸ء انوار محمدی لکھنؤ ۱۳۱۹ھ سید عبداللہ نے مطبع احمدی ہگلی سے ۱۲۵۴ھ میں اردو ترجمہ بھی شائع کیا۔ نیز ترجمہ از عبدالماجد دریابادی ۱۹۶۷ء
۹	حُجّۃ اللہ البالغہ	علم الکلام وفقہ و حدیث	یہ کتاب شاہ صاحب کا ایک عجیب کارنامہ ہے۔ یہ اگرچہ علم حدیث کے بارے میں نہیں مگر اسمیں بے شمار احادیث کی روشنی میں علوم واسرار دین بیان کیے گئے ہیں اس کتاب میں دین ونظام شریعت کا ایک مربوط وجامع خاکہ پیش کیا گیا ہے جس میں زندگی کے ہر شعبہ کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے خواہ عبادات ہوں یا معاملات 'اخلاق ہو یا احسان'	مطبع بولاق مصر ۱۲۹۶ھ مطبع صدیقی بریلی ۱۲۸۶ھ لاہور ۱۹۷۸ء اردو ترجمہ "نعمۃ اللہ السابغۃ" از عبدالحق حقانی مطبع احمدی پٹنہ ۱۳۱۲ھ۔ اس کے تراجم میں

			اجتماعی وتمدنی رخ ہو یا انفرادی و شخصی پہلو غرض کہ دین کے تعلق سے انسانی زندگی کے ہر رخ کا جائزہ لیا گیا ہے اور عقلی والہامی نقطہ ہائے نظر میں جو رابطہ ہے اسکو واضح کیا گیا ہے۔ شاہ صاحب نے اختلاف فقہا ومحدثین میں تطبیق کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس طرح حجۃ اللہ البالغۃ ایک نئی طرز کا علم الکلام بن گیا۔ مقدمہ میں خود شاہ صاحب نے لکھا ہے "علوم حدیث میں سب سے باریک ، دقیق و عمیق وبدیع علم اسرار دین کا وہ علم ہے جس میں احکام کی حکمتیں و مصلحتیں اور خواص اعمال کے نکات و اسرار و رموز بیان کئے جائیں جن کے ذریعہ انسان شریعت کی لائی ہوئی چیزوں کے بارے میں صاحب بصیرت بن جاتا ہے اور ملاوٹ (خلط) اور شبہات سے محفوظ رہتا ہے۔"	ایک 'شموس اللہ البازغۃ' کے نام سے ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء میں حمایت اسلام پریس لاہور سے شائع ہوا۔ اس کا غالباً انگریزی میں ترجمہ بھی ہوا۔ (مظاہری:۸۶)
۱۰	حسن العقیدۃ	عقائد	شامل خمسہ رسائل (عبدالحی ۲۳۹) مسلک اہل سنت کو قرآن وحدیث کی روشنی میں جامع طریقہ پر بیان کیا گیا ہے۔ محمد اویس نگرامی نے اسکی شرح "العقیدۃ السنیۃ" کے نام سے لکھی (ابوالحسن علی ۵/)	مطبع احمدی دہلی۔ اردو ترجمہ بھی ہوا مطبع روزانہ اخبار (قاموس ۲۰۹/۱)

۱۱	خاصیت تراجم ابواب صحیح البخاری	فن حدیث	تفہیم احادیث کے بارے میں اصول بیان کیے گئے ہیں جن سے احادیث کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اسمیں صحیح بخاری کے تراجم ابواب کی شرح اور انکی حکمت کا بیان ہے۔	سہارنپور ۱۲۹۲ھ/۱۸۸۸ء
۱۲	الخیر الکثیر	تصوف، فلسفۂ دین	یہ کتاب فلسفہ، تصوف، طبعیات، اسمائے الٰہیہ کی صفات غرض کہ دین کے بارے میں تمام عقائد (بعثت، معاد وغیرہ) پر فلسفیانہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔	مجلس علمی ڈابھیل ۱۳۵۴ھ اردو ترجمہ: غلام محمد سورتی نیز عبدالرحیم پشاوری (قاموس/۲۷۲)
۱۳	الدر الثمین فی مبشرات النبی الامینؐ	مشاہدات	مشاہدات و مبشرات۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبشرات کا مجموعہ جو شاہ صاحب اور انکے بزرگوں کے بارے میں ہے۔ اسمیں اپنے والد اور چچا کے بھی کچھ حالات بیان کیے ہیں۔	سہارنپور ۱۲۹۲ھ/ ۱۸۷۵ء اردو ترجمہ: مطبع مجتبائی دہلی ۱۸۹۹ء (قاموس ۱/۷۵۲)
۱۴	دیوان اشعار	شاعری	اس دیوان کو شاہ عبدالعزیز نے جمع کیا اور شاہ رفیع الدین نے مرتب کیا۔	عبدالحی ۵۳ اس کا مخطوطہ کتب خانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں موجود ہے
۱۵	شرح تراجم بعض ابواب بخاری	فن حدیث	صحیح بخاری کے ابواب کے تراجم کی شرح اور قدرے تفصیل بیان کی گئی ہے۔	دائرۃ المعارف حیدرآباد ۱۳۲۳ھ۔ اصح المطابع دہلی۔ مسلسلات مطبوعہ مطبع نور الانوار آرہ کے آخر میں بھی شامل ہے۔

۱۶	العقد الجید فی أحکام الاجتهاد والتقلید	اصول فقہ	اجتہاد (استخراج مسائل) اور تقلید کے بارے میں احکامات اور شرائط پر محققانہ تصنیف ہے اس میں استنباط کی تاریخ، اجتہاد و تقلید کے موضع پر عالمانہ بحث ہے۔ عوام کیلئے تقلید میں تحفظ ہے، عالم کیلئے عدم تقلید گناہ نہیں۔	مطبع صدیقی بریلی ۱۳۰۹ھ۔ اس کا اردو ترجمہ عبد الشکور فاروقی لکھنوی نے نیز سلک مروارید کے نام سے محمد احسن صدیقی نانوتوی نے کیا مطبوعہ: مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۱۰ھ
۱۷	فتح الخبیر (الفوز الکبیر کا باب پنجم)	متعلق تفسیر قرآن	تفسیر قرآن مجید کے بارے میں ہے۔ قرآن کے بعض غریب الفاظ کی تشریح اور مشکل لغات کا سہل مترادف دیا گیا ہے۔ قرآنی آیات کی تفسیر احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے اور اقوال صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کی گئی ہے۔	مطبع احمدی ہگلی، ۱۲۴۹ھ / ۱۸۶۹ء
۱۸	فتح الودود فی معرفة الجنود	علم الخلائق وتصوف	مولانا رحیم بخش نے حیات ولی میں اسکو اخلاق و تصوف سے متعلق لکھا ہے۔	غیر مطبوعہ
۱۹	الفضل المبین فی المسلسل من الحدیث النبوی الامینؐ	فن حدیث	یہ رسالہ مسلسلات کے نام سے معروف ہے۔ اس کا ذکر شاہ صاحب نے اپنی ایک سند مرقومہ ۱۱۵۹ھ بنام شیخ محمد بن پیر محمد بن شیخ ابوالفتح میں کیا ہے جو خدا بخش لائبریری پٹنہ میں صحیح بخاری کے ایک نسخے پر مرقوم ہے اور جس کا عکس الخیر الکثیر مطبوعہ ڈابھیل کے آغاز میں ہے۔ (برکاتی ۴۹)	

۲۰	فیوض الحرمین	حقائق باطنی و تصوف	مشاہدات و واردات، قیام حجاز کے دوران جو روحانی و باطنی فیوض و برکات آپ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل ہوئے ان کا بیان، اس میں وہ تمام حالات و واردات اور حقائق و معارف واسرار و غوامض جو حرمین شریفین میں آپ پر وارد ہوئے، بیان فرمائے۔ یہ کتاب خواص کے مطالعہ کی ہے۔	مطبع احمدی دہلی، ۱۳۰۸ھ، اردو ترجمہ محمد سرور سندھ ساگر اکیڈمی لاہور ۱۹۶۷ء
۲۱	قصیدة همزية	نظم	مخطوطہ پھلواری	مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۰۸ھ
۲۲	القول الجميل فی بيان سواء السبيل	تصوف	سلوک کے مختلف ادوار کا بیان، بیعت اس کی حکمت، شرائط مرید و مرشد، طریقۂ بیعت و تعلیم، آداب وعظ، اشغال صوفیہ: قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ اور اصطلاحات تصوف۔ خاندانی مجربات اعمال کا حال بیان کیا گیا ہے۔	مطبع نظامی کانپور، ۱۲۹۱ھ اور ۱۳۰۷ء نیز مطبع الجمیلہ مصر ۱۲۹۰ھ اردو ترجمہ ۱۲۶۰ھ میں خرم علی بلہوری نے شفاء العلیل کے نام سے کیا۔ درخشانی ۱۲۷۸ھ
۲۳	المسوىٰ شرح المؤطا	حدیث	مؤطا امام مالک کی شرح عربی میں ہے، اس کے علاوہ بہت سے مسائل فقہ کا حل بھی ہے۔	مطبع مرتضوی دہلی ۱۲۹۳ھ اور ۱۳۴۷ نیز طبع مکہ معظّمہ

۲۴	المقدمة السينة فی انتصار الفرقة السنية	رد رفض	حضرت مجددؒ کے فارسی رسالہ رد روافض کا عربی ترجمہ مع تمہید۔اس کے قلمی نسخے ٹونک اور بھوپال کے کتب خانوں میں موجود ہیں	ابوالحسن زید فاروقی نے دہلی سے شائع کیا۔
۲۵	المکتوب المدنی	مکتوب، تصوف	وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے تقابل کے بارے میں بنام شیخ اسماعیل بن عبداللہ رومی، یہ مکتوب تفہیمات الٰہیہ میں بھی شامل ہے اور الگ سے بھی طبع ہوا ہے۔	اردو ترجمہ محمد حنیف ندوی لاہور ۱۹۶۵ء
۲۶	النوادرمن احادیث سید الاوائل و الاواخر	حدیث	یہ مسلسلات کے ساتھ طبع ہوا۔	سہانپور ۱۲۹۲ھ / ۱۸۷۵ء

فارسی تصانیف

نمبر شمار	نام کتب	موضوع	مختصر تشریح	مطبوعہ نسخے
۱	اتحاف النّبية	متعلق حدیث وتصوف	الانتباہ کے باقی دوابواب	مکتبہ سلفیہ لاہور ۱۹۶۹ء
۲	ازالة الخفا عن خلافة الخلفاء	مسئلہ خلافت	اس کتاب کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اسمیں خلفائے راشدین کی سیرت اور اسلام کی دینی ومذہبی تاریخ اور لمحہ بلمحہ انقلاب وتغیر کا ابھرا ہوا خاکہ بھی موجود ہے یہ تاریخ اسلام وسیاست میں بے نظیر کتاب ہے ، تاریخ اسلام میں ابتدائی	مطبع صدیقی بریلی ۱۲۸۶ھ/۱۸۶۹ء

			دور سے آج تک خلفائے راشدین کی خلافت کی ترتیب اور اس ترتیب کی اصل کے بارے میں شکوک اور اختلافات رہے ہیں جنکی وجہ سے ملت اسلامیہ دو بڑے فرقوں میں تقسیم ہوگئی ۔ خلفائے راشدین کی خلافت اور ترتیب کے بارے میں ان شبہات کا ازالہ کرنے کی یہ کوشش بقول شاہ صاحبؒ اصول دین پر شک کے رفع کرنے کی کوشش ہے، اس موضوع پر پورے اسلامی لٹریچر میں ایسی کوئی کتاب نہیں ۔	
۳	الطاف القدس	متعلق اصول تصوف	اس تصنیف میں شاہ صاحبؒ نے ان الہامات و مکشوفات کو ضبط تحریر کیا ہے جو وقتاً فوقتاً آپکو ہوتے رہے۔	مطبع احمدی دہلی ۱۳۰۷ھ
۴	الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ	تصوف	تصوف کے مختلف سلاسل کی تاریخ، شاہ صاحب کو کن واسطوں سے خرقۂ سلاسل ملے ان کا بیان۔	مطبع احمدی دہلی، ۱۳۱۱ھ
۵	انفاس العارفین	تذکرہ متعلق سوانح وتاریخ	یہ کتاب در اصل سات رسائل کا مجموعہ ہے۔ (۱) بوارق الولایۃ: شاہ صاحب کے والد شاہ عبدالرحیم کے حالات، اقوال، تصرفات وغیرہ کے بارے میں تحریر کیا ہے۔	مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۳۵ھ کراچی ۱۳۵۸ھ اردو ترجمہ محمد اصغر فاروقی لاہور ۱۹۷۷ء نیز ترجمہ از ڈاکٹر محمد

			(۲) شوارق المعرفۃ: شاہ صاحب کے چچا شیخ ابوالرضاء کے حالات پر مشتمل ہے۔ (۳) الامداد فی مآثر الاجداد: اپنے چند اجداد کا تذکرہ کیا ہے۔ اس میں آپ کا نسب نامہ بھی شامل ہے۔ (۴) النبذۃ الابریزیۃ فی اللطیفۃ العزیزیۃ: اس میں آپ کے ننھالی جد اعلیٰ شیخ عبدالعزیز شکر بار اور ان کے اسلاف واخلاف کے حالات ہیں۔ (۵) العطیۃ الصمدیۃ فی انفاس المحمدیۃ: یہ آپ کے نانا شیخ محمد پھلتی کے حالات پر مشتمل ہے۔ (۶) انسان العین فی مشائخ الحرمین: یہ آپ کے اساتذہ حرمین کے بارے میں ہے۔ (۷) الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف: یہ ایک مختصر خودنوشت سوانح ہے جس میں اپنی پیدائش سے واپسی حج تک کے حالات ہیں	ایوب قادری، نیز ترجمہ سید محمد فاروق
٦	تحفۃ الموحدین		دعوت، توحید خالص اور رد شرک میں حضرت شاہ صاحبؒ کا مختصر مگر بہت جامع رسالہ ہے، عقیدہ توحید کی تشریح ہے بعض مضامین کی بناء پر بعض لوگوں کو اسکی شاہ صاحب کی طرف نسبت میں تردد ہے۔	اردو ترجمہ رحیم بخش دہلوی ۱۳۸۱ھ / ۱۹۶۲ء مکتبہ سلفیہ لاہور

۷	رسالۂ دانشمندی	اصول تعلیم	اصول تعلیم و اساتذہ کے لئے قیمتی ہدایات پر مشتمل ایک پر مغز اور مفید رسالہ	مطبع احمدی دہلی، ۱۸۹۹ء۔ اردو ترجمہ: محمد سرور ۱۹۶۴ء ، عربی ترجمہ: محمد اکرام ندوی ۱۴۰۳ھ
۸	زھـراوین	تفسیر بعض اجزاء القرآن	ترجمہ و تفسیر سورہ بقرہ و سورہ نساء جو حج پر تشریف لیجانے سے قبل لکھا تھا۔	غیر مطبوعہ عبدالحیٔ ۱۷۰
۹	سرورالمحزو ن فی سیر الأمین و المامـون	سیرت وعقائد	حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کی فرمائش پر لکھا گیا ابن سید الناس کے رسالہ 'نور العیون فی سیر الامین و المامون' کا ترجمہ وخلاصہ	مطبوعہ ۱۲۵۶ھ دارالاشاعت کراچی، ۱۳۵۸ھ اردو ترجمہ: کنزالمکنون مولا بخش چشتی مطبع ستارۂ ہند دہلی، ۱۳۱۵ھ الذکر المیمون از عاشق الٰہی دہلی، قرۃ العیون، مطبع محمدی ٹونک، ۱۲۷۱ھ
۱۰	سطعـات	متعلق سلوک و تصوف	اصطلاحات صوفیاء و رموز کا تذکرہ ہے۔ طویل مباحث اور دقیق مسائل کا اختصار سے نہایت واضح بیان ہے۔ فلسفیانہ اور متصوفانہ اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں۔	مطبع احمد ۱۳۰۷ھ کراچی ۱۹۳۹ء اردو ترجمہ سید محمد متین ہاشمی لاہور ۱۹۷۶ء نیز غلام مصطفیٰ قاسمی حیدر آباد سندھ ۱۹۶۴ء

۱۱	شفاء القلوب	تصوف	حقائق و معارف میں ایک رسالہ غیر مطبوعہ جس کا ذکر دیگر تصانیف میں کیا گیا ہے۔(عبدالحیؒ ۱۹۶)	مطبع مجتبائی دہلی نے اشاعت کا اعلان کیا تھا۔
۱۲	فتح الرحمن فی ترجمة القرآن	تفسیر و ترجمہ	فارسی میں قرآن مجید کا ترجمہ ہے۔ ہندوستان میں یہ پہلا باقاعدہ ترجمہ ہے جس کو کسی ہندوستانی عالم نے کیا، اس سے پیشتر ایک فارسی ترجمہ سعدیؒ کا ترجمہ کے نام سے مشہور تھا جو علامہ سید شریف علی الجرجانی (م ۸۱۶ھ) کا تھا مگر غلط العام کی وجہ سے 'سعدی کا ترجمہ' کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ آٹھویں صدی کے عالم حسن بن محمد علقمی (مشہور بہ نظام نیشاپوری) کا ترجمہ تھا۔ یہ دونوں اصحاب ہندوستانی نہیں تھے اور نہ ان کے علاوہ کسی دوسرے ترجمہ کا سراغ ملتا ہے۔	مطبع ہاشمی، میرٹھ ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۹ء مطبع فاروقی ۱۲۹۴ھ دیوبند ۱/۶۱-۶۰ انڈیا آفس رقم ۱۹ (ت) نسخہ ۲ مکتوبہ ۱۲۴۰ھ
۱۳	الفوز الکبیر فی اصول التفسیر	متعلق قرآن مجید و تفسیر	یہ رسالہ اصول تفسیر میں ہے، اس رسالہ میں اصول تفسیر کے پیچیدہ مباحث مختصر اور سہل مگر عالمانہ عبارت میں حل کر دیئے گئے ہیں۔ (عبدالحیؒ ۱۷۳ قاموس ۱/۶۹)	اس کا عربی ترجمہ ایک مصری عالم نے کیا تھا نیز مطبع احمدی ہگلی ۱۲۴۹ھ / ۱۸۳۴ء مطبع مجتبائی ۱۸۹۸ء اردو ترجمہ مکتبہ برہان دہلی، ۱۹۴۱ء
۱۴	فیض عام	متفرقات	ماخوذ از حیات ولی	

۱۵	قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین	تاریخ اسلام و عقائد	اس موضوع پر حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی عقلی و نقلی دلائل کی مدد سے فضیلت ثابت کی ہے ساتھ ہی حضرت عثمان و حضرت علی رضی اللہ عنہما کے فضائل کو بھی بیان فرمایا ہے۔	مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۱۰ھ، مطبع روازنہ اخبار دہلی ۱۸۹۹ء
۱۶	کشف الغین فی شرح رباعیتین	متعلق تصوف	خواجہ باقی باللہ کی دو صوفیانہ رباعیوں کی شرح مفصل ساتھ ہی فن تصوف اور اس کے حصول کے بارے میں کار آمد نکات بھی ہیں	مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۱۰ھ منقول از نسخہ مصنف، ش ۳ مجموعہ ۹۶-۱۳۷
۱۷	لمحات	تصوف	واردات قلب	شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدر آباد سندھ سنہ ندارد
۱۸	مجموعہ مکاتیب	مکتوبات	دو حصوں میں، حصہ اول مرتبہ حافظ شاہ عبدالرحمٰن بن شیخ محمد عاشق پھلتی، حصہ دوم مرتبہ شاہ محمد عاشق پھلتی اس کے علاوہ ایک دیگر مجموعہ میں شاہ ولی اللہ، شاہ اہل اللہ اور شاہ عبدالعزیز کے مکتوبات شامل ہیں۔	ترجمہ مولانا نسیم احمد فریدیؒ، شاہ ولی اللہ اکیڈمی پھلت مظفر نگر ۱۹۹۸ء دیوبند ۲/ ۲۱۰/ اوراق ۹۵
۱۹	المصفیٰ شرح المؤطا	حدیث	موطا امام مالک کی شرح جو بڑے فوائد اور تحقیقات پر مشتمل ہے۔ حدیث کے ذریعہ استخراج مسائل بھی ہیں۔	مطبع فاروقی دہلی، ۱۲۹۳ھ ۱۸۷۶ء جلد ۲ مطبع مرتضوی ۱۲۹۳ھ

۲۰	المقالة الوضية فی النصیحة و الوصیة	وصیت نامہ	اس وصیت نامہ میں آٹھ وصایا شامل ہیں۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے اس پر حاشیہ لکھا۔	مطبع مطبع الرحمٰن دہلی سے ۱۲۶۸ھ میں چھپا، ایک بار مطبع مسیحی کانپور سے بھی ۱۲۷۳ھ میں چھپا
۲۱	المقدمة فی قوانین الترجمة		فتح الرحمٰن کے آغاز میں بھی شامل ہے۔	غیر مطبوعہ ہے ٹونک میں مخطوطہ موجود ہے۔ (حوالہ: نادر مکتوبات شاہ ولی اللہ دہلویؒ)
۲۲	مکتوبات مع مناقب امام بخاریؒ و ابن تیمیہؒ	مکتوبات، ادب	فضائل ابو عبداللہ اسمٰعیل بخاری و ابن تیمیہ۔ کلمات طیبات سے دو خط لے کر رسالے کی شکل دے دی ہے۔	مطبع احمدی دہلی ۱۳۰۸ھ نیز مطبع مجتبائی دہلی
۲۳	مکتوبات المعارف	تصوف	تصوف کے بارے میں مختلف لوگوں کے سوالات کے جوابات	مطلع العلوم سہارنپور ۱۳۰۴ھ نیز مطبع مجتبائی دہلی۔
۲۴	همعات	تصوف	واردات قلب، دربیان نسبت الی اللہ۔ ان تغیرات کلیہ کا بھی ذکر ہے جو طریق تصوف میں پیش آئے نیز عہد رسالت کے بعد زمانہ کے تغیر سے معالجات کا ذکر	لاہور ۱۹۴۱ء ڈاکٹر غلام مصطفیٰ حیدر آباد سندھ ۱۹۶۴ء

۲۵	هوامع شرح حزب البحر	ادعیاء ماثورہ تصوف	دعاء حزب البحر کی شرح ہے، دعائیں پڑھنے کا طریقہ اور اس کے آداب بیان کئے گئے ہیں۔ (عبدالحی ۲۰۵ قاموس ۱/ ۱۰۷۴)	مطبع احمدی دہلی، ۱۳۰۷ھ مطبع روزانہ اخبار دہلی

ان تصانیف کے علاوہ کچھ ایسی تحریریں بھی ہیں جنکا وجود دراصل کہیں نہیں ہے صرف انکا تذکرہ مختلف کتابوں میں مل جاتا ہے ایسی تصنیفات کی الگ سے ایک فہرست مندرجہ ذیل ہے۔[1]

نام شمار	نام کتاب	مختصر تشریح
۱	دعاء الاعتصام	شاہ عبدالعزیز نے رسالہ فیض عام میں اس کا ذکر کیا ہے۔ شاہ محمد عاشق نے اس کی شرح لکھی تھی اور شاہ ولی اللہ نے اس شرح کی ایک منظوم تقریظ بھی لکھی تھی۔
۲	النخبہ فی سلسلۃ الصحبہ	شاہ ولی اللہ نے شاہ جاراللہ کو ۱۱۷۳ھ میں سند اجازت دی تھی اس میں اپنی تصانیف میں اس کا بھی ذکر کیا ہے۔ (المسوی طبع مکہ معظمہ مقدمہ صفحہ ۵۳)
۳	حاشیۃ رسالۃ لبس احمر	شاہ عبدالعزیز نے شاہ صاحب کے اس رسالہ کا ذکر فتاویٰ شاہ عبدالعزیز میں کیا ہے۔ صفحہ ۱۲۸۔
۴	اسرار فقہ و منصور	ان دونوں کتابوں کا ذکر مولانا سید محمد نعمان رائے بریلوی نے اپنے ایک مکتوب بنام شاہ ابوسعید رائے بریلوی میں کیا ہے۔ (الفرقان صفر ۱۳۸۵ھ مولانا نسیم احمد فریدی) یہ خط خاندانی مجموعہ مکاتیب مکتوب المعارف قلمی میں موجود ہے جسے سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے اپنی کتاب کے صفحہ ۱۱۹ تا ۱۲۷ پر بجنسہ نقل کیا ہے۔[2]

علاوہ ازیں عبدالرحیم ضیاء نے مقالات طریقت میں ایسی تصنیفات کا بھی ذکر کیا ہے جن کے

---

[1] شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان صفحہ ۲۴، ۲۵،

[2] تاریخ دعوت و عزیمت جلد ۵ صفحہ ۱۱۹-۱۲۷

صرف نام معلوم ہیں یہ نہیں معلوم کہ یہ طبع ہوئیں یا نہیں نیز یہ کہ انکے مخطوطات کہاں پائے جاتے ہیں ان کی فہرست درجہ ذیل ہے: [۱]

۱۔ عوارف

۲۔ واردات

۳۔ نہایات الاصول

۴۔ الانوار المحمدیہ

۵۔ فتح السلام

۶۔ رسالہ در ذکر روافض در رد گوہر مراد (مصنفہ عبدالرزاق لاہجی شاگرد صدر شیرازی)

۷۔ کشف الانوار

☆☆☆☆☆

---

[۱] مقالات طریقت صفحہ ۹

باب پنجم

شاہ صاحب کی عربی تصانیف (نثر نگاری و شاعری) اور زبان و ادب میں ان کا حصہ

شاہ ولی اللہ دہلویؒ جس دور میں پیدا ہوئے، جو پُر آشوب زمانہ انہوں نے دیکھا، جس خاندان میں پیدائش ہوئی، جس قسم کی تربیت اور تعلیم اپنے بزرگوں اور اساتذہ سے پائی اور جس قسم کے لوگوں میں آپ نے اپنی تمام عمر گذاری اس کا خاکہ سابقہ ابواب میں پیش کیا جا چکا ہے۔ یہی وہ عوامل ہیں جو کسی ادیب کی تصنیفات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس باب میں موضوع کے اصل پہلو پر روشنی ڈالی جا رہی ہے یعنی شاہ صاحب کی عربی تصانیف اور زبان و ادب میں ان کا حصہ۔ اس موضوع کو پوری طرح سمجھنے اور اس پر کچھ کلام کرنے کے واسطے یہ اشد ضروری ہے کہ اس دور میں ہندوستان میں عربی ادب اور ادیبوں کا جائزہ بھی لیا جائے۔ مؤخرا لذکر بات یعنی اس دور کے عربی ادیبوں کے تذکرہ کے لئے ایک باب معاصرین شاہ ولی اللہ کے عنوان سے جداگانہ اس باب کے بعد قائم کیا جائے گا جس میں مختصراً ان ادیبوں اور ان کی کاوشوں کا جائزہ لیا جائے گا جو شاہ صاحب کے معاصرین تھے اور جنہوں نے عربی زبان کے مختلف شعبوں میں اپنی تخلیق کے جوہر دکھائے۔

جہاں تک عربی ادب کی بات ہے اور ہندوستان میں اس کے مقام کا سوال ہے، شاہ صاحب کے عربی ادب کی حیثیت متعین کرنے کے لئے اس پر مختصر روشنی ڈالنا ضروری ہے۔

ماالأدب (ادب کیا ہے) :

ڈاکٹر طہٰ حسین المصری نے اپنی کتاب "فی الادب الجاھلی" میں ادب کی دو قسموں کا تذکرہ کیا ہے۔ ادب انشائی اور ادب وصفی۔ ادب انشائی کسی ادیب یا شاعر کا منثور یا منظوم کلام ہوتا ہے، یعنی شعر جس کو شاعر موزوں کرتا ہے یا رسالہ و مضامین جن کو ادیب تحریر کرتا ہے۔ مختصراً ادب کلام مروی یا کلام منقول کا نام ہے۔ یہ اشعار یا مضامین کیا ہیں، ان کا موضوع کیا ہے، ان کے تحریر کرنے کا مقصد کیا ہے، ان کا انداز بیان اور اسلوب کس طرح کا ہے، ان تمام سوالوں کے جواب میں ادب کی متعدد اقسام کی جا سکتی ہیں۔ فنی ادب، تحقیقی ادب، تخیلاتی ادب (Fiction)، موضوعاتی ادب، واقعاتی ادب (Non Fiction)، ادب برائے زندگی، ادب برائے ادب، غرض کہ ادب کی اتنی ہی وسیع تعریف کی جا سکتی ہے جتنی زندگی کی۔ کیوں کہ ادب کا اصل مقصد انسان کی زندگی کو سنوارنا ہے[1]۔

اللہ تعالیٰ نے ازل ہی میں انسان کو علم کی بدولت اشرف المخلوقات بنایا اور تمام مخلوق سے افضل قرار دے کر مسجود ملائکہ بنا دیا۔ اسی ذات باری تعالیٰ نے انسان کو قلم کے ذریعہ علم دیا اور فرمایا "علم الانسان مالم یعلم"[2]۔

---

[1] فی الادب الجاہلی، مصنفہ طہٰ حسین المصری، مترجمہ رضا انصاری، صفحہ ۴۷-۵۲،

[2] القرآن، سورہ علق، الآیہ: ۴، ۵

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ہے "ادبنی ربی فاحسن تادیبی" ایک دوسری حدیث میں قرآن مجید کو "مادبة الله فی الأرض" کہا گیا ہے۔[۱]

دوسرے انداز سے دیکھا جائے تو اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل عطا کی اور عقل نے تجسس پیدا کیا تجسس اور تحقیق کے ذریعہ علم آیا، اور علم ادب کے حصول کا ذریعہ بن گیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ادب کے اجزاء یا عناصر ترکیبی کون کون سے ہیں جن کے بارے میں تحقیق کر کے کسی ادیب کا مقام متعین کیا جا سکتا ہے۔

ناقدین نے ادب کے چار عناصر تجویز کئے ہیں:[۲]

(۱) العاطفہ، (۲) خیال (۳) اسلوب یا طرز بیان (۴) فکر یا معانی (اس کو موضوع بھی کہہ سکتے ہیں)

ایک اچھے ادیب کی کاوش کے لئے ان چاروں عناصر کا ہونا ضروری ہے تب ہی ادب کا کوئی شہ پارہ وجود میں آتا ہے۔

۱۔ العاطفہ:

دراصل یہ انسان کا وہ اندرونی احساس یا جذبہ ہے جو کسی شئے کو دیکھ کر یا محسوس کر کے اس کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ نفسیات کی اصطلاح میں اس کو Emotion کہتے ہیں اگرچہ عاطفہ یا emotion انسان کی فطرت کا ایک جزو ہے لیکن اس کا انداز اور شدت intensity مختلف انسانوں میں مختلف ہوتی ہے، مثلاً کوئی شخص خوبصورت فطری منظر دیکھے یا کسی دردناک حادثہ سے دوچار ہو تو ان دونوں صورتوں میں اس کے اندر ایک عجیب سا ہیجان برپا ہوتا ہے، یہی ہیجان یا جذبہ تخلیق ادب کا سبب بن جاتا ہے، اسی جذبہ کا نام عاطفہ ہے اور یہ تخلیق ادب کا سب سے اہم اور بنیادی عنصر ہے، اگر ہم نظر ڈالیں تو بعض اوقات بالکل معمولی واقعہ ادب کے کسی بڑے زبردست شہ پارے کی تخلیق کا سبب دکھائی دیتا ہے، بلبل کا چہکنا، ہوا کا چلنا، پھول کا کھلنا، ہر وقت ہر ایک کی نظر سے گذرتا ہے مگر یہی چیز ایک شاعر، ادیب یا مصور کے لئے جس کے عاطفہ میں گیرائی اور وسعت وشدت ہو ایک عمدہ نظم، پر اثر نثر یا قابل دید تصویر کا موضوع بن جاتی ہے اور اس کے اظہار کی شکل میں وہ شہ کار وجود میں آتا ہے جو رہتی دنیا تک یاد رکھا جاتا ہے، خواہ وہ Wordsworth ہو، متنبی ہو، پکاسو ہو یا کوئی اور تخلیق نگار، عاطفہ کے

۱۔ عربی تنقید.....مطالعہ اور جائزہ مصنفہ محمد اقبال حسین ندوی، صفحہ ۱۷، حیدرآباد ۱۹۹۱ء، تاریخ ادب عربی مصنفہ مقتدیٰ حسن ازہری، صفحہ ۴۔

۲۔ النقد الادبی مؤلفہ احمد امین، صفحہ ۲۰ ، قاہرہ ۱۹۵۲ء۔

بغیر کوئی فنکار کسی تخلیق کا باعث نہیں بن سکتا۔ عاطفہ ہی وہ عنصر ہے جو ادب کے کسی نمونہ کو خلود و دوام کا درجہ بخشتا ہے، خود ادب اسی عاطفہ پر منحصر ہوتا ہے، جس تحریر میں عاطفہ کا جتنا عنصر ہوگا اتنا ہی وہ پائیدار اور ادبیت کا حامل ہوگی۔

لغت میں عاطفہ کو حماسہ اور فرح (انشراح صدر) جیسے الفاظ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔[1] عاطفہ کی اصطلاح جدید نقادوں کی ایجادہ کردہ ہے، عاطفہ ایک فطری صلاحیت کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ادیب و شاعر کو ودیعت کی جاتی ہے، لیکن اس فطری صلاحیت کو تعلیم اور تربیت کے ذریعہ ترقی دی جاسکتی ہے۔ وسیع مطالعہ، مسلسل صبر آزما مشق اور عمیق غور و فکر اور گہرا ارتکاز توجہ (deep concentration) اس شعبہ کی ترقی کے لئے انتہائی ضروری اجزاء ہیں جن کے ذریعہ یہ موہوبہ صلاحیت اپنے عروج کو پہنچ سکتی ہے۔

۲۔ خیال:

ادب کا دوسرا عنصر خیال ہے، دوسرے الفاظ میں اس کو اظہار عاطفہ یا اظہار خیال بھی کہا جاسکتا ہے۔ خیال اس زبان کا نام ہے جس کے ذریعہ انسان عاطفہ یا احساس کی ترجمانی کرتا ہے، ایک ادیب و شاعر کی تحریر، ایک مصور کی تصویر، ایک مغنی کا نغمہ اس کے عاطفہ کے ترجمان ہیں اور اس ہیجان فطری کو جو اس کے قلب و نظر میں پیدا ہوتا ہے معرض وجود میں لانے کا آلہ ہیں جن کے ذریعہ وہ اپنے احساسات اور عواطف کو دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ جب کسی شخص کے اندر عاطفہ پیدا ہوتا ہے تو اس بات کے لئے مجبور ہوجاتا ہے کہ وہ اپنے ان جذبات کو صحیح صحیح دوسروں تک منتقل کردے، چنانچہ وہ اس کام کے لئے کسی وسیلہ (medium) کو منتخب کرتا ہے، ادیب و شاعر کے لئے یہ وسیلہ کلام و الفاظ ہیں چنانچہ ایک ادیب و شاعر عام بول چال سے ہٹ کر ایسے الفاظ اور نئی طرز کی زبان وضع کرتا ہے جو تشبیہات، استعارات اور دیگر محاسن سے مرصع ہوکر اس کے عاطفہ کے اظہار کے لئے مناسب ذریعہ بن جائے، اسی زبان کا نام خیال ہے۔

عربی ادب میں حسن خیال کے بے شمار نمونے متقدمین اور متأخرین کے کلام میں ملتے ہیں، مثلاً متنبی کے مندرجہ ذیل اشعار:

رمانی الدهر بالارزاء حتی ۔۔۔ فؤادی فی غشاء من نبال

فصرت اذا اصابتنی سهام ۔۔۔ تکسرت النصال علی النصال

---

[1] المنجد

و هـان فـمـا ابـالی بـالرزایـا　　لانـی انتفـعـت بـان ابـالـی[1]

(زمانے کے حوادث نے مجھ کو اپنے تیروں کا نشانہ بنایا یہاں تک کہ (مشکلات و پریشانیوں کے) ان تیروں سے میرا دل چھپ گیا اور جب مجھ پر یہ تیر لگے تو یہ حال ہوگیا کہ تیر پر تیر ٹوٹنے لگا (یعنی مصیبتوں پر مصیبتیں آنے لگیں) میں نے اب پرواہ کرنی چھوڑ دی کیوں کہ زخموں کی پرواہ کرنے سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا)

ان اشعار میں عاطفہ دراصل حوادث زمانہ پر غم وغصہ کا جذبہ اور اس سے بیزاری کا احساس ہے جس کی بناء پر شاعر بے انتہا مصائب وآلام سے دوچار ہوگیا ہے، اس احساس کے اظہار کے لئے جو خیال شاعر نے استعمال کیا ہے وہ ایک خاص زبان اور الفاظ کی شکل میں ہے جس کی بناء پر وہ اظہار خیال بیحد مؤثر ہوگیا ہے، اس طرح ان الفاظ سے شاعر نے اپنے احساسات کو بہت حد تک لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ یہ زبان جو تشبیہات، استعارات اور کنایات سے مزین ہے، اس کے ذریعہ شاعر اپنے جذبات اور عواطف کی صحیح تصویر پیش کرتا ہے، یہ زبان ہی خیال کہلاتی ہے۔

احمد امین کے الفاظ میں:

"کـذلک لا بد للادب من عنصر الخیال و هو ضروری فی کل أنواع الأدب و هو الکـــوة التی نستطیع بها ان نصور الاشخاص و الاشیاء و المعانی و نمثلها شاخصة امام من نخاطبه و نستثیر مشاعرة"[2]

(خیال کا عنصر ادب کے لئے بیحد اہم ہے اور یہ تمام انواع ادب کے لئے ضروری ہے، خیال ایک ایسی کھڑکی ہے جس کے ذریعہ ہم اشخاص، اشیاء، اور معانی کی ایسی تصویر مخاطب کے سامنے پیش کر سکتے ہیں گویا کہ وہ اس کی آنکھوں کے سامنے مجسم موجود ہو اور اس کے جذبات واحساسات کو جھنجھوڑ سکتے ہیں۔)

خیال کے بغیر عاطفہ کے اظہار سے دوسرے کے احساسات کو برانگیختہ کرنا ناممکن ہے۔

---

[1] دیوان المتنبی صفحہ ۲۰۴

[2] النقد الأدبی، صفحہ ۲۷۔

۳۔اسلوب:

ادب کا ایک عنصر اسلوب ہے،اس کو حسن نظم یا تالیف الکلام یا طرز تحریر بھی کہتے ہیں، عاطفہ،خیال اور افکار کے اظہار کے لئے بہترین طرز کلام کی ضرورت ہوتی ہے،اگر عاطفہ بھی موجود ہو اور خیال بھی ہو لیکن اس خیال کو پیش کرنے کا انداز یا اس کے لئے منتخب کئے ہوئے الفاظ اور زبان مناسب و معقول نہ ہو یا ایسا انداز اختیار کیا جائے جو اس جذبہ و احساس (عاطفہ) سے میل نہ کھاتا ہو جس کے اظہار کے لیے وہ اسلوب بیان منتخب کیا گیا ہے،تو ادب کی قیمت وہ نہیں رہے گی جو ہونی چاہئے،اس لئے اسلوب بیان بھی ادب میں نہایت اہمیت کا حامل ہے،سامع اور قاری کے عاطفہ کو برانگیختہ کر کے اپنے عاطفہ سے اس کا تعلق قائم کرنے کے لئے اسلوب سب سے زیادہ ضروری چیز ہے،اکثر دیکھا گیا ہے کہ اگر کسی معمولی اور عام بات کو ذرا لطیف اور عمدہ پیرایہ میں بیان کیا جائے تو سامعین کو وجد آجاتا ہے اور ان کے جذبات برانگیختہ ہو جاتے ہیں اور یہی عمدہ اسلوب کا کمال ہے۔

اسلوب معانی کی ادائیگی کا ایک ذریعہ ہوتا ہے،خود یہ مقصود بالذات تو نہیں لیکن ادب کی قدر و قیمت متعین کرنے کے لیے اس کے اہم کردار کی وجہ سے ادب کا عنصر قرار دے دیا گیا ہے۔اسلوب پر قدرت حاصل کرنے کے لئے زبان پر مہارت پانا انتہائی ضروری ہے،صحیح موقع کے مطابق الفاظ،فصاحت و بلاغت کا لحاظ، تحریر میں سلاست و روانی،صرف و نحو کا ایسا لحاظ جو اہل زبان کے قواعد کے موافق ہو،تشبیہات،استعارہ و کنایہ اور دیگر محاسن کلام کا برمحل استعمال،یہ وہ لسانی عوامل ہیں جو اسلوب پر اثر انداز ہوتے ہیں اور یہ سب زبان و ادب پر مہارت حاصل ہونے کا ہی نتیجہ ہیں۔

ان عوامل کے ذریعہ عبارتوں کی تشکیل میں اختلاف ہی دراصل مصنفین کی تحریروں میں فرق کا سبب ہوتا ہے،لیکن اس کے علاوہ یہ فرق ایک اور جگہ سامنے آتا ہے،اور وہ ہے موضوع کے لحاظ سے افکار کا انتخاب،انکی منطقی ترتیب،ان کی وضاحت یا ابہام،ان کو پیش کرنے کا طرز،ان کو تخیل و تصویر کا قالب عطا کرنا، ان کے بیان کے لیے خوبصورت اور بامعنی الفاظ استعمال کرنا،یہ وہ تمام نکات ہیں جہاں تخلیق نگار،شاعر،ادیب اور مصنف ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں اور ہر ایک اپنا اسلوب اور طرز تحریر لے کر سامنے آتا ہے۔

۴۔فکر یا معانی(Thought):

فکر و معانی بھی ادب کا ایک عنصر ہے،کوئی ادبی تخلیق اگر اپنے اندر معانی کا عنصر نہ رکھتی ہو تو وہ بے قیمت

ہو جاتی ہے، جس تحریر میں جتنا معانی اور فکر کا عنصر ہوگا اس کی اسی قدر حیثیت و وقعت ہوگی۔ انشائی ادب میں محض ذوق کی تسکین یا فطرت کے کسی پہلو کی تصویر کشی کرنے والی تحریر خواہ کتنے ہی متاثر کن اسلوب بیان اور حسین دلنشین الفاظ میں ہو وہ وقعت اور اہمیت نہیں رکھ سکتی جو ایک سادہ اسلوب میں وضع کردہ اس تحریر میں پائی جاتی ہے جس میں زندگی کی حقیقت یا کسی طرز فکر کا اظہار ہو، عصر جدید میں اس ادب کی اہمیت اور زیادہ ہوگئی ہے اور زندگی کے مسائل اور ان کے حل پیش کرنے والی سنجیدہ تحریروں نے ادب میں ایک خاص مقام بنالیا ہے۔ فلسفہ، تاریخ، علوم عمرانیات، وغیرہ چند ایسے موضوعات ہیں جن میں پیش کردہ ادب نہایت اہم حیثیت کا حامل ہے، اس قسم کے ادب کا مقصد صرف ادبی ذوق کی تسکین نہیں بلکہ حقائق و معانی اور مسائل کا بیان ہوتا ہے، اس سلسلہ میں ادیب کا مطمح نظر، تحقیق اور استخراج نتائج اس کی اصل خصوصیات ہیں۔ اسی لیے ادب کی اس شق میں معانی اور موضوع کا خاص خیال رکھا جاتا ہے، اور ممکن حد تک معنوی پہلو کو غالب حیثیت دی جاتی ہے، اس کے اظہار کے لیے جتنا آسان مدلل اور سلیس انداز اختیار کیا جائے اتنی ہی اس میں مظبوطی اور خوبصورتی آتی ہے۔

لیکن یہ قدرت و ملکہ تمام ادباء میں یکساں نہیں ہوتا، Words worth شاعر فطرت کہلاتا ہے، اور انشائی ادب میں ایک بلند مقام رکھتا ہے، مگر اس سے کسی سنجیدہ موضوع پر اظہار خیال کی امید نہیں کی جاسکتی۔ عواطف اور خیال کی طرح فکر میں بھی ادباء مختلف ہوتے ہیں اور جو ادیب یا شاعر حقائق کے معانی کو پیش کرنے میں عاطفہ و خیال کی جتنی زیادہ آمیزش پر قادر ہوتا ہے اس کی تحریر اتنی ہی محکم، باوقار اور موثر سمجھی جاتی ہے۔

عربی ادب کا ہندوستان میں مقام:

اگر ہم آٹھویں صدی سے بارہویں صدی تک کی تاریخ کا بغور مطالعہ کریں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ شمالی ہندوستان میں اسلام براہ راست عرب کے بجائے براہ ایران و ترکستان آیا اور اسی طرح عربی زبان بھی سیدھی عربوں کے ذریعہ نہیں بلکہ ایرانیوں اور ترکوں کے لشکروں کے ہمراہ یا پھر اس طرف سے آنے والے ان عربی دانوں کے ہمراہ آئی جن کی مادری زبانیں فارسی، ترکی یا اسی قبیلہ کی دیگر زبانیں تھیں۔ بقول سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ:

> ''جس طرح ہندوستان پانچویں صدی ہجری سے سیاسی اور فوجی حیثیت سے ترکستان و افغانستان کے زیر اثر رہا اسی طرح وہ علمی، ادبی، ثقافتی، تہذیبی اور فکری حیثیت سے کم و بیش ایران کے زیر اثر رہا ہے۔ وہاں کا ادب و شاعری، تصوف کے سلاسل و طرق اور آخر میں وہاں کا نصاب درس اور

طریقہ تعلیم اور وہاں کے علماء اور اساتذۂ فن کی تصنیفات ہندوستان کے ذہن و دماغ پر سایہ فگن رہی ہیں ..... ہندوستان اپنے نصاب، طریقۂ تعلیم، معیار فضیلت کے تعین اور معقولات و ''علوم حکمت'' کے میدان میں ایران کا کلیۂ خوشہ چیں بلکہ باج گذار اور غاشیہ بردار بن گیا''۔[۱]

چنانچہ عربی زبان نے بھی تاریخی اعتبار سے اس وقت ہندوستان میں باقاعدہ قدم جمایا جب اس کا ادب فارسی اثرات سے پوری طرح متاثر ہو چکا تھا۔

یہ فارسی اثرات صرف تدریسی و تصنیفی حلقہ تک محدود نہیں رہے بلکہ زبان وادب پر بھی پڑے، جب عربوں کا ایرانیوں سے میل جول بڑھا تو انہوں نے باریک بینی، پرنویسی اور تکلف سے کام لینا شروع کر دیا اور مرور زمانہ کے ساتھ وہ بھی اس طرز میں ترقی کرتے رہے حتیٰ کہ انہوں نے قدماء کے سادہ اسالیب کو چھوڑ دیا اور ایک ایک مطلب کو بیان کرنے کے لیے یکے بعد دیگرے کئی کئی جملے اور مترادف الفاظ لکھنے لگے۔ بات کو طول دے کر اور الفاظ کی تکرار کر کے مطلب کو اور زیادہ واضح کرنے کی کوشش میں وہ سادگی اور بے تکلفی گم ہو گئی جو قدمائے علم کا خاصہ تھی، رفتہ رفتہ انشاء پردازی میں اس اسلوب نے اپنی جگہ بنالی جس میں یہ انشاء پرداز اپنے اصل مقصد سے غافل ہو گئے اور انہوں نے انواع بدیع کے زیر اثر کلام کو خوشنما اور الفاظ کو حسین بنانے کے خبط میں اتنا غلو کیا کہ ان کے الفاظ بھونڈے اور معانی خام رہ گئے، افسوس کہ ان لوگوں نے علوم کی تدوین اور کتابوں کی تصنیف میں بھی اسی اسلوب کو استعمال کرنا شروع کر دیا مثلاً ''تاریخ العتبی'' اور ''الفتح القدسی'' وغیرہ۔[۲]

اس زمانہ کے اہل علم پر غالب ذوق ادب، شاعری، علم مجلسی، اور الغاز ولطائف (معمہ اور پہیلیاں) کا سجع وقوافی کی کثرت اور تکلفات ادب میں عام تھے۔ ترکی حکومت کے اثرات بھی ساتھ ہی علمی اور ادبی حلقہ پر نمایاں تھے۔ کوئی بڑا محقق اور صاحب نظر بدقت ڈھونڈنے سے نظر آتا تھا، مرادی کی ''سلک الدرر فی اعیان القرن الثانی عشر'' کی چار جلدیں، قصائد، غزلیات، ابیات ومقطوعات سے بھری پڑی ہیں، بعض علماء نے تو فقہی متون قدوری وغیرہ تک کو نظم میں بدل دیا، اس دور تک آتے آتے ایران کا رابطہ امام مسلم، امام ابوداؤد، امام نسائی، امام ماجہ جیسے مسلّم ماہرین حدیث اور علامہ ابواسحٰق شیرازی، حجۃ الاسلام ابوحامد محمد الغزالی جیسے بلند پایہ فقیہ اور متبحر علماء سے کٹ گیا تھا اور تقریباً سوا دو سو برس کی باجبروت صفوی شیعہ سلطنت کے نتیجہ میں

---

۱ تاریخ دعوت وعزیمت، جلد ۵، صفحہ ۱۸۔

۲ تاریخ ادب عربی، مصنفہ احمد حسن زیات، صفحہ ۱۹۳، الٰہ آباد ۱۹۸۵ء۔

حدیث، فقہ اور علوم نافعہ سے ان کا بُعد بُعد المشرقین بن چکا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے اثرات سے ہندوستان کے نصاب درس اور طریقہ تعلیم پر عقلیت کی ایسی گہری چھاپ لگادی جو تیرہویں صدی ہجری تک باقی رہی۔[1]

''ایران کے نسلی ذوق نے جو صدیوں سے رائی کا پربت اور بات کا بتنگڑ بنانے کا عادی تھا اس عقلی رجحان کا پورا ساتھ دیا اور لفظی موشگافیاں اور دعاوی ومفروضات کی بھول بھلیاں ایران کی مغربی سرحد سے ہندوستان میں پھیلا دیں، تدریسی اور تصنیفی حلقہ پر 'علوم حکمت' کی حکومت قائم تھی اور ان علوم کے مصنفین کی عبارتوں کو سمجھنے اور ان کی شرح وتحشیہ کے سوا اظہار کمال بلکہ اپنی ذہانت کا ثبوت دینے کا کوئی دوسرا ذریعہ نہ تھا''۔[2]

جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے ہندوستان میں عربی ادب کی گنجائش صرف علمی اور دینی حلقوں میں ہی تھی عوام الناس مقامی زبانیں بولتے اور سمجھتے تھے اور درباری زبان فارسی تھی جس میں زیادہ تر اہل قلم اپنی تصنیف کے جوہر دکھاتے تھے، لشکر اور بازار میں ایک نئی زبان ریختہ ابھر رہی تھی جو بعد میں اردو کے نام سے مشہور ہوئی، عربی میں جو لوگ کچھ لکھنے کی کوشش کررہے تھے ان کا اسلوب نگارش اسی فارسی یا اس سے متاثر ہونے والی عربی طرز میں تھا جو اس وقت عام تھی۔

شاہ صاحب کا دور بدقسمتی سے ہماری تاریخ میں ادبی اور علمی بے مائیگی کا دور تھا، الفاظ کے طلسم میں گرفتار، مسجع ومقفع عبارتوں اور غیر مانوس ترکیبوں کے شیدائی مصنفین اس اسلوب اور اس میں تحریر کردہ تصانیف کی تشکیل میں ایسے مستغرق تھے کہ انہیں بھولے سے بھی اس طرز کی مصنوعیت کا خیال نہ آتا۔

بقول مولانا مناظر احسن گیلانیؒ:

''ایک مدت سے ہندوستان ہی نہیں بلکہ تمام دنیائے اسلام کے اہل علم وفضل پر ایسا جمود طاری ہوگیا تھا کہ پچھلی چند صدیوں میں ایک بھی قابل ذکر مصنف پیدا نہیں ہوا تھا، تصنیف کا ذوق و شوق تو باقی تھا لیکن کتابوں میں بھی ادھر دو تین صدیوں سے یہ آفت آئی ہوئی تھی کہ محض لفظوں کی دھڑا بندی کی جارہی تھی، علمائے اسلام کے جو تذکرے ادھر تیار ہوئے انہیں دیکھئے، بقول نواب علامہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی 'سوائے البحر العلام والبحر القمقام کے ہم قافیہ الفاظ کے سوانح و حالت کی ایک سطر نہیں ملتی'۔ بے مائیگی میں یہی حال دوسرے علوم وفنون کی کتابوں کا بھی تھا''۔[3]

---

[1] تاریخ دعوت وعزیمت، صفحہ ۳۶ [2] تاریخ دعوت وعزیمت، صفحہ ۳۷

[3] الفرقان: شاہ ولی اللہ نمبر ۱۹۴۱ء بریلی۔ صفحہ ۲۳۴

تفسیر وحدیث تک کی کتابوں میں یہ خرابی در آئی تھی، شہاب الدین دولت آبادی جیسے عالم نے تفسیر قرآن ''بحر المواج'' لکھی اس میں بھی نہایت مرصع و مسجع زبان استعمال کی گئی۔ اسی طرح دیگر علماء نے بھی سنجیدہ اور ادق موضوعات کو اپنی اسی رنگیں بیانی کی وجہ سے بے وزن بنا دیا تھا۔[۱]

اس دور کے مصنفین عموماً تخلیقی ادب کے مقابلہ میں تشریحی ادب کی جانب زیادہ توجہ دیتے تھے، اسی لیے شروح، تفاسیر، حاشیے، سوانح، طبقات، تذکرے، وغیرہ اس دور کی تصانیف میں بکثرت نظر آتے ہیں۔

تخلیق اور وہ بھی اس پایہ کی جس میں غور وفکر، دقت نگاہ، سلاست فہم کے ساتھ ساتھ واضح مطمح نظر، قلبی اطمینان اور حساس دل کی تڑپ شامل ہو اور جس کے اظہار کے لیے ایسا سلیس، مدلل اور شیریں انداز اختیار کیا جائے جو قاری وسامع کو فوراً اپنی طرف متوجہ کر لے، اس دور میں کم سے کمتر تھی، بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ تقریباً ناپید تھی۔

اس زمانہ کے ادب خصوصاً عربی ادب پر جو ہندوستان کی مادری زبان میں نہیں تھا، اس دور کے انحطاط اور ذہنی تنزل کا اثر تھا۔ عام طور پر متاخرین عربی ادباء وشعراء اسی طرز تحریر اور اسلوب نگارش کے شکار تھے جو مقامات حریری جیسے قدیم کلاسیکی ادب کی دین تھا لیکن مطالب عالیہ اور علمی مضامین کے اظہار کے لیے قطعاً موزوں نہیں تھا۔ وہ لوگ سجع وقوافی کے ایسے پابند، تکلف اور تصنع کے اتنے دلدادہ اور قدیم طرز کے ایسے پیرو تھے کہ نئی راہیں تلاش کرنے کی ہمت بھی نہ کر سکتے تھے، بقول سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ:

> ''حریری کے بعد جس نے بھی کسی مضمون پر قلم اٹھایا حریری ہی کے قلم سے لکھا جس کا قط پرانا ہو گیا تھا۔ رسائل وخطوط اور کتابوں کی تقریظیں حتیٰ کہ فتاوے تک کی طویل عبارتیں بھی حریری کے اس اثر سے آزاد نہیں۔''

---

[۱] حجۃ اللہ البالغۃ: ایک تجزیاتی مطالعہ، مرتبہ، یٰسین مظہر صدیقی، صفحہ ۴۹، مقالہ پروفیسر سید عبدالباری۔

شاہ صاحب کی عربی تحریر کی خصوصیات

الف- العاطفہ:

جب ہم شاہ صاحب کی زندگی اوران کی تصانیف پرنظر ڈالتے ہیں تو ہم کواس بات کے خارجی اور داخلی دونوں اقسام کے ثبوت ملتے ہیں کہ شاہ صاحب کوقدرت نے عاطفہ کی دولت وافر مقدار میں بخشی تھی جس کوانہوں نے اپنی ذاتی کوششوں اورمحنت سے بام عروج پر پہنچادیا۔ نیز عاطفہ پراتنی کامل قدرت پالی تھی کہ اس کو بہ آسانی اپنے طور پر جس طرح چاہتے استعمال کرتے۔

خارجی طور پر یہ ثبوت آپ کے نسب، آپکی پیدائش، آپ کی زندگی، تعلیم وتربیت اور عادات واطوار سے اور داخلی طور پرآپ کی تصنیفات سے بکثرت مہیا لیے جاسکتے ہیں۔

سابقہ ابواب میں ان تمام خارجی اثرات وعوامل پر تفصیلی روشنی ڈالی جاچکی ہے جوشاہ صاحب کے عاطفہ کی تربیت اورترقی کا باعث بنے، ان تمام واقعات وحادثات کا تذکرہ شاہ صاحب نے اپنی خودنوشت سوانح اوراس کے علاوہ متعدد مصنفین نے اپنی تصنیفات میں کیا ہے۔

شاہ صاحب نے اپنے عاطفہ کا تذکرہ کہیں نوربصیرت سے کیا ہےاور کہیں وجدانی علم سے، الجزء اللطیف میں اپنی تعلیمی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''اس حصول علم کے دوران ہرفن کے کئی قیمتی نکات میرے ذہن میں پیدا ہوتے تھے جومزید غورو فکر سے کئی اورراہیں سجھادیتے تھے''۔[1]

آگے فرماتے ہیں:

> ''جب میں والدگرامی کے مزار مبارک پرمراقبہ کرتا تو مسائل توحید حل ہوجاتے، جذب کا راستہ کھل جاتا، سلوک میں سے وافر حصہ میسر آتا اوروجدانی علوم کا ذہن میں ہجوم لگ جاتا۔''[2]

علامہ محسن ترہتی اپنی تصنیف میں اسی عاطفہ کوان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

---

[1] انفاس العارفین، صفحہ ۴۰۵

[2] ایضاً

"و منها ما صب الله تعالیٰ فی صدره من نور کشف له عن وجوه اسرار الشریعة و حکمها الغامضة البدیعة ثم شرح صدره لبیانها فبینها علی احسن وجه فی کتابه حجة الله البالغة" [1]

(اور ان کی خصوصیات میں ایک یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں ایک نور پیدا فرمادیا جس کے ذریعہ آپ نے اسرار شرعیہ اور اس کی گہری اور واضح حکمتوں کا کشف کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کا سینہ اس کے بیان کے لیے کھول دیا جس کی وجہ سے آپ نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں ان کو نہایت عمدہ طریقہ پر بیان کردیا ہے۔)

آپکے محبّ صادق، خلیفہ اور بھائی شاہ محمد عاشق نے شاہ صاحب کے بچپن کے کئی واقعات اپنی کتاب 'القول الجلی' میں بیان کر کے ثابت کیا ہے کہ آپکی حس باطنی بہایت قوی تھی جسکو آپنے اپنے اعمال، اشغال طریقت، مراقبہ وغیرہ سے قوی تر بنالیا تھا۔ آپ نہایت حساس طبیعت تھے۔ بچپن سے نفاست پسند، متین، سنجیدہ و شائستہ مزاج اور خداداد قابلیتوں مثلاً حافظہ، ذہانت، فراست وغیرہ سے متصف تھے۔ ان تمام خصوصیات اور قابلیت کی بناء پر آپکے احساسات وعواطف انتہائی تیز ہوگئے تھے اور ماحول کی ذراسی تبدیلی آپکے جذبات پر گہرا اثر ڈالتی۔ یہ اثر صاف طور پر آپکی تحریر میں نمایاں ہے۔ رحیم بخش صاحب نے حیات ولی میں جا بجا ان خصوصیات کا تذکرہ کیا ہے۔

ب- خیال:

شاہ صاحب کی تصانیف میں خیال کا عنصر اپنے انتہائی ترقی یافتہ مقام پر نظر آتا ہے۔ آپکی تصانیف ایک ایسے مصنف کے قلم کا شاہکار نظر آتی ہیں جو اپنے خیالات میں پختہ، اظہار خیال میں ماہر اور الفاظ پر مکمل طور پر قادر ہے، ایسے قادر الکلام ادیب کے لیے ضروری ہے کہ قلبی اطمینان، ذہنی سکون، اور خاطر جمعی حاصل ہو۔

شاہ صاحب کا ماحول اور اس دور کے حالات انتہائی پرآشوب تھے اور وہ زمانہ انتہائی بے اطمینانی، مصائب اور غیر یقینی کیفیات کا حامل تھا، خود شاہ صاحب اور ان کے متعلقین اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ یہاں تک ہوا کہ ۱۱۷۳ھ کے احمد شاہ ابدالی کے فتنہ کے دوران جب شہر دہلی میں قتل وغارتگری کا بازار گرم تھا جس سے خود آپ کا مسکن بھی محفوظ نہ رہا، تو آپ وہاں سے منتقل ہوکر پہلے شہر پناہ کے اندر تشریف لے گئے اور

---

[1] الیانع الجنی۔ صفحہ ۱۴۹

اس کے بعد شہر والوں اور خدام کی استدعاء پر مع متعلقین واعزاء وطن مالوف سے قصبہ بڈھانہ تشریف لے آئے، اس ضمن میں شاہ عاشق تحریر کرتے ہیں:

''ان ہی ایام میں اپنے ایک مکتوب میں جو اس عقیدتمند کے نام صادر ہوا تھا (ان الفاظ میں) ارشاد فرمایا کہ 'ایسا نظر آرہا ہے کہ بہت بڑا فتنہ پیدا ہوگا اور ایک عالم تہ و بالا ہوگا مبارک ہے وہ شخص جو (اس وقت) تسلیم ورضاء کو اپنا شعار بنالے اور اسے اپنے ہاتھ سے نہ جانے دے۔''[1]

یہی راز تھا جس کی بناء پر آپ اس دور میں بھی رمضان شریف آنے پر حسب معمول چلہ کشی، عبادتوں اور اعتکاف وغیرہ کا اہتمام بھی کرتے رہے، درس، تصنیف، دعوۃ الی اللہ، تزکیۂ نفوس اور تربیت طالبین میں بھی مصروف رہے، اور جمعیت خاطر کے ساتھ ایک گوشۂ عافیت میں بیٹھے ہوئے علمی تحقیق، فکری رہنمائی، اخلاقی تربیت، اور احیائے ملت کے کام میں ہمہ تن مصروف رہے گویا کہ دہلی میں ہی نہیں سارے ہندوستان میں حالات معتدل اور پرسکون ہوں۔[2] یہ سکون واطمینان اور ارتکاز خیال آپ کو اپنی تربیت، روحانی ترقی اور سب سے زیادہ توفیق الٰہی اور حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پرفتوح کی امداد سے حاصل ہوا۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اس حقیقت کو نہایت عمدہ انداز میں اس طرح پیش کیا ہے:

''ایسے کم مصنف گذرے ہیں جن کی تصانیف میں ان کے زمانہ کی روح نہ ہو، یا اس میں زمان و مکان کی جھلک نہ ہو اور کم از کم یہ کہ اپنے زمانہ کی علمی ناقدر شناسی اور اضطراب احوال کا ذکر نہ ہو مگر شاہ صاحب کی تصانیف کا یہ حال ہے کہ وہ زمان ومکان کی قید سے بالکل پاک اور گلہ وشکایت اور حرف وحکایت سے سراپا بے نیاز ہے، یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ کتابیں اس زمانہ میں لکھی گئی ہیں جب امن واطمینان اس ملک سے حرف غلط کی طرح مٹ گیا تھا.....اس درمیان میں دہلی خدا جانے کتنی دفعہ لٹی اور کتنی دفعہ بنی مگر دہلی کے تاجدار علم کا امن واطمینان کہ یہ سب کچھ آنکھوں کے سامنے ہوتا رہا مگر نہ دل کو اضطراب، نہ خیال میں انتشار، نہ قلم سے بے اطمینانی کا اظہار!.....شاہ صاحب کی تصنیفات کے ہزاروں صفحے پڑھ جایئے آپ کو یہ معلوم بھی نہ ہوگا کہ یہ بارہویں صدی ہجری کے پرآشوب زمانہ کی پیداوار ہیں.....صرف یہ معلوم ہوگا کہ علم وفضل کا ایک دریا ہے جو کسی شور وغل کے بغیر سکون وآرام کے ساتھ بہ رہا ہے، جو زمان و

---

[1] القول الجلی، صفحہ ۲۹۶۔

[2] تاریخ دعوت وعزیمت صفحہ ۲۹۲۔

مکان کے خس وخاشاک کی گندگی سے پاک وصاف ہے۔''[۱]

بقول سید ابوالاعلیٰ مودودی:

''اس تاریک زمانہ میں نشونما پا کر ایسا آزاد خیال مفکر ومبصر منظر عام پر آتا ہے جو زمانہ اور ماحول کی ساری بندشوں سے آزاد ہو کر سوچتا ہے۔ تقلیدی علم اور صدیوں کے جمے ہوئے تعصّبات کے بند توڑ کر ہر مسئلۂ زندگی پر محققانہ ومجتہدانہ نگاہ ڈالتا ہے اور ایسا لٹریچر چھوڑ کر جاتا ہے، جس کی زبان، انداز بیان، خیالات، نظریات، مواد تحقیق اور نتائج مستخرجہ کسی بھی چیز پر ماحول کا کوئی اثر دکھائی نہیں دیتا، حتیٰ کہ اس کے اوراق کی سیر کرتے ہوئے یہ گمان تک نہیں ہوتا کہ یہ چیزیں اس جگہ لکھی گئی تھیں، جس کے گرد وپیش عیاشی، نفس پرستی، قتل وغارت، جبر وظلم اور بدامنی وطوائف الملوکی کا طوفان برپا تھا۔''[۲]

ج- اسلوب:

شاہ صاحب کی عربی تالیفات خصوصاً حجۃ اللہ البالغہ شہادت دیتی ہیں کہ ان کو عربی زبان اور اس میں تحریر و انشاء پر نہ صرف مکمل قدرت اور تصرف حاصل تھا بلکہ وہ ایک ایسے طرز واسلوب کے بانی مبانی ہیں جو علمی مضامین وتحقیقی مقاصد کی شرح اور بیان کے لئے موزوں ترین اسلوب ہے۔ زبان اور ادب پر آپ کی گرفت اتنی مضبوط ہے کہ الفاظ وتراکیب اہل زبان کی سی روانی سے آپ کے نوک قلم پر آتے ہیں۔

مولانا مناظر احسن گیلانی شاہ صاحب کے اسلوب اور عربی زبان پر آپ کی گرفت کا راز ان الفاظ میں عیاں کرتے ہیں:

''عربی زبان میں انہوں نے جتنی کتابیں لکھی ہیں ان میں ایک خاص قسم کی انشاء کی جو ان کا مخصوص اسلوب ہے، پوری پابندی کی ہے، شاہ صاحب نے عربی انشاء وادب کا جو نیا قالب تیار کیا ہے یہی نہیں کہ ہندوستانی مصنفین میں اس کی نظیر نہیں پائی جاتی بلکہ میں نہیں جانتا کہ آغاز اسلام سے اس وقت تک کسی اسلامی علاقہ کے ارباب تصنیف نے اس کو اختیار کیا ہے۔ شاہ صاحب کے اس اسلوب بدیع کی کیا خصوصیتیں ہیں، مختصر لفظوں میں شاید کہا جاسکتا ہے کہ وہ پہلے

---

۱ الفرقان: صفحہ ۳۴۸-۳۴۹، ۱۹۴۱ء

۲ الفرقان: صفحہ ۹۳، ۱۹۴۱ء

آدمی ہیں جن کی عبارتوں میں زیادہ تر ''جوامع الکلم'' النبی الخاتم صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز گفتگو کی پیروی ہے، حتی الوسع وہ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ اپنے مدعا کا اظہار ان ہی لغات اور ان ہی محاوروں میں کریں، جو لسان نبوت سے خاص تعلق رکھتے ہیں اور اس میں خدا نے ان کو خاص مہارت عطا فرمائی ہے۔ حدیث کے بعد ان کی عبارت میں قرآنی طرز تکلم کا بھی اثر ہے، لیکن قرآن سے زیادہ اس باب میں وہ حدیث ہی کے متبع نظر آتے ہیں۔ اس چیز نے ان کی کتابوں کے رنگ کو عربی زبان کے دوسرے مصنفین سے ممتاز کر دیا ہے۔''[1]

شاہ صاحب کے اسلوب کے بارے میں مولانا گیلانی کا یہ قول اگرچہ بڑی حد تک قابل قبول ہوسکتا ہے اور شاہ صاحب کے عشق رسول کا مقتضیٰ بھی یہی ہے کہ وہ اس راہ میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتے نظر آئیں جو خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند تھی اور جس کے سلسلے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کئی احادیث خود شاہ صاحب نے بیان کی ہیں۔ مثلاً

(۱) قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم هلك المتنطعون، قالها ثلاثاً۔ (رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فضول باتیں کرنے والے ہلاک ہوئے، اور اس بات کو تین مرتبہ فرمایا۔)

(۲) قال صلى الله عليه وسلم الحياء و العى شعبتان من الايمان و البذاء و البيان شعبتان من النفاق۔ (حیا اور کم گوئی ایمان کے دو شعبے ہیں اور بے حیائی اور یادہ گوئی نفاق کے دو شعبے ہیں۔)

چنانچہ ان احادیث کی روشنی میں شاہ صاحبؒ نے اپنے اسلوب کا انتخاب کرلیا تھا جس کی خصوصیت اختصار اور جامعیت تھی جو ان کی انشاء کے ایک بڑے حصہ کا وصف خاص ہے۔ آپ حجۃ اللہ البالغہ کے آخری باب میں اس کی توجیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

واعلم ان التنطع و التشدق و التقعر فى الكلام و الاكثار من الشعر و المزاح و ترجية الوقت باسمار و نحوها احدى المسليات التى تشغل عن الدين و الدنيا و ما	واضح ہو کہ کلام میں حلق پھاڑنا اور چرب زبانی کرنا اور تکلف کرنا اور شعر و مدح میں زیادتی کرنا اور قصہ کہانیوں میں وقت گذارنا، یہ سب باتیں ان امور میں ہیں جو دین اور دنیا سے غافل کرتے ہیں، جن سے

---

[1] الفرقان: صفحہ ۲۲۵، ۱۹۴۱ء

یقع بہ التفاخر و المراآۃ، و کان حالھا کحالات العجم فکرّھھا النبی صلی اللہ علیہ وسلم[1]	باہم تفاخر ونمائش کی جاتی ہے۔ پس انکا حال اہل عجم کا سا ہے، اسلئے اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کراہت کی ہے۔

شاہ صاحب کا یہ اسلوب ان کی تصانیف کے ان حصوں میں زیادہ ملتا ہے جہاں آپ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور احادیث کے رموز واسرار بیان کرتے ہیں اور احادیث کو بیان کرنے کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال سے نتائج اخذ کرتے ہیں۔ لیکن باوجود اس امر کے کہ شاہ صاحب کلام میں حلق پھاڑنے کو پسند نہیں کرتے، اپنی تصنیف کے ابتدائی حصہ میں جہاں عالم امثال، روح، موت، ملاء اعلیٰ اور دیگر مابعد الطبیعیاتی افکار پر قلم اٹھاتے ہیں ان موضوعات پر اپنا الگ نظریہ بیان کرنے کے لئے روح الحقیقہ، بہیمی اور ملکی خصائل اور نفوس نسمہ جیسی اصطلاحات وضع کرتے ہیں اور ان کو اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لئے آلہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور ان کی مدد سے اپنی بات کو واضح کرتے ہیں، وہاں ان کا انداز مختلف ہے۔ یہاں ایجاز کے بجائے اطناب اور مساوات کا استعمال کرتے ہیں، اپنی بات کو تشبیہات، استعارات کے ذریعہ واضح کرتے ہیں اور دلیلوں اور مرکب وپیچیدہ جملوں کی مدد سے اظہار خیال کرتے ہیں اور اختصار کے بجائے تفصیل سے اپنے مدعا کو بیان کرتے ہیں۔

اگر چہ خود شاہ صاحب کے بیان کردہ علوم میں جن کو آپ نے بچپن اور لڑکپن میں والد مرحوم سے حاصل کیا کوئی کتاب خالص ادب عربی یا کلاسیکی ادب کی نظر نہیں آتی لیکن والد صاحب سے سند واجازت حاصل ہونے اور پھر ان کی وفات کے بعد بارہ سال تک آپ نے بذات خود ان قدیم معیاری کتابوں کا مطالعہ کیا جو حلاوت وسلاست کا نمونہ تھیں اور عجمی تاثرات سے بہت کچھ محفوظ تھیں۔ مطالعہ اور علمی انہماک کے نتیجہ میں بقول خود شاہ صاحب:

''طالب علمی کے زمانہ میں مضامین عالیہ ذہن میں آتے تھے جن میں برابر ترقی ہوتی تھی''[2]

آپ کی علمی لگن نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اس بات پر مجبور کیا کہ آپ بذات خود عرب جا کر وہیں کے علماء سے علم وادب خصوصاً علم حدیث کا درس لیں اور اس سے استفادہ کریں، چنانچہ تیس سال کی عمر میں آپ عرب تشریف لے گئے اور دو سال وہاں قیام کیا۔ حجاز کے قیام کے دوران خاص طور پر عربی میں اس عظیم تصنیفی کام کی تیاری کی جس کو تدبیر الٰہی نے صرف ان کے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ۔ صفحہ ۴۸۳، جلد دوم

[2] الجزء اللطیف: صفحہ ۳۔

صاحب ''الیانع الجنی'' لکھتے ہیں:

فمنها ما اکرمه الله تعالیٰ به من الفصاحة فی اللغة العربیة دون کثیر من المولدین وغیر هم اذاسمعت من لفظه الرقیق المعرب البدیع خیل الیک کانما هورجل نشا بباديةٍ من علیاءِ هوازن او کانما ادبته امراة من سفلیٰ تمیمٍ له شعرٌ رخیم الحواشی کانه نظامٌ فریدٌ فی نحرالخرید او باسمُ الوردفی رَونق الربیع الجدید حازمن اللفظ مانوسه وتجنّب غواشی التعقید و اجود الشعرِ مارقَّ لفظه و راق معناه و صفا مورده' وسهل مغناه

و لِلّٰه ما انشده بعضهم نظم

التمس للقریض لفظاً رقیقاً　　کنسیم الریاض فی الاسحارِ

فاذااللفظ رق شف عن المغنی　　فابداه مثل ضوءِ النهار

کلمارقت الزجاجة راقت　　اعین الناظرین لون العقار

وما تا تی له البلوغ الی مابلغ من انسجامِ اللفظ عند حواره و تصریف المعنی فی اطوارِه من غیر تکلفٍ یتکلفه شدیدٍ ولا تعن فی مایحاوله بعیدٍ الامن اکثارِه النظر فی کتب الحدیث والقائه شراشره علیها و شدة مراسه بهاوضمه الیٰ ذالک اشتغاله بکتب السیر و ایام العرب و اخبارالملوک و اسفار الادب وهی التی یندفع بهاالمرءُ الی لسان العرب الاول و یهتدی بها الیٰ موارد کلامهم و مصادره فکیف و قداقام بالحجاز سنین و زاحم العرب وسمع من اهل البادیة و هم یومئذٍ احسن حالاً منهم فی زماننا واعرب نطقاً لم تکثر فی بلدانهم الاعاجم کثرتهم هذه و قد المع الشیخ نفسه الی بعض ماوصفته به من حظه من العربیة حیث حث بنیه فی کتاب الوصیة له علی تحصیل دربة فی لسان العرب و ملکة بصناعة الادب و ذکر لهم ان العربیة احدی مفخر تیهم التی تقربهم من سید المرسلین و تصل حبلهم بحبل منه.....[1]

---

[1] الیانع الجنی، صفحہ ۱۱۸-۱۲۰

(اور انکی خصوصیات میں ایک یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو عربی ادب میں اکثر مقامی لوگوں سے زیادہ فصاحت و بلاغت سے نوازا ہے۔ جب تم ان سے کوئی سلیس و بدیع عربی الفاظ سنو تو تمہیں خیال ہوگا کہ یہ ایسے شخص کے الفاظ ہیں جس کی نشونما بادیۂ عرب میں علیائے ہوازن میں ہوئی ہے یا اسکو سفلیٰ تمیم کی عورتوں نے ادب میں تربیت دی ہے۔ انکے اشعار ایسے نرم وسبک ہیں جیسے دوشیزہ کے گلے کے ہار کی لڑی یا جیسے بہار میں کھلنے والے گلاب کی مسکراہٹ۔ انکی تحریر میں مانوس الفاظ کا اکٹھا ہونا اور پر پیچ دوراز معانی سے پرہیز پایا جاتا ہے۔ اور عمدہ شعر وہ ہے جس کے الفاظ آسان اور سلیس ہوں جسکے معنی صاف ہوں اور جس کے مصادر خالص ہوں اور جسکی موسیقی کانوں کو بھلی لگے۔ اور انکی بلاغت کی یہ کیفیت تھی کہ الفاظ اپنے محاورہ کی جانب اور معنی اپنے مطالب کیطرف بے تکلف اور بلا آورد بہتے تھے۔ اور انہوں نے بعید حوالہ جات سے مدد نہیں لی بس صرف کتب حدیث پر بہت زیادہ نظر ڈالی اور خود کو اس میں گم کر دیا اور تحقیق میں بہت شدت اختیار کی اور اسکے ساتھ ہی کتب سیر، ایام عرب، حکمرانوں کے واقعات، اور ادبیات پر بھی توجہ دی کیونکہ یہ تمام چیزیں کسی شخص کو قدیم عربوں کی زبان کے حصول اور انکے موارد کلام اور لسانی اصولوں کی جانب ہدایت کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں اور کیوں نہ ہو جبکہ وہ خود حجاز میں دو سال مقیم رہے اور عربوں سے مزاحم ہوئے اور اہل بادیہ سے انکا کلام سنا جو اس زمانہ میں ہمارے آج کے دور کے مقابلہ میں بہتر حالت میں تھے اور گفتگو اور بات چیت میں زیادہ خالص تھے جب ان شہروں میں غیر عرب لوگوں کی کثرت نہیں ہوئی تھی۔ اور شیخ نے اسطرح عربیت کے اوصاف سے خود کو روشن کر لیا جیسا کہ آپ نے اپنی کتاب 'الوصیۃ' میں اپنے بیٹوں کو عرب زبان اور اسکے محسنات اور خوبیوں میں ملکہ حاصل کرنے کی وصیت فرمائی اور کہا کہ عربی زبان ان قابل فخر چیزوں میں سے ایک ہے جو انکو سرکار دو عالمؐ کا تقرب حاصل کرنے اور انکی رسی کو تھامنے میں مددگار ثابت ہوگی۔)

د۔ فکر یا معانی:

اس فن میں اپنی تصنیفات میں شاہ صاحب کا قلم اپنے پورے جوہر دکھاتا ہے۔ انکی تحریروں میں سلاست، زور بیان اور حسن انشاء کے ایسے نمونے ملتے ہیں جن تک انکے دور میں ہی نہیں بلکہ ماضی میں بھی کم ہی لوگوں کو

رسائی حاصل ہوسکی ہے۔

شاہ صاحب کی تاریخ پر گہری نظر، حقیقت تک پہونچنے کی صلاحیت اور صورتحال کے صحیح تجزیہ کے بعد درست نتائج اخذ کرنے کی خداداد قابلیت کا اندازہ انکے پیش کردہ ادب سے بخوبی ہوتا ہے۔

آپکے ایک ہم عصر لکھتے ہیں:

''حضرت شاہ ولی اللہ محدث رحمۃ اللہ علیہ طریقہ جدیدہ بیان نمودہ اند و در تحقیق اسرار معرفت و غوامص علوم طرز خاص دارند، بایں ہمہ علوم و کمالات از علمائے ربانی اند مثل ایشاں در محققان صوفیہ کہ جامع اند در علم ظاہر و باطن و علم نو بیاں کردہ اند چند کس گذشتہ باشند''[1]

سرزمین حجاز میں جس نئے علم کی انکو جستجو تھی وہ یہی علم معانی تھا۔ علوم قرآن، علوم حدیث، علوم اسرار شریعت کی سمجھ حاصل کرنے کے ساتھ ہی انکا اظہار و تعبیر اور اس کے ذریعہ اصلاح و تجدید آپکا خاص مطمح نظر تھا جس کا اشارہ قلم حسین کی عطا کے مبشرہ کی شکل میں انکو مل چکا تھا۔

اگر علوم کے حصول کا مقصد صرف الفاظ اور مطالب کے حصول تک محدود ہو تو وہ سطحی اور جامد ہوتا ہے مگر جب کوئی عالم الفاظ کے دائرہ سے بلند ہو کر معانی کے سراغ کی تلاش میں منہمک ہو جائے تو اسکا مرتبہ اور زیادہ بلند ہو جاتا ہے۔ علم معانی اسرار و رموز پر مبنی ہوتا ہے اور شاہ صاحب اسی علم کے طالب تھے۔ مدینہ منورہ اور مکہ معظّمہ کی تمام مجلسوں میں اپنے اساتذہ خصوصاً شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم الکردی اور شیخ تاج الدین قلعی جیسے یکتائے روزگار اور عظیم علمائے وقت کی صحبت میں آپنے جو علم حاصل کیا وہ سطحی علم نہیں تھا۔ شاہ صاحب کا مقصد ہر مجلس میں حدیث و قرآن اور فقہ و شریعت کے رموز و حقائق سے واقفیت حاصل کرنی تھی جسکی آپکو اپنی آئندہ تصنیفی و تحقیقی زندگی میں اشد ضرورت تھی۔ اس سے زیادہ فائدہ آپکو حرمین شریفین کے کتب خانوں سے ہوا کیونکہ ان میں متقدمین کے وہ نوادرات اور کتابوں کے خزانے دستیاب تھے جو ہندوستان میں ناپید تھے۔

حجاز جانے سے قبل شاہ صاحب کی کسی اہم تصنیف کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ یہاں تک کہ آپکے فارسی ترجمۂ قرآن فتح الرحمٰن کی تکمیل بھی آپکی مکہ معظّمہ سے واپسی کے بعد ہی ہوئی۔ چنانچہ دو سال قیام حجاز کے بعد شاہ صاحب ایک نئی شخصیت کے روپ میں نئے جوش اور حوصلہ کے ساتھ قرآن و حدیث کے شارح، مفسر، مجدد اور مصلح کی حیثیت میں لوگوں کے سامنے آئے۔ ۱۱۴۵ھ میں حجاز سے واپسی کے بعد سے ۱۱۷۶ھ تک تقریباً اکتیس

---

[1] کلمات طیبات، صفحہ ۱۱۵۔

سال میں شاہ صاحب نے علمی دنیا کو وہ انمول تحفے دیئے جو انکو زندہ جاوید کر گئے۔

نزھۃ الخواطر کے مصنف مولانا عبدالحئی الحسنی نے شاہ صاحب کے علوم اور تصانیف کا تذکرہ کیا ہے۔ جنھیں انھوں نے تاریخ ہند میں ایک نئے فن سے تعبیر کیا ہے۔ مولانا الحسنی کے قول کے مطابق:

"انه خصه بعلوم لم يشرك معه فيها غيره والى اشرك فيها معه غيره من سائر الائمة كثيرة لا يحصيها البيان. منها ما اكرمه الله تعالىٰ به من الفصاحة فى اللغة العربية والربط الخاص بالفنون الادبية فى النظم والنثر كا نما الاعجاز او السحر من رقة اللفظ و معناه وصفاء المورد ومعناه.....[1]

شاہ ولی اللہ کو عربی زبان میں بلاغت وفصاحت کا ملکہ حاصل تھا۔ نظم ونثر میں معنی کی ترتیب میں انہیں عجیب وغریب قدرت حاصل تھی۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نثری ادب

شاہ صاحب کی سب سے معرکۃ الآرا کتاب **حجة الله البالغة** ہے جس میں دین ونظامِ شریعت کا ایک جامع، واضح اور مدلل خاکہ پیش کیا گیا ہے اور اس کے اسرار ومعارف کو نہایت متاثر کن، بلیغ اور مربوط طریقہ پر بیان کیا ہے۔ آپکی عربی نثر کا جائزہ لینے کے لئے یہ تصنیف ہر لحاظ سے ایک موزوں نمونہ کے طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔

حجۃ اللہ البالغۃ میں شاہ صاحب نے اسرار شریعت کے جس موضوع کا انتخاب کیا وہی عالم صحیح طور پر اس سے انصاف کرسکتا ہے جو دین وشریعت کے علوم سے کماحقہ آگاہ ہو اور جس کے قلب وروح میں ایمان احتساب اور روحانیت پیوست ہوگئی ہو۔ جسکی جسمانی، ذہنی وعلمی نشو ونما اور تربیت اسی ایمانی اور روحانی، ماحول میں ہوئی ہو۔ چنانچہ اس نازک موضوع پر قلم اٹھانے کے لئے شاید وہ موزوں ترین شخص تھے۔

حجۃ اللہ البالغۃ اور عربی ادب میں اسکا مقام:

جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے کہ کسی ادبی تخلیق کے لئے سب سے پہلے ضروری ہے کہ صاحب قلم کا عاطفہ بلند اور ترقی یافتہ ہو۔ یعنی اسکے احساس کی دنیا میں طوفان برپا ہو۔ شاہ صاحب کی زندگی اور تربیت وتعلیمی حالات کی

[1] نزہۃ الخواطر، مصنفہ عبدالحئی الحسنی، صفحہ ۴۰۱۔

روشنی میں ہم اس بات کا بخوبی تصور کر سکتے ہیں کہ آپ نہایت حساس تھے اور آپکا عاطفہ انتہائی اعلیٰ خصوصیات کا حامل تھا۔ جو ہیجانِ عاطفہ حجة الله البالغة کی تخلیق کا باعث ہوا اسکا ذکر آپنے ان الفاظ میں کیا ہے:

"انا جالس ذات یوم بعد صلوٰة العصر متوجها الیٰ الله اذظهرت روح النبی صلی الله علیه وسلم و عشیتنی من فوقی بشئیٍ خیل الی انه ثوب القی علی ونفث فی روعی فی تلک الحالة انه اشارة الیٰ نوع بیان للدین و وجدت عند ذٰلک فی صدری نوراً لم یزل ینفسح کل حینٍ.....لما احدث نفسی ان ادون فی رسالة تکون تبصرة للمبتدی و تذکرةً للمنتهی یستوی فیه الحاضر والباد و یتعاوره المجلس و الناد".....[1]

(میں ایک روز بعد عصر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر بیٹھا ہوا تھا کہ روح نبی صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر ہوئی اور مجھ کو ایک شے سے ڈھانک دیا جیسے کوئی کپڑا ہو جو مجھ پر ڈالدیا گیا ہو اور اسی حالت میں میرے قلب میں کچھ پھونکا گویا کہ دین کے اسرار کے بیان کی طرف اشارہ ہوا اور تب میں نے اپنے سینہ میں ایک نور پایا جو ہر آن بڑھتا اور پھیلتا جاتا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تب میرے دل میں آیا کہ میں ایک ایسا رسالہ تدوین کروں جو مبتدی کیلئے مطالعہ اور منتہی کیلئے یاد رکھنے والی چیز ہو جسمیں شہری اور دیہاتی سبھی شامل ہوں۔

اسکے بعد آپنے مکہ معظّمہ میں اپنے خواب میں قلم حسین کا ذکر کیا ہے جسکی تفصیل سابقہ ابواب میں آ چکی ہے۔ چنانچہ کافی پس وپیش کے بعد آپنے اس کتاب کی تصنیف شروع کی۔

شاہ صاحب کو موضوع کی اہمیت کے لحاظ سے اپنی علمی اہلیت اور قابلیت کے ساتھ ہی اپنی کوتاہیوں اور حدود کا بخوبی احساس تھا جس موضوع پر انہوں نے قلم اٹھایا وہ اتنا حساس اور نازک تھا کہ قلم کی ذرا سی لغزش مصنف کے لئے بیحد مہلک ثابت ہو سکتی تھی۔ اسی لیے آپ نے نہایت غور وفکر اور لیت ولعل کے بعد اس پر اپنا قلم اٹھایا اور نہایت احتیاط اور باریک بینی سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ یہ ایسا موضوع ہے جسکے لئے وسیع مطالعہ کے ساتھ ہی ایک مخصوص ذوق کی بھی ضرورت تھی۔ یہ دونوں خصوصیات ان میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اسلئے انہوں نے موضوع کے ساتھ کما حقہ انصاف سے کام لیا جسکے نتیجہ میں حجة الله البالغه جیسی تصنیف وجود میں

---

[1] حجۃ اللہ البالغۃ۔ صفحہ ۵

آئی جس کی مثال مشکل سے ہی مل سکتی ہے۔

علم اسرار دین جیسے انتہائی ادق موضوع پر بہت کم لوگوں نے قلم اٹھایا ہے۔ چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

"وان ادق الفنون الحديثية با سرها عندى وا عمقها محتدى (۱) وارفعها منا راً واولىٰ العلوم الشرعية عن آخرهافيما ارىٰ و اعلاها منزلة و اعظمها مقدارً هو علم اسرارالدين الباحث عن حكم الاحكام ولمياتها و اسرار خواص الاعمال و نكاتها فهووالله احق العلوم بان يصرف فيه من اطاقة نفائس الاوقات و يتخذ عدة لمعادهٖ بعد مافرض عليه من الطاعات. اذبهٖ يصير الانسان على بصيرة فيما جاء به الشرع و تكون نسبة بتلك الاخبار كنسبة صاحب العروض بدواوين الا شعار اوصاحب المنطق ببراهين الحكماء اوصاحب النحو بكلام العرب العرباء او صاحب اصول الفقه بتفاريع الفقها و به يامن من ان يكون كحاطب اليل او كغائص سيل او يخبط خبط عشواء (۲) اويركب متن عمياء.....لكن قلَّ من صنف فيه اوفاض فى تائسيس مبانيه اور تب منه الاصول والفروع واتىٰ بما يسمن او يغنى من جوع. وحق له ذٰلك و من المثل السائر فى الورىٰ ومن الرديف و قدركبت غضنفراولا تبيّن اسراره الالمن تمكن فى العلوم الشرعية باسرها و استبد (۳) فى فنون الاهية عن آخرها و لايصفوا مشربه' الالمن شرح الله صدره' لعلم لدنى و ملاء قلبه' بسروهبيّ و كان مع ذٰلك وقاد الطبيعة سيال القريحه حاذقاًفى التقريروالتحرير بارعاً فى التوجيه و التجسير (۴) قد عرف كيف يوصل الاصول و يبنى عليه الفروع و كيف يمهد القواعد و ياتى لها بشواهد المعقول و المسموع وان من اعظم نعم الله علىَّ ان اتانى منه حظاً و جعل لى منه نصيبا

---

(۱) ای اصلاً

(۲) الناقة التی لاتبصر امامها والمعنی رکبها علی غیر بصیرة ای یتصرف فی الامور علی غیر بصیرة۔ المنجد، صفحہ ۵۳۰۔

(۳) ای تفرد

(۴) ای التزین

و ما انفک اعترف بتقصیری و ابوء وما ابری نفسی ان النفس لامارة بالسوء"[1]

(اور میرے نزدیک فنون حدیث میں حصول میں مشکل ترین (دقیق) عمیق ترین، بلند ترین اور علوم شرعیہ میں بہترین علم جسکی منازل بہت ارفع واعلیٰ ہیں اور جسکی وسعت بیحد عظیم ہے، علم اسرار دین ہے جسمیں احکامات اور انکے لمیات (وجوہ) اور اعمال کی خصوصیات اور انکے راز اور باریکیاں بیان کی جاتی ہیں۔ واللہ یہی تمام علوم میں بھی سب سے زیادہ سچا علم ہے کہ اسمیں فرض عبادات کے بعد اپنے بہترین اوقات کو صرف کیا جائے اور اسے قیامت کے لئے ذخیرہ حسنات بنایا جائے۔ اسکے ذریعہ انسان شرع میں آئے ہوئے احکامات کی بصیرت حاصل کرتا ہے اور ان احکامات اور اخبارات سے اسکی نسبت ایسی ہو جاتی ہے جیسے کہ صاحب عروض (ماہر فن شعر) کو دیوان اشعار سے، منطقی کو حکماء کے واضح اقوال و براہین سے، نحوی کو قدیم عرب (عرب العرباء) کے کلاسیکی ادب سے اور فقیہ کو استنباط و تخریج مسائل فقہا سے ہوتی ہے اور اسکے ذریعہ لوگ ایسی اندھی چال سے محفوظ رہتے ہیں جیسی کہ رات میں لکڑیاں جمع کرنے والا (محاورتاً گفتگو یا تحریر میں ہر قسم کی رطب و یابس اکٹھی کرنے والا فیروز اللغات۔۱۲۴) یا تیز بہاؤ میں غوطہ مارنے والا (کہ اسمیں موتی وغیرہ کچھ حاصل نہیں ہوتے)، یا اندھی اونٹنی کی چال چلنے والا (جس میں کوئی سمت یا منزل نہ ہو) یا طوفان میں ڈگمگاتے جہاز میں سوار کی جو حالت ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔لیکن ایسے لوگ کم یاب ہیں جنہوں نے اس فن میں قلم اٹھایا ہو یا اسکے مبانی اور اصول قائم کرنے میں غور و خوض کیا ہو یا ان مبانی سے اصول و فروع مرتب کئے ہوں یا ایسی چیزیں لایا جن سے کسی کی (علم کی) بھوک اور پیاس مٹے اور یہ اس فن کا حق ہے۔ مثل مشہور ہے کہ اگر تو شیر کی سواری کرے تو تیرا ردیف کون ہوگا۔ ایسا کیونکر ہوگا اس لئے کہ اس کے اسرار کو وہی بیان کر سکتا ہے جسکو علوم شرعیہ پر پوری پوری دسترس اور قدرت حاصل ہو اور جو فنون الاہیہ (دینیات) پر پوری طرح حاوی اور مقتدر ہو اور اسکا خواہش نفس اور میلان طبع کبھی صاف نہیں ہو سکتا جبتک اللہ تعالیٰ اسکے سینہ کو علم لدنی کے لئے نہ کھول دے اور اسکے قلب کو سر وہبی (عطا کردہ راز) سے نہ بھر دے اور ساتھ ہی ساتھ وہ تیز طبع، رواں ذہن، تقریر و تحریر میں ماہر، توجہ اور تزئین کلام میں فائق ہو اور جانتا ہو کہ

---

[1] حجۃ اللہ البالغۃ، صفحہ ۳ و ۴

اصول کو کسطرح مرتب کیا جاتا ہے اور اس پر فروع کو کس طرح تعمیر کیا جاتا ہے، کس طرح قواعد کو مقرر کیا جاتا ہے اور ان پر کسطرح عقلی و نقلی دلائل و شواہد کو لایا جاتا ہے۔ اور مجھ پر اللہ تعالیٰ کی عظیم ترین نعمت یہ ہے کہ اسنے مجھکو ان باتوں میں حظ وافر عطا فرمایا ہے اور اس فن میں میرا حصہ مقرر و مقدر کیا ہے اور میں اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کا بخوبی احساس رکھتا ہوں اور ان پر شرمندہ ہوں۔ اپنے نفس کو برائیوں سے مبرا قرار نہیں دیتا کیونکہ نفس تو برائی کیطرف جھکتا ہی ہے۔")

موضوع کی سنجیدگی کے پیش نظر اپنی کوتاہیوں اور کمیوں کا احساس کرتے ہوئے آپ لکھتے ہیں:

"انی سکیت نادی البیان ضالع حلبة (۱) الرهان (۲) و انی متعرق مرماة و انه لایتاتی منی الا معان فی تصفح الاوراق شغل قلبی بما لیس له فواق ولاتیسر لی التناهی فی حفظ المسموعات لا تشدق بهاعند جاء وات و انماانا المتفرد بنفسه المتجمع لرمسه الذی هوابن وقته وتلمیذ بخته و اسیروارده و مغتنم (۳) باردة"[۱]

(بندہ خاموش پسند کم گو گھوڑ دوڑ میں ٹھٹکنے والا گھوڑا ہے اور میں ہڈی چوسنے والا بے حال شخص ہوں اور اپنے دل کے اشغال میں جنکی کوئی حد، گنجائش نہیں ہے۔ ایسا گھرا ہوں کہ عرق ریزی اور تعمق سے مطالعہ اور کتابوں کی ورق گردانی آسان نہیں اور مجھے مسموعات (منقولہ احادیث) کے یاد رکھنے میں بھی دسترس نہیں اور میں اسکو بیان کرنے کے لئے ہر آنے جانے والے کے سامنے زبان بھی نہیں کھول سکتا۔ اور بیشک میں خود میں ایک علیحدگی پسند شخص ہوں جو اپنے کو چھپانے میں مطمئن ہے جو ابن وقت (یعنی وقت و موقع کی تلاش میں رہنے والا) ہے۔ اپنی قسمت پر شاکر اسکے آنے کا پابند اور بے محنت اسکے حصول کا منتظر ہے۔")

مندرجہ بالا اقتباس میں اپنے لئے جس کسر نفسی کا اظہار کیا گیا ہے، جو الفاظ اسکو بیان کرنے کے لئے استعمال کئے گے ہیں اور جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے وہ نادر ہے۔ پڑھنے والے کے ذہن میں لکھنے والے کی

(۱) حلبۃ: دوڑ کے گھوڑے

(۲) رہان: گھوڑ دوڑ

(۳) غنیمۃ: بغیر جنگ یا محنت کئے ہوئے حاصل شدہ مال غنیمت۔

[۱] حجۃ، صفحہ ۶، جلد اول

بیچارگی اور بے مائیگی کا تو احساس ہوتا ہی ہے لیکن ساتھ ہی جو طرز تحریر اور جو با محاورہ لغات استعمال کی گئی ہیں ان سے یہ بھی اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ لکھنے والا اپنے علم میں ماہر اور انداز بیان پر قادر ہے۔ اپنی کم علمی، کم لیاقتی اور جھجک کو ظاہر کرنے کے لئے شاہ صاحب نے متعرق مرماۃ اور ضالع حلبه الرهان، غنيمة باردة جیسے الفاظ استعمال کئے ہیں جنکے معنی تو المنجد اور لغت میں مل جاتے ہیں مگر اسکا مفہوم سمجھنے کے لئے خاصا غور وخوض کرنا پڑتا ہے۔

دوسری جگہ اپنے ماحول اور زمانہ کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"ثم يعوقني انی لا اجد عندی ولدی ولا اریٰ خلفی و بين يدیّ من اراجعه فی المشتبها من العلماء المصنفين الثقات و يثبطنی قصور باعی فی العلوم المنقوله مما كان عليه القرون المقبوله و يفشلنیٰ انی فی زمان الجهل و العصبية و ابتاع الهویٰ و اعجاب كل امری بارٰاہٖ الرديه. وان المعاصره اصل المنا فرة. وان من صنف قد استهدف (فبنيا) انا فی ذالک اقدم رجلا واؤخر اخریٰ واجری شوطاثم ارجع قهقریٰ.....[1]

(پھر جو بات مجھے (تصنیف سے) روک رہی ہے وہ یہ ہے کہ میں اپنے پاس نہ اپنے بیٹے کو پاتا ہوں اور نہ آگے پیچھے کوئی ایسا شخص نظر آتا ہے جس سے میں علماء وثقہ مصنفین کی تصنیفوں کے شبہات کے بارے میں رجوع کرسکوں اور یہ بات مجھے اس سے باز رکھتی ہے کہ میں علوم منقولہ (یعنی قرآن وحدیث) جو قرون مقبولہ (یعنی عہد نبیؐ وعہد صحابہؓ وتابعین) میں مروج تھے ان کے حصول اور ان تک دسترس سے عاجز ہوں (قصور الباع: عاجز معذور) اور یہ بات بھی مجھ کو پست ہمت کرتی ہے کہ میں زمانہ جہل، زمانہ عصبیت اور زمانہ اتباع خواہشات نفسانیہ میں ہوں جہاں ہر کس وناکس اپنی ناکارہ رائے پر غرور کرتا ہے اور معاصرہ منافقت کی اصل جڑ ہوتا ہے (محاورہ) اور جسنے تصنیف میں قدم اٹھایا وہ نشانہ ملامت بنا (ضرب المثل) چنانچہ میں اسی تذبذب میں تھا کہ ایک قدم آگے ایک پیچھے رکھتا اور چکرا کر پھر اسی جگہ پلٹ آتا۔۔۔۔۔۔)

مندرجہ بالا اقتباسات پر نظر ڈالنے سے یہ بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ شاہ صاحب کی عربی نثر جسکا نمونہ ان

---

[1] حجۃ، صفحہ ۵۔

اوراسکی وجہ بیان کرتے ہوئے آگے لکھتے ہیں:

"وانما کان بوجهین احد هما ان الله تعالیٰ جعل فی قلبی وقتاً من الا و قات میزاناً اعرف به سبب کل اختلاف وقع فی الملة المحمدیة علیٰ صاحبها الصلوٰة والسلام و مکننی من ان اثبت ذٰلک بد لائل العقلیة بحیث لا یبقی فیه شبهة ولااشکال".....[1]

چنانچہ ان مباحث پر جوابواب آخر کتاب میں ہیں انکو بعد میں آپ نے ایک الگ کتاب کی شکل میں ترتیب دیا جسکا نام "الانصاف فی بیان سبب الاختلاف" رکھا۔اس کتاب میں آپ نے اس موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔اس کے بارے میں آگے لکھتے ہیں:

"وابین فیه (فی الکتاب الانصاف فی بیان سبب ا لاختلاف) هذه المطالب بیاناً شافیاً و اکثرفیه من ذکر الشواهد والا مثال و التفریعات مع المحافظ علیٰ الاقتصاد بین الا فراط و التفریط فی کل مقام والا حاطة بجوانب الکلام و اصول المقصود و المرام".....[2]

اس بیان سے آپکے اسلوب بیان اور طرز تحریر پر روشنی پڑتی ہے جو ہر جگہ مربوط' مرتب' بیان میں واضح' دلائل وشواہد میں مضبوط اور افراط وتفریط میں معتدل اور موزوں اور غایت تصنیف کے اطراف وجوانب کا پوری طرح احاطہ کئے ہوئے ہے۔

اقتباسات بالا میں شاہ صاحب نے تحریر کو پر اثر بنانے کے لئے مترادفات کا بھی استعمال کیا ہے مثلاً اعمقها محتدی' ارفعها مناراً'.....و اعلا ها منزله و اعظمها مقدار ۔ان تمام مترادفات سے آپنے اپنی اس بات کو پر زور اور پر اثر انداز میں بیان کیا ہے کہ فنون حدیث میں فن اسرار دین کی بہت بڑی حیثیت اور اہمیت ہے۔اسی طرح اس فن کے ماہر کی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے آپ نے جو مثالیں دی ہیں وہ بھی مترادفات کے ذریعہ اپنی بات میں زور پیدا کرنے کا ایک نمونہ ہے۔

وتکون نسبة بتلک الاخبار کنسبة صاحب العروض بدواوین الاشعار' او

---

[1] حجۃ، صفحہ ۳۲۱، جلد اول

[2] ایضاً

صاحب المنطق ببراهين الحكماء و صاحب النحو بكلام العرب العرباء او صاحب اصول الفقه بتفاريع الفقها.

تمام کتاب میں جابجا اسی طرح مترادفات ملتے ہیں۔

اطناب اور اسکے لئے پیچیدہ جملوں اور اضافتوں کے استعمال کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل اقتباس ایک اچھی مثال ہے جسمیں ایک جملہ اسمیہ خبریہ میں مبتدا اور خبر کے درمیان جو عبارت ہے اور جسکے اختتام پر جملہ کا مفہوم پورا ہوتا ہے وہ تقریباً ایک صفحہ یا اس سے کچھ زیادہ پر پھیلی ہوئی ہے۔ مقدمہ کتاب میں شاہ صاحب نے یہ بات کہنی چاہی ہے کہ لوگوں کا یہ گمان کہ شرعی احکام مصلحتوں پر مبنی نہیں بلکہ محض بندہ کے تابع فرمان ہونے یا نہ ہونے کے آزمانے کے لئے ہیں، بروئے احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم واجماع امت غلط ہے۔ اس بات کی وضاحت کے لئے آپنے جو کلام استعمال کیا ہے وہ ایک لمبے جملہ کے ذریعہ ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

"ومن عجز ان يعرف ان اعمال معتبرة بالنيات و الهيات النفسانية التى صدرت منها كما قال النبى صلى الله عليه وسلم انما الا عمال بالنيات و قال الله تعالىٰ..... و ان الصلوٰة شرعت لذكر الله..... وان الزكوٰة..... و ان الحج....."[1]

اور اسکے بعد ایک طویل تحریر کو اس جملہ سے 'وقال' 'كما قال' 'وان' اور 'و' سے منسلک کرتے ہوئے قرآن مجید کی آیات، احادیث واقوال نبوی اور عقائد واعمال دینی کے حوالہ دیتے ہوئے اسطرح اسکو پورا کیا ہے:

"فانه لم يمسه من العلم الا كما مس الا برة من الماء حين تغمس فى البحر وتخرج".....[2]

(اور جو یہ پہچاننے سے عاجز ہے کہ اعمال کا اعتبار نیتوں اور نفسانیت کی اشکال وہیات پر ہے جو ان اعمال کی بناء پر وجود میں آتی ہیں جیسا کہ حضورؐ نے فرمایا الاعمال بالنیات اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔۔۔۔ اور یہ کہ نماز کو ذکر اللہ کے لئے مشروع کیا گیا ہے۔۔۔۔۔۔ اور زکوٰۃ کو۔۔۔۔۔ اور حج۔۔۔۔۔، تو اسکو علم نے اتنا بھی نہیں چھوا جتنا کہ اس سوئی کو پانی نے چھوا ہو جسکو سمندر میں ڈبو کر نکال لیا جائے)

---

[1] حجۃ، صفحہ ۶ تا ۸

[2] حجۃ، صفحہ ۸

اس جملہ میں ومن عجز مبتدا ہے جسکو 'ان' کے بعد مختلف اضافتوں کے ذریعہ جملوں، کلموں سے جوڑ کر اسمیں اطناب کرتے ہوئے اسکو ایک بڑے جملہ کی شکل دیکر اسکی خبر فانہ لم یمسہ۔۔۔۔۔ الخ سے مکمل کیا گیا ہے۔ ایسے کم علم اور کم فہم شخص کی اس کوتاہی کو اس تری سے مشابہت دی ہے جو سوئی کو سمندر میں ڈبو کر نکالنے پر اسمیں پانی لگ جانے سے اس پر باقی رہتی ہے۔ ظاہر ہے سوئی پر پانی باقی نہیں رہ سکتا اور کتنے ہی زیادہ پانی سے اسکو مس کیا جائے اس پر پانی کی مقدار انتہائی قلیل ہوگی۔ اس مثال سے اس شخص کی کم علمی بخوبی واضح ہو جاتی ہے اور یہی حسن بیان ہے۔

اس قسم کے اطناب کی مثالیں جگہ جگہ نفس مضمون میں بھی ملتی ہیں:

(۱) "وکان الاوائل لصفاء عقائد هم ببركة صحبة النبی صلی الله علیه وسلم و قرب عهده و قلة و قوع الا ختلاف فیهم و اطمینان قلوبهم بترک التفتیش عماثبت عنه صلی الله علیه وسلم وعدم التفا تهم الیٰ تطبیق المعقول بالمنقول و تمکنهم من مراجعة الثقات فی کثیر من العلوم الغامضة مستغنین عن تدوین هذاالفن"....[۱]

اس جملہ میں کان الاوائل (عہد اول کے لوگ) جو مبتدا ہے اسکی خبر مستغنین عن تدوین هذا الفن (اس فن اسرار شریعت سے مستغنی تھے) ہے جو مبتدا سے 'و' اور 'ب' کے ذریعہ ملایا گیا ہے۔

(۲) "اماقوله تعالیٰ حرمت علیکم المیتة ای کلها' و حرمت علیکم امها تکم ای نکاحهن و قولهٗ العین حق ای تاثیر ها ثابت' والرسول حق ای مبعوث حقاً' وقولهٗ رفع عن امتی الخطاء و النسیان ای اثم ما وقعافیه' و قولهٗ لا صلوٰة الا بطهور' لا نکاح الابولی' انما الاعمال بالنیات ای لایترتب علیٰ هٰذه الاء اثار ها التی جعلها الشارع لها، اذا قمتم الیٰ الصلوٰة فاغسلوا ای ان لم تکونوا علیٰ الوضوء فظاهرلیس بمؤ ولٍ".....[۲]

اس جملہ میں لفظ قولہ مبتدا ہے اور اس کے بعد کے تمام جملے مبتدا پر معطوف ہو کر مبتدا کی وضاحت میں

---

[۱] حجۃ، صفحہ ۲۷۲، باب ۸۱

[۲] ایضاً

آئے ہیں اوراس طویل مبتدا کی فظاھرٌ لیس بمؤ ولٍ خبر ہے۔اس جملہ میں قرآن مجیداوراحادیث سے اقتباسات دیتے ہوئے ظاہری الفاظ اورتاویلات کا فرق بیان کیا گیا ہے۔

اسی طرح حروف عطف' حروف شرط وغیرہ کے استعمال سے جملہ کے مختلف اجزاء کو وصل دیکر اپنے مافی الضمیر کو واضح کرنے کے واسطے تحریر میں اطناب پیدا کرنے کی بھی مثالیں ہمیں آپکی تحریر میں جگہ جگہ ملتی ہیں۔مثلاً باب۸۱'کیفیة فهم المعانی الشرعیة من الکتاب والسنة' کے ابتدا میں آپ لکھتے ہیں:

"واعلم انا الصیغة الدالة علیٰ الرضاءِ والسخط هی الحب و البغض والرحمة و اللعنة و القرب و البعد و نسبة الفعل الیٰ المرضیین او المسخوطین کالمومنین و المنافقین و الملائکة والشیاطین و اهل الجنة و النار و الطلب و المنع و بیان الجزاء المترتب علیٰ الفعل و التشبیه بمحمود فی العرف اومذموم و اهتمام النبی صلی الله علیه وسلم بفعله او اجتنابه عنه مع حضور دواعیه"...[1]

کتاب کا جوادبی پہلو ہے وہ بالکل ابتداء میں مقدمہ الکتاب سے ہی نظر آتا ہے۔جس میں محاوروں اور ضرب الامثال کا استعمال،مترادفات کے ذریعہ تحریر کو پرزور بنانا' تشبیہ اوراستعارہ سے بیان کو قوت دینا' سادگی اورسلاست کے ساتھ مدلل انداز میں اپنی بات کہنا اورایسی زبان استعمال کرنا جونہ تو بالکل عامیانہ ہواورنہ ہی اتنی مشکل کہ قاری کی سمجھ سے بالاتر ہو۔ایسے الفاظ اورتراکیب کا استعمال جوقلب ودماغ پر اثر انداز ہوں۔ان ساری خصوصیات کے ساتھ ساتھ آپکی تحریر میں جگہ جگہ قرآن مجیداوراحادیث مبارکہ کے اقتباسات کے علاوہ ایسے الفاظ سے جوقرآنی آیات سے اخذ کئے گئے ہوں آپکی تحریر کا معیاراورزیادہ بلند ہوتا ہے اورسنجیدہ موضوع کی سنجیدگی میں اوراضافہ ہوتا ہے۔

کسی بات کواپنی اصل پرچھوڑنے کے لئے طواًعلی غرہ (کپڑے کا اپنی پہلی تہہ پرلپیٹنا) محاورتاً آتا ہے۔ان مسئلوں کے لئے جنکے بارے میں کتاب وسنت نے خاموشی اختیار کی اورصحابہ نے بھی کلام نہیں کیا آپنے انکومطوی عن غرہ سے بیان کیا ہے۔۔۔۔۔۔۔[2]

اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں الفاظ استواء' وجه' ید وغیرہ کے معانی کے سلسلے میں طواها قوم علی غرها (لوگوں نے اسکوجوں کا توں چھوڑ دیا) لایا گیا ہے۔اسی طرح تردد کی کیفیت ظاہر کرنے کے لئے

[1] حجة،صفحہ۲۶۸

[2] حجة،صفحہ۱۵۔

اقدمه رجلاً و اخرخرا خریٰ و اجریٰ شوطاً ثم ارجع القهقریٰ کی ترکیب کا استعمال کیا گیا ہے۔اس جملہ میں علم بیان کے لحاظ سے مجاز مرکب کی خصوصیت پائی جاتی ہے اس لئے کہ یہاں دراصل پیر آگے بڑھانے یا پیچھے ہٹانے اور چکر کھا کر واپس لوٹ آنے کے الفاظ اپنے اصلی معنی (معنی موضوع لہٗ) کے بجائے بمعنی تردد (معنی غیر موضوع لہٗ) استعمال ہوئے ہیں جو مجاز مرکب کہلاتا ہے۔

فن اسرار دین کی اہمیت کو ظاہر کرنے کے لئے کل الصید فی جوف الفرا کی کہاوت استعمال کی ہے جسکا مطلب سب سے بڑا شکار یا سب سے زیادہ اہم چیز ہے۔[1] ان علماء کے لئے جن سے تخریج اور استنباط مسائل میں شاہ صاحب نے اختلاف کیا آپ نے ضرب المثل نحن رجال و هم رجال والا مر بيننا و بينهم سجال (ہم بھی انسان ہیں اور وہ بھی انسان اور معاملہ ہمارے اور انکے درمیان ڈول کی طرح ہے کہ کبھی ادھر کبھی ادھر) استعمال کی ہے۔اسی طرح کلام پاک کے الفاظ کا استعمال بھی آپکی تحریر کا خاصہ ہے مثلاً اتیٰ بمایسمن او یغنی من جوع (لایسمن ولا یغنی من جوع. سورة الغاشية) يا احدى الكبر (لا حدیٰ الكبر. سورة المدثر) وانه اشرقت الارض بنور ربها (و اشرقت الارض بنور ربها. سورةالزمر) وما ابری نفسی ان النفس لا مارة بالسوء (سورة يوسف). حسبی الله و نعم الوكيل ولا حول ولا قوة الابالله العلى العظيم. خلق الناس من تراب و خلق الجان من مارج من نار (خلق الانسان من صلصال كالفخار وخلق الجان من مارج من نار. سورة رحمٰن)

ان تمام ادبی خوبیوں کے ساتھ ساتھ آپکے عاطفہ اور احساس کی قوت اور تخیل کی بلند پروازی آپکی تحریر کو انتہائی معیاری اور پر اثر بنا دیتی ہے۔حجتہ اللہ البالغہ شروع سے آخر تک پڑھ جایئے یہ اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ یہ تصنیف اسی پر آشوب و پرفتن دور میں لکھی گئی ہے۔اسکا بڑا سبب تو شاہ صاحب کی مضبوط شخصیت اور شدید قوت ارتکاز، توجہ، لگن اور علم حدیث سے آپکی انتہائی انسیت اور رغبت تھی۔جس کی بنا پر آپ اس تصنیف کے موقعہ پر تمام ماحول کو فراموش کر بیٹھے۔اس کے علاوہ اس تصنیف میں آپکے تخیل کی حد بندی موضوع کی نزاکت نے کر دی تھی کہ آپ اپنے قلم کو کسی طرف بھٹکنے کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

[1] اس کہاوت کی اصل یہ ہے کہ تین شکاریوں نے شکار کرتے ہوئے پہلے نے ایک خرگوش دوسرے نے ہرن اور تیسرے نے گورخر شکار کیا تینوں اپنے اپنے شکار پر خوش ہوئے تو تیسرے نے کہا کہ تمام شکار اس گورخر کے پیٹ میں آجائے گا (کل الصید فی جوف الفرا) یعنی یہ سب سے بڑا شکار ہے جس کے بعد دوسرے شکار کی ضرورت نہیں، یہ کہاوت کسی بہت بڑی چیز کے لئے آتی ہے جو دوسری تمام چیزوں سے مستغنی کردے۔ المنجد. فرائدالادب ص ۱۰۷۳

ستجدنی اذاغلب علیّ شقشقة البیان و امعنت فی تمهید القواعد غایة الامعان ربما اوجب المقام ان اقول بما لم یقل به جمهور المناظرین من اهل الکلام کتجلی الله تعالیٰ فی مواطن المعاد بالصور والاشکال و کاثبات عالم لیس عنصراً یکون فیه تجسدالمعانی والا عمال باشباح مناسبة لهافی الصفة و تخلق فیه الحوادث قبل ان تخلق فی الارض و ارتباط الاعمال هیئات نفسانیه کالشوق والخوف و الرجاء و کون تلک الهیات فی الحقیقة سبباً للمجازاة فی الحیوٰة الدنیا و بعد الممات و القول بالقدر الملزم ونحوذالک"....[1]

(عنقریب تم مجھکو اظہار بیان کرتے ہوئے اور قواعد کی تمہید میں بہت زیادہ غور وفکر کرتا (مشکلات سے دوچار) پاؤ گے تو ایسا مقام بھی آئیگا جب میں وہ کہونگا جو عام جمہور مناظرین اہل کلام نہیں کہتے مثلاً اللہ تعالیٰ کی قیامت اور معاد میں مختلف صورتوں اور شکلوں میں تجلی اور ایسے جہان کی موجودگی جو بلابدن (غیر عنصری) ہے جس میں معانی اور اعمال (جنکی صفتیں ان اعمال ومعانی کے مطابق ہونگی) اجساد کی شکلوں میں ہونگی اور جہاں اس زمین پر پیدا ہونے سے پہلے تمام حادثات و واقعات پیدا کئے جاتے ہیں اور نفسانیت انسانی (مثلاً شوق، خوف، امید وغیرہ) کی مختلف ہیئتیں اور اعمال سے انکا رشتہ اور ان ہیئات کا فی الحقیقت اس دنیاوی زندگی اور مرنے کے بعد سزا وجزا کا سبب ہونا اور ہمہ وقت ساتھ لگی رہنے والی تقدیر کے بارے میں قول وغیرہ۔)

اس کے بعد آپ ان خیالات کے بیان کی حدود بیان کرتے ہیں:

"فاعلم انی لم اجتری علیه الا بعد ان رایت الأیات والا حادیث و اثار الصحابة والتابعین متظاهرة فیه ورایت جماعات من خواص اهل السنة المتمیزین منهم بالعلم الدنی یقولون به و یبنون قواعد هم علیه".....[2]

(پس تم اس بات کو جان لو کہ میں نے ہرگز ان باتوں کے کہنے کی جرات نہیں کی مگر آیات قرانی احادیث رسولؐ اور آثار صحابہ کے مطالعہ کے بعد اور یہ دیکھ کر کہ تابعین ایک دوسرے پر انکو ظاہر کرتے تھے اور میں نے یہ دیکھا کہ اہل سنت کے خواص جو علم لدنی سے متصف اور متمیز ہیں انکے

[1] حجۃ، صفحہ ۱۴، جلد ۱

[2] ایضاً

بارے میں گفتگو کرتے ہیں اور انکے قواعد مرتب کرتے ہیں۔)

اس حد بندی کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ کتاب کی قسم اول میں جہاں آپنے ان باتوں کا بیان کیا ہے وہاں تخیل اور زور بیان کی بہتات ہے اور مشکل ترین خیال بھی آپنے ایسے انداز میں واضح کیا ہے کہ وہ قاری کے ذہن نشین ہو جاتا ہے اور اس بیان میں وہ تمام ادبی خوبیاں اور بلاغت کے عناصر پائے جاتے ہیں جو آپکی تحریر کا خاصہ ہے۔ آپنے ہر قسم کے مسائل پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اور تحریر کے جوہر دکھائے ہیں مادّی، غیر مادّی، طبیعیاتی، مابعد الطبیعیاتی ہر قسم کی اشیاء کا بیان واضح الفاظ اور سادہ اور سلیس اسلوب میں کیا ہے۔

کتاب کی ابتداء مبحث اول تصورات اور قواعد کلیہ سے کی گئی ہے جنکا استعمال آئندہ ابواب میں بطور حقائق کے کیا گیا ہے مثلاً تصورِ ابداعِ خلق، عالم مثال، ملاء اعلیٰ، حقیقت روح وغیرہ۔ اور اسکے بعد ان تصورات کی بنیاد پر نظریات قائم کئے گئے ہیں۔ مثلاً نظریہ سر التکلیف، تکلیف کا تقدیر سے انشقاق (پھوٹنا، جسطرح دانہ سے کونپل)، تکلیف کا جزا و سزا کے لئے باعث وجہ ہونا، ارادۂ انسانی اور انکا اعمال کی وجہ ہونا، اعمال کا ہیاتِ نفسانی سے تعلق اور جزا و سزا کے اسباب اسی باب پر مبحث اول پورا ہوتا ہے۔

مبحث ثانی زندگی اور موت اور مابعد الموت جزا و سزا کے بارے میں ہے۔ اسی مبحث میں حقیقت موت، حقیقت برزخ اور اسرار قیامت کے تصور بھی شامل ہیں۔

تیسرے مبحث میں انسانی سماج کی تشکیل اور آپسی تعلقات، ضروریات اور تدابیر نافعہ (ارتفاقات) جو کل عالم انسانیت کے لئے منفعت بخش ہیں انکا تذکرہ ہے۔ جن میں آدابِ معیشت، آداب فن معاملات، سیاست مدن، سیرت الملوک والاعوان یعنی حکمرانوں اور انکے علائق و مددگاروں کی زندگی اور منافع عام کا بیان ہے۔

مبحث چہارم میں انسان کی سعادت اور شقاوت، سعادت کے حصول کے طریقے، اسمیں آنے والی مشکلات اور رکاوٹوں اور انکو دور کرنے کا بیان ہے۔

مبحث پنجم میں حقیقت برّ و اثم کا بیان ہے اس مبحث کے تحت برّ، اسکی اقسام اسکے ذیل میں آنے والے اعمال، ایمان باللہ، توحید، شرک اور اسکے اقسام، صفات اللہ پر ایمان، ایمان بالقدر، عبادات اور انکے مصالح اور اسرار۔ اسکے بعد اثم، طبقات اثم، مقاصد اثم، معاصی نفس، معاصی عباد اللہ (جن گناہوں کا تعلق لوگوں سے ہوتا ہے) کے بیانات شامل ہیں۔

مبحث سادس سیاسیات ملل اور ادیان عالم کے بارے میں ہے۔ اسمیں ایک آخری دین کی ضرورت،

حقیقت نبوت اور خواص نبوت، دین کی مدت اور شرائع کے اختلاف کی کیفیت اور انکے مطابق مؤاخذہ کے اسباب، اسرار الاحکامات، مذہب میں آسانیاں، ترغیب وترہیب کے اسرار، اسباب اختلاف بین الادیان اور اختلاف فی الدین، زمانۂ جاہلیت سے لے کر اب تک جو اختلاف پیدا ہوئے انکا بیان ہے۔ یہ مبحث کتاب کا ایک اہم جزو ہے۔

مبحث سابع میں حدیث نبویؐ سے احکام شرعی کے مستنبط ہونے کا بیان ہے جو شاہ صاحب کا اصل اور پسندیدہ موضوع ہے۔ اسمیں طبقات کتب الحدیث، معانی شرعیہ کو کتاب وسنت سے اخذ کرنے کی کیفیت شامل ہیں اور اسی پر کتاب کا جزو اول پورا ہوتا ہے۔ اسکے بعد تتمہ کے طور پر اختلاف الصحابہ والتابعین فی الفروع کے نام سے جو ابواب قائم کئے گئے وہ اصل کتاب سے زائد ہیں جنکو بعد میں ایک الگ کتاب کی شکل میں تحریر کیا گیا ہے۔ یہ ابواب گویا کہ تاریخ مذہب اسلام ہیں جسمیں شاہ صاحب نے اول صدی ہجری (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت) سے لے کر آخر تک جو فرقے اور مسالک دین میں پیدا ہوئے اور جو فقہ جات مرتب کئے گئے سب کا مفصل حال تحریر کیا ہے۔ بعد میں آپ نے ان ابواب کو دوبارہ مرتب کر کے ایک علیحدہ تصنیف کی شکل دی۔ اس کتاب کا نام 'الانصاف فی بیان سبب الاختلاف، رکھا۔

القسم الثانی کے عنوان سے جلد اول کے آخری حصہ اور تمام جلد دوم میں احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور احکام دین وشریعت اور اعمال کے اسرار کا بیان ہے۔ یہ حصہ تصنیف علم الکلام کی بہترین مثال ہے اور قسم اول کے اسلوب نگارش سے اسکا اسلوب مختلف ہے جسکی تفصیل آگے بیان کی جائے گی۔

یہ اس عظیم تصنیف کا مختصر جائزہ ہے جسکی بدولت شاہ صاحب کو امام غزالی، ابن خلدون، امام ابن تیمیہ جیسے علماء وفضلاء کی صف میں جگہ دی جاتی ہے اور جسکو علم کلام کی ایک نئی شاخ سے تعبیر کیا جاتا ہے جس پر بقول مولانا شبلی شاہ صاحب پہلے شخص ہیں جنہوں نے قلم اٹھایا ہو۔ لیکن اس جگہ ہم کو ان موضوعات اور خیالات سے اس حد تک تعلق ہے کہ آپکی تحریر کے ادبی پہلو اور اس کتاب کی ادبی خصوصیات کو واضح کر کے پیش کیا جائے ورنہ تو یہ تصنیف ایک بحر ذخار ہے کہ اگر متعدد پہلوؤں سے اسکا جائزہ لیا جائے تب بھی کوئی نہ کوئی پہلو تشنہ رہ جاتا ہے۔

شاہ صاحب کی تصنیفات پر جو خارجی اثرات پڑے انمیں شاہ صاحب کی شخصیت ایک اہم اثر ہے حجۃ کے مطالعہ سے احساس ہوتا ہے کہ آپ کی شخصیت کتنی پہلو دار تھی اور آپکا مطالعہ کتنا وسیع اور عاطفہ کتنا شدید تھا۔ کتاب کا موضوع اسرار شریعت اور قرآن وحدیث کے ارشادات اور آثار صحابہ سے محدود ہونے کے باوجود آپکے

قلم نے علم کے وہ دریا بہائے جنکی گہرائی اور وسعت کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔آپ کی معلومات کی وسعت کا اندازہ اس طرح کیا جاسکتا ہے کہ کہیں آپ ماہر علم طبعیات وکیمیا (physicist & chemist) نظر آتے ہیں تو کہیں ماہر علم نباتیات وحیوانیات (zoologist and botanist) کہیں فطرت انسانی اور جذبات عالیہ وسفلیہ کا بیان کرتے ہوئے ماہر نفسیات (psychologist) دکھائی دیتے ہیں تو کہیں اسرار نکاح کے بارے میں لکھتے ہوئے ماہر ڈاکٹر اور ماہر جنسیات (sexologist) جو انسان کے اس فطری رجحان کو مطابق شرع اور فائدہ مند راہ دکھاتے ہیں۔کہیں آپ ارتفاقات اور تدابیر نافعہ کو بیان کرتے ہوئے ماہر سیاسیات اور ماہر عمرانیات (politician and sociologist) نظر آتے ہیں تو کہیں ماہر اقتصادیات (economist) کہیں آپ صوفی کی حیثیت سے اپنے روحانی کشف اور باطنی تجربات پر تبصرہ کرتے ہیں اور کہیں صاحب اسرار شریعت کی شکل میں اعمال کی روح اور ظاہری عبادات کے مصالح کے راز کھولنے میں مصروف نظر آتے ہیں اور یہ سب اسی مرکزی موضوع کے تحت اور انہیں حدود کے اندر تحریر کیا گیا ہے جنکو آپنے از ابتدا تا انتہا مدنظر رکھا ہے۔اور اسکے ساتھ ساتھ جلد اول کے آخر اور پوری جلد دوم میں آپکا محبوب علم،علمِ حدیث پورے جوہر پر نظر آتا ہے۔

ادبی لحاظ سے یہ آپکے خیال اور فکر ومعانی کی گہرائی اور اسلوب کی روانی، الفاظ وتراکیب کو موضوع کے لحاظ سے منتخب کرنے اور انکو سیاق وسباق کے مطابق استعمال کرنے میں مہارت کا واضح ثبوت اور دلیل ہیں۔اس نظریہ کے ثبوت آپکی تحریر میں جابجا مل سکتے ہیں۔

مثلاً ان مسائل کے بارے میں جنکے سلسلہ میں قرآن اور حدیث خاموش ہیں اور علمائے مابعد نے انمیں اختلافات کئے ہیں اور یا تو جزئیات کا استنباط دلائل نقلیہ سے کیا ہے یا انکو ان اصولوں کا مطابق بتایا ہے جو سنت کے موافق ہیں آپ فرماتے ہیں:

"شئی من مباحث الجواهر والا عراض. فان القول بحدوث العالم یتوقف علی ابطال الهیولیٰ اثبات الجزء الذی لا یتجزء"....[1]

مادی اور غیر مادی اشیاء کی بحث کے سلسلہ میں ماہرین کے اقوال جو عالم (کائنات) کی ناپائداری کے بارے میں ہیں ابطال ہیولیٰ (ابتدائی خام مادہ کی ٹوٹ پھوٹ) اور جزء لا یتجزء (ایسا جزو جسکے مزید اجزاء نہ کئے جاسکیں) کی موجودگی کے اثبات پر منحصر ہیں۔

---

[1] حجۃ، صفحہ ۱۵۔

جزء لا یتجزء کیا ایٹم نہیں جسکی ٹھیک یہی تعریف ماہرین طبیعیات (physicists) نے کی ہے، اور جن سے ملکر عنصر (element) کی تخلیق ہوئی ہے اور اسی سے تمام مادہ کی ابتدائی تخلیق ہوئی اور ابطال ھیولیٰ کا نظریہ سائنسی زبان میں Big Bang Theory کے نام سے جانا جاتا ہے جسمیں کرہ زمین کی پیدائش ابتدائی خام مادہ (ہیولیٰ) کی ٹوٹ پھوٹ (ابطال) سے ہوئی۔

اس مسئلہ میں قرآن و حدیث خاموش ہیں کہ خلقت عالم کا عمل کیا تھا۔ صرف اتنا کہا گیا ہے کہ کن فیکون ۔ چنانچہ شاہ صاحب نے علمائے مابعد کی اس تحقیق کی نفی نہ کرتے ہوئے ابداع وحدوث عالم کے بارے میں ان علماء کی رائے کا اظہار کرنے کے بعد ایک حدیث کا حوالہ دیا ہے:

"قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم کان الله ولم یکن شیئی قبله"[1]

دوسری حدیث میں ہے۔

اوقال رسول الله صلی الله علیه وسلم کان الله ولم یکن معه شئی"[2]

اس حدیث سے حدث عالم ثابت ہوتا ہے۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

"فالارکان اذاتصغرت و امتزجت با وضاع مختلفة کثرة اوقلة حدثت ثنائیات کالبخار و الغبارو الدخان والثریٰ والا رض المثارة والجمرة و السفعة والشعلة و ثلاثیات کا لطین المخمروالطحلب و رباعیات نظائر ماذکرنا و تلک الاشیاء لها خواص مرکبة من خواص اجزائها لیس فیها شیئی غیر ذالک و تسمیٰ بکائنات الجو"[3]

(پس ارکان یعنی elements جب چھوٹے کئے جائیں (یعنی ایٹم کی شکل میں) تو وہ مختلف وضعوں اور شکلوں میں کمی اور بیشی کے ساتھ ملتے ہیں اور ان سے دو دو یعنی ثنائیات (molecules/سالمہ) بنتے ہیں جیسے بھاپ، غبار، دھواں، نرم اوپری مٹی، کاشت کی مٹی،

---

[1] حجۃ، صفحہ ۱۹

[2] ایضاً

[3] حجۃ، صفحہ ۵۷

چنگاری، لپٹ اور شعلہ اور تین تین یعنی ثلاثیات جیسے گوندھی ہوئی مٹی (جسمیں پانی ملا ہوا ہو)' کائی اور چار چار یعنی رباعیات مثل مذکورہ بالا بنتے ہیں۔ اور ان اشیاء کے خواص انکے اجزاء کے خواص کے مرکب ہوتے ہیں اسکے علاوہ کچھ نہیں ہوتا اور انکو (بشکل مجموعی) کائنات الجو کے نام سے پکارا جاتا ہے۔)

مندرجہ بالا اقتباس میں chemical bonding' ایٹم، مالی کیول (سالمہ)، کمپاؤنڈ اور مکسچر (مرکب) کا تصور پایا جاتا ہے۔

حقیقت روح کے بارے میں تذکرہ کرتے ہوئے ایک جگہ شاہ صاحب طبیعیات کا ایک مسئلہ بطور تشبیہ کے پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کما انت اذا مصصت الهواء من القارورة تخلخل الهواء حتیٰ تبلغ الیٰ حدٍ لا تخلخل بعده'. فلا تستیطع المص او تنفقیٔ القارورة" [1]

(گویا کہ جب کانچ کی شیشی میں سے ہوا کو چوسا جائے (کھینچ کر نکالا جائے) تو ہوا باہر نکلتی ہے یہانتک کہ ایک حد کے بعد نہیں نکل سکتی اسوقت اگر اسکو باہر اور کھینچیں تو شیشی پھٹ جائیگی)

جب vaccum پیدا ہو جائے تو وہ قائم نہیں رہ سکتا بلکہ ہر چہار طرف کی ہوا کے دباؤ سے شیشی پھٹ جائیگی۔ علم نباتات botony کے سلسلہ میں شاہ صاحب کا قلم نیرنگیاں دکھاتا ہے:

"فانظر الیٰ الا شجار واوراقها وازهارها وثمرا تها ومافی کل ذٰلک من الکیفیات المبصرة والمذوقة و غیرها فانه جعل لکل نوع اورا قاً بشکل خاصٍ و ازهاراً بلونٍ خاصٍ و ثماراً مختصه بطعوم و بتلک الاموریعرف ان هٰذا الفردمن نوع کذاو کذا وهٰذهٖ کلها تابعة للصورة النوعیة ملتویة معها انما تجیٔ من حیث جاء ت الصورة النوعیة. و قضاء الله تعالیٰ بان تکون هٰذا المادة نخلةً مثلاً مشتبک مع قضائه التفصیلی بان تکون ثمر تها کذاوخواصها کذا" [2]

(پس درختوں، اور انکے پتوں اور انکے پھول وپھلوں کو اور انمیں خوشنمائی اور خوش ذائقہ ہونے

---

[1] حجۃ، صفحہ ۳۲

[2] حجۃ، صفحہ ۳۵، ۳۶، جلد ا

وغیرہ کی کیفیات کو دیکھو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انمیں سے ہر نوع کے لئے خاص شکل کے پتے بنائے ہیں خاص رنگ کے پھول بنائے ہیں اور پھل بنائے ہیں جنکا خاص مزہ ہے اور انہیں امور سے یہ پہچانا جاتا ہے کہ فلاں فلاں نوع کا یہ ایک فرد ہے یہ تمام چیزیں اسی صورت نوعیہ کے تابع ہیں جسکے ساتھ وہ لپٹی ہوئی ہیں۔ اور اسی طرح آتی ہیں جسطرح وہ صورت نوعیہ آتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے کہ فلاں مادہ مثلاً خرمہ بنے گا تو یہ تفصیلی حکم بھی کہ اسکے پھل ایسے ہونگے اور انکے خواص ایسے ہونگے اسی حکم کے ساتھ شامل ہوتا ہے۔)

اور آگے فرماتے ہیں:

"تخاطیط الا زھار وطعوم الثمرات فی تشابکھا مع الصورۃ النوعیۃ"

(پھولوں کے خطوط اور پھلوں کے ذائقے صورت نوعیہ سے متعلق ہوتے ہیں)

اسکے بعد حیوانات کا ذکر کرتے ہوئے علم حیوانیات zoology پر اپنی قدرت کا اسطرح اظہار کرتے ہیں:

"انظر الی اصناف الحیوان تجد لکل نوع شکلاً و خلقۃ کما تجد فی الاشجار و تجد مع ذالک لھا حرکات اختیاریۃ والھامات طبیعیۃ و تدبیرات جبلیۃ یمتاز کل نوع بھا. فبھیمۃ الا نعام ترعیٰ الحشیش و تجترو الفرس و الحمار والبغل ترعیٰ ولاتجترو السباع تاکل اللحم والطیر یطیر فی الھواء و السمک یسبح فی الماء. ولکل نوع من الحیوان صوتٌ غیر صوت الأ خرو مسافدۃ غیر مسافدۃ الأ خرو حضانۃ للاولادحضانۃ الأخر و النوع الذی لایتکون من الارض تکون الدیدان منھاد براللہ تعالیٰ لہ بان اودع فیہ قوی التناسل و خلق فی الانثیٰ رطوبۃ یصر فھا الیٰ تربیۃ الجنین ثم حوّلھا لبنا خالصا و الھم المتولد مص الثدی وإرِدِراد اللبن و جعل فی الدجاجۃ رطوبۃ یصر فھا الیٰ تکون البیض فاذاباضت اصابھا یبسٌ و خلوجوف یحملانھا علیٰ جنون یستدعی ترک المخالطۃ بنی نوعھا و استحباب حضانۃ شئی تسدبہ جوفھا و جعل من طبع الحمامۃ الانس بین ذکرھا و انثا ھاوجعل خلو جو فھا ھوالحامل

علیٰ حضانة البیض ثم جعل رطوبتها البالیة سبباً لتهوُّعِها و دفع الحبوب والماء الیٰ جوف فرخها. وجعل الذکر منها بسبب الانس یقلد انثاهاو خلق للفراخ مزاجاً رطباً ثم حول رطوبتهاریشاً تطیربة" (۱)

(جنس حیوانات پرنظر ڈالوگے تو تم پاؤ گے کہ انمیں ہرنوع کی الگ الگ شکل اور بناوٹ ہے جیسے کے درختوں میں ہے اور اسکے ساتھ یہ بھی پاؤ گے کہ انکی اختیاری حرکات ہوتی ہیں (جو اشجار میں نہیں ہوتیں) اور طبعی الہامات اور جبلی طریقے ہوتے ہیں جو انمیں سے ہرنوع کو ممتاز کردیتے ہیں۔ پس مویشی گھاس کھاتے ہیں اور جگال کرتے ہیں اور گھوڑے، گدھے اور خچر بھی گھاس کھاتے ہیں مگر جگال نہیں کرتے اور درندے گوشت خور ہیں اور پرندے ہوا میں اڑتے ہیں اور مچھلیاں پانی میں تیرتی ہیں اور حیوانات کی ہر قسم ایک آواز نکالتی ہے جو دوسری نہیں نکالتی اور ہر ایک کی مجامعت کا طریقہ دوسرے سے جدا ہے اور بچوں کی پرورش کا طریقہ دوسرے سے الگ ہے۔

اور وہ نوع جو زمین سے نہیں پیدا ہوتی اسکے بچے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسکے لئے یہ تدبیر کی ہے کہ اسے قوائے تناسل عطا کئے ہیں اور اسکی مادہ میں خاص رطوبت بنائی ہے جسکو وہ بچے کی تربیت میں صرف کرتی ہے پھر اسکو خالص دودھ میں بدل دیا اور نومولود کو الہام کیا کہ ماں کے پستان کو چوسے اور اس دودھ کو نگل جائے اور مرغی کے اندر ایک رطوبت بنائی جسکو وہ انڈے کی بناوٹ میں صرف کرتی ہے پھر جب وہ انڈے دیکر فارغ ہوتی ہے اس پر ایک قسم کی خشکی طاری ہو جاتی ہے اور پیٹ کے خالی ہونے پر اس پر ایک دیوانگی سی طاری ہوتی ہے جو اسکو اپنی بنی نوع سے ملنے جلنے سے روکتی ہے (مرغی کا کڑک ہوجانا) اور وہ کسی شے کو اپنے پوٹے کے نیچے دبا کر اسکی پرورش کو پسند کرتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے کبوتر کی طبیعت میں نر و مادہ کے درمیان انس کا جذبہ پیدا کیا اور اسکے پیٹ کو خالی کر کے انڈوں کو سینے کا باعث بنایا پھر اس کی زائد رطوبت کو قے کے ذریعے باہر نکال کر اسکو چوزے کے لئے باعث رحمت بنایا اور اس زائد رطوبت کو اس رحمت کے ساتھ قے کو بچہ کے پیٹ میں دانہ و پانی پہچانے کا سبب بنایا اور اسکے نر کو انس و محبت کے سبب مادہ کے پیچھے پھرنے پر آمادہ کیا اور چوزہ کا مزاج مرطوب بنایا پھر اس رطوبت کو بال و پر بنا دیا کہ ان

(۱) حجۃ، صفحہ ۳۶، ۳۷، جلد ۱

سے وہ اڑنے لگا)

اسکے بعد شاہ صاحب ان دونوں انواع کا مقابلہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ثم انظر الیٰ تدبیر الحق لکل نوع و تربیته ایاه و لطفه به. فلما کان النباتات لایحس ولایتحرک جعل له' عروقاتمص المادة المجتمعة من الماء والهواء ولطیف التراب ثم یفرقها فی الاغصان و غیرها علیٰ تقسیم تعطیه الصورة النوعیة ولما کان الحیوان حساسامتحرکا بالارادة لم یجعل له عروقاتمص المادة من الارض بل الهمة طلب الحبوب والحشیش والماء من مظانها والهمة جمیع ما یحتاج الیه من الارتفاقات." [1]

(پھر تدبیر الٰہیہ دیکھو جو ہر نوع کے لئے اور اسکی تربیت و پرداخت کے لئے اور اس پر رحم کرنے کیلئے ہے۔ پس نباتات جو حس وحرکت نہیں رکھتے انکے لئے جڑیں بنائیں جنکے ذریعہ وہ اس مادہ غذا کو جو پانی، ہوا اور نرم مٹی میں مجتمع ہے چوستے ہیں پھر انکو ٹہنیوں وغیرہ کی شکل میں پھیلایا اور اس طریقہ پر تقسیم کیا جو انکی صورت نوعیہ کو عطا کیا گیا تھا اور حیوانات کیونکہ حس رکھتے ہیں اور اپنی مرضی وارادہ سے چلتے پھرتے ہیں انکے لئے جڑیں نہیں بنائیں جو زمین سے مادۂ غذا کو چوستیں بلکہ فطری طور پر انکو دانہ، گھاس اور پانی کے خزانوں کی تلاش کا حکم کیا اور ان منافع کا بھی الہام کیا جنکی انکو ضرورت تھی)

اس گفتگو کے بعد شاہ صاحب فطرت انسانی اور عطیات ربانی کیجانب رخ کر کے ثابت کرتے ہیں کہ کس طرح انسان دیگر مخلوقات سے ممتاز ہے اور اس کا کیا راز ہے:

"ثم انظر الیٰ نوع الانسان تجد له ماوجدت فی الاشجار وماوجدت فی اصناف الحیوان کالسعال و التمطی والجشاء و دفع الفضلات و مص الثدی فی اول نشاته و تجد مع ذٰلک فیه خواص یمتاز بهامن سائرالحیوان منها النطق وفهم الخطاب و تولید العلوم الکسبیة من ترتیب المقدمات البدیهیة اومن التجربة والاستقراء والحدس ومن الاهتام بامور یستحسنها بعقله ولا یجدها بحسّه

---

[1] حجۃ، صفحہ ۳۷، جلد ۱

ولاوهمه كتهذيب النفس و تسخير الاقاليم تحت حكمه و كذٰلک يتوارد علىٰ اصول هذه الامور جميع الامم حتىٰ سكان شواهق الجبال و ماذٰلک الالسر ناشئی من جذر صورة النوعية و ذٰلک السران مزاج الانسان يقتضی ان يكون عقله قاهرا علىٰ قبله و قلبه قاهراً علی نفسه" [1]

(پھر نوع انسان پر نگاہ ڈالو تو اسمیں وہ بھی پاؤ گے جو درختوں میں پایا تھا اور وہ بھی پاؤ گے جو تمام اقسام حیوانات میں پایا تھا مثلاً کھانسنا، انگڑائی لینا، ڈکار لینا، فضلات کو خارج کرنا، نومولود کا ماں کے پستان کو چوسنا مگر اس کے ساتھ ہی وہ خواص بھی پاؤ گے جن سے وہ تمام حیوانات سے ممتاز ہوتا ہے۔ انمیں نطق یا گفتگو ہے، دوسرے کی بات کو سمجھنا ہے، بدیہی اور واضح مقدمات امور کی ترتیب سے، تجربہ سے، ثابت قدمی سے اور یقین اور انداز سے علوم کسبیہ کو پیدا کرنا اور ان امور کا اہتمام کرنا ہے جن کو وہ اپنی عقل سے پسند کرتا ہے اگر چہ حس وخیال سے نہیں معلوم کرسکتا جیسے اپنے نفس کو مہذب بنانا، ملکوں اور سلطنتوں کو اپنے زیر حکومت لانا اور ان امور کے اصولوں پر تمام امتیں اور فرقے یہانتک کہ پہاڑوں کی بلندیوں پر رہنے والے غیر مہذب قبائلی تک عمل پیرا ہیں اور یہ خواص محض صورۃ نوعیہ کے بطن سے پیدا ہوتے ہیں تو اسکا یہ ہی راز ہے کہ انسان کے مزاج اور فطرت کا تقاضہ یہ ہے کہ اسکی عقل اسکے قلب پر اور اسکا قلب اسکے نفس پر غالب ہو)

ان طویل اقتباسات کے مطالعہ سے نہ صرف شاہ صاحب کی علمیت کی وسعت وتنوع کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ انکے قوت بیان، طرز تحریر اور اسلوب بیان کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ نہایت نپے تلے سادہ وسلیس انداز میں آپ اپنے خیالات اور معلومات کو صفحہ قرطاس پر منتقل کرتے ہیں اس میں تصنع اور آورد یا ثقالت الفاظ اور فضول قافیہ پیمائی کا شائبہ تک نہیں۔ ہر بات آسانی سے قاری کے ذہن میں واضح ہو جاتی ہے ساتھ ہی قاری کی دلچسپی بھی برقرار رہتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ فصاحت اور بلاغت کے تمام اصولوں کی پابندی بھی برقرار رہتی ہے اور کوئی حرف یا کوئی جملہ ایسا نہیں جسکو ذوق سلیم ثقیل یا مجہول المعنی اور غیر مانوس پائے۔ کسی جگہ پر تعقید لفظی (۱) یا تعقید معنوی (۲)

---

[1] حجۃ، صفحہ ۳۶، ۳۷۔

(۱) تعقید لفظی: نظم کلام میں لفظی خلل کو کہتے ہیں، جس سے فصاحت میں نقص پیدا ہوتا ہے، اور کلام کا مطلب پوری طرح واضح نہیں ہوتا۔ (البلاغت)

(۲) تعقید معنوی: کلام کا مطلب اس وجہ سے ظاہر نہ ہونا کہ بعید لوازمات اور بہت زیادہ واسطوں کے بغیر متکلم کے مطلب کو سمجھنا دشوار ہو، یہ بھی فصاحت میں نقص کی شکل ہے۔ (البلاغت: سید محمد غیاث الدین مظاہری، صفحہ ۱۷)

نہیں پائی جاتی جو کلام کو غیر فصیح بنائے اور تمام عبارت مقتضیٰ حال کے مطابق (۱) ہے اور اسلئے فصیح و بلیغ ہے۔ آپنے اپنی تحریر میں ایجاز اطناب اور مساوات تینوں طریقوں کا استعمال کیا ہے۔ شاہ صاحب اپنے افکار کو ان الفاظ اور اس طریقہ سے پیش کرتے ہیں جو انتہائی مناسب و موزوں ہے۔ ان اقتباسات میں مساوات کا بہت استعمال ہے یعنی الفاظ معنی کے بالکل برابر ہیں اور ایک لفظ کو بھی کم و بیش کرنے سے معنی غیر واضح ہو جانے کا خدشہ ہے۔

لیکن شاہ صاحب اپنے اسلوب میں جہاں سادہ زبان اور سلیس انداز اپناتے ہیں وہیں نثر کو استعاروں، تشبیہات، ضرب المثال اور دیگر محاسن لفظیہ و معنویہ سے سجاتے ہیں اور یہ تزئین سجع و قوافی، نامانوس اور پرشکوہ الفاظ کے استعمال اور لفظی گورکھ دھندوں کی جگہ لیتی ہے جسکے ذریعہ اس دور کے لوگ اپنی تحریروں کو بوجھل بنایا کرتے تھے۔ اس قسم کی نثر کی مثال جگہ جگہ ملتی ہے۔ مثلاً انسان کی فوقیت کی مزید تشریح کرتے ہوئے آپنے تحریر کیا:

"واعلم ان الانسان ليس كسائر انواع الحيوان بل له ادراک اشرف من ادراکاتهم من علومه التی يتواردعليها اكثرافراده غير من عصت مادته احكام نوعه التفتيش عن مسبب ايجاده و تربيته والتنبيه باثبات مد برفی العالم هواوجده و رزقه والتضرع بين يدی بارئه ومدبره بهمته وعلمه حسب ما يتضرع اليه هو و جميع ابناء جنسه دائما سرمدا بلسان الحال وهو قوله تعالیٰ الم تران الله يسجد له من فی السمٰوات و من فی الارض والشمس و القمرو النجوم و الجبال و الشجر و الدواب و كثير من الناس و كثير حق عليه العذاب (القران) اليس ان كل جزء من الشجرة من اغصا نها واوراقها و ازهارهامتكفف يده الیٰ النفس النباتية المدبرة فی الشجرة دائما سرمدافلو كان لكل جزء منها عقل لحمد النفس النباتية حمد اغير حمد الا خرولو كان له فهم لا نطبع التكفف الحالی فی علمه و صارتكففا بالهمة. فاعلم من هناک ان الانسان لما

---

(۱) مقتضیٰ حال کی مطابقت: حال کا دوسرا نام مقام بھی ہے، اس کا مطلب ہے کہ عبارت کو ایک خاص ڈھانچہ پر ڈھالنا جو حال اور مقام کے مطابق ہو، یعنی گفتگو اسی انداز اور پیرایہ میں کرنا جو موضوع کے مقام و حالات کے مطابق ہو اور یہ بلاغت کی خاص صفت ہے۔ (ایضاً، صفحہ ۱۹)

کان ذاعقل ذکی انطبع فی نفسه التکفف العلمی حسب تکفف الحالی"۔[1]

(اور جان لو کہ انسان دیگر انواع حیوان جیسا نہیں بلکہ اسکا ادراک اور قوت فہم انکے ادراکات سے زیادہ بلند و برتر ہے اسکے علوم میں جن پر سب کا اتفاق ہے سوائے ان لوگوں کے جنکا مادہ (عقل، نفس) احکام نوع سے انحراف کرتا ہے اپنی تخلیق اور تربیت کے اصلی مسبب کی تفتیش، تحقیق و جستجو اور عالم کائنات کے اثبات سے واقف اور متنبہ ہونا ہے جس نے اس کی اولیں تخلیق کی اور اس کو رزق دیا اور اپنے خالق و مالک کے سامنے اپنی ہمت اور علم کے موافق گریہ وزاری کرنا ہے جس طرح وہ خود اور اس کے تمام ابنائے جنس ہمیشہ ہمیشہ لسان حال سے گڑگڑاتے رہتے ہیں اور قول باری تعالیٰ الم تر۔۔۔العذاب۔ کا بھی یہی مطلب ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ درخت کا ہر حصہ خواہ اس کی ٹہنیاں ہوں یا پتے اور پھول سب اس نفس نباتی جو انکا مدبر (خالق) ہے اس کے آگے ہمیشہ ہاتھ پھیلائے رہتے ہیں۔ تو اگر انکے ہر حصہ میں عقل ہوتی تو وہ اس نفس نباتی کی ایسی حمد کرتا جیسی کوئی دوسری حمد نہ ہوسکتی اور اگر اس میں فہم وفراست ہوتی تو یہ تکفف حالی (زبان حال سے ہاتھ پھیلا کر مانگنا) اسکے علم میں منقش ہو کر تکفف بالا رادہ ہو جاتی۔ پس جان لو کہ انسان کیونکہ صاحب عقل اور ذکی الطبع ہے اس لئے اس کے تکفف حالی کی طرح تکفف علمی اس کے دل پر منقش ہوگئی ہے۔)

تکفف حالی اور تکفف علمی کی ترکیبیں اور آیت سجدہ کو اس پر منطبق کرنا ایسا خیال ہے جس کی ندرت تحریر کی خوبی میں چار چاند لگا دیتی ہے۔

شاہ صاحب کی تحریر میں اطناب کی مثالیں جابجا پائی جاتی ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کے بے مثل و یکتا ہونے کے سلسلہ میں آپ لکھتے ہیں:

"لیس کمثله شئی فی هٰذه الصفات"

پھر ان صفات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے آگے لکھتے ہیں:

"فهو حیی لا کحیاتنا بصیر لا کبصر ناقدیر لا کقدر تنا مرید لا کار ادتنا متکلم لا ککلا مناو نحوذالک"

---

[1] حجۃ، صفحہ ۳۸، جلد ۱

(وہ حی ہے مگر اس کی حیوٰۃ ہمارے جیسی نہیں، بصیر ہے مگر بصارت ہماری جیسی نہیں، قدیر ہے مگر قدرت ہماری جیسی نہیں، صاحب ارادہ ہے مگر ارادہ ہمارے جیسا نہیں وعلیٰ ہذا۔)

پھر اسکی عدم مماثلت ان امور میں تفصیلاً بیان کرتے ہیں جو نوع انسانی میں نہیں ملتے بلکہ ناممکن الوقوع ہیں۔ مثلاً:

"(فهو) يعلم عدد قطر الا مطارو عدد رمل الفيافى وعدداوراق الاشجارو عدد انفاس الحيوانات و يبصر دبيب النمل فى الليلة الظلماء و يسمع مايتوسوس به تحت اللحف فى البيوت المغلقة عليها ابوابها ونحوذالک" [1]

(وہ بارش کے قطروں، ریگزاروں کے ذروں، درختوں کے پتوں، اور حیوانات کی سانسوں کی تعداد تک کو جانتا ہے۔ وہ کالی رات میں چیونٹی کے چلنے کو دیکھ سکتا ہے اور دل کے وسوسوں کو بھی سن سکتا ہے جو مقفل دروازوں والے مکانات میں لحاف کے نیچے لیٹے ہوئے لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں۔)

یہ صفت ایضاح بعد الابہام ہے جو اطناب کا ایک طریقہ ہے۔

اسی طرح اطناب کی دیگر مثالیں ہیں جو تحریر کو خوبصورت اور واضح بنانے کے لئے استعمال کی گئی ہیں۔ شاہ صاحب نے اپنی تحریر میں تشبیہات استعارات وغیرہ کا بھی جا بجا استعمال کیا ہے۔ بعض تشبیہات تو ایسی عمدہ ہیں کہ غیر عرب کے قلم سے انکا نکلنا سخت حیرت کا باعث ہے مثلاً عرب مصنفین نے اپنے کلام میں اونٹوں کا بہت ذکر کیا ہے اور عربی لغات میں اونٹ کے لئے سینکڑوں مختلف الفاظ آئے ہیں۔ انسان کے اندر صفت بہیمیہ کی زیادتی اور کمی کے سلسلہ میں آپ نے اونٹ کی جو مثال دی ہے وہ اس طرح ہے:

"البهيمية الشديدة الصفيقة كهيئة الفحل الفارة الذى نشأ فى غذاء غريروتدبير مناسب فكان عظيم الجسم شديدة جهورى الصوت قوى البطش ذاهمة نافذة وتية عظيم و غضب و حسد قويين و شبق و افرمنافسافى الغلبة و الظهور شجاع القلب" [2]

---

[1] حجۃ، صفحہ ۴۰، جلد ۱

[2] حجۃ، صفحہ ۴۵، جلد ۱

(شدید اور اڑیل بہیمیت اس مست اونٹ کی طرح ہوتی ہے جس کی پرورش و پرداخت عمدہ اور پر شکم غذاؤں سے ہوئی ہو اور مناسب تدابیر کے ساتھ اسکی تربیت کی گئی ہو اسلئے بڑے اور مضبوط جثہ والا، بلند آواز، سخت گرفت رکھنے والا، بے روک ٹوک حوصلہ رکھنے والا، بڑی اینٹھ والا ہو اور غصہ اور کینہ اس میں قوی و شدید ہو، بہت شہوت والا ہو، دوسروں پر غلبہ اور اظہار قوت کے لئے ہمہ وقت لڑنے کو تیار اور توانا دل ہو۔)

"والبهيمة الضعيفة المهلهلة كهئية الحيوان الخصى المخدج الذى نشأفى جدب و تدبير غير مناسب فكان فقير الجسم ضعيفه ركيک الصوت ضعيف البطش جبان القلب غير ذى همة ولا منافسه فى الغلبة و الظهور"[1]

(وہ ضعیف اور کمزور بہیمیت اس خصی اور ناقص الخلقت جانور (اونٹ) کی مانند ہے جو قحط کے زمانے میں کم غذا پر پلا بڑھا ہو اور غیر مناسب تربیت پائی ہو اس لئے کمزور اور لاغر جسم والا، مہین آواز، کمزور پکڑ والا، بزدل، بے ہمت اور غلبہ اور اظہار طاقت کے لئے دوسروں سے نہ جھگڑنے والا ہو)

ان تشبیہات سے شاہ صاحب نے اونٹوں کی جس تصویر خیال (imagery) کی مصوری کی ہے اس سے انکی شکل آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے اور یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی تصویر وہی شخص پیش کرسکتا ہے جسنے اپنا وقت غصیل کٹ کھنے، مست اونٹوں اور کمزور، بزدل لاغر، بھاگ جانے والے جانوروں کے ساتھ گذارا ہو اور انکا بچشم خود ملاحظہ کیا ہو۔ یہ انکے مطالعہ اور تصور کی گہرائی اور عمق کا بہت بڑا ثبوت ہے۔

ایک جگہ اللہ والوں کی کیفیت بیان کرتے ہوئے آپ نے ایک تصویر خیالی (imagery) بنائی ہے جو انتہائی خوبصورت اور پر اثر ہے۔

"ورايت طائفة من اهل الله صارت نفو سهم بمنزلة الجوابى الممتلئة ماء راكدلاتهيجه الرياح فضربها ضوء الشمس فى الهاجرة فصارت بمنزلة قطعة من النور وذٰلک النور امانور الاعمال المرضية اونور الياداشت اونور الرحمة"[2]

---

[1] حجۃ، صفحہ ۴۵، جلد ۱

[2] حجۃ، صفحہ ۵۹، ۶۰، جلد ۱

(اور میں نے اللہ والوں کی ایک جماعت ایسی دیکھی ہے جنکے نفوس گویا کہ ایسے بڑے تالاب کی طرح ہیں جو ٹھہرے ہوئے ساکت پانی سے لبالب بھرے ہوئے ہوں جسکو ہوائیں متوج نہیں کر رہی ہوں تب اس پر ٹیکا ٹیک دوپہری میں سورج کی روشنی پڑے تو جیسے وہ نور کا ایک ٹکڑا (قطعہ) بن جائے اور یہ نور یا تو اعمال صالحہ کا ہوگا یا نور یادداشت (جب ہر کیفیت میں یاد خدا بس جائے) یا پھر نور رحمت الٰہی۔)

یہ تشبیہ در تشبیہ کی ایک مثال ہے کہ پہلے اہل اللہ کے نفوس کو تالاب کے اس ٹھہرے ہوئے پانی سے جسکو دوپہر کو سورج کی کرنیں چمکا رہی ہوں جس سے دیکھنے والے کی نگاہ خیرہ ہو جائے اور پھر اس تیز چمک کو نور سے تشبیہ دی جو ان اہل اللہ کے رضائے الٰہی کے مطابق اعمال، یا انکے یاد اللہ میں محو ہونے یا پھر رحمت الٰہی کا نور ہو۔

انسانوں کی اپنے گناہوں کے لحاظ سے کیفیت اور ان کبیرہ وصغیرہ گناہوں کو بیان کرتے ہوئے شاہ صاحب نے پنجرہ میں قید پرندہ کی مثالیں دی ہیں جو بہت دلچسپ ہیں

(۱) "اعلم ان القوة الملكية من الانسان قد اكتفت بها القوة البهيمية من جوانبها وانما مثلها فى ذٰلک مثل طائر فى قفص سعادته ان يخرج من هٰذاالقفص فيلحق بحيزه الاصلى من الرياض الا رضة ويا كل الحبوب الغاذية و الفواكه اللذيذة من هنا لک و يدخل فى زمرة ابناء نوعه فيبتهج بهم كل الابتهاج"(۱)

(جان لو کہ انسان کے اندر قوت ملکیہ (وہ قوت جو نیکیوں پر آمادہ کرتی ہے) کو قوت بہیمیہ (وہ قوت جو برائیوں اور گناہوں پر اکساتی ہے) چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ اور قوت ملکیہ کی مثال اس پرندہ کی سی ہے جو پنجرہ میں بند ہو۔ اسکی خوش بختی یہ ہے کہ وہ اس پنجرہ سے نکلے تو تروتازہ باغات ارضی میں اپنی اصلی جگہ پر پہنچ جائے اور وہاں غذائی دانہ اور لذیذ میوہ جات کھائے اور اپنے ہم جنس پرندوں کے جھنڈ میں رہ کر ہشاش بشاش زندگی گذارے)

(۲) "الدهرى الذى لم يجمع فى نفسه تعظيم ربه (وليس لعلمه نفوذالىٰ حيز القدس اصلاً) وهو بمنزلة الطائر المحبوس فى قفص من حديد ليس فيه

---

(۱) حجۃ، صفحہ ۱۴۸، جلد ۱۔

منفذو لاموضع ابرة"[1]

(دہریہ وہ ہے جسکے نفس میں اپنے رب کی تعظیم قطعاً نہیں ہے (اور اس کے علم کی پہنچ بالکل بھی حیز القدس تک نہیں ہے) وہ اس مقید پرندہ کی طرح ہے جو لوہے کے پنجرے میں ہے جسمیں کوئی سوئی کے برابر بھی سوراخ نہیں ہے)

(۳) والکافر فھٰذا کطیر فی قفص لہ منافذالاانہ قد غشی من فوقہ بغاشیة عظیمة"[2]

(اور کافر کی مثال اس پرندہ کی ہے جو ایسے پنجرہ میں قید ہو جسمیں سوراخ تو ہوں مگر اسکو اوپر سے بھاری غلاف سے ڈھک دیا گیا ہو)

(۴)"وھو ان یعتقد التوحید و التعظیم علیٰ وجھھا ولکن ترک الامتثال لما امربہ فی حکمتہ البروالاثم.....مثلہ کمثل طائر فی قفص مشبک یریٰ الخضرة والفواکہ وقد کان فیما ھنا لک ایاماثم طراعلیہ الحبس فیشتاق الیٰ ماھنا لک ویضرب بجناحہ ویدخل فی المنافذ مناقیرہ ولایجد طریقاً یخرج منہ. وھٰذہ ھی الکبائر"[3]

(وہ جو توحید پر تو ٹھیک ٹھیک اعتقاد رکھتا ہے اور تعظیم الٰہی بھی بجالاتا ہے لیکن ان احکام کی تعمیل نہیں کرتا جنکو بطور حکمت الٰہی نیکی و گناہ قرار دیا گیا ہے۔۔۔۔۔۔اسکی مثال اس پرندہ کی ہے جو کسی مقفل پنجرہ میں قید ہو اور ہریالی اور میوے دیکھ رہا ہو جہاں وہ مدتوں رہا تھا پھر قید کرلیا گیا تو وہاں جانے کے لئے بے قرار ہوگا اور اپنے پر پھڑ پھڑائیگا اور اس پنجرہ کے سوراخوں میں اپنی چونچ ڈالیگا لیکن اس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں پائیگا۔اور یہی گناہ کبیرہ ہیں)

(۵)"وادنیٰ من ذٰلک ان یفعل ھٰذہ الاوامر ولکن لا علیٰ شریطتھا التی تجب لھا فمثلہ کمثل طائر فی قفص مکسور فی الخروج منہ حرج ولا یتصور

---

[1] حجہ، صفحہ ۱۴۹، جلد ا۔

[2] ایضاً، صفحہ ۱۵۰، جلد ا۔

[3] ایضاً، صفحہ ۱۵۰، جلد ا

الخروج الا بخدش فی جلده ونتف فی ریشه فهو یستطیع ان یخرج من قفصه ولٰکن یجدو کدولا یبتهج فی ابناء نوعه کل الابتهاج ولا یتناول من فواکه الریاض کما ینبغی لما اصابه من الخدش والنتف. وهٰولاء هم الذین خلطوا عملاً صالحاً و اٰخر سیئا. هٰذه هی الصغائر"[1]

(اوراس سے کمتر درجہ اس کا ہے جوان اوامر کوانجام تو دیتا ہے لیکن انکی شرائط کے ساتھ انجام نہیں دیتا جوانکے لئے واجب ہیں اسکی مثال اس پرندہ کی سی ہے جواس پنجرہ میں ہے جس سے وہ باہر نکلنے سے عاجز ہے اور جو بیحد تنگ ہے اور پرندہ اس سے نکلنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا جب تک کہ اسکی کھال زخمی نہ ہو جائے اور پر نہ نچ جائیں تو وہ کوشش بسیار کے بعد ہی اس قفص سے نکل سکتا ہے اور وہ اپنے ہم جنسوں کے ساتھ نہ تو اس خوشی سے رہ سکتا ہے اور نہ وہ باغوں کے میوے کھا سکتا ہے جیسا وہ چاہے کیونکہ وہ زخمی ہوگا اور اسکے پر نچے ہوئے ہونگے اور وہ لوگ وہ ہیں جنہوں نے اعمال صالحہ کو اعمال سیئہ سے خلط ملط کر دیا ہے۔ یہی گناہ صغیرہ ہیں۔)

انکے علاوہ بھی جگہ جگہ آپنے اپنے مطالب کو واضح کرنے اور سریع الفہم بنانے کے لئے تشبیہوں اور استعارات کا سہارا لیا ہے۔ بدن میں روح کی مثال دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ومثاله فی البدن کمثل الماء الوردفی الورد و کمثل النار فی الفحم"[2]

(اور بدن میں اسکی مثال ایسی ہے جیسے کے گلاب کے پھول میں گلاب کا عرق اور جلتے ہوئے کوئلہ میں آگ)

عالم قدس سے انسانوں کے لئے نازل کردہ استعداد کے مختلف ہونے اور اس تغیر استعداد کی مثال دیتے ہوئے آپنے تحریر کیا ہے۔

"فالامور المتغیره انماجاء تغیرها من قبل الاستعداد الارضیة بمنزله حرالشمس یبیض الثوب و یسود الفصاد"[3]

---

[1] حجۃ، صفحہ ۱۵۰، جلد ا۔

[2] حجۃ، صفحہ ۳۱

[3] ایضاً، صفحہ ۳۲

(اور امور متغیرہ کے بارے میں یہ ہے کہ استعدادات دنیوی ارضی کی راہ سے انسان میں جو تغیر ہوتا ہے اس کی مثال ایسی ہے گویا کہ دھوپ کی گرمی کپڑوں کو تو سفید کرتی ہے لیکن دھوبی کو کالا کر دیتی ہے)

یعنی منبع فیض تو ایک ہے مگر استعداد کے تغیر سے اسکا اثر ہر انسان میں مختلف ہوتا ہے۔

شاہ صاحب نے ضرب الامثال اور مقولوں سے بھی جگہ جگہ اپنی تحریر کو رونق بخشی ہے۔

المعاصرة اصل المنافرة. من صنف قد استهدف. كل صيد فى جوف الفرىٰ. وغیرہ اور ان جیسے چھوٹے چھوٹے جملے اور عبارتیں آپکی تحریر میں جگہ جگہ موتیوں کی طرح ٹکے ہوئے ہیں۔

ہم شاہ صاحب کی تحریر میں عاطفہ، خیال اور معانی کی وہ تاثیر دیکھتے ہیں جو انکی تحریر کو جاوداں بنانے میں انتہائی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ بقول پروفیسر سید عبدالباری:

''دوسروں کو بیدار کرنے کے لئے خود بیدار ہونا پڑتا ہے اور دوسروں کے احساسات کو اسوقت چھیڑا جا سکتا ہے جبکہ خود صاحب قلم کے احساس کی دنیا میں طوفان برپا ہو۔ باقی تمثیل، تشبیہ، استعارہ، کنایہ، منظر نگاری، تصویر کشی یہ سب اسلوب کے رنگ وروغن ہیں۔ شاید اچھے اور پرتاثیر خیالات اپنے الفاظ کا پیراہن خود تلاش کر لیتے ہیں۔ یہ بات سچ ہے کہ خیال، معنی کی گہرائی و گیرائی اور اسکے خوبصورت اسرار ورموز کا ادراک کرتا ہے اور ذوق اس خوبصورت خیال کے مناسب حال موزوں ترین عبارت کا انتخاب کرتا ہے۔ اگر صاحب قلم کا مذاق ستھرا ہے، منزل مقصود واضح ہے، ذکاوت کی روشنی اور بصیرت کی چنگاری حاصل ہے تو وہ اپنے اسلوب کی عالیشان عمارت خود تعمیر کر لیتا ہے، اپنا راستہ خود بناتا چلا جاتا ہے'' [1]

یہ بات شاہ صاحب پر حرف بحرف صادق آتی ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے حالات زندگی اور آپکی تربیت وتعلیم کی تفصیلات کا علم رکھنے والا سمجھ سکتا ہے کہ آپکا عاطفہ اور احساس کس قدر اعلیٰ اور تربیت یافتہ تھا اور خود آپکو اپنی صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ تھا۔ آپنے اپنی تصنیف میں کنایتاً اسکا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ مبحث ثالث میں ارتفاقات کے عنوان سے آداب معیشت کے باب میں لکھتے ہیں:

---

[1] حجۃ اللہ البالغۃ، ایک تجزیاتی مطالعہ، صفحہ ۴۷-۴۸۔

"وکل من خلق علیٰ مزاج صحیح و ذوق سلیم یختار لا محالة فی کلامه من الالفاظ کل لفظی غیر وحشی ولا ثقیل علیٰ اللسان و من التراکیب کل ترکیب متین جید ومن الاسالیب کل اسلوب یمیل الیه السمع ویرکن الیه القلب و هٰذاالرجل هو میزان الفصاحه"[1]

(اور ہر وہ شخص جو مزاج صحیح اور ذوق سلیم پر پیدا ہوا ہو لامحالہ اپنے کلام (تصنیفات) میں ایسے الفاظ لانا پسند کرتا ہے جسمیں کوئی لفظ غیر مانوس نہ ہو اور نہ زبان پر ثقیل ہو اور ایسی ترکیبیں استعمال کرتا ہے جسمیں ہر ترکیب (الفاظ) بیحد متین وسنجیدہ ہو اور ایسے اسلوب اختیار کرتا ہے جسمیں ہر اسلوب سماعت میں بھلا لگے اور دل اسکی طرف جھک جائے اور وہ شخص ہی فصاحت کا پیمانہ ہے)

یعنی عمدہ مصنف اور صاحب قلم وہ ہے جسکا کلام تنافر حروف (ایسے الفاظ جو زبان پر ثقیل ودشوار ہوں) اور غرابت (لفظ وحشی مجہول المعنی یعنی جنکے معنی ظاہر نہ ہوں یا غیر مانوس ہوں) سے پاک ہو اور جسکا کلام ہر قسم کی ادبی خامیوں سے مبرا اور فصاحت و بلاغت کی خوبیوں سے مزین ہو۔[2] اور آپکے نزدیک اس شخص کا کلام ہی معیار فصاحت ہے۔ یہ گویا خود اعتمادی اور اپنی خداداد صلاحیتوں کا اعتراف ہے۔

ایک جگہ معانی شرعیہ کو سمجھنے کے سلسلہ میں آپ فرماتے ہیں:

"واما معرفة المقاصد التی بنی علیها الاحکام فعلم دقیق لا یخوض فیه الا من لطف ذهنه و استقام فهمه[3]

(اور ان مقاصد کی معرفت (سمجھ) جن پر احکام شرعی کی بنیاد ہے ایک علم دقیق ہے جسمیں صرف وہی غور وفکر کرسکتا ہے جس کا ذہن لطیف اور فہم مستحکم ہو۔)

مقدمہ کتاب میں اپنے بارے میں انکی تحریر کا جب ان الفاظ سے مقابلہ کیا جائے جہاں انھوں نے کہا تھا:

"و ان من اعظم نعم الله ان اتانی منه حظا و جعل لی منه نصیباً"[4]

---

[1] حجۃ، صفحہ ۷۲، جلد ۱

[2] البلاغت، مرتبہ محمد غیاث الدین مظاہری، الہ آباد، صفحہ ۱۴

[3] حجۃ، صفحہ ۲۶۹، جلد ۱۔

[4] ایضاً، صفحہ ۴۔

تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان الفاظ میں بھی آپکا اشارہ اپنی ہی طرف ہے:

ایک بڑی دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ آپکو غالباً اپنے فارسی داں ماحول اور عربی زبان و ادب اور اسمیں موجود علوم و معارف تک فارسی کے وسیلہ سے رسائی کا بھی احساس تھا۔ چنانچہ معانی شرعیہ کے باب ہی میں ایک جملہ آپکے قلم سے ایسا نکل گیا ہے جسمیں اس جانب اشارہ ملتا ہے۔

"بمنزلة مايدب فی ذهن الفارسی من معرفة موضوعات اللغة العربية عند ممارسةالعرب و استعمالهم اياهافی المواضع المقرونة بالقرائن من حيث لا يدری و انما ميزانه نفس تلک المعرفة."[۱]

(جیسے کہ کسی فارسی دان کے ذہن میں عربی زبان کے موضوعات کی معرفت عربی کی مشق اور انکے لئے اپنے قرینہ کے مناسب عربی الفاظ کا استعمال کرتے کرتے غیر محسوس طریقہ پر جم جاتی ہے اور یہی اس پہچان اور معرفت کا اصل پیمانہ ہے)

شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں ایک نئے طرز کے علم الکلام کی بنیاد ڈالی جسمیں احکام شرعیہ کو قرآن و سنت کی روشنی اور ان احکامات کے اسرار و رموز کے مطابق 'منزل من اللہ' ثابت کیا ہے اور جو دلائل اس سلسلہ میں دیے ہیں وہ عین مطابق نقل و عقل ہیں۔ یہ حقیقت انکی تحریر کی ادبی حیثیت کو موضوع، معانی، تخیل اور اسلوب کے اعتبار سے انتہائی بلند درجہ پر پہنچا دیتی ہے۔ ابن خلدون کے بعد وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور کما حقہ، اسکے ساتھ انصاف کیا ہے۔

مقالہ ہذا کا موضوع کیونکہ آپکی عربی تصنیفات کا ادبی پہلو اور حیثیت ہے اس لئے آپ کے رقم کردہ موضوعات کے دیگر پہلوؤں پر صرف اسی حد تک گفتگو کی جائیگی جتنی اس سلسلہ میں ضروری ہو

شاہ صاحب نے اپنے اسلوب میں موضوع کی وضاحت کا خاص خیال رکھا ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے اپنی تصنیف میں ایک باب قائم کیا ہے جسکا عنوان 'کیفیۃِ فهم المراد من الکلام' ہے۔ اس عنوان کے تحت آپنے خود ان اصول فصاحت کو بیان کیا ہے جو موضوع کی وضاحت اور تفہیم کے لئے ضروری ہیں اور جنکے ذریعہ قاری مقصود کلام کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ اس باب کو آپ ان الفاظ سے شروع کرتے ہیں:

"اعلم ان تعبير المتكلم عمافی ضميره وفهم السامع اياه يكون علیٰ درجات

---

(۴) حجۃ، صفحہ ۲۶۹

مترتبة فی الوضوح والخفاء....."[1]

اسکے بعد آپ صراحت و وضاحت موضوع کے لحاظ سے اول درجہ میں اس تحریر کو رکھتے ہیں جسمیں (۱) خاص موضوع لہٗ (یعنی جسکے بارے میں گفتگو کی جارہی ہو) کیلئے واضح طور پر کوئی بات یا حکم ثابت کیا گیا ہو (۲) کلام صرف اسی موضوع کو سمجھانے کیلئے کیا گیا ہو۔ (۳) اسمیں کسی دوسرے معنی کا احتمال نہ ہو۔

دوسرے درجہ میں وہ تحریر ہے جسمیں ان تینوں قیود میں سے کوئی ایک نہ پائی جائے بلکہ (۱) یا تو حکم (بات) کا ثبوت کسی عام عنوان کے لئے ہو جو چند اشخاص یا معانی کے لئے ملا کر یا بدل کر بولا جائے مثال کے طور پر الناس، مسلمون، قوم، رجال اور اسماء اشارہ جب انکا صلہ عام ہو جیسے اولئک اصحاب النار۔ یا کوئی موصوف جسکی صفت عام ہو یا وہ لفظ جو لائے نفی جنس سے منفی کیا گیا ہو کیونکہ اکثر عام معانی میں تخصیص بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ (۲) یا صرف موضوع لہٗ کے افادہ کے لئے کلام نہ ہو بلکہ اس سے وہ فائدہ لازم طور پر معلوم ہو جائے۔ مثلاً جآء نی زید الفاضل اور یازیدن الفقیر میں زید کا فضل یا اسکا فقر اصل مطلب نہ تھا مگر ضمناً اور لازماً معلوم ہو گیا (۳) اسمیں کسی دوسرے معنی کا بھی احتمال ہو مثلاً لفظ مشترک یا وہ لفظ جسکے حقیقی معنی بھی مستعمل ہوں اور مجازی معنی بھی متعارف ہوں یا وہ الفاظ جو مثال اور تقسیم کے لحاظ سے تو پہچانے جائیں مگر کسی جامع و مانع حد سے نہ جانے جائیں۔ مثلاً 'سفر' کہ کوئی اگر مدینہ سے نکل کر مکہ کا قصد کرے۔ اور یہ معلوم ہے کہ بعض حرکتیں سیر و تفریح کے لئے ہوتی ہیں اور کبھی ضرورت کے لئے بھی سفر ہوتا ہے اس طرح کہ اسی روز اپنے شہر کو واپسی ہو جائے۔ اور سفر بھی ہوتے ہیں جنکی کوئی حد معروف نہیں۔ اس لئے لفظ کے استعمال میں کئی معانی کا احتمال ہو سکتا ہے۔ اور دوسرے معنی کا احتمال اس لحاظ سے بھی ہوتا ہے کہ ایک لفظ میں دو چیزوں کا احتمال ہو جیسے اسم اشارہ اور اسم ضمیر جبکہ قرائن میں اختلاف و تعارض ہو (کہ کونسے معنی مطلوب ہیں)، یا صلہ کا مصداق (موصول) دو چیزیں ہو سکتی ہیں۔

اسکے بعد اس تحریر کا درجہ ہے کہ الفاظ کے استعمال کے بغیر کسی عبارت سے کلام کے معنی کا ادراک ہو جائے ایسے تین بڑے طریقہ ہیں: (۱) فحواء کلام (۲) اقتضاء کلام (۳) ایماء کلام

(۱) فحواء کلام: (اپنے کلام سے کسی مضمون کی طرف اشارہ کرنا)

اور وہ یہ ہے کہ کلام کو اسطرح سمجھ لیا جائے کہ تحریر اسکے معاملہ میں خاموش ہو مگر اسکے معنی اس حکم کو ظاہر کر

---

[1] حجۃ، صفحہ ۲۶۵

دیں جسکو بیان کرنا ہے مثلاً "ولا تقل لهما اف (ان دونوں (ماں باپ) کو اف تک نہ کر) میں ان کی زودکوب سے روکنا بدرجۂ اولیٰ ظاہر ہوتا ہے۔

(۲) اقتضاء کلام:

اور وہ یہ ہے کہ کلام کو اسکے لوازمات کے واسطہ سے پہچانا جائے جو عادتاً شرعاً یا عقلاً اس سے متعلق اور اس کے ساتھ مستعمل ہوتے ہوں۔ مثال کے طور پر اعتقاء (غلام آزاد کرنا) اور بیعٌ (کسی شے کا بیچنا) پہلے انکی ملکیت ہونے پر منحصر ہے یا مشئی (چلنا) کا مقتضیٰ پیروں کی درستی اور صلیٰ کا مقتضیٰ طہارت ہے۔ یعنی اعتقت کہنے سے لازمی طور پر یہ مطلب اخذ کیا جائیگا کہ وہ شخص اس (غلام) کا مالک تھا اور مشیٰ کہنے کا مطلب ہے کہ وہ شخص پیروں سے معذور نہیں۔

(۳) ایماء کلام:

اور وہ یہ ہے کہ مقصود کی ادائیگی ایسی عبارتوں کے ذریعہ ہو جو اعتبارات مناسبہ کے مقابلہ پر ہوں۔ اس سے بلغاء کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ عبارت اس اعتبار مناسب (۱) کے مطابق لائی جائے جو اصل مقصود سے زائد اور اس کے علاوہ ہوتا کہ کلام کو اس اعتبار کے ذریعہ سمجھا جا سکے جو اسکی مناسبت سے ہو جیسے کہ وصف یا شرط سے مشروط کرنا اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ ان (شرطوں یا وصفوں) کا نہ پایا جانا حکم کلام کے نہ ہونے کے مترادف ہے۔ جبکہ کلام میں سوال کی مشابہت (مشاکلت) پیدا کرنا یا کلام کو ایسی صورت سے بیان کرنا جو آسانی سے ذہن میں آجائے یعنی کلام کی آسان شرح کرنا یا حکم کا فائدہ بیان کرنا مقصود نہ ہو (کہ یہ صورتیں ایمائے کلام میں شامل نہیں) اور یہی بات استثنائے کلام، غرض وغایت اور گنتی کے بیان کی بھی ہے (کہ یہ بھی ایمائے کلام نہیں)

ایماء کے اعتبار کی شرط یہ ہے کہ اہل زبان کے نزدیک اس (ایماء) سے کلام میں تناقض (اختلاف) نہ پیدا ہو جائے مثلاً جملہ 'علی عشرة الاشئی انما علی واحد' کہنے پر جمہور بلغاء نے تناقض کا حکم لگایا ہے لیکن وہ امور جن میں علم معانی کے ماہرین ہی غور وخوض اور تعمق کر سکتے ہیں اسمیں کوئی نقص نہیں۔

اسکے بعد ان مطالب کا درجہ ہے جنکا استدلال مضمون کلام سے کیا جائے۔ اور انمیں تین امور اہم ہیں۔

(۱) عموم سے کسی بات کو اخذ کرنا۔ مثلاً **الذئب ذونابٌ و کل ذی نابٌ حرام** اس بات سے

---

(۱) اعتبار مناسب: وہ اعتبار جو حال اور مقام کے مناسب ہو یعنی وہ خاص ڈھانچہ جس پر عبارت ڈھالی جائے۔

استدلال کیا جاتا ہے کہ بھیڑیا حرام ہے۔اور قیاس اقترانی (۱) سے اسکا بیان مثلاً آیة فبهد اهم اقتده اور وظن داو'د.....فخر راکعاً واناب سے حضرت ابن عباسؓ نے استدلال کیا کہ تمہارے نبی انبیائے سابقہ کی پیروی پر مامور تھے۔جبکہ کوئی صریح حکم اسکے خلاف نہ ہو۔اسی لئے یہ آیت آیت سجدہ ہے۔

(۲) استدلال بالملازمت والمناقات: یعنی مضمون سے منطقی اور لازمی نتائج اخذ کرنا۔مثلاً لو کان الو تر واجباً لم یؤدعلیٰ الراحلة لٰکنه یؤدی کذٰلک۔(اگر وتر واجب ہوتے تو انکی ادائیگی سواری پر نہ ہوتی لیکن انکو اسطرح ادا کیا جاتا ہے) اور اسکا شرط کے ساتھ بیان۔جسکی مثال قول باری تعالیٰ لو کان فیهما الٰهة الا الله لفسد تا (اگر زمین وآسمان میں اللہ کے سوا کوئی دوسرا معبود ہوتا تو ان میں فساد برپا ہو جاتا) یعنی کوئی دوسرا اللہ نہیں اسلئے توازن قائم ہے۔

(۳) قیاس (محض): اور وہ یہ ہے کہ ایسی علت کی بنا پر جو دونوں میں مشترک ہو ایک شئے کی تمثیل ہو بہو دوسرے شئے میں پائی جائے۔مثلاً الحمص ربویٰ کا لحنطة (چنے میں بھی مثل گیہوں کے سود ہے) یعنی ربویٰ (علت مشترک) کے لحاظ سے چنا مثل گیہوں کے ہے۔اور قولہ صلی اللہ علیہ وسلم:

ارائیت لو کان علیٰ ابیک دین فقضیته اکان یجزی عنه. قال نعم. قال فا حجج عنه.
یعنی ادائیگی دین (علت مشترک کے لحاظ سے قرض اور فرض کی ادائیگی ایک دوسرے کے مثل ہے۔)

اس باب میں ایک ماہر فن نحوی کے طور پر آپنے فصاحت و بلاغت، واخفاء کلام، اطناب وایجاز اور کلام عرب العرباء کی باریکیوں اور محسنات کے اصول بیان کئے ہیں۔اس سے آپکی مہارت فن اور علمی وادبی فراست کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔آپ نے اپنی تصنیفات میں ان اصولوں کا استعمال جا بجا کیا ہے۔اس طرح اہل زبان ہی کے انداز میں اپنی بات پیش کی ہے اور متکلمین کے طریقہ پر دلائل کو منطقی صورت میں قیاس اقترانی یا استثنائی کے طور پر پیش کیا ہے جس سے آپ کی قوت استدلال اور قوت بیان کا اظہار ہوتا ہے۔

اسکے علاوہ ایک دوسرے باب میں آپ نے ان ادبی اصولوں کے تحت احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں مبہم اور مشکل مقامات کے حل کا بیان کیا ہے جسکا عنوان "ضبط المبهم و تميز المشكل و التخريج من الكلية و نحو ذٰلک، (کلام مبہم یا مخفی کے انضباط اور مشکل مقامات کی تمیز اور کلیہ سے حکم نکالنے وغیرہ کا

---

(۱) قیاس اقترانی، کوئی کلمہ یا کلام جو کسی خاص تقریب یا فعل کے متصل بولا جائے اور اس سے اس تقریب یا فعل کا قیاس کیا جائے جب کہ اس تقریب یا فعل کا ذکر محذوف ہو، اقتران ایک علامت حذف ہے۔(البلاغت:۸۴)

بیان) ہے [1] اس باب میں آپ نے علوم نبویؐ کے ایسے مشکل مقامات اور مسائل میں مندرج مبہم احکام کا تذکرہ کیا ہے جنکی تشریح اور انضباط ان اصولوں کے تحت خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے۔ جہاں کہیں قرآن مجید یا احادیث میں عمومی طور پر سرقہ (چوری)' الرفاهية البالغة (عیش کوشی اور عیش پسندی)' قصر (نص میں قصر کا لفظ کلام پاک میں آیا ہے مگر لفظ سفر کے معنی معلوم کرنے میں اشتباہ ہوتا ہے) وغیرہ کے الفاظ وارد ہوئے ہیں تو کسی تعریف جامع و مانع سے انکا حال معلوم نہیں ہوسکتا۔ مثلاً آیت السارق و السارقة فقطعوا ایدیهما۔ ہر سرقہ پر منطبق نہیں ہوتی اور کسی تعریف جامع و مانع سے لفظ سرقة کا حال نہیں معلوم ہوسکتا جس پر یہ حد لاگو ہو صرف مثال اور تقسیم سے ہی اقسام سرقہ کی کیفیت بیان کر کے اس حکم پر عمل کیا گیا ہے اور اسکی تفصیل خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہے۔ اسی طرح الرفاهية البالغة (عیش کوشی) کا لفظ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نفاست اور عیش کوشی میں فرق اور انسانوں اور قوموں کے اختلاف کی بناء پر ہی اسکے احکام امر و نہی بیان فرمائے ہیں اور کسی تعریف جامع پر انکا انحصار نہیں رکھا۔ یہی بات صلوٰۃ قصر کی ہے کہ سفر اور قیام کی خاص حالتوں میں واجب ہوتی ہے اور عمومی طور پر لفظ سفر کے استعمال سے اس کا ابہام دور نہیں ہوسکتا۔

قرآن و حدیث کے حوالوں اور انکی روشنی میں ان مثالوں کے ذریعہ آپ نے اخفاء کلام کے اس درجہ کی وضاحت کی ہے جس میں ان الفاظ کا استعمال کیا گیا ہو جن میں دوسرے معنی کا بھی احتمال ہو یعنی وہ الفاظ جو مثال اور تقسیم سے تو پہچانے جاسکیں مگر جامع و مانع تعریف سے انکا ابہام دور نہ کیا جاسکے۔

شاہ صاحب کے خیال اور اسکے اظہار کا ایک اور پہلو ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں علمی اور ظاہری تعلیم و تربیت کے ساتھ ہی آپ نے باطنی علوم میں بھی کمال حاصل کیا تھا اور اپنے والد محترم کے علاوہ مدینہ منورہ میں اپنے استاد شیخ ابوطاہر الکردی المدنی سے خرقہ جامع زیب تن کیا تھا۔ اسکے نتیجہ میں آپ کی باطنی حسیات اور تخیل اتنے ذکی الحس ہوگئے تھے کہ آپ ان واقعات کا تصور اس صراحت سے کر لیتے گویا اپنی ظاہری آنکھوں سے انکو دیکھ رہے ہوں۔ ساتھ ہی ساتھ آپ ان واقعات کو اس مہارت سے بیان کرتے کہ قاری کی آنکھوں کے سامنے اس واقعہ کی تصویر آجاتی ہے۔ ایسے ہی چند واقعات کا تذکرہ آپ نے اس طرح کیا ہے:

"وقد شاهدت ذٰلک مراراً منها ان ناساً تشاجروا فيما بينهم و تحاقدوا فالتجات الیٰ الله فرائت نقطة مثالية نورانية نزلت من حظيرة القدس الیٰ الارض فجعلت تنبسط شياً فشياً و كلما انبسطت زال الحقد عنهم فما برحنا

[1] حجۃ، صفحہ ۲۰۷، باب ۶۷۔

المجلس حتیٰ تلاطفوا ورجع کل واحدٍ منهم الیٰ ما کان من الا لفة و کان ذٰلک من عجیب اٰیات الله عندی. ومنها ان بعض او لادی کان مریضاً و کان خاطری مشغولاً بهٖ فبینما انا اصلیّ الظهر شاهدت موتهٖ نزل فمات فی لیالته"[1]

(اور میں نے متعدد مرتبہ اسکا مشاہدہ کیا ہے۔ انمیں سے ایک یہ ہے کہ چند لوگ آپس میں جھگڑا اور مناقشہ کر رہے تھے تو میں نے اللہ تعالیٰ سے التجا کی (کہ اسے دور کردے) تب میں نے ایک نورانی نقطۂ مثالیہ حظیرہ القدس سے زمین کی طرف اترتے ہوئے دیکھا جو لحظہ بہ لحظہ پھیلتا جاتا تھا۔ اور جیسے جیسے وہ پھیلتا جاتا انکا کینہ رفع ہوتا جاتا۔ ابھی مجلس برخواست نہیں ہوئی تھی کہ انمیں محبت پیدا ہوگئی اور انمیں سے ہر ایک اسی سابقہ الفت کی طرف لوٹ آیا اور یہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے میرے نزدیک ایک عجیب نشانی تھی۔

اور ان واقعات میں ایک یہ ہے کہ میرا ایک لڑکا بیمار تھا اور میری طبیعت اسی میں لگی ہوئی تھی۔ تو جبکہ میں نماز ظہر پڑھ رہا تھا میں نے اسکی موت کو اترتے دیکھا اور اسی رات اسکا انتقال ہوگیا۔)

شاہ صاحب کی متعدد تصنیفات میں اس قسم کے واقعات کا ذکر ملتا ہے جسکو ہم انکی روحانی ترقی کی معراج سے منسوب کر سکتے ہیں اور ان واقعات کے واضح بیان کو ادبی لحاظ سے ادب کے ایک مخصوص درجہ میں رکھ سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جاگتی آنکھوں سے دیدار اور آپؐ سے شرف گفتگو، مافوق الطبیعیاتی واقعات اور مراقبہ کی کیفیات کا بیان وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ آپکی تصانیف کے ادبی پہلو کے بارے میں گفتگو میں آپکی یہ تمام تحریریں شامل ہیں جن کو آپکے باطنی تجربات کا نتیجہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

جیسا کہ سابقہ اوراق میں بیان کیا جاچکا ہے شاہ صاحب نے قدیم کلاسیکی عربی ادب کا عمیق مطالعہ اپنے عرب کے قیام کے دوران کیا۔ اس سلسلہ میں دور جاہلیت اور مخضرمی دور کے شعراء کے اشعار بھی آپکی نظر سے گذرے آپ نے اپنی تصانیف خصوصاً حجۃ اللہ البالغہ میں ان شعراء کے اشعار نقل کئے ہیں جسکی وجہ سے انکی ادبی حیثیت دوبالا ہوگئی ہے۔

اسرار نماز کے بارے میں خضوع قلب اور تأدب جوارح کا بیان کرتے ہوئے آپنے کسی عربی شاعر کا شعر نقل کیا ہے جسکا نام تو نہیں لکھا صرف قال القائل لکھتے ہوئے آپ تحریر کرتے ہیں:[2]

---

[1] حجۃ، صفحہ ۱۲۳، جلد ۱

[2] حجۃ، صفحہ ۱۳۶، جلد ۱

افادتکم النعماء منی ثلاثة　　یدی و لسانی والضمیر المحجبا

آپ نے شعرائے جاہلیت میں امیہ بن ابی صلت اور زید بن عمرو بن نفیل کے اشعار نقل کئے ہیں۔ امیہ بن ابی صلت نے حاملین عرش کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:[۱]

رجل و ثور تحت رجل یمینہٖ　　والنسر للاخریٰ ولیث مرصد

والشمس تطلع کل آخر لیلة　　حمراء یصبح لونھا یتورد

تابیٰ فما تطلع لنافی رسلیھا　　اِلا معذبة و اِلا تجلد

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ اشعار سنے تو آپؐ نے فرمایا صدق۔ امن شعرہ' ولم یؤمن قلبہ'۔

زید بن عمرو بن نفیل نے حمد باری تعالیٰ کے بارے میں لکھا ہے:[۲]

عبادک یخطئون وانت رب　　یکفیک المنایا والحتوم

اور توحید کے بارے میں لکھا[۳]

اربا واحداً ام الف رب　　ادین اذا تقسمت الامور

ترکتُ الات والعزیٰ جمیعاً　　کذٰلک یفعل الرجل البصیر

شاہ صاحب کی تصانیف میں اختیار کردہ اسلوب میں نیرنگی پائی جاتی ہے۔ خود حجۃ اللہ البالغہ میں جہاں جز و اول کے بیشتر حصہ میں آپ نے موضوع کو تفصیلی انداز میں بیان کرتے ہوئے اطناب کا سہارا لیا ہے اور تشبیہات اور استعارات کے ذریعہ اپنا مفہوم واضح کیا ہے اور لمبے جملوں اور ترکیبات کا استعمال کیا ہے وہیں قسم ثانی میں جو جز و اول کے آخری حصہ اور جز و دوم پر محیط ہے آپ نے احکامات شریعت کے اسرار اور اعمال کے فلسفہ کو بیان کرنے کے لئے تخیل کے بجائے تفکر اور تدبر' دلیل و ثبوت کے بجائے وضاحت و تفسیر، پر پیچ جملوں کی جگہ چھوٹے چھوٹے جملے، عام فہم آسان الفاظ، حدیث و قرآن کے مطابق اسلوب بیان کا استعمال کر کے اپنی تحریر کو

---

۱ حجہ صفحہ ۲۴۴۔

۲ حجۃ، صفحہ ۲۴۵،

۳ ایضاً، صفحہ ۲۴۵: زید بن عمرو بن نفیل حضرت عمرؓ بن خطاب کے چچازاد بھائی تھے، اور ان لوگوں میں سے تھے جو بعثت نبویؐ سے پیشتر سے ہی بت پرستی سے متنفر تھے اور موحد تھے۔

علم الکلام کا ایک ایسا نمونہ بنا دیا ہے جسمیں روانی اور سلاست کے ساتھ ساتھ فہم وفراست کا امتزاج نہایت عمدہ اور دل نشین انداز میں کیا گیا ہے۔

اس حصہ میں شاہ صاحب کا اسلوب یہ ہے کہ آپ کسی موضوع (ایمانیات، اعمال، عمرانیات، وغیرہ) کی مناسبت سے احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم نقل کرتے ہیں اور پھر اسکے مصالح اور اسرار کا بیان عام فہم انداز میں کر دیتے ہیں اور ساتھ ہی اسکا فلسفہ بھی بیان کرتے ہیں۔ مثلاً طلب رزق کے باب میں تبرع وتعاون کے موضوع کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"قال رسول الله صلى الله عليه وسلم 'من صنع اليه معروف فقال لفاعله 'جزاک الله خيراً' فقد ابلغ فى الثناء' اقول انما عيّن النبى صلى الله عليه وسلم هٰذهِ اللفظة لان الكلام الزائد فى مثل هٰذاالمقام اطراءٌو الحاحٌ والناقص كتمانٌ وغمطٌ. واحسن ما يحيى بهٖ بعض المسلمين بعضاً مايذ كرالمعاد و يخيل الامرعلىٰ الله وهٰذه اللفظة نصابٌ صالح بجميع ماذكرنا"[1]

(فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے 'جس شخص کیساتھ کوئی بھلائی کرے تو اگر وہ بھلائی کرنے والے سے کہدے "جزاک اللہ خیرا" تو اسنے اسکی تعریف میں مبالغہ کر دیا (یعنی پوری پوری تعریف کردی)'۔

میں کہتا ہوں کہ آپنے یہ الفاظ اسلئے معین فرمائے کیونکہ اس جگہ اس سے زیادہ کلام (بات) حد سے زیادہ تعریف اور خوشامد ہے اور کم کہنا (احسان کو) چھپانا اور اسکا اظہار نہ کرنا ہے۔ اور کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان سے اس سے بہتر بات نہیں کہہ سکتا جو اسکو آخرت کی یاد دلائے اور اسکا دھیان اللہ کی طرف پھیر دے۔ اور یہ لفظ ایسا ہی عمدہ (صالح) طریقہ ہے جس میں وہ باتیں مجتمع ہیں جنکا ہم نے ذکر کیا ہے۔")

اسی طرح آپنے فلسفہ تصوف اور لطائف ثلاثہ (عقل، قلب اور نفس) کو مقامات واحوال کے بیان میں مقدمہ اولیٰ ومقدمہ ثانیہ کے تحت بیان کیا ہے اور اس سلسلہ میں احادیث بیان کی ہیں جنکے ذریعہ موضوع زیر بحث جو انتہائی پیچیدہ تصورات پر مبنی ہے پوری طرح واضح ہو کر آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔[2]

---

[1] حجۃ، صفحہ ۲۷۵۔ جلد ۲۔

[2] حجۃ، صفحہ ۱۹۷-۲۴۷، جلد دوم

ان سنجیدہ اور ادق تصورات کو بیان کرنے کے لئے آپ نے تشبیہ واستعارہ کا استعمال ایسی مہارت سے کیا ہے کہ قاری کی دلچسپی برقرار رہنے کے علاوہ جو بات آپ کہنا چاہتے ہیں وہ بہ آسانی ذہن نشین ہو جاتی ہے۔

لطائف ثلثہ: العقل، القلب اور النفس کا ذکر کرتے ہوئے انکا محل وقوع جسم انسانی میں تین اعضائے رئیسہ: دماغ، دل اور جگر کو بتا کر انکے باہمی تعلق کو تشبیہ کے ذریعہ اسطرح بیان کیا ہے۔

''کل واحد منهما بمنزلة ملک اهتم بأمر عظیم فی فتح القلعة ونحوه فاستمد من اخوانه بجیوش و دروع ومدافع و هو المدبر فی فتح القلعة و الیه الحکم و منه الرأی و انما هم خدم یمشون علیٰ رأیه فجائت صور الحوادث علیٰ حسب الصفات الغالبة فی الملک من جرأته و جنبه وسخائه وبخله و عدالته و ظلمه. فکما یختلف الحال باختلاف الملوک وآرائهم و صفاتهم و ان کانت الجیوش والآلات متشابهة فکذٰلک یختلف حکم کل رئیس من الرؤساء الثلٰثة فی مملکة بدن الانسان''۔[1]

(انمیں سے ہر ایک ایک بادشاہ کی طرح ہے جس نے کسی دشوار قلعہ وغیرہ کو فتح کرنے کے عظیم الشان کام کا بیڑا اٹھایا ہو، تو وہ (بادشاہ) اپنے دوستوں سے افواج، آلاتِ دفاع اور زرہ بکتر (ہتھیار) کی مدد مانگتا ہے۔ مگر اس قلعہ کی فتح کے سلسلہ میں وہ خود تدبیر کرنے والا ہوتا ہے، اسی کا حکم چلتا ہے اور اسی کی رائے پر (حملہ وغیرہ کا) دارومدار ہوتا ہے۔ اور وہ (ساتھی) صرف خدمت گار ہوتے ہیں جو اس (بادشاہ) کی رائے پر عمل کرتے ہیں۔ تو جو حادثات اور واقعات پیش آئیں وہ اس بادشاہ میں پائی جانے والی صفات غالب مثلاً اسکی جرأت وشجاعت، اسکی بزدلی وکمزوری، اسکی سخاوت وبخشش یا اسکے بخل، اسکے انصاف یا اسکے ظلم کے مطابق ہی ہوتے ہیں۔ پس جسطرح بادشاہوں اور انکی رائے اور انکی صفات کے اختلاف کی بناء پر حالات مختلف ہو جاتے ہیں اگرچہ لشکر اور ہتھیار یکساں ہی کیوں نہ ہوں، اسی طرح بدن انسانی کی مملکت میں ان تینوں رئیسوں میں سے ہر ایک رئیس کا حکم مختلف ہوتا ہے۔)

زبان اور خیالات پر آپکی گرفت اور آپکی قوت بیانیہ کا یہ ایک عمدہ نمونہ ہے۔

اور یہی آپکے اسلوب کا کمال ہے۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ: ج۔۲ صفحہ ۱۴۔۲۱۳

شاہ صاحبؒ کی دیگر تصانیف اور ادب میں انکا مقام

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی عربی تصانیف میں اگرچہ حجۃ اللہ البالغہ کو ایک مرکزی اور اہم مقام حاصل ہے بقول سید ابوالحسن علی ندوی :

''یہ کتاب اپنے موضوع پر بالکل منفرد و یگانہ ہے۔ اور عربی زبان اپنی وسعت کے باوجود اسکی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ یہ کتاب عربیت، بیان کی قوت اور زبان کی سلاست کا ایک ممتاز اور کامیاب نمونہ ہے۔''[1]

لیکن آپ کی ادبی حیثیت کو متعین کرنے کے لئے آپکی دیگر تصنیفات بھی کم درجہ نہیں رکھتیں۔

موضوع کے لحاظ سے آپ کی تصانیف **الانصاف فی بیان سبب الاختلاف، العقد الجید فی احکام الاجتهاد و التقلید ،البدور البازغة** اور **الخیر الکثیر** ایک لحاظ سے حجۃ اللہ البالغہ کے تتمہ اور تسلسل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ خصوصاً 'الانصاف' تو حجۃ اللہ البالغہ کے جزو اول کے تتمہ کے چار ابواب 'اسباب **اختلاف الصحابة و التابعین فی الفروع** '۔ 'اسباب **اختلاف مذاهبهم الفقهآء**'. '**الفرق بین اهل الحدیث و اصحاب الرأی** '۔ اور 'حکایة حال **الناس قبل المائة الرابعة و بعدها**' پر ہی منحصر ہے اور ان ابواب کو تھوڑی ردوبدل اور اضافہ کے ساتھ ایک علیحدہ تصنیف کی شکل دیدی گئی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ حجۃ میں خاص موضوع اسرار شریعت ہے جبکہ الانصاف کا موضوع تاریخ مذہب وفقہ ہے۔ چنانچہ جیسا کہ عنوانات سے ظاہر ہوتا ہے الانصاف میں صحابہ' تابعین اور فقہاء کے فروعی اختلافات' انکے حل اور آپس کے تعلق و تطبیق کے بارے میں سیر حاصل بحث ہے۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں اسکی کیا اہمیت ہے؟ تقلید کی تاریخ کیا ہے؟ تقلید کس حد تک اور کن حالات میں درست ہے اور کب تقلید کو ترک کرنا ضروری ہے؟ غرض کہ اس قبیل کے تمام سوالات کے جوابات اس تصنیف میں پیش کئے گئے ہیں۔

اسلوب کے لحاظ سے اس تصنیف کا انداز خالصتاً علمی اور تحقیقی ہے۔ باوجود اطناب موضوع کے آپنے اس میں اپنے تخیل اور قلم کو قابو میں رکھا ہے۔ اور ادبی لحاظ سے اسکو سجع وحسن کلام کی مصنوعی آراستگی سے دور رکھا ہے۔ اور موضوع کی سنجیدگی کا پورا خیال رکھتے ہوئے وہی زبان اور انداز اختیار کیا جو مورخ ومحقق اپنی تحریر میں کرتا ہے۔

---

[1] ہندوستانی مسلمان: سید ابوالحسن علی ندوی: ۱۹۶۷ء صفحہ ۴۰

الانصاف کیونکہ دراصل حجۃ اللہ البالغہ کا ہی ایک حصہ تھا جو موضوع کے لحاظ سے کچھ ردوبدل کے ساتھ الگ کتابی شکل میں ترتیب دیدیا گیا ہے اس لئے اسکے اسلوب وغیرہ کے بارے میں سابقہ صفحات میں تذکرہ کیا جاچکا ہے۔ صرف اتنا اور عرض کرنا ہے کہ یہاں اطناب کے لئے شاہ صاحب نے اپنی بات کی تائید میں دیگر علمائے سابقین کی کتابوں سے طویل اقتباسات نقل کئے ہیں اور ثبوت میں انکی آراء کو ظاہر کیا ہے۔ مثلاً استنباطِ مسائل فقہ و مذہب کے سلسلہ میں جس جگہ آپنے مجتہد کی اقسام ـــــ مجتہد مطلق مستقل، مجتہد مستقل منتسب (جو کسی سابقہ عالم کے مذہب سے نسبت رکھتا ہو) اور مجتہد فی المذہب (جو اس مذہب کا اتباع کرتے ہوئے مسائل کا استخراج کرے اور اپنی طرف سے کوئی بات نہ کہے) ـــــ بیان کی ہیں، وہاں انہوں نے فقیہ ابن زیاد شافعی یمنی کا ایک نہایت طویل اقتباس نقل کیا ہے جو کئی صفحات پر محیط ہے۔ جسمیں ابن زیاد نے بلقینی کے ان اعتراضات کا جواب دیا ہے جو امام شافعی کے خلاف تھے اگر چہ خود بلقینی مجتہد مستقل منتسب (بہ امام شافعی) تھے۔ اس لمبے اقتباس میں دیگر علمائے سابق جیسے ابو زرعہ، جلال الدین سیوطی، امام غزالی وغیرہ کے اقوال اقتباس در اقتباس کے طور پر درج کئے گئے ہیں۔ اور ابن جریر اور امام بخاری وغیرہ کا ذکر کیا ہے جو اگر چہ منتسب تھے (کیونکہ انکے ساتذہ امام شافعی کے ہی شاگرد تھے) مگر اپنے علوم کی وسعت وانفرادیت کی بناء پر منفرد ہو کر مستقل ہو گئے۔

اس اقتباس کے علاوہ شاہ صاحب نے کتاب انوار اور دیگر کتب سے اپنی تائید میں مضامین نقل کئے ہیں یہ تمام اقوال، حوالہ جات اور اقتباسات شاہ صاحب نے اس خوبصورتی سے اپنی تحریر میں سموئے ہیں کہ اس سے تحریر کے تسلسل میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں پڑتا اور پڑھنے والے کو ایسا لگتا ہے گویا کہ ان تمام حضرات نے اپنی تحریریں خاص اسی موقعہ کے لئے اور شاہ صاحب کی بات کی تائید کیلئے ہی لکھی ہوں۔ یہی آپکی قوت علم اور قوت بیان کی خصوصیت ہے۔

اپنی اس تصنیف میں جہاں حتیٰ المقدور شاہ صاحب مصنوعی طرز بیان اور اسلوب سے کترائے ہیں وہیں آپنے زور بیان کے اظہار کے لئے لطیف اور عمدہ استعارات اور تشبیہات کا سہارا بھی لیا ہے مثلاً علم واجب کے حصول کے طریقوں کے بارے میں لکھتے ہوئے آپ کہتے ہیں:

"فاذا کان للواجب طرق متعددة وجب تحصیل طریق من تلک الطرق من غیر تعین واذا تعیّن له' طریق واحد وجب ذلک الطریق بمخصوصة"[1]

(۱) الانصاف فی بیان سبب الاختلاف، صفحہ ۶۹

(جب واجب کے چند طریقہ ہوں تو انمیں سے ایک غیر معین طریقہ پر اسکا حاصل کرنا ضروری اور واجب ہے اور جب اسکا ایک ہی طریقہ ہو تو خاص اسی طریق کا حاصل کرنا واجب ہے)

اسکی تشبیہ آپنے بھوک سے بیتاب، روزی کی تلاش میں منہمک شخص سے اسطرح دی ہے:

"کما اذا کان الرجل فی مخمصة شدیدة یخاف منها الهلاک و کان لدفع مخمصة طرق من شراء الطعام والتقاط الفواکه من الصحراء و اصطیادما یتقوت به وجب تحصیل شئی من هٰذه الطرق لاعلیٰ التعیین، فاذا وقع فی مکان لیس هناک صید ولا فواکه وجب علیه بذل المال فی شراء الطعام"[1]

(جیسے کہ جب کوئی شخص سخت بھوک کی تکلیف میں مبتلا ہو جس سے اس کے ہلاک ہونے کا اندیشہ ہو اور اس تکلیف کو دور کرنے کے چند طریقہ ہوں جیسے کھانا مول لینا، جنگل سے میووں کا چننا اور غذا کے حصول کے واسطے شکار کرنا۔ بس ان طریقوں میں سے کسی ایک غیر معین طریقہ کے استعمال سے اس کا بہم پہنچانا (اور بھوک مٹانا) واجب ہے۔ مگر جب بھوکا شخص ایسی جگہ پر ہو کہ وہاں شکار اور میوے نہ ہوں تو اس پر مال خرچ کر کے کھانے کو خریدنا واجب ہے۔)

مجتہدین کے درجہ کو بیان کرنے کے لئے آپنے طبیبوں اور شعراء کا استعارتاً ذکر کیا ہے:

"وکذالک کل من نظم الشعر فی هٰذه الازمنة اما ان یقتدی فی ذٰلک باشعار العرب ویختار اوزانهم و قوافیهم و اسالیب قصائد هم اوباشعار العجم فهم بمنزلة المجتهد المستقل، ثم ان کان هٰذا الشاعر مخترعاً لانواع من الغزل والتشبیب و المدح والهجو والوعظ واتیٰ بالعجب العجاب فی الاستعارات والبدائع ونحوها ممالم یسبق الیٰ مثله بل تنبه لذالک من بعض صنائعهم فاخذ النظیر بالنظیر وقاس الشیئی بالشئی واقتدرعلیٰ ان یخترع بحراً لم یتکلم فیه من قبله اواسلوباً جدیداً کنظم المثنوی والرباعیة ورعایة الردیف اعنی کلمة تامة یعید هافی کل بیت بعد القافیة یفعل کل ذٰلک فی الشعر العربی فهو بمنزلة المجتهد المطلق المنتسب وان لم یکن مخترعاً و

[1] الانصاف: صفحہ ۶۹-۷۰

انما یتبع طرقهم فقط فهو بمنزلة المجتهد فی المذهب"[1]

(اور اسی طرح جو کوئی اس زمانہ میں شعر نظم کرتا ہے، تو اگر وہ اس بارے میں شعرائے عرب کا اقتدا کرتا ہے اور انکے اوزان اور قافیوں اور قصائد کے اسلوب اور طرز کو پسند کرتا ہے یا شعراء عجم کا اقتدا کرتا ہے تو وہ لوگ تو مجتہد مستقل ہیں۔ پھر اگر یہ شاعر اقسام غزل، تشبیب، مدح، ہجو اور وعظ کا موجد ہو اور استعارات اور بدائع کو عجیب وغریب ڈھنگ سے لائے کہ اس سے پہلے کسی نے ایسا نہ کیا ہو بلکہ خود اس نے ان (سابقہ ماہرین فن) کی صنائع سے واقف ہو کر وہ ڈھنگ نکالا ہو اور نظیر کو نظیر پر ڈھالا ہو اور ایک چیز کو دوسری پر قیاس کیا ہو اور اس بات پر قادر ہو کہ ایسی بحر ایجاد کرے جسمیں پہلے کسی نے کچھ نہیں کہا یا کوئی نیا اسلوب نکالے مثلاً مثنوی اور رباعی کا بنانا اور ردیف کا التزام کرنا یعنی کسی پورے کلمہ کو ہر بیت میں قافیہ کے بعد مکرر لانا اور یہ سب باتیں شعر عربی میں کرے تو وہ مجتہد مطلق منتسب کے بمنزل ہے اور اگر شاعر حال موجد نہیں بلکہ صرف پہلے شاعروں کے طریقوں کی پیروی کرتا ہے تو وہ مجتہد فی المذہب کے بمقام ہے)

تقلید محض کی مثال دیتے ہوئے آپ تشبیہ کا سہارا لیتے ہیں:

"انهم اطمانوا بالتقليد و دب التقليد فی صدور هم دبيب النمل و هم لا يشعرون"[2]

(ان لوگوں نے تقلید پر اطمینان کر لیا اور تقلید انکے سینوں میں چیونٹی کی طرح گھس گئی اور انکو خبر نہ ہوئی)

اس سنجیدہ موضوع میں موقعہ کی مناسبت سے آپ اشعار کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ امام شافعی کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے آپ لکھتے ہیں:

وکن طُفيليهم علی ادب　　فلا اری شافعاسوی الادب[3]

(ادب کی راہ سے یا ادب کے ساتھ ان حضرات (امام شافعی اور انکے اصحاب) کا طفیلی بن۔ ادب کے سوا میں اپنا کوئی سفارشی نہیں پاتا۔)

---

[1] الانصاف: صفحہ ۷۵-۷۶

[2] الانصاف، صفحہ ۸۸۔

[3] ایضاً، صفحہ ۸۰

یہاں امام شافعی کے نام کی مناسبت سے شافعاً (سفارشی) کا استعمال آپ کی فصاحت وبلاغت کی جانب اشارہ کرتا ہے غرضکہ جہاں الانصاف ایک سنجیدہ کتاب ہے وہیں ادبی حیثیت سے بھی یہ ایک بلند پایہ تحریر بن گئی ہے۔

اجتہاد وتقلید کے موضوع پر شاہ صاحب نے ایک اور کتاب 'العقد الجید فی احکام الاجتهاد و التقلید' کے عنوان سے تحریر کی ہے۔ جہاں 'الانصاف' میں آپ نے تدوین فقہ اور اجتہاد وتقلید کی تاریخ بیان کی ہے اسپر سیر حاصل بحث کی ہے وہیں 'العقد الجید' میں آپکا موضوع مصالح اجتہاد وتقلید ہے۔ اس کتاب کے چار باب ہیں جسمیں اجتہاد وتقلید کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اجتہاد کی کیا شرعی تعریف ہے؟ مجتہد کی کیا خصوصیات ہیں اور اجتہاد کی کیا شرائط ہیں؟ ایک عامی کو کس حد تک اور کس کی تقلید کرنی چاہئے؟ کس موقع پر تقلید فرض ہے اور کہاں حرام ہے؟ مختلف فقہی مذاہب کی موجودگی میں کوئی شخص کیا مختلف مسائل میں الگ الگ فقہی مسلک پر عمل کر سکتا ہے یا اسپر مجبور ہے کہ کسی ایک فقہ کی پابندی کرے؟ خصوصاً جبکہ دوسرے مسلک میں اسکو کوئی شرعی سہولت میسر ہو؟ آیا کوئی شخص بغیر کسی مسلک کی تقلید کے اپنی مرضی کے مطابق مذہب پر عمل کر سکتا ہے؟ اور علماء اور مفتی حضرات کو مسائل کے حل کے لیے کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہئے، اور اس سلسلہ میں انکا کیا فرض ہے؟ 'العقد الجید' میں ان سوالوں کے جواب فراہم کیے گئے ہیں۔

دراصل 'العقد الجید' 'الانصاف' کا ہی تتمہ وتکملہ ہے۔ الانصاف میں شاہ صاحب نے چاروں مذاہب فقہ اور اہل سنت والحدیث کے فروعی اختلافات کو واضح کرنے کے لئے انکا تاریخی اور تنقیدی تجزیہ کیا ہے۔ جبکہ 'العقد الجید' میں ان تمام مذاہب فقہ اور اختلافات کے باوجود، علماء اور عام مسلمانوں کے لئے راہ عمل متعین کی ہے۔

شاہ صاحب نے اپنے مزاج اور ذوق کے مطابق جو راہ اختیار کی ہے وہ تطبیق کی ہے۔ بقول عبدالمجید سالک:

> ''آپ مذاہب اربعہ میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ کسی ایک کی جانب داری اور دوسرے مذاہب کی نکتہ چینی انہوں نے نہیں کی بلکہ جو حکم کسی مذہب کا انہیں باعتبار استدلال یا استحسان پسند آیا اسکو بے تکلف اختیار کرلیا۔''[1]

---

[1] مسلم ثقافت ہندوستان میں مصنفہ عبدالمجید سالک: صفحہ ۶۱۲

استخراج احکام فقہی کے سلسلہ میں شاہ صاحب چاروں اماموں کو یکساں طور پر معتبر سمجھتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ آپنے تاریخی اعتبار سے انکو ایکدوسرے سے بأعتبار استاد وشاگرد الگ درجہ پر رکھا ہو۔ اسی لئے انکا خیال ہے کہ علمائے وقت ان ائمہ میں سے کسی ایک کا قول کسی مصلحت کی وجہ سے اختیار کریں تو بالکل جائز ہوگا۔

لیکن ایک عامی کے لیے 'لزوم مذهب معينه' کے قائل ہیں کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتو جس ملک میں شرع رائج ہے وہاں کا نظام درہم برہم ہوجائے گا اور ایک عام مسلمان کے گلے سے مذہب کا قلادہ نکل جائے گا۔ ایسے حالات میں ایک عامی پر تقلید فرض ہوجاتی ہے۔ دوسری جانب اگر تقلید کا مفہوم یہ ہوجائے کہ قرآن وحدیث اور نصوص کے علیٰ الرغم کوئی شخص، خواہ وہ کتنا ہی بڑا عالم یا فقیہ ہو، کوئی حکم دے جو صریحاً خلاف قرآن وحدیث ہوتو اس حکم کی پابندی جائز نہیں اور اس صورت میں تقلید حرام ہے۔ کیونکہ ایسے مقلد کو جب کوئی صحیح وصریح حدیث بھی پہونچ جاتی ہے جس سے فقیہ کے قول کی تردید ہوتو مقلد پھر بھی اسکو نہیں چھوڑتا۔

'العقد الجيد' میں آپنے امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے اقوال نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

"وروى الحاكم والبهيقي عن الشافعي انه كان يقول 'اذا رأيتم كلامي يخالف الحديث فاعملوا بالحديث و اضربوا بكلامي الحائط'۔

وكان رحمة الله عليه يقول 'لاحجة في قول احدٍ دون رسول الله صلى الله عليه وسلم وان كثروا'

وكان الامام احمد يقول 'ليس لا حدمع الله و رسوله كلام'"۔[1]

(اور روایت کی حاکم اور بیہقی نے امام شافعیؒ سے کہ وہ فرماتے تھے کہ 'اگر تم میرا قول پاؤ جو حدیث کی مخالفت کرتا ہوتو حدیث پر عمل کرو اور میرا قول دیوار پر ماردو'۔

اور آپؒ کہتے تھے کہ 'کسی شخص کے قول کی کوئی حجت نہیں سوائے قول رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اگرچہ ایسے اقوالِ غیر کثرت سے ہوں'۔

اور امام احمدؒ فرماتے ہیں 'کسی کو حکم خدا اور رسول کے ساتھ کلام کرنے کی گنجائش نہیں'")

شاہ صاحب حل مسائل اور جزئیات کے بارے میں تشدد کے قائل نہیں بلکہ سہولت اور وسعت پسند کرتے ہیں اور آپنے اس طریقہ کو طریقۂ رسول بتایا ہے۔

---

[1] العقد الجید صفحہ ۸۰۔۸۱

چنانچہ آپ مجتہد کو بھی اسی طرح کا مشورہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''فلو كان حافظاً للا قاويل المختلفة للمجتهدين ولا يعرف الحجة ولاقدرة له علىٰ الاجتهاد للترجيح لا يقطع بقول منها ولا يفتي به بل يحكيها للمستفتي فيختار المستفتي مايقع في قلبهٖ انه الا صواب. ذكره في بعض الجوامع و عندي انه لا يجب عليه حكاية كلّها بل يكفيه ان يحكي قولاً منها.''[1]

(اور اگر فتوہ دہندہ مجتہدوں کے اقوال مختلفہ (کسی مسئلہ کے بارے میں) یاد رکھتا ہو۔ مگر حجت قول کی نہیں جانتا اور نہ خود اجتہاد پر قادر ہے کہ کس قول کر ترجیح دے تو اس صورت میں انمیں سے کسی قول کے مطابق فیصلہ، قطعی نہ کرے اور نہ اسپر فتویٰ دے بلکہ تمام اقوال کو فتویٰ خواہندہ کے لئے نقل کر دے کہ وہ ان میں سے ایسا قول چھانٹ لے جو اسکے دل میں صواب تر معلوم ہو۔ اسکو بعض جوامع کتابوں میں ذکر کیا ہے اور میرے نزدیک یہ ہے کہ اس (مفتی) پر سب اقوال کا نقل کرنا واجب نہیں بلکہ اسکو کافی ہے کہ صرف ایک قول کو سب اقوال میں سے نقل کر دے۔)

کتاب کے آخر میں آپنے لکھا ہے:

''فكون الانسان متتبع ماهو اخفّ علىٰ نفسهٖ من قول مجتهد يسوغ له الاجتهاد ما علمت من الشرع ضمه عليه. وكان صلىٰ الله عليه وسلم يحبّ ما خفّف عن امتهٖ. والله سبحانه اعلم بالصواب''[2]

(اگر انسان کسی مجتہد کے، جسکو اجتہاد جائز ہو، ایسے قول کی جستجو کرے جو اس کے نفس پر سہل ہو تو، ہمکو معلوم نہیں کہ شرع نے اس عمل پر اسکی برائی کی ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ جو باتیں آپ کی امت پر سہولت کی ہوں انہی کو دوست رکھتے تھے۔)[3]

العقد الجید کیونکہ الانصاف کے تسلسل کا ہی ایک حصہ ہے اسلیے اسلوب کے لحاظ سے اس تصنیف میں آپنے وہی اسلوب اپنایا ہے جو 'الانصاف' اور حجة الله البالغة کے لیے اپنایا ہے فرق صرف یہ ہے کہ یہاں آپ مورخ یا محدث کے بجائے ماہر علوم دین اور اصول فقہ اسلامی (Islamic Jurisprudence)

---

[1] العقد الجید صفحہ ۹۰۔۹۱

[2] ایضاً صفحہ ۹۳

[3] سلک مروارید ترجمہ العقد الجید مترجمہ مولانا محمد احسن صدیقی نانوتوی، صفحہ ۷۲؛ رود کوثر، صفحہ ۵۶۲

کی باریکیوں سے بخوبی آگاہ نظر آتے ہیں۔ اور قانون اسلام یعنی قرآن وحدیث کے بنیادی اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے دلائل اور مثالوں کا سہارا لیتے ہیں۔ 'العقد الجید' میں 'حجۃ' جیسا اطناب یا تشبیہوں اور مترادفات وغیرہ کا یا 'الانصاف' جیسا علماء سابق کی تحریروں سے اقتباس کا استعمال نظر نہیں آتا۔ بلکہ مختصر مگر مدلل انداز تحریر ملتا ہے۔ کسی بامقصد تحریر میں تخیل کی کارروائی کم سے کم ہوتی ہے۔ اسی لحاظ سے علمی موضوعات میں آپنے اپنے قلم کو تخیلانہ پرواز سے روک کر سنجیدہ اور مدلل مگر موقعہ کے لحاظ سے مؤثر انداز اختیار کرنے پر مجبور کیا ہے۔ یہی آپکا مخصوص طرز ہے۔

اسکے برخلاف البدور البازغہ میں حجۃ کے مضامین کو فلسفیانہ اور کلامیانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے اوران میں وہ مضامین بھی شامل ہیں جنکو علماء اور حکماء نے بیان نہیں کیا۔ ادبی اعتبار سے البدور البازغہ کو حجۃ اللہ البالغہ سے علیحدہ کوئی حیثیت نہیں دی جاسکتی سوائے اس بات کے کہ البدور البازغہ میں بیان کردہ تشریحات کا انداز زیادہ فلسفیانہ ہے اور ایک نوع سے حجۃ اللہ البالغہ کے اجمال کی تفصیل ہے۔ لیکن حجۃ کے جزو اول کی طرح اسمیں تشبیہات واستعارات اور امثال وغیرہ کا سہارا لیکر اطناب کی کوشش نہیں کی گئی اور نہ ہی جزو دوم کی طرح احادیث کے اسرار کو حل کرنے اور شریعت کے رموز کو عام فہم انداز سے ظاہر کرنے کا عزم کیا ہے۔ بلکہ اس کتاب میں فلسفیانہ انداز اختیار کرتے ہوئے انہیں موضوعات کو ایک نئے پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی آپ کے علمی تبحر اور فکر کی گہرائی وگیرائی کا ثبوت ہے۔

البدور البازغہ ایک مقدمہ اور تین مقالات پر مشتمل ہے اور حجۃ اللہ البالغہ کی طرح سب سے پہلے تخلیق کائنات، احکامات فطری جو آدم کی سرشت میں ودیعت کئے گئے ہیں انکا ذکر ہے۔ اسکے بعد وہی مباحث جو حجۃ میں 'ارتفاقات' اور 'تدبیر منزل' کے عنوانات سے بیان کئے گئے تھے انکا دلائل کے ساتھ بیان ہے جسمیں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ امام یا بادشاہ کو معاشرہ کو قابو میں رکھنے اور انتظامات حکومت سے روبراہ ہونے کے لئے کن چیزوں اور کس قسم کے معاونین کی ضرورت ہوتی ہے۔ گویا کہ آپ نے فلسفہ حکومت کو دینی احکامات کی روشنی میں بیان کیا ہے۔[1] اس آپکے حسن کلام کے جوہر کھل کر سامنے آتے ہیں۔ ادبی اعتبار سے البدور البازغہ اپنے موضوع میں ایک گرانقدر اور مفید اضافہ ہے۔

البدور البازغہ میں اگرچہ آپکا موضوع حجۃ اللہ البالغہ کے موضوع سے ملتا جلتا ہے مگر یہاں آپکا اسلوب حجۃ کے اسلوب سے مختلف ہے۔ حجۃ میں جہاں آپنے قرآن وحدیث کے اسرار بیان کئے ہیں

---

[1] البدور البازغہ۔ مترجمہ قاضی مجیب الرحمٰن، لاہور، ۲۰۰۰ء

وہیں البدور البازغہ میں انسانی اخلاق، معاشرت، معیشت کے اصول بیان کرتے ہوئے انکو مسائل حکمت سے تعبیر کیا ہے اور انسانی معاشرہ پر انکے اثرات کا ذکر کیا ہے۔

تصنیف کی ابتدا میں لکھتے ہیں:

''امابعد- فیقول العبد الضعیف المدعو بولی الله بن عبدالرحیم عامله الله بلطفه الجسیم. هٰذهٖ تفهیمات الٰهیة فاضت من عنایة الرحمٰن الیٰ الجنان ثم الیٰ اللسان ثم الیٰ البیان واقتضت فی هٰذاالزمان ان تعانق البرهان سمیتها بالبدور البازغة و رتبتها علیٰ فاتحة وثلاث مقالات..... وسألت الله ان ینفع بها عبادهٖ. حسبی الله و نعم الوکیل ولاحول ولا قوة الا بالله العلی العظیم''[1]

ادبی لحاظ سے البدور البازغہ میں بھی آپ نے اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں۔ معیشت انسانی کو بیان کرتے ہوئے آپ لکھتے ہیں:

''الحکمة المعاشیة ان تستوافی حوائجک علیٰ مراعاة مقتضیٰ الاخلاق الفاضلة من الدیانة والسمت الصالح و غیرهما و مقتضی العلوم التجاربیة والرائی الکل. ولها ابواب منها الاکل و الشرب والنظافة والزینة و اللباس والمسکن و المشیٰ و العقود والسفر و الکلام والمنام والجماع و المرض و المصائب و تلک اعمد تها و اصولها.... فالاکل و الشرب....''[2]

(معیشت کی حکمت یہ ہے کہ تم اپنی ضروریات زندگی کو اخلاق فاضلہ میں دیانت اور صالح کردار وغیرہ اور علوم میں تجربہ اور پختہ رائے کے ذریعہ سنوارو، اور اسکے متعدد ابواب ہیں: انمیں اکل و شرب، صفائی ستھرائی اور زینت، پہننے اوڑھنے، رہنے سہنے، چلنے پھرنے، معاملات و معاہدات کرنے، سفر، بات چیت، سونے جاگنے، شادی بیاہ، مرض و مصائب کے آداب وقواعد شامل ہیں۔ اور یہ تمام معیشت کے اصول وقواعد ہیں..... اکل وشرب میں.....)

افراد اور معاشرہ میں تعلق کو تشبیہ کے ذریعہ اس طرح ظاہر کیا ہے۔

---

[1] البدور البازغہ: مخطوطہ در مولانا آزاد لائبریری: صفحہ ۴

[2] ایضاً صفحہ ۷۸

"والا فراد الانسان کالا عضاء للعناية الازلية المنعقدة فی صورة نوع الانسان فاذا صحّت الاعضاء کلها بالغرض فهو الصحة التامة و الاعتدال الحقيقی و هو کالممتنع"[۱]

(اللہ تعالیٰ کی عنایت ازلی جو نوع انسانی کی شکل میں پیوست ہوگئی ہے (جم گئی ہے) کے واسطے افراد (انسانی) مثل اعضاء کے ہیں۔ اگر تمام اعضاء صحت مند ہوں تو وہ صحت تامہ اور اعتدال حقیقی ہوگا۔ اور یہ حالت انتہائی دشواری سے حاصل ہوتی ہے)

اخلاق انسانی کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

انما الاخلاق بالاحوال لا بالعلوم[۲]

(اخلاق انسانی حالات (environment) کا نتیجہ ہوتے ہیں نہ کہ علوم (سیکھنے) learning کا)

یہ ایک انتہائی اہم نفسیاتی نکتہ ہے جو اس تعلق کی نشاندہی کرتا ہے جو انسان کے اخلاق (عادات واطوار) اور اسکے احوال (حالات environment) میں پایا جاتا ہے۔ اسکی مثال آپ اسطرح دیتے ہیں۔

"اذا کان الرجل ظريفاً فی الطبع و ذاسمت و دخل الوهن فی ظرافته و حصل منها حب التزين بزينة النساء و التسمت بسمتهن فيتکلم بکلا مهن ويتأدب بادابهن ويحب کل صناعة فيها ميل الیٰ الخفة و الطرب و التلذذ"[۳]

(اگر کوئی مرد بالطبع ظریف اور سمجھدار ہو تو اگر اسکی ظرافت میں کمزوری (چھچھورپن) داخل ہو جائے اور اسکی وجہ سے اسمیں عورتوں کی طرح سجنے سنورنے کی عادت ہو جائے اور وہ ان (عورتوں) کا طریقہ اختیار کرے تو وہ انکی طرح بولنے لگتا ہے اور انہیں کے کردار واطوار اختیار کر لیتا ہے اور ان تمام کاموں اور پیشوں کی جانب مائل ہو جاتا ہے جسمیں ہلکا پن، طرب اور لذت پسندی پائی جائے۔(۱))

---

۱ البدور البازغہ (مخطوطہ) صفحہ ۶۸

۲ و ۳ ایضاً صفحہ ۵۶

(۱) جیسے ناچنا گانا، نقل اتارنا وغیرہ۔

اس اخلاقی کجی کو جو کچھ مردوں میں پائی جاتی ہے آپنے حجة اللہ البالغہ میں بھی بیان کیا ہے۔لیکن وہاں آپکا انداز دوسرا ہے۔اس جگہ آپنے فطرت انسانی پر صحبت کے اثرات کو واضح کرنے کے لئے اس لڑکے کی مثال دی ہے جو عورتوں کی صحبت میں پلنے بڑھنے کی بناء پر جوانی میں انہیں کے شوق اور عادات اختیار کر لیتا ہے اور انہیں کی زبان میں بات کرنے لگتا ہے۔جو خلاف فطرت امر ہے۔

اسی طرح ارتفاقات کا موضوع جس پر آپنے حجة اللہ البالغہ میں تفصیلی روشنی ڈالی ہے،البدور البازغہ میں بھی اسکو دوسرے انداز میں پیش کیا ہے:

''فکن من الجاهرين بانحصار الغرض الالٰهی من قبل الانسانية فی شيوع هٰذهٖ الملة وظهورها تارةً علیٰ و طيرة الارتفاق الثالث و تارةً علیٰ وطيرة الارتفاق الرابع..... ومن مقاصد شرع رسول الله صلی الله عليه وسلم ابراز الدين الحنيفی و اظهارهٖ علیٰ وطيرة الارتفاق الرابع بان لا يوجد علیٰ وجه الارض الاّ وقد غلبه الدين الحنيفی بحيث لايمكن له مقاومته..... ولما كان هٰذاالاظهار مثل تسلط اسكندر بار تفاق الرابع ويزيد عليه بانه يقصد بهٖ ابقاء الدين علیٰ وجه طول الزمان وادامه التسلط غضاً طرياً وجب من هٰذاالسبيل الامور منهاابطال الملل واعدائها والجزرعن الخوض ومنها ايجاب التمذهب بهٰذاالمذهب''[1]

(پس اللہ تعالیٰ کے مقصد کو پورا کرنے کے لیے انسانیت کے سامنے بلند بانگ آواز میں اس ملت کی اشاعت اور اظہار کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔جو کبھی ارتفاق ثالث (قومی حکومت) کی شکل میں ہو اور کبھی ارتفاق رابع (بین الاقوامی حکومت) کی شکل میں ہو.....اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شرع کے مقاصد میں سے ایک مقصد دین حنیفی کا اعلان و اظہار بشکل ارتفاق (سارے جہاں پر دین کا غلبہ) ہے۔اس طرح کہ زمین کی پشت پر کوئی ایسا نہ رہے جس پر دین حنیفی کا ایسا غلبہ نہ ہو جائے کہ اس سے مقابلہ کی کسی میں سکت نہ رہے..... اور جب یہ غلبہ ارتفاق رابع کی شکل میں سکندر کے تسلط جیسا ہو جائے اور اس پر مزید برآں یہ ہو کہ غلبہ رہتی دنیا تک دین کے ابقاء (باقی رکھنے) اور اسکے تسلط کو ہمیشہ کے لیے شاداب و سرفراز رکھنے کے لیے

[1] البدور البازغہ (مخطوطہ) صفحہ ۳۳۴

ہو۔ اس جدوجہد کے لئے کئی امور ضروری ہیں۔ انمیں دیگر ملتوں اور اس مذہب (حنفی) کے دشمنوں کا استیصال وابطال کرنا اور بیہودہ باتوں (افعال) سے روکنا، اور انمیں تمام لوگوں کو اس مذہب کے قبول کرنے پر آمادہ کرنا ہے۔)

اسی بات کو حجة الله البالغه میں اسطرح بیان کیا گیا ہے:

''واعلم ان النبی صلیٰ الله علیه وسلم بعث بالخلافة العامة وغلبة دینه علیٰ سائر الادیان لایتحقق الاّ بالجهاد واعداد الاته.''[1]

(جان لو کہ نبی صلیٰ اللہ علیہ وسلم کی بعثت عامہ اور آپکے لائے ہوئے دین کے تمام ادیان پر غلبہ کے لیے ہے جو جہاد اور آلات (حرب ودفاع) کے جمع کے بغیر پوری نہیں ہوسکتی۔)

یہی بات دیگر موضوعات کے بارے میں کہی جاسکتی ہے جنکو بار بار مختلف انداز میں دہرایا گیا ہے۔ اس طریقہ سے بات واضح اور اثر پذیر ہوجاتی ہے۔

ادبی نکتہ سے اگر حجة الله البالغه اور البدور البازغه کا مقابلہ کیا جائے تو شاہ صاحب کی قوت بیانیہ کا بخوبی اظہار ہوتا ہے۔ ایک ہی موضوع کو دو مختلف انداز میں بیان کرنا اور اس طرح بیان کرنا کہ اگرچہ خیالات میں توارد ہو اور الفاظ یکساں یا مشابہ ہو مگر دونوں تحریروں کا مقصد اور سیاق کلام جدا ہو، یہ مصنف کی صلاحیت اور قابلیت کا کمال ہے۔ دراصل شاہ صاحب نے اپنی تحریر میں قرآنی اسلوب کی پیروی کی ہے(۱) اور آپکی عبارات میں قرآنی طرز تکلم کا بھی اثر ہے۔ یہ آپ کی قرآن فہمی اور عمیق مطالعہ کا نتیجہ ہے۔

---

[1] حجة اللہ البالغہ (معہ ترجمہ شموس اللہ البازغہ) صفحہ ۴۱۵

(۱) نوٹ:- اگر ہم قرآن پر اس انداز سے غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ قرآن مجید میں عموماً اور جہاں قصص انبیاء کا ذکر ہے وہاں خصوصاً لفظی ومعنوی توارد وتشابہ پایا جاتا ہے۔ جگہ جگہ ایک بات کو بار بار دہرایا گیا ہے مگر ہر بار سیاق وسباق کے لحاظ سے انداز جدا ہے اور مقصد مختلف ہے۔ اس اسلوب کو خود قرآنی الفاظ میں اسطرح فرمایا گیا ہے: ولقد صرفنا للناس فی هٰذا القرآن من کل مثل (سورۃ بنی اسرائیل آیۃ ۸۹) (اور ہم نے لوگوں کے سمجھانے کے لئے اس قرآن میں ہر قسم کا مضمون طرح طرح سے بیان کیا ہے) دوسری جگہ فرمایا: الله نزل احسن الحدیث کتاب متشابهاً مثانی (اللہ تعالیٰ نے بہترین کلام نازل کیا؛ ایسی کتاب جو باہم ملتی جلتی ہے اور بار بار دہرائی گئی ہے۔) لیکن اس تشابہ سے تحریر میں کہیں لچک نہیں آتی بلکہ اس کا اثر دوبالا ہوجاتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے: تقشعر منه جلود الذین یخشون ربهم ثم تلین جلودهم وقلوبهم الیٰ ذکر الله. (الزمر آیۃ ۲۳ مع ترجمہ) (اس سے اپنے رب سے ڈرنے والے کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ پھر انکی کھالیں اور قلب ذکر اللہ کے لیے نرم ہو جاتی ہیں)۔ یہ اعجاز قرآنی ہے جسکی نقل کوئی نہیں کرسکا اور نہ کرسکتا ہے۔

ترجمہ القرآن: مولانا اشرف علی تھانویؒ

البدور لبازغہ کے اختتام پر شاہ صاحب نے اس تصنیف کے مقصد پر روشنی ڈالی ہے۔ جس سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ یہ حجۃ سے کس طرح اور کس انداز میں الگ اور مختلف تصنیف ہے۔ اگر چہ دونوں کا موضوع اور اکثر مقامات پر تحریر یکساں ہے۔ آپ نے کتاب کے آخر میں لکھا ہے:

وصیۃ: ایھا الطالب لقد امحضت لک النصح فی ھٰذالکتاب فاغتنمہ وتدبرفیہ ولا تشکن انہ علم الٰھی ربانی من اللہ تعالیٰ بہ علیّ وعلیٰ عبادہ ولکن اکثر الناس لایعلمون.

ومن منح الجھال علماً اضاعہ ومن منع المستوجبین فقدظلم

الحمدللہ رب العالمین. اللھم صلی علیٰ محمد و اٰلہ واصحابہ اجمعین. برحمتک یاارحم الراحمین

(وصیت: اے طالب علم! میں نے اس کتاب میں محض تیری خیر خواہی اور نصیحت کی باتیں کی ہیں۔ پس تو اسکو غنیمت جان اور اسمیں شک مت کر کہ یہ علم اللہ تعالیٰ کی جانب سے میرے لیے اور اسکے بندوں کے لیے علم ربانی ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

اور جسنے جاہلوں کو علم دیا اس نے اسکو ضائع کیا اور جس نے مستحق لوگوں سے اسکو روکا اسنے ظلم کیا

الحمدللہ رب العالمین.)

اس وصیت سے اسبات کا اظہار ہوتا ہے کہ البدور البازغہ کا مقصد قاری کو دینی و دنیاوی نصیحت کرنا ہے۔

حجۃ اللہ البالغہ کا مقصد علم اسرار الحدیث ہے اور دراصل اسکا تعلق فن حدیث سے ہے جیسا کہ خود شاہ صاحب نے حجۃ کی جلد اول قسم اول کے آخر میں اس کتاب کا پورا نام 'حجۃ اللہ البالغہ فی علم اسرار الحدیث' تحریر کیا ہے۔ اسرار احکام شریعت کو بیان کرنے کے لیے احادیث کے ساتھ قرآن مجید کی آیات کا بھی حوالہ جگہ جگہ دیا گیا ہے۔

جہانتک الخیر الکثیر کا سوال ہے اس میں بحث کا انداز فلسفیانہ نہیں بلکہ صوفیانہ ہے جو حجۃ اللہ البالغہ اور البدور البازغہ دونوں سے کافی حد تک مختلف ہے۔ یہ اسلوب شاہ صاحب کی صوفیانہ تعلیم و تربیت کا منطقی نتیجہ، آپکے ذاتی روحانی تجربات اور آپکی ریاضت شاقہ کا فطری ردعمل اور اس کے نتیجہ میں حاصل ہونے

والے علم حقائق کا اظہار ہے۔ چنانچہ الخیر الکثیر کے مقدمہ میں علامہ محمد انور شاہ کشمیری کا ایک قول نقل کیا گیا ہے۔

"الخیر الکثیر تصنیف لطیف فی علم الحقائق. درجته فی کشف الحقائق ارفع من حجة الله البالغه"[1]

شاہ صاحب نے ان علوم کو علوم حکمۃ کا نام دیا ہے۔ چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

هذه علوم الحکمة التی من اوتیتها فقد اوتی خیراً کثیرا.

اسی لئے اس کتاب کا نام خیر کثیر رکھا گیا ہے۔

خیر کثیر میں خزائن الحکمة کے عنوان سے دس ابواب۔ خزانة الاولیٰ تا خزانة العاشره کے نام سے قائم کئے گئے ہیں جو شروع سے آخر تک انہیں علوم روحانی پر مبنی ہیں۔ کتاب میں صوفیانہ اصطلاحات کا استعمال کثرت سے کیا گیا ہے جنکو سمجھنے کے لئے ان علوم سے واقفیت ضروری ہے موضوع کے لحاظ سے خود شاہ صاحب نے اس کتاب کا خلاصہ ان الفاظ میں تحریر کیا ہے۔

'ملاک الحکمة عرفان ذات الله سبحانه' بذاته ثم عرفان اسمائه بخصوصیتها واحکامها ثم عرفان النشاة المنتشئة و ظهور اسماء الله تعالیٰ سبحانه' فیها بوجهٍ خاصٍ ثم عرفان الاسماء العودیة با حکامها و اقضائها الیٰ الله تعالیٰ. فتلک السلسلة الدوریة من اوتی علمها بالذوق فقد اوتی خیراً کثیرا.....[2]

(حکمت کے خزانے یہ ہیں: ذات اللہ تعالیٰ کا عرفان، پھر اسمائے تعالیٰ کا عرفان بمعہ خصوصیات اور احکامات پھر پیدائش خلق اور اس میں خاص وجوہات کی بناء پر اسمائے تعالیٰ کے ظہور کا عرفان، پھر اسمائے عودیہ اور انکے احکام اور انکی حق تعالیٰ کی جانب قضا۔ پس یہی سلسلۂ کائنات ہے۔ جسکو اسکے ذوق کے مطابق اسکا علم دیا گیا گویا اس کو عظیم دولت (خیر کثیر) عطا کر دی گئی۔)

علم و عرفان کے اس سلسلہ کو بیان کرنے کے واسطے یہ تصنیف معرض وجود میں آئی۔ چنانچہ خزانۂ اولیٰ کے

---

[1] مقدمہ الخیر الکثیر، مصنفہ شاہ ولی اللہ دہلوی، بجنور، ۱۳۵۲ھ صفحہ ۱۲

[2] الخیر الکثیر، خزانہ ثانیہ۔ صفحہ ۲۵

تحت ذات باری تعالیٰ کے بارے میں خالص باطنی نکتہ نظر سے گفتگو کی گئی ہے جسمیں تجلی ذات، کنہ ذات، قرب الوجود، عالم الغیب، نفس رحمانی جیسی اصطلاحات کا استعمال کیا گیا ہے اور خزانۂ ثانیہ میں اسماء اللہ تعالیٰ کا ذات باری تعالیٰ سے انجاس واطلاق بیان کر کے اس کائنات کو انکا پرتو اور مظہر بتایا گیا ہے۔ جو فلسفۂ وحدۃ الوجود کی اصل ہے۔

'ان فی کل نشاۃ منبجسۃ صورۃ مختصۃ لکل اسمٍ اسمٌ لا یوجدلہ فی غیرھا'[1]

(ہر ایک پیدائش میں کسی ایک اسم (الٰہی) کی خصوصی صورت کا مظہر موجود ہے۔ وہ اسم اس کے غیر میں نہیں پایا جاتا)

بقیہ ابواب یا خزانوں میں قرآن مجید کی آیات اور احادیث نبویؐ کی باطنی تشریح کرتے ہوئے اسی روشنی میں حقیقت روح، پیدائش خلق، حصول کمال عامیہ وخاصہ، کمالات انبیاء عموماً و نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم خصوصاً، احکامات ولایت: انوار نبویؐ کا فیضان، احکامات شرح اور انکا اجراء، معاد: عالم برزخ، قیامت، یوم الدین، جنت وجہنم کا بیان ہے۔

الخیر الکثیر میں ان خیالات اور مسئلوں کو دہرایا گیا ہے جو حجۃ اللہ البالغہ میں تحریر کئے گئے ہیں۔ مثلاً عالم مثال، حقیقت روح، تعلق روح وجسم، موت کے بعد انکی کیفیات اور معاد میں انکی یکجائی، ارتفاعات، عالم معاد و برزخ وغیرہ۔ اگرچہ بعض جگہ عبارتیں حجۃ اللہ البالغہ سے ملتی جلتی ہیں لیکن کیونکہ ان تمام امور میں زاویۂ نظر مختلف ہے اس لئے تحریر کا انداز بھی حجۃ اللہ سے مختلف ہوگیا ہے مثلاً روح اور بدن کے تعلق سے آپ لکھتے ہیں:

"فاذامات العبد لحق النفس بالبدن الغیرا لمحسوس و لزمت بھا. واذا اقامت القیامۃ تعلقت بالابدان المحسوسۃ. واذاجاء یوم الحساب اسبغت بالروح فنشاء من صلبھا بدن فرفضت البدن العنصری ثم ید خل امافی الجنۃ او النار"[2]

(جب بندہ کی موت آتی ہے تو اس کا نفس (ناطقہ) بدن غیر محسوس سے مل جاتا ہے اسسے چمٹ جاتا ہے۔ اور جب قیامت قائم ہوگی تو وہ بدن محسوس سے مل جائیگا اور جب یوم حساب آئیگا تو روح کے رنگ میں رنگ جائیگا جو بدن کے صلب سے پیدا ہوگی۔ اور بدن عنصری کو چھوڑ دیگا۔ پھر جنت یا دوزخ میں داخل ہوجائیگا۔)

---

[1] الخیر الکثیر، خزانہ ثالثہ۔ صفحہ ۴۸

(۲) ایضاً، خزانہ رابعہ، صفحہ ۵۵-۵۶

'والذی لحق بالمبادی التی هی الاسماء با لا نسلاخ او الفناء یغلب علیه الجهة العلیا و الذی تدنس یغلب علیه جهة السفلی''[1]

(اور جو (نفس) مبدات خلق جو کہ اسماء (الٰہی) ہیں ان سے انسلاخ یا فنا کے توسط سے ملحق ہو جاتا ہے اس پر جہت علیاء غالب ہو جاتی ہے اور جو ارضی و اور زمینی ملوثات میں مبتلا ہو جاتا ہے اس پر جہت سفلیٰ غالب ہو جاتی ہے)

اور یہی بات حجۃ میں دوسرے انداز میں کہی گئی ہے۔

حجۃ اللہ البالغہ میں ارتفاعات کے عنوان سے آپ نے ایک اہم باب قائم کیا ہے جسمیں انسان کی پوری زندگی اور تعلقات باہمی کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ الخیر الکثیر میں اس سلسلہ میں خزانہ ثامنہ میں آپ لکھتے ہیں:

''واعلم ان کل شیئی من العبادات فله' اربع خصائل و هو المنتشاة من الرب بحسب الکمال وله دعوة تامة.. من سبیل تهذیب النفس .. من سبیل تدبیر المنزل.. من سبیل اساس المدینة''[2]

عالم مثال کے بارے میں خزانہ ثالثہ میں لکھتے ہیں:

''ومن هٰذاالعالم نور الوضوء والغسل و ظلمة الحدث والجنابه. واماالحکماء فیجدون فیها ایضاً انوار الصلوٰة و الصوم و غیرها''[3]

لیکن اسکے برخلاف ایسے خیالات کا بھی اظہار کیا گیا ہے۔ جو بالکل نئے ہیں۔ مثلاً آواز کی دنیا اور حروف والفاظ کی زبان سے ادائگی کے بارے میں نئے انداز سے آپ لکھتے ہیں:

''الاتریٰ الیٰ عجائب عالم الصوت. فلکل حیوان صوت تخصه فلاجرم انها تمثاله فی هٰذا العالم. ولکل حالاته فرحه و وجله و جوعه و عطشه اصوات مخصوصة فلا جرم انها تماثیلها ثم ان للا وقات اصوتاً و للعشق و الغضب صوتا فلاجرم انها تماثیلها. و الهم الله سبحانه للا نسان ان یقطع اصواته

---

[1] الخیر الکثیر، خزانہ رابعہ صفحہ ۵۵-۵۶

[2] ایضاً، خزانہ ثامنہ صفحہ ۱۰۱-۱۰۲

[3] ایضاً، خزانہ ثالثہ، صفحہ ۴۷

فقطعها فحصلت حروفٍ فوضعها بازاء الاسماء الحسنیٰ التی بها نظام العالم و تلفظ بها بازاء کل مظهرٍ حرفاً هو بازاء المظاهرو ضم الحرف الثانی تحصیلاً و الثالث تشخیصاً فبدت مواد ثلاثیات فی الاصل"۱

(کیاتم نے عالم اصوات کے عجائبات کونہیں دیکھا! ہرحیوان کی ایک آواز ہوتی ہے جواس عالم میں اسکی تمثال ہوتی ہے اوراسکی ہرحالت: خوشی، خوف، بھوک، پیاس کی مخصوص آوازیں ہوتی ہیں جو ان حالتوں کی تمثال ہوتی ہیں۔ پھراوقات کی آوازیں ہوتی ہیں، عشق کی آواز ہوتی ہے، غصہ و غضب کی آوازیں ہوتی ہیں جوانکی تمثیل ہوتی ہیں اوراللہ سبحانہ نے انسان کوالہام کیا کہ اپنی ان آوازوں کی قطع وبرید (کاٹ چھانٹ) کرے پس اسنے ایسا کیااوراس سے حروف حاصل ہوئے تو اسنے انکواسمائے حسنیٰ کے مقابلہ پررکھا جن سے نظام عالم قائم ہے اور ہرمظہر کے سامنے ایک حرف رکھا جومظاہراسماء کے مقابلہ پرتھااورحروف ثانی کواس حرف سے تحصیلاً ملایااورتیسرے حرف کوتشخیصاً ملادیاتواس سے ثلاثیات کااصل مواد مل گیا۔)

ایک دوسری جگہ تو آپنے اسی تخیل کواور وسعت دیتے ہوئے لکھا کہ اس عالم میں ہرحرکت اور ہروقوعہ کی ایک آواز ہوتی ہے۔ عربی کسی آواز کودق دق کہتا ہے تو فارسی دہ دہ۔

مندرجہ بالا اقتباسات سے شاہ صاحب کے عاطفہ کی پذیرائی، رسائی اورتخیل کی فراوانی کا ثبوت ملتا ہے۔ اورادبی اعتبار سے آپکی تحریر کی خصوصیات واضح ہوتی ہیں کہ کتنے سلیس اورسادہ انداز میں ایک مشکل لسانی مسئلہ یعنی ایجادحروف کا حل پیش کردیا جوعین قرین قیاس ہے۔ اور پھرانہیں خیالات کے پیش نظر آپنے 'حکمۃ فن الحروف' کے نام سے ایک نئے علم کوپیش کیا ہے جوخالصتاً الہامی وباطنی علم ہے اوراس علم کی مدد سے آپ نے کلام پاک میں حروف مقطعات کے معنی بیان کئے ہیں۔۲

اورخزانہ عاشرہ میں فوائدشتّی کے عنوان سے الف سے ی تک تمام حروف تہجی اور'ال' 'بل' ودیگرالفاظ کے معانی بیان کئے ہیں۔ جوانکی باطنی تربیت کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔۳

علم اورحصول علم کے بارے میں شاہ صاحب نے اپنے خیالات کااظہاران الفاظ میں کیا ہے:

---

۱ الخیرالکثیر، صفحہ ۵۶، خزانہ رابعہ

۲ ایضاً، صفحہ ۸۳-۸۴، خزانہ خامسہ

۳ ایضاً، صفحہ ۱۲۸-۱۲۹، خزانہ عاشرہ۔

"العامة حصروا مطلق العلم فی اربعة اقسام. الاول الاحساس باحدیٰ الحواس الخمس و هو من اللطیفة القالبیة والثانی التخیل و هو من اللطیفة الخیالیه شأنها الالتفات الیٰ امرمتلون متشکل غائب والثالث التوهم و هو من اللطیفة الواهمة وشأنها ادراک معانی جزئیة یتلبس به المحسوسات و حفظها و ایعاء ها. و الرابع التعقل و هو من اللطیفة النفسیة و شأنها ادراک الکلیات الطبیعیة و الامورالمجردة"[1]

(عام لوگ علم کو چار طریقوں سے حاصل کرتے ہیں۔ اول: حواس خمسہ میں سے کسی ایک سے محسوس کر کے اور یہ لطیفۂ (قوت) جسمانیہ سے ہوتا ہے۔ دوم: تخیل کے ذریعہ اور یہ لطیفۂ خیال کی بدولت ہوتا ہے جسکی خاصیت ایسے امر کی طرف توجہ کا التفات ہے جو کسی غائب چیز کی ناپائدار صورت کی شکل میں ہو اور سوم: توہم جو لطیفہ واہمہ سے ہوتا ہے جسکی خاصیت ایسی چیزوں کے معنی کا جزوی ادراک ہے جنکو محسوسات کے ذریعہ معلوم کیا جاتا ہے اور یاد کیا اور یاد رکھا جاتا ہے۔ اور چہارم: تعقل جو نفس کی قوت (لطیفہ) ہے اور اسکی خصوصیت طبیعی کلیات اور امور مجردہ کا ادراک ہے)

"العلوم الحاصله للناس صنفان. صنف یدرکونه فی مجاری عاداتهم کالاهتداء لدقائق الصناعات والاستدلال باقانین الافکار. وصنف هو خارق لعاداتهم وهٰذا الصنف اقسام. اما فی اللطیفة الخیالیة فی الیقظة. وهوالمسمیٰ بالکشف فی مصطلح المشهور. واما فی المنام و هوالرؤ یاو امافی العدم و قدیسمی غیبیة اعنیٰ شبیهة بالنوم فی کسل الحواس الاان النوم طبعی و هو صنعی بواسطة التوجه التامه". [2]

(علوم جو انسانوں کے حصول کے لائق ہیں انکی دو اصناف ہیں۔ ایک صنف وہ ہے جو وہ اپنی روز مرہ کی عادتوں میں پاتے ہیں جیسے صنعتوں کے نکات کی طرف ہدایت اور افکار کے قوانین سے استدلال۔ اور دوسری صنف انکی عادتوں کے برخلاف بطور خرق عادت کے ہے اور اس صنف کی

---

[1] الخیرالکثیر، خزانہ رابعہ، صفحہ ۵۳

[2] ایضاً، صفحہ ۵۷۔

اقسام ہیں۔ حالت بیداری میں قوت خیالیہ کے ذریعہ اور اسکو اصطلاح مشہور میں کشف کہا جاتا ہے۔ اور نیند کی حالت میں جو خواب کہلاتے ہیں۔ اور عدم وجود میں جو غیبیہ کے نام سے پکارے جاتے ہیں یعنی کسل حواس میں نظر آتے ہیں سوائے اسکے کہ نیند طبعی اور فطری شے ہے اور وہ بارادہ توجہ تامہ کے ذریعہ ہوتا ہے)

ادبی اور فنی اعتبار سے بھی الخیر الکثیر حجۃ اللہ اور البدور البازغہ سے علیحدہ تصنیف ہے۔ جہاں حجۃ اللہ کی بحث کی جہت اسرار، احکامات شریعت اور کلامیہ انداز میں انکی توضیح وتفہیم ہے وہیں الخیر الکثیر میں عرفان ذات الٰہی سے پیدائش خلق اور معاد تک پوری تخلیق اور حصول کمال انسانی جسکی معراج کمالات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اسکا روحانی اور باطنی خاکہ پیش کرتے ہوئے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ مذہب کا اصل اصول اور نجات کا ذریعہ خدائے وحدہ لاشریک کی عبادت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ہے۔ چنانچہ کتاب کے آخر میں جو وصیت درج ہے اس میں بھی انہیں خیالات کا اظہار ہے۔ الخیر الکثیر میں عربی زبان پر آپکی گرفت اہل زبان کی طرح مضبوط ہے اور اسی قسم کی زبان اور اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں جو اس قسم کی سنجیدہ عبارت اور عالی افکار کے بیان کے لئے ضروری ہیں۔ اسلوب کے اعتبار سے آپنے اس کتاب میں حتی الامکان طویل اور پیچیدہ جملوں یا تشبیہ واستعارہ وغیرہ جیسے محسنات لفظی سے اجتناب کیا ہے۔ اور اطناب سے بھی پرہیز کیا ہے۔ کتاب کا موضوع ایسا ادق ہے کہ اگر آپ ایسی زبان استعمال کرتے تو کتاب ناقابل فہم حد تک مشکل ہو جاتی۔ اسکے باوجود بھی جہاں آپ کے قلم کو موقع ملا آپ حسن کلام کی خوبیوں کو نہیں بھولے۔ مثلاً اولیاء اللہ کے کمالات کو بیان کرنے کے سلسلہ میں جب فناء فی اللہ ہونے کا ذکر آیا تو آپکے قلم سے ایک تشبیہ نکل گئی:

"واعلم ان للفناء وزناً کر جلٍ غرق فی البحر فمات"[1]

الخیر الکثیر صوفیانہ جہت رکھتے ہوئے بھی ادبی اعتبار سے ایسا درجہ رکھتی ہے جو منفرد ہے اور ایسی تصانیف شاذ ہی نظر سے گذرتی ہیں۔

صوفیانہ اسلوب آپنے اپنی دیگر تصنیفات میں بھی اپنایا ہے۔ اس سلسلہ میں آپکی تصنیف 'القول الجمیل فی بیان سواء السبیل' بطور خاص قابل ذکر ہے۔ یہ تصنیف آپ کے روحانی تجربات کا نچوڑ ہے۔ کتاب موضوعاتی ادب کا خالص نمونہ ہے اور صوفیانہ ادب میں نصابی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب میں سلوک کے مختلف ادوار کا تذکرہ ہے۔ بیعت کی شرعی حیثیت، اسکی حکمت اور اسکے شرائط کا بیان ہے۔ آداب وعظ، تعلیم اور اشغال

---

[1] الخیر الکثیر، خزانہ سابعہ صفحہ ۹۵،

صوفیاء قادریہ، چشتیہ اور نقشبندیہ کی تفصیل ہے اور اصطلاحات تصوف کو بیان کیا گیا ہے اس کے ساتھ ساتھ آپنے اپنے خاندانی مجرب اعمال کو بھی اس کتاب میں تحریر کیا ہے اور انکے فوائد کا ذکر کیا ہے غرضکہ یہ تصنیف تصوف سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے نہایت منفعت بخش اور عمدہ ہے۔[1]

اسکے علاوہ دیگر عربی تصانیف مثلاً فیوض الحرمین، لمحات، التفهيمات الاهية میں بھی تصوف کے مختلف پہلوؤں پر بحثیں ہیں جو سب کی سب اسی اسلوب بیان کے نمونہ پر ہیں جنمیں آپنے اپنے روحانی تصورات اور تجربات کو صفحہ قرطاس پر پیش کیا ہے۔

ادبی اعتبار سے شاہ صاحب کی عربی تصانیف کے متعدد پہلو ہیں۔ ان میں ایک پہلو آپ کی قرآن فہمی اور حدیث فہمی ہے۔ آپنے اپنی تصنیفی زندگی کی ابتدا ہی قرآن فہمی اور اسکا ترجمہ لکھنے سے کی۔ چنانچہ تعلیم و تعلم کے دوسرے بارہ سالہ دور ہی میں آپنے فارسی زبان میں سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران کا ترجمہ لکھنے کی شروعات کردی تھی جسکو آپ اپنے شاگردوں کو بطور درس پڑھاتے بھی تھے۔ یہ کوشش 'فتح الرحمٰن فی ترجمه القرآن' کی شکل میں آپ کی عرب سے واپسی کے بعد منظر عام پر آئی۔ عربی زبان میں بھی آپنے 'فتح الخبير' کے نام سے مختصر تفسیر قران لکھی اور اسکے علاوہ 'تاويل الاحاديث فی رموز قصص الانبيا' کے نام سے قرآن مجید میں مذکور انبیاء علیہم السلام کے واقعات لکھے۔ اس تصنیف میں آپنے اپنے فطری رجحان کے مطابق رموز و اسرار حوادث جو انبیاء علیہم السلام کی زندگی میں پیش آئے ان کو بھی بیان کیا ہے۔ یہ مختصر رسائل آپکی عربی تصانیف میں خاص مقام رکھتے ہیں اور بقول صاحب حیات ولی: 'یہ ایسے عمدہ اور مختصر رسالے ہیں جنہوں نے بڑی بڑی تفاسیر کے مطالعہ سے شائقین کو مستغنی کردیا'۔[2]

شاہ صاحب عاشق حدیث تھے اور آپنے خدمت حدیث میں اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ صرف کیا۔ اسی سلسلہ میں آپنے موطا ابن مالکؒ کی عربی شرح 'مسویٰ شرح موطا' کے نام سے لکھی جو حدیث فہمی کے ساتھ آپکے علمی کمال اور خداداد قابلیت کا مظہر ہے۔ اس کتاب میں اصل کتاب کی احادیث کے ہر فقرہ اور جملہ کی نہایت عمدگی اور روانی سے تشریح کی ہے کہ مسویٰ بجائے شرح خود ایک مستقل تالیف بن گئی ہے۔ احادیث کی توضیح کے علاوہ آپنے ان سے پیدا شدہ مسائل فقہ کی تشریح بھی ساتھ ہی میں کی ہے۔ مسویٰ کے علاوہ آپنے احادیث اور اسکی اسناد کے سلسلہ میں کئی تصانیف قلمبند کیں جن میں شرح تراجم ابواب صحیح

---

[1] القول الجمیل، مصنفہ شاہ ولی اللہ دہلوی

[2] حیات ولی، صفحہ ۲۶۶

البخاری' الفضل المبین فی المسلسل من حدیث النبی الامین' الاربعین، النوادرمن حدیث سید الاوائل والاواخر اورالارشاد الیٰ مهمات علم الاسناد وغیرہ شامل ہیں۔ یہ تمام کتب کیونکہ ایک اہم موضوع (علم حدیث) پر مشتمل ہیں اس لئے انکا اسلوب نہایت سنجیدہ ومتین ہے۔ بیان رواں، فکر عمیق اور مطالعہ وسیع ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ یہ وہ موضوعات ہیں جنمیں تخیل کی زیادہ کارفرمائی نہیں ہوسکتی اور قلم کو نہایت احتیاط سے قدم اٹھانا پڑتا ہے۔ شاہ صاحب کا یہی ادبی کمال ہے کہ ایسے نازک موضوعات میں بھی حد بندیوں کے باوجود آپ کا قلم نہیں ٹھہرتا اور نہ ہی حدود سے باہر جاتا ہے۔

فن حدیث کی کتابوں میں شاہ صاحب کی ایک 'الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین' ہے اس کتاب کو اگرچہ آپنے چہل حدیث کہا ہے اور کتاب کے ابتداء میں لکھتے ہیں:

"هٰذهٖ اربعون حدیثاً منِ احادیث النبی صلی الله علیه وسلم"[1]

(یہ احادیث نبویؐ سے چالیس حدیثیں ہیں)

لیکن ماہرین فن حدیث جانتے ہیں کہ احادیث کی اصل یہ ہے کہ راوی اول نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف حاصل کیا ہو (یعنی وہ صحابی ہوں) اور انہوں نے وہ حدیث خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنکر روایت کی ہو۔ اس لحاظ سے خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت اور آپؐ سے گفتگو اس نوعیت کی نہیں ہوسکتی جو خواب دیکھنے والے کو صحابی اور خواب میں ہونے والی گفتگو کو آپؐ سے براہ راست روایت کا درجہ دے سکے۔ لہٰذا انکے بارے میں یہ دعویٰ کرنا کہ یہ احادیث کا درجہ رکھتی ہیں درست اور مناسب نہیں زیادہ سے زیادہ انکو رویائے صادقہ، مبشرات یا روحانی ترقی کا کمال کہا جاسکتا ہے جنمیں مراقبہ اور تفکر اس پایہ کا ہو کہ اسکے نتیجہ میں سامنے آنے والی صورتیں اور واقعات اصلی نظر آئیں۔ فنی اور ادبی اعتبار سے یہ تحریر آپکے تخیل اور زور بیان کے کمال کی جانب اشارہ کرتی ہے۔ اس کتاب میں جو رؤیا یا مشاہدہ روح بیان کئے گئے ہیں انکا ذکر شاہ صاحب نے اپنی متعدد تصنیفات میں جگہ جگہ کیا ہے۔ مثلاً خواب حسنؓ وحسینؓ جس میں آپکو قلم عطا کیا گیا یا خوابِ ردا جسمیں آپکو چادر اڑھائی گئی انکا ذکر آپنے حجۃ اللہ البالغہ، فیوض الحرمین وغیرہ میں بھی کیا ہے اور اسکے نتیجہ میں جو روحانی اور علمی کمال آپکو حاصل ہوا اسکو آپنے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"فمن یومئذٍ انشرح صدری للتصنیف فی العلوم الشرعیه. و الحمد لله"[2]

---

[1] الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین۔ صفحہ ۱، دہلی ۱۸۹۹ء

[2] ایضاً، صفحہ ۲

(پس اسی روز سے میرا سینہ علوم شرعیہ میں تصنیف وتالیف کے لئے کھل گیا)

درثمین میں جس انداز میں شاہ صاحب نے اپنے روحانی مشاہدات کو بیان کیا ہے اسکی مثال حدیث خامس سے دی جاسکتی ہے جسمیں ایک خالصتاً روحانی تخیل کوان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

"سالته' صلی الله علیه وسلم سوالاً روحانیاً عن معنی قوله 'کان فی عماءٍ ما فوقه هواء ما تحته' هواء' فی جواب من قال 'این کان ربنا قبل ان یخلق خلقه' '. ففاض علیٰ روحی من روحه الکریمة صورة نور عظیم فی اعالی بعد هیولانی قد احاط بجا مع هٰذا البعد بخطوط شعاعیة فقیل هٰذاالنور و هوالتجلی المشار الیه بهٰذا القول هٰذا البعد الهیولانی هوالعماء وهٰذهٖ الا حاطة بالخطوط الشعاعیة هوالقهر المشار الیه بقوله تعالیٰ 'هوالقاهر فوق عباده"[1]

(میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روحانی طور پر ایک سوال کیا کہ حدیث **'کان فی عماء مافوقه هواء ماتحته هواء '** (وہ عماء میں تھا جس کے اوپر بھی ہوا (خلاء یا space) تھی اور نیچے بھی ہوا تھی) جو سائل کے اس سوال کے جواب میں فرمایا گیا تھا کہ **'این کان ربنا قبل ان یخلق خلقه'** (ہمارا رب خلقت کے خلق سے پہلے کہاں تھا؟) تو آپکی روح کریم کی جانب سے میری روح پر ایک نور عظیم کی صورت ظاہر ہوئی جو بعد ہیولانی سے ماورا تھا اور جس نے اپنی روشنی کی کرنوں سے اس بعد کو بھر دیا تھا۔ پس کہا گیا 'یہ نور ہے اور وہ اس کی تجلی ہے جسکی جانب اس قول (حدیث) سے اشارہ کیا گیا ہے۔ اور یہ بُعد ہیولانی وہی عماء ہے اور یہ روشنی کی کرنیں بس اسی کا قہر (غلبہ) ہیں جسکی جانب اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ **هوالقاهر فوق عباده** (وہ اپنی مخلوق پر قاہر یعنی غالب اور صاحب اقتدار ہے) میں اشارہ کیا ہے)

اس تجربہ روحانی کو جو اسکے مشاہدہ کرنے والے کو حاصل ہوا کتنے مناسب اور عمدہ الفاظ میں قید خیال میں لایا گیا ہے۔ **بُعد هیولانی** کی ترکیب استعمال کرتے ہوئے آپنے جو نقشہ کھینچا ہے اس سے اس عظیم الشان کائنات کا تصور ابھرتا ہے جو تمام اجرام فلکی اور وسیع خلاء بلکہ اس سے بھی پرے اس تمام علاقہ کو محیط ہے جو خالق کائنات کی مخلوق ہے اور جسکی وسعت کو آج تک کوئی نہیں ناپ سکا۔ **هیولانی** کا لفظ (۱) شاہ صاحب نے

---

[1] الدر الثمین، صفحہ ۳

(۱) هیولانی یا هیولا: المادة الاولیٰ (المنجد) صفحہ ۹۷۴، ابتدائی خام مادہ، (فیروز اللغات) صفحہ ۸۰۹

حجۃ اللہ البالغہ میں بھی استعمال کیا ہے اور اس جگہ ابطال ہیولیٰ کی ترکیب استعمال کی گئی ہے۔ گویا کہ تمام مادی مخلوقات جنکی ابتدائی تخلیق اللہ تعالیٰ نے فرمائی اور جسکا بُعد یعنی پھیلاؤ بیحد وسیع وعریض ہے۔ اس وسعت سے بھی ماوراقبل تخلیق نور خداوندی موجود تھا۔ حدیث شریف میں اس جگہ کو عماء کے لفظ سے بیان کیا گیا ہے

اس تحریر سے آپکا فکری تعمق، زبان پر گرفت، علم وتخیل کی وسعت اور اسلوب بیان کی نفاست کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ فیوض الحرمین اور دیگر کتب میں بھی آپکی یہ ادبی صلاحیت واضح طور پر نظر آتی ہے۔

شاہ صاحب کی تصانیف میں دو تالیفات ایسی ہیں جو آپکی تخلیقات کا ایک مختلف ادبی پہلو اجاگر کرتی ہیں۔ یہ تالیفات 'التفہیمات الالھیۃ' اور 'مکتوبات' ہیں جہاں آپکی دیگر کتب میں ضخیم اور مختصر تحریریں اور رسائل شامل ہیں جسمیں آپنے ہر موضوع ومضمون پر سیر حاصل بحث کی ہے وہیں تفہیمات میں آپکے مقالہ جات کا انداز مضامین اور یادداشتوں پر مبنی ہے جیسے کہ کوئی شخص اپنی ذاتی ڈائری لکھتا ہو جسمیں ان خیالات کا اظہار کردیتا ہو جو ہمہ وقت اسکے ذہن میں آتے رہتے ہوں اور جنکے اظہار کے لئے وہ خود کو فطری طور پر مجبور پاتا ہو۔ تفہیمات میں شاہ صاحب نے فارسی اور عربی دونوں زبانیں استعمال کی ہیں۔ یہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ آپکے دماغ میں ہمہ وقت آنے والے خیالات کا موقعہ بہ موقعہ بلا تکلف اظہار ہے جسمیں آورد یا دماغی کاوش بالکل نہیں۔ یہ بھی آپکی ذہنی پختگی، مطالعہ کی وسعت اور اسلوب بیان کا کمال ہے کہ آپ نے نہایت مختصر جگہ میں، چند الفاظ میں جو کبھی چند سطروں اور کبھی ایک یا دو صفحہ پر مشتمل ہیں ایسے مسائل کو حل کردیا ہے جن پر اظہار خیال کے لئے سینکڑوں صفحات کی ضرورت ہو اور بالفعل خود اپنے ہی ان خیالات کا اظہار اپنی ضخیم کتب مثلاً حجۃ اللہ البالغہ اور الخیر الکثیر میں کیا ہے۔ اس حقیقت کا اظہار آپنے تفہیمات میں جگہ جگہ ان الفاظ میں کیا ہے:

"وتفصیل ھٰذا فی 'الحجۃ اللہ البالغہ' فی علوم الانبیاء المختصۃ بھم"[1]

"ذکرناھا فی الخیر الکثیر[2]

تفہیمات میں مختلف النوع مقالات اور مضامین ہیں۔ ان مضامین میں شاہ صاحب اپنی روحانی تربیت، خرقۂ صوفیہ اور اجازہ حاصل کرنے سے لیکے سماج کے مختلف طبقات سے خطاب ونصیحت کرنے تک ہر قسم کے موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔ موضوعات کے لحاظ سے مسائل تصوف، تذکرۂ انبیاء و

---

[1] تفہیمات الٰہیہ، تفہیم ۱۵، ص ۳۸، جلد ۱

[2] ایضاً، تفہیم ۱۶، صفحہ ۴۲، جلد ۱

اولیاء خصوصاً تذکرہ نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم، ذکر اہل بیت وصحابہ، ذکر سلاسل طریقت، مسائل ومباحث فقہ، تذکرہ اساتذہ واحباب، خطابات وتلقین طبقات مختلفہ اور دیگر مضامین پر آپنے تفہیمات میں مختصر مگر جامع رائے ظاہر کی ہے۔ اس کے علاوہ تفہیمات میں آپنے بعض مشکل مسائل کا حل نہایت واضح انداز میں پیش کیا ہے اور اس سلسلہ میں سائل حضرات کے سوالات کے جواب دئے ہیں۔

تفہیمات کے اس حصہ میں خصوصاً جہاں تصوف کے مسائل اسرار و رموز کے بیان، اصول دین اور اصطلاحات کا ذکر ہے جسمیں ملاء اعلیٰ، عالم مثال، حقیقت روح وغیرہ شامل ہیں تفہیمات کا اسلوب آپکی دیگر تصنیفات خصوصاً 'حجة الله البالغة' اور 'خیر کثیر' کے اسلوب سے مماثل ہے۔ عنوانات سے لے کر نفس مضمون تک ایسا ظاہر ہوتا ہے گویا کہ تفہیمات میں ان مضامین کا مختصر خاکہ ہے جنکی تفصیل آپکی کتب میں دی گئی ہے۔

مقالہ نگاری ایک جداگانہ صنف ادب ہے۔ اس صنف میں مؤلف مختلف موضوعات پر مختصر مگر جامع انداز میں اپنے احساسات کو قلمبند کرتا ہے۔ کیونکہ نفس مضمون تھوڑا ہوتا ہے اور بات مختصر اسلئے اگر مصنف کا انداز بیان دلچسپ ہو تو قاری کی توجہ کسی ضخیم کتاب کے مقابلہ میں مقالہ کو پڑھنے کی جانب زیادہ مبذول رہتی ہے۔ قاری کے ذہن کو اسیر کرنا اور اسکے قلب کو مطمئن کرنا ایک فن ہے اور ادبی اعتبار سے وہی مصنف زیادہ کامیاب ہے جو اپنے مختصر مضمون میں اسطرح اظہار خیال کرے کہ پڑھنے والے کی تشنگی رفع ہو جائے اسکے لئے انداز بیان ایسا ہونا چاہئے کہ قاری از اول تا آخر تحریر کو پڑھنے پر مجبور ہو جائے۔ یہی فن کا کمال ہے۔ شاہ صاحب اس فن میں صاحب کمال ہیں آپکے جملوں کی بندش ایسی چست، انداز ایسا شگفتہ، دلائل ایسے پختہ اور اسلوب ایسا رواں ہوتا ہے کہ پڑھنے والا پورا مضمون پڑھے بغیر نہیں چھوڑتا اور خاتمہ پر بیان کردہ بات سے مطمئن ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ہر مضمون کا موضوع الگ ہوتا ہے اس لئے ایک کے بعد ایک مضمون کے مطالعہ سے پڑھنے والا تھکتا نہیں اور نہ اسکی توجہ دوسری جانب مبذول ہوتی ہے۔ حالانکہ موضوع کے لحاظ سے تفہیمات میں بعض باتیں وہی دہرائی گئی ہیں جو آپنے مختلف کتب میں لکھی ہیں لیکن ضخیم تصنیفات کے مقابلہ میں آپکے مضامین میں زیادہ کشش ہے۔

تفہیمات میں بعض مقالہ جات دوسروں کے مقابلہ میں نسبتاً طویل ہیں۔ انمیں آپنے ذیلی عنوانات بھی قائم کئے ہیں۔ مثلاً تفہیم سترہ جو ایک دقیق مسئلہ یعنی مسئلہ تجلی الرحمٰن اور تخلیق عالم یعنی مسئلہ وحدۃ الوجود کے بارے میں ہے، یہ تفہیم یا مقالہ دس صفحات پر محیط ہے اور اسمیں آپنے تشریح جملی، تصویر، تحقیق، تمیز، تنزل، عذر، تحدیق، توضیح، تأسیس، تمهید، تقریب، تفتیش، تفحص کے ذیلی عنوانات قائم کر کے مسئلہ کے ہر پہلو پر بحث کی ہے۔ اگرچہ یہ مسئلہ خالصتاً تصوف اور روحانی افکار سے تعلق رکھتا

ہے لیکن شاہ صاحب نے اسکو اس انداز سے بیان کیا ہے کہ تھوڑے سے تفکر اور توجہ سے ساری بات ذہن میں صاف ہو جاتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ اس مقالہ میں آپنے تمام صوفیانہ اصطلاحات مثلاً وحدۃ الکبریٰ، وجود الاقصیٰ، شخص اکبر (انسان الاکبر)، انسان الاصغر وغیرہ کا استعمال کیا ہے لیکن قاری کو ذرا سی بھی ذہنی الجھن نہیں ہوتی جو اس علم (تصوف) سے ناواقفیت کی صورت میں ہونی چاہئے۔ یہ آپکے اسلوب نگارش ہی کی وجہ ہے کہ ایسا ادق مضمون اس انداز میں تحریری میں آسکا۔

اسکے برخلاف تفہیم ۲۳ محض ۷ سطروں پر مشتمل ہے جسمیں حجابات الٰہی کا ذکر ہے جو ایک حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح کے طور پر ہے اور تفہیم ۲۴ میں صرف ۸ سطریں ہیں۔ اسکا مضمون انسانی خواب، انکے اسرار اور عالم مثال (جو شاہ صاحب کا خاص تصور ہے) میں ان امور و واقعات کی مناسبت کے بارے میں ہے جنکے خواب انسان کو نظر آتے ہیں۔ اسی طرح دیگر مختصر تفہیمات میں کسی ایک تخیل اور تصور کو بیان کیا گیا ہے۔

شاہ صاحب نے تفہیمات کے شروع میں خطبہ مصنف کے تحت اپنے والد محترم شاہ عبدالرحیم، اپنے استاد شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم الکردی المدنی اور ان سے حاصل شدہ خرقۂ تصوف اور اپنے شاگردوں شیخ نور اللہ بن معین الدین وغیرہ اور انکو دی گئی اجازۃ کا بھی ذکر کیا ہے جسکے آخر میں اسکی تاریخ تحریر ۲۶ جمادی الاخر ۱۱۴۶ھ دی گئی ہے۔ تفہیم ۳۰ شاہ صاحب کے قصیدہ تائیہ پر منحصر ہے جسکے اشعار میں اپنے احوال و مقامات تصوف اور ان پر اپنے سلوک اور مشاہدات کا تذکرہ کیا ہے۔ آخری شعر ہے:

ویرجو ولی اللہ فی حق نفسہ　　وفی الصحب والاولاد اوسع رحمۃ

تصوف اور علوم کشف جیسے دقیق مضامین کے علاوہ تفہیمات میں بدعات محرم، اختلاف عمل الصحابہ رضی اللہ عنہم، ائمہ اہل بیت وغیرہ جیسے عنوانات کے تحت آپنے قلم اٹھایا ہے۔ کتاب کا ایک دلچسپ اور اہم حصہ خطابات کے عنوان سے ہے جسمیں شاہ صاحب نے طالب علم، اولاد مشائخ، یادہ گو واعظ، بادشاہوں، امراء، سپاہی، عوام اور جماعات مسلمین سے خطاب کیا ہے۔ یہ خطابات تفہیم ۶۹ میں دیگر موضوعات کے ساتھ دیئے گئے ہیں۔[1] ان خطابات کا اسلوب بیان شاہ صاحب کی دیگر تحریروں سے مختلف ہے۔ علمی استعداد، مدلل اسلوب بیان، عمیق فکر و نظر کی جگہ ان خطابات میں آپکے احساسات اور جذبات کی تندی زیادہ نظر آتی ہے۔ آپ اپنے عہد کے سماج کے تمام طبقات کے کرداروں اور افعال سے نالاں دکھائی دیتے ہیں اور ایک گداز طبیعت اور دکھی دل رکھنے والے شخص کی طرح ان تمام طبقات کو ہدایت دیتے ہیں۔ بقول شاعر: سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

[1] تفہیم ۶۹، صفحہ ۲۱۳۔۲۱۹ جلد ۱

ان خطابات میں آپکا طرز بیان واعظانہ ہے اور آپ مخاطب کو متوجہ کر کے اسکی غلطیوں کا احساس دلاتے ہیں گویا کہ اس کے سامنے تقریر کر رہے ہیں۔ رحیم بخش دہلوی کے الفاظ میں:

''جناب ولی اللہ صاحب کی تقریر میں اس بلا کا جادو تھا جسکا موافق، مخالف دونوں پر یکساں اثر پڑتا تھا۔ اثناء تقریر ادب کا پہلو کبھی نہ چھوڑتے تھے۔ مخالفوں کے دلوں پر قبضہ کر لینا آپکے آگے کوئی بات ہی نہ تھی۔''[1]

رحیم بخش دہلوی نے اگرچہ آپکی زبانی تقریروں اور مواعظ کی کیفیت بیان کی ہے لیکن ان خطابات میں ہم وہی کیفیت اور انداز پاتے ہیں جنکی طرف مصنف حیات ولی نے اشارہ کیا ہے۔ یعنی دل سے نکلنے والی بات دل پر اثر کرتی ہے اور یہی اسکی ادبی خصوصیت ہے۔ چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

'انی اخاطب کل فرقة فرقة من الناس برد الملاء الا علیٰ علیهم ثم اعم طوائف الناس[2]

یہ کہ کر آپ سوسائیٹی کے ہر طبقہ کو مخاطب کرتے ہوئے اپنے دل کی بات فہمائشی انداز میں ان تک پہنچاتے ہیں

''فاقول لا ولا دالمشائخ المترسمین برسم آبائهم من غیر استحقاق یاایهاالناس مالکم تخربتم اخراباواتبع کل ذی رای رایة و ترکتم الطریقة التی انزلها الله علی لسان محمد صلی الله علیه وسلم رحمة بالناس ولطفا بهم وهدی لهم فانتصب کل واحد منکم اماما ودعی الناس الیه وزعم نفسه ها دیا مهدیا و هو ضال مضل نحن لا مرضی بهٰولاء الذین یبایعون الناس لیشتروابه ثمنا قلیلا او لیثوبوا اغراض الدنیا بتعلم علم اذلا تحصل الدنیا الا بالتشبیه باهل الهدایة ولا بالذین یدعون الی انفسهم و یا مرون بحسب انفسهم هوالا قطاع الطریق دجالون کذابون مفتونون فتانون ایاکم و ایاهم ولا تتبعواالا من دعی الی کتاب الله و سنة رسوله ولم یدعی الی نفسه ولا ترضی باشاعة الا

---

[1] حیات ولی، صفحہ ۲۷۳-۲۷۴

[2] تفہیم ۶۹، صفحہ ۲۱۳ جلد ۱

شارات الصوفیه فی المجالس و المحافل انما المرضی الا حسان اما لکم عبرة فی قول اللہ تبارک وتعالیٰ و ان ھذاصراطی مستقیما فا تبعو ہ و لا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیلہ" [1]

(پس میں مشائخ کی اولاد سے جو اپنے آباؤاجداد کی رسوم اور طریقوں سے بغیر استحقاق کے چمٹے ہوئے انکی تقلید میں منہمک ہیں مخاطب ہو کر کہتا ہوں لوگو! تم کو کیا ہو گیا ہے کہ تم ٹکریوں اور فرقوں میں بٹ گئے ہو اور ہر رائے دینے والے کی رائے پر عمل کرنے لگتے ہو اور تم نے اس طریقہ کو چھوڑ دیا ہے جسکو اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر نازل کیا جو انسان کیلئے رحمت و لطف کا باعث ہے اور ہدایت ہے۔ اسے چھوڑ کر تم میں سے ہر ایک اپنے طور پر ایک امام اور پیشوا بن گیا ہے اور خود کو ہدایت یافتہ اور ہدایت دہندہ سمجھتا ہے جبکہ وہ خود گمراہ ہے اور دوسروں کو گمراہ کرنے والا ہے ہم ایسے لوگوں کو قطعاً پسند نہیں کرتے جو لوگوں سے اس لئے بیعت کرتے اور انکو مرید بناتے ہیں کہ اس سے تھوڑا پیسہ کمالیں اور علم (دین) اسلئے حاصل کرتے ہیں کہ اس سے دنیا کی اغراض حاصل کرلیں کیونکہ دنیا اس ذریعہ سے تب تک نہیں کمائی جاسکتی جب تک اہل ہدایت کی شکل وصورت نہ بنائی جائے۔ نہ ان سے راضی ہوں جو لوگوں کو اپنی ذات کی طرف بلائیں اور اپنی خواہش کے مطابق احکامات جاری کریں۔ یہ لوگ اچکے، دجال، کذاب، فتنہ پرور اور فتنہ پرداز ہیں خبردار ان سے بچو اور کسی کی پیروی نہ کرو سوائے اس کے جو کتاب اور سنت رسول کی طرف بلائے اور صوفیاء کی اشاروں کنایوں کی باتوں کا ذکر عام مجلسوں میں نہ کرنا کیونکہ تصوف کا مقصد مقام احسان کو حاصل کرنا ہے کیا تم اللہ تعالی کے اس قول سے نصیحت نہیں پکڑتے **و ان ھذا صراطی مستقیما فاتبعوہ و لا تتبعواالسبل فتفرق بکم عن سبیلہ**)

شاہ صاحب کی تصانیف کا ایک انتہائی اہم حصہ آپکے مکاتیب اور خطوط ہیں جو آپنے مختلف لوگوں کو لکھے۔ انمیں ذاتی، تفہیمی، علمی، سیاسی ہر طرح کی تحریریں اور خطابات شامل ہیں جو وقتاً فوقتاً آپنے اپنے خطوط کے ذریعہ لوگوں سے کئے ہیں۔ یہ مکاتیب بڑی تعداد میں ہیں جو مختلف کتب خانوں اور ذاتی مجموعہ کتب میں ملتے ہیں۔ آپکے عزیز، محب، خلیفہ اور شاگرد شاہ محمد عاشق پھلتی کے فرزند شاہ عبدالرحمٰن نے شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے مکاتیب کا ایک مجموعہ ترتیب دیا تھا۔ انکی وفات تک ۲۸۱ مکاتیب جمع ہوئے تھے۔ شاہ عاشق نے اس حصہ کو جلد اول قرار

[1] تفہیم ۶۹، صفحہ ۲۱۴، جلد ۱

دیکے دوسری جلد کا آغاز کیا اور اسمیں مزید ۷۷ خطوط جمع کئے۔ اس طرح ۳۵۸ خطوط جمع ہو گئے۔ یہ مجموعہ مکاتیب مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوری کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ مولانا نسیم احمد فریدی نے اس مجموعہ مکاتیب کو کتابی شکل میں ''نادر مکتوبات شاہ ولی اللہ دہلویؒ'' کے نام سے تحقیق و ترجمہ کے بعد دو جلدوں میں طبع کروایا ہے۔[۱]

مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوری کے ذخیرہ سے موضوعات کے لحاظ سے ادبی، سیاسی، سماجی، ذاتی اعتبار سے انکو چھانٹا گیا ہے اور ان پر تحقیقات کی بنیاد رکھی گئی ہے چنانچہ پروفیسر خلیق نظامی نے شاہ صاحب کے سیاسی خطوط پر نہایت عرق ریزی سے تحقیق کر کے ایک پوری کتاب مرتب کی ہے۔

تفہیمات کی طرح شاہ صاحب نے ان مکاتیب میں عربی اور فارسی دونوں ہی زبانوں کا استعمال کیا ہے اور ادبی اعتبار سے دونوں کی الگ الگ اہمیت ہے۔ جہاں فارسی میں آپنے سیاسی افکار، ہندوستانی مسلمانوں کی حالت زار اور سماجی بگاڑ کا تذکرہ کر کے احمد شاہ ابدالی وغیرہ کو ہندوستان آنے اور یہاں کا نظام حکومت سنبھالنے کی درخواست کی ہے۔ وہیں عربی میں آپنے اپنے اساتذہ، مخلصین، شاگردوں اور عربی دانوں کو مخاطب کر کے نہ صرف ذاتی باتیں تحریر کی ہیں بلکہ اکثر مسائل تصوف اور دیگر علمی مسائل کا حل بھی بیان کیا ہے۔

خطوط نویسی بھی ایک ادبی صنف ہے اور اس دور میں تو اسکو علیحدہ سے ایک زبردست اہمیت دی جاتی ہے۔ خطوط نویسی میں ذاتیات کا جو عنصر ہوتا ہے اس سے مصنف کے جذبات، احساسات، طبیعت، مزاج، اسکے حالات اور اس دور کے واقعات اور ان سے پیدا شدہ اثرات پر روشنی پڑتی ہے اور اس ماحول کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے جسمیں مصنف اپنی تصنیفات کی تخلیق کرتا ہے۔ گویا کہ یہ خطوط مصنف کے داخلی اور خارجی دونوں عوامل کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔

رحیم بخش دہلوی نے حیات ولی میں شاہ صاحب کے چند عربی مکاتیب بطور نمونہ نقل کئے ہیں۔ انھوں نے ان خطوط سے قبل بطور تمہید لکھا ہے:

> ''جناب شاہ ولی اللہ صاحب کے خطوط کا گو میرے پاس ایک بہت بڑا ذخیرہ تھا لیکن میں نے بنظر طوالت انمیں سے صرف ان ہی چند خطوط کا انتخاب کیا ہے جو ناظرین کی دلچسپی کا باعث ہیں اور چونکہ وہ علم و ادب کی روح اور ادیبوں کی جان ہیں اس لئے بجنسہٖ نقل کرتا ہوں'' [۲]

---

۱ نادر مکتوبات حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (اردو ترجمہ) محقق و مترجم نسیم احمد فریدیؒ، مظفر نگر ۱۹۹۸ء

۲ حیات ولی، صفحہ ۲۸۰-۲۸۱۔

اسکے بعد انہوں نے شاہ صاحب کے دس مکاتیب کو نقل کیا ہے۔ پہلا خط شاہ صاحب نے اپنے استاد شیخ ابو طاہر الکردی المدنی کے انتقال پر بطور تعزیت انکے صاحبزادے شیخ ابراہیم مدنی کے نام لکھا ہے۔ اس خط میں شاہ صاحب نے جن دلی جذبات کا اظہار کیا ہے اور جو قلق استاد محترم کے وصال پر ظاہر کیا ہے وہ ان سے آپکے تعلق اور آپکے قلب کی رقت کو تو ظاہر کرتا ہی ہے علاوہ ازیں فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے بھی آپکی تحریر کا ایک نمونہ ہے۔ خط کی ابتداء جن القاب و آداب سے کی گئی ہے وہ اسوقت کی مروجہ عربی نثر کی خصوصیات میں ہیں۔ خط اسطرح شروع ہوا ہے:

من الشیخ ولی الله العمری الیٰ الشیخ ابراهیم المدنی فی تعزیة والده الشیخ ابی طاهر المدنی قدس الله اسرار هم

اسکے بعد ان القاب سے موصوف کو مخاطب کیا گیا ہے۔

"اعلیٰ الله معالم العلم وشیّد بنیانه و رفع اعلام الدین و سدد ارکانه و رضیٰ ریاض الحدیث و اعظم رواء ه و نضر اهله و نور حزبه و اعلیٰ سمائه بد روس الحبر الهمام قدوة الانام وارث المجد کا براعن کا بر جائز میراث اسلافه الا کابر الشیخ ابراهیم بن سیدی الشیخ ابی طاهر الکردی المدنی امابعد فا عظم الله تعالیٰ اجر کم والهمکم صبر کم علیٰ شیخنا رضی الله عنه وارضاه عنی انی حقیق ان اعزیٰ به ویلح بی بد عاء الصبر علیه. فوالله ما زلت منذ قرع سمعی حدیث وفاته و بلغنی خبر انتقاله الیٰ رحمة ربه وجناته فی قلق فالق الکبد. و ملل کملل ذی الرمد. و فوقی سحابٌ مطر الهّم و الاسیٰ و تحت بحار باللظیٰ تتدفق کیف لا و کان رضی الله عنه برکة اهل الارض و مجلیٰ برها نها و امام دار الهجرة و عمدة ارکانها. و کان حدبه علیّ ما قد ظهرت ایاته ولاحت مخائله واماراته. وصار شغفی به یضرَب به الامثال. ولا یعلم کنهه الاّ کبیر المتعال"[1]

(شیخ ولی اللہ العمری کا خط بنام شیخ ابراہیم مدنی (انکے والد شیخ ابو طاہر مدنی) قدس اللہ اسرارہم کی

---

[1] حیات ولی، صفحہ ۲۸۱

تعزیت میں۔ خدا تعالیٰ علم کے آثار اونچے اور اسکی بنیادیں مضبوط کرے۔ دین کے جھنڈے بلند اور اسکے ارکان مستحکم کرے۔ حدیث کے باغ کو سرسبز وشاداب اور اسکی رونق کو دوبالا کرے۔ اہل حدیث کو تازگی اور انکے احزاب (گروہ) کو نور بخشے اور دانشمند بزرگ میرے استاد شیخ ابوطاہر مدنی کردی کے فرزند رشید مولانا شیخ ابراہیم کے حدیث کی درس واشاعت کیوجہ سے علم حدیث کو عروج کمال پر پہنچائے جو پیشوائے مذہبی اور مقتدائے مخلوق ہیں۔ اور اپنے بزرگ اسلاف کی بزرگی و فضیلت کے جائز وارث ہیں۔ اسکے بعد واضح ہو کہ خدا تعالیٰ آپکا اجر بڑھائے اور ہمارے شیخ رضی اللہ عنہ پر صبر کرنے کا آپکو الہام کرے۔ مجھے سزاوار ہے کہ میں اپنے شیخ کی تعزیت کروں اور دعاء صبر میں کوشش کروں۔ خدا کی قسم جب سے شیخ کے انتقال کی جانگداز خبر میرے کان میں پہنچی ہے اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ دنیا سے منہ موڑ کر خداوند رحمت اور اسکی جنتوں میں انتقال کر گئے ہیں تو میں ایک ایسے قلق اور اضطراب میں گرفتار ہوں جو جگر کو پاش پاش کئے دیتا ہے اور اس اندوہ ورنج میں مبتلا ہوں جسمیں صاحب امر مبتلا ہوتا ہے۔ میرے سر پر ایک ایسا ابر چھایا ہوا ہے جو غم و اندوہ کا مینہ برساتا ہے اور میرے نیچے مشتعل آگ کا دریا لہریں لے رہا ہے اور کیوں نہ لے میرے شیخ رضی اللہ عنہ حقیقت میں زمین کے باشندوں کے لئے برکت اور مدینہ طیبہ کے مقتدی و پیشوا اور اسکے عمدہ ارکان تھے انھیں مجھ سے اس درجہ محبت تھی جسکی نشانیاں ظاہر اور علامات وآثار واضح تھے اور میری محبت انکے ساتھ ضرب المثل تھی جسکی حقیقت خدا تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی نہیں جان سکتا۔)

اسکے بعد شاہ صاحب نے اپنی تعلیم کے زمانہ کو یاد کیا ہے اور اپنے استاد کی شفقتوں اور ان سے وداعی ملاقات کا ذکر کیا ہے اور وہ مشہور شعر لکھا جو اس سے قبل ذکر کیا جا چکا ہے یعنی

نسیت کل طریق کنت اعرفه　　الاطریقاً یودینی لربعکم

اور اس غم کی کیفیت کو بیان کیا ہے جو اسوقت استاد کو اس جدائی سے ہوا۔

پھر آگے آپ لکھتے ہیں:

"فلو شئت ان ابکی دماً لبکیته علیه ولکن ساحة الصبر اوسع وان سلو ان فوادی و عصیّةَ اعتمادی عند هجوم دواعی البکاء وضیق الارض علیّ والسماء انه' رضی الله عنه خلف عن مثل جنا بکم دام المجد بقیا مکم وان

الشّبل یشبه الاسد و انما یظهر سرا لوالد من الولد

بقیت بقاء الدهر یا کهف اهله وهٰذادعاء للبریة شامل

والسلام"[1]

(تو اگر میں ان باتوں کو یاد کر کے خون کے آنسو رونا چاہوں تو رو سکتا ہوں لیکن صبر کا میدان زیادہ وسیع ہے اور اسباب گریہ کے ہجوم اور آسمان وزمین کی تنگی کے وقت میرے دل کی تسلی اور میرے بھروسہ کی لاٹھی صرف یہ ہے کہ شیخ رضی اللہ عنہ نے آپ جیسا فرزند اپنی محسوس یادگار چھوڑی ہے۔ اسمیں ذرا شک نہیں کہ شیر کا بچہ شیر کے مشابہ ہوتا ہے اور فرزند سے باپ کی خصلت ظاہر ہوتی ہے۔ اے زمانہ کے ماویٰ وملجا تیری بقا زمانہ کی بقائے دوام کیساتھ رہے اور یہ دعا تمام مخلوق کو شامل ہے۔ والسلام)

اسکے علاوہ اپنے استاد کے نام آپکے کئی خطوط ہیں جنمیں ان سے محبت کا اظہار طرح طرح سے کیا گیا ہے اور انکی ملاقاتوں کو بار بار یاد کیا گیا ہے۔

(۱)"لازالت شابیب الرحمة والبرکات منهلةً و منسجة وسحائب العنایة والکرمة ممطرةً و مستدیمة علی الصقع المحفوف بالبررة الکرام الموصوف بالمجدفوق مانذ کر بالکلام جناب من اجلة ان اذکره بصریح اسمهٖ. واستغنی من ذٰلک بتعیینه بعلا مته و وسمه

ومن العجائب ان افوه بذکره ولقد غار بانْ یّمر بخاطری"

اسی خط میں آگے لکھتے ہیں:

(۲)"امابعد فهذا المستمد بتوجها تکم المعتمد علیٰ دعواتکم بحمدالله تعالیٰ الیکم فی جمیع الامور ظاهر ها و باطنها و یشکرلد یکم نعمة التی لا یحصیٰ عددها ولا یحصر مد دهامن جملتها صوم رمضان بمکة المبارکه واعتکاف العشرة الاخیرة فی المسجد الحرام"[2]

---

(۱) حیات ولی، صفحہ ۲۸۲۔

(۲) حیات ولی، صفحہ ۲۸۳۔

ایک اور خط میں اپنی محبت اور عقیدت کی انتہا اس طرح کی ہے:

(۳)وصل الیٰ مکة زادھا اللہ شرفاً و تعظیماً مأموناً عن جمیع المخوفات سالماً عن جمیع المکروھات. اللھم الافراقکم الذی لا صبر علیٰ صبرہٖ الا کصبر المصبور ولامصانعة معہ' الا کمصانعة المغلوب المقھور...

وللہ لو حلّف العشاق انھم قتلیٰ من الحب یوم البین ماحنثوا

والیٰ اللہ المشتکی وھوالمستعان و ھوالعالم بالاسرار والاعلان والمستولی منکم الدعاء فی الاوقات المرجّوة و طلب الخیر فی الواردات المحوة الحمد للله اولاً و آخراً[۱]

(۱) (آپکی رحمتوں اور برکات کی بوچھاڑیں ہمیشہ سیراب اور فیضیاب کرنے والی ہیں اور آپکی عنایات اور کرم کے بادل برسنے والے ہیں اور ایسی زمین پر اکٹھے ہونے والے ہیں جسکو فرشتوں نے گھیر لیا ہے آپ ایسی عزت وشرف سے موصوف ہیں جو ہمارے تذکرہ اور کلام سے بلند تر ہے اور آپکی ذات اس سے پرے ہے کہ میں صریح نام لیکر آپکا ذکر کروں اور اس بات سے مستغنی ہے کہ اسکا تعین کسی علامت یا نشان سے کیا جائے۔)

(۲) (اسکے بعد واضح ہو کہ یہ (بندۂ ناچیز) آپکی توجہات کا محتاج ہے اور آپکی دعاؤں پر بھروسہ کرنے والا ہے اور تمام امور ظاہری و باطنی میں اللہ تعالیٰ کے حمد وشکر کے ساتھ آپکا شکر گذار ہے۔ان نعمتوں کے لئے جنکا کوئی حد وحساب نہیں اور جنکی کوئی گنتی نہیں۔منجملہ انکے مکہ مبارکہ میں رمضان کے روزے اور عشرۂ آخری میں مسجد حرام میں اعتکاف کی سعادت ہے۔)

(۳) (تمام خوف اور ناگوار باتوں سے محفوظ رہ کر یہ خادم مکہ معظّمہ (خدا اس کی عزت وعظمت بڑھائے) پہنچا۔سوائے آپکے فراق کے جسکا رنج ایسا غم ہے جس پر صبر کرنا ایسا ہے جیسے کسی بندھے ہوئے جانور کا صبر یا ایسا معاملہ ہے جو مغلوب ومقہور سے کیا گیا ہو۔

اگر عشاق حلف اٹھائیں کہ وہ محبت کی بناء پر جدائی کے دن قتل کر دئے گئے ہیں تو واللہ وہ اپنی قسم میں جھوٹے نہ ہونگے۔

میں اللہ ہی سے اپنی شکایات بیان کرتا ہوں وہی مددگار ہے وہی ظاہر وباطن کا جاننے والا ہے اور میں آپ

---

[۱] حیات ولی، صفحہ ۲۸۵

سے اوقات قبولیت میں دعاؤں کا طالب ہوں اور طالب خیر ہوں۔ والحمدللہ اولاً وآخراً)

ان تمام مکتوبات میں آپکا اسلوب آپکی دیگر تصنیفات سے بالکل مختلف ہے۔ اور کیوں نہ ہو! یہ تحریریں ذاتی خطوط کی شکل میں ہیں جن میں فکری اور عقلی کاوشوں کی جگہ جذبات اور قلبی احساسات کا اظہار ہے جو مکتوب الیہ کیلئے کاتب کے دل میں موجزن ہیں اور جنکے اظہار کا طاقتور ذریعہ الفاظ اور جملے ہیں جن پر شاہ صاحب مکمل طور پر قادر ہیں۔ ان خطوط میں آپنے اپنے دور کے عربی ادب میں معروف طریقہ کے مطابق مقفع و مسجع نثر کا بھی استعمال کیا ہے، القاب وآداب میں غلو بھی ہے اور مترادفات اور ہم معنی الفاظ کے ساتھ تحریر میں غنیٰ اور لے بھی پیدا کی گئی ہے۔ موقعہ بہ موقعہ اشعار اور اقتباسات کا استعمال تحریر کی خوبصورتی کو دوبالا کر دیتا ہے اور وہ انشاء کا ایک عمدہ نمونہ بن جاتی ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ مکتوب الیہ ایک عرب عالم ہیں جو آپکے استاد بھی ہیں اور عربی نژاد ہونے کی وجہ سے زبان داں بھی اس لئے ان سے مخاطب ہونے والے کو یہ بھی ملحوظ خاطر رہا ہے کہ کہیں لغات، اسلوب یا لہجہ میں کوئی کمی یا نقص نہ رہ جائے۔ اسکے ساتھ اپنے جذبات کا والہانہ اور قلم برداشتہ استعمال تحریر کو رواں اور سلیس بنا دیتا ہے۔

ان خطوط کے علاوہ دو اور خط دلچسپی کا باعث ہیں۔ ایک خط میں شاہ صاحب نے اپنے چند دوستوں کو کچھ نصیحتیں کی ہیں اور دوسرے خط میں وحدۃ الوجود جیسے ادق مسئلہ کو چند لفظوں میں سلجھانے کا عجیب وغریب کام کیا ہے۔ یہ خطوط ادبی اعتبار سے بھی اسلئے اہم ہیں کہ انمیں دیگر مکتوبات کی طرح القاب وآداب میں غلو یا مسجع نثر اختیار کئے بغیر بھی تحریر میں ایک خاص اثر پیدا کیا گیا ہے جو زیر تحریر موضوع کو بیان کرنے میں آپ کی قادر الکلامی کا ثبوت ہے۔

اول الذکر میں آپ لکھتے ہیں:

من الشیخ عارف باللہ الیٰ بعض خلانہ

ان الزمان قدتغیّر وان المشرب قد تکدّرَ ولیس کل تزیاً تزین المسلمین مسلماً ولیس کل مایدعیه الانسان لنفسهٖ مسلّماً. فایاک و خمسة من الناس فانهم فی الحقیقة بمنزلةِ انناس.

۱. صوفیٌ شاطح یحتال لرفع التکلیف ولایقف فی مجازی امره عندالتوقیف،

۲. معقولی مجادل ینشر فتنة الشکوک والا وهام ولاینقاد بقیاد العزیز العلام، و

۳. فقیه مختر ح یستطیب علیٰ اقوال المیتة ولایتبع ما اوضحه النبی صلی الله علیه وسلم لامة ، و

٤. زاهد متقشف یتشد دفی دینه کان الترخص لیس فی خزینه، و

٥. غنيٍ طاغٍ یتکلف زی الاعاجم ویتد اخل فی مضاربه الجماجم.

والسلام [۱]

(منجانب شیخ عارف باللہ بعض احباب کے نام

بیشک زمانہ کا رنگ بدل گیا ہے اور (مذہب کا) گھاٹ گدلا (مکدر) ہوگیا ہے اور نہ ہر پوشش جو مسلمانوں کو زیب وزینت بخش رہی ہے اصل میں اسلامی ہے اور نہ ہر وہ شے جسکو انسان اپنے لئے طلب کررہا ہے، محفوظ ہے۔ پس تم کو لازم ہے کہ تم پانچ قسم کے لوگوں سے اپنے کو بچاؤ جو در حقیقت بمنزلۂ اناس ہیں:

۱۔ آوارہ صوفی جو تکلیف (مکلّف ہونے) سے بچنے کے لئے مکر سے کام لیتا ہے۔ اور موقعہ پڑنے پر اپنے عمل میں ثابت قدم نہیں رہتا۔ اور

۲۔ جھگڑالو معقولی (عقل کی بالادستی کا قائل) جو شکوک واوہام کا فتنہ پھیلاتا ہے اور اللہ عزیز العلام کی قیود کا پابند نہیں ہوتا۔ اور

۳۔ شیخی خور فقیہ جو مردہ اقوال پر خوش ہوتا ہے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے لئے جن باتوں کی وضاحت کی ہے انکی پیروی نہیں کرتا۔ اور

۴۔ بدحال زاہد خشک جو دین میں سختی اور تشدد کرتا ہے گویا کہ رخصت اور آسانی اسکے خزانہ میں نہیں۔ اور

۵۔ سرکش مالدار جو عجمیوں کے فیشن کو بہ تکلف اختیار کرتا ہے اور امراء کے ہنگاموں میں خواہ مخواہ دخل اندازی کرتا ہے۔ والسلام)

اس مختصر سے نصیحت نامہ میں شاہ صاحب نے اپنے معاشرہ میں پھیلی ہوئی تمام بے راہ رویوں اور سماج

---

[۱] حیات ولی، صفحہ ۲۸۹۔

کے مختلف طبقوں میں پائے جانے والے ان اشخاص کی نشان دہی کردی ہے جو مقتدا کہلاتے ہیں۔ مگر انکی پیروی سے گمراہی کے علاوہ کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ یہ مکتوب ایجاز کا عمدہ نمونہ ہے۔ اسمیں نہایت مختصر انداز میں تھوڑے الفاظ میں اپنا مافی الضمیر پوری طرح واضح کیا گیا ہے اور ان لوگوں کی قلعی کھولی ہے جو معاشرہ کی دیمک بنے ہوئے تھے۔

ایک خط جو شاہ صاحب نے مولانا عبدالقادر جونپوری کی وحدۃ الوجود کے بارے میں ایک استفساری تحریر کے جواب میں لکھا ہے اسکا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ بقول رحیم بخش دہلوی:

''اس خط کو نقل کرنے سے علاوہ ادب انشاء اور زور تقریر کے ناظرین کو یہ بھی دکھانا منظور ہے کہ آپکو صوفی تحقیقات میں کس درجہ اقتدار تھا اور اس خاص علم کو آپنے کس عروج پر پہنچادیا'' [1]

مولانا عبدالقادر کو مخاطب کر کے آپ لکھتے ہیں:

امابعد فقد وصل الیّ مکتوبکم الشریف الدال علیٰ مخبرکم المنیف یعرض علٰی مسئلة حارت فی بوادیها الافکار و تقاعست دو نها الانظار. و کیف لی بجوابها فی ورقةٍ اوحلّها فی کلمةٍ لکنی اذکر نکتة قولکم فی تقریر المعنی الثالث للتوحید: ان ذوات الممکنات بحذافیرها و ذرات المجعولات بنقیرها وقطمیرها ها لکةٌ فی شبح جوهر ها باطلة فی حدانفسها فلولا فیض الواجب لم یکن هناک ذات ولم یعقل ماهیة و انما نقررها و نصدرها و صلوحها للحکم علیها و بها بالنظر الیٰ تلک الذات المنیث فیضا الممتدظلها' انتهیٰ.

هو بعینهٖ معنیٰ وحدة الوجود عندالمحققین من اهل المعرفة و الشهود غیران الناس لهم السنةٌ شتیٰ بعضها من قبیل النجوزوالمسامحة و بعضها من قبیل التحقیق والمفاتحة عبار اتنا شتیٰ وحسبک واحد کل الیٰ ذٰلک الجمال یشیر. فهٰذا الفیض الوجدانی بالذات المتکثر باعتبار القوابل یسمیٰ بالفیض الاقدس من جهة صدرالماهیات و بالفیض المقدس من جهة صدور العقلیات و لوازم الوجود الخارجی. اما قولهم 'هوالوجود المطلق' فلا یعنون 'بالمطلق'

---

[1] حیات ولی، صفحہ ۲۹۱۔

الامر المنتزع عن الافراد کمایقرره المتکلم فی الکلیات' ولا 'الموجود' فی ضمن الافراد ولا باستقلال کمازعمه الحکیم ولکن امراً هو متحقق فی نفسه متعین بذاته استوت نسبة الی الممکنات باثرها والعقل مقول علیٰ معنیین احد هما النفس الناطقة وکل معرفة فانما هی قائمة بالنفس حاصلة لها. وثانیهما قواعد اسسها قوم اشتغلوا بالعلوم العقلیه ورُبَّ دقیقةً فاقت تلک القواعد و بعد فان الحالة الراسیة لاکثر من هٰذاوعسیٰ ان یکون بعد ذٰلک عود.

والمرجو من مکارم اخلاقکم ان لا تنسو نامن مصالح دعواتکم ولا من لطیف مکاتبا تکم فالمکاتبة نوع من الاستصحاب والعبرة بمناسبة الارواح لا بمقارنة التراب. احسن الله تعالیٰ الیکم وافاض نعمته' علیکم. والسلام[1]

(امابعد۔ مجھکو آپکا مکتوب گرامی ملا جس سے آپکی خیریت کی خبر ملی۔ آپنے ایسا مسئلہ پیش کیا ہے جسکی وادیوں میں افکار حیران رہ جاتے ہیں اور اسکو دیکھنے سے آنکھ قاصر ہے اور نظر پلٹ آتی ہے اور میں کیونکر ایک ورق میں اسکا جواب دے سکتا ہوں یا اسکو ایک جملہ میں حل کرسکتا ہوں۔ لیکن مجھے توحید کے تیسرے مطلب کی تقریر میں آپکے قول سے ایک نکتہ یاد آتا ہے جسمیں آپنے فرمایا ہے 'بیشک ممکنات عالم کی حدود میں تمام اشیاء اور مخلوقات عالم کے تمام قلیل وکثیر ذرات اپنے جوہر سمیت اور اپنی حد کے اندر تمام وکمال ہلاک ہونے والے ہیں۔ اگر حق تعالیٰ سبحانہ کا فیض و کرم نہ ہوتو یہاں کوئی شئے باقی نہ رہے، اور نہ ماہئیت عقل میں آئے لیکن ہم اس ماہئیت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اسکو سمجھتے ہیں اسکی اصلاح کرتے ہیں جو اس شے کے لئے مقرر کردہ احکامات کے مطابق ہوتا ہے۔ اور یہ سب اسی ذات باری پر نظر رکھتے ہوئے ہے جسکے فیض کا سایہ ہر چہار سو پھیل رہا ہے، فقط۔

اہل معرفت وشہود محققین کے نزدیک بعینہٖ یہی تو وحدۃ الوجود کے معنی ہیں۔ سوائے اس بات کے کہ لوگوں کے پاس طرح طرح کی زبانیں ہیں جو کچھ تو تکمیل کار اور مسامحت (نرمی) کے قبیل کی ہوتی ہیں اور کچھ تحقیق ووضاحت کے واسطے ہوتی ہیں۔ ہماری عبارتیں مختلف ہوتی ہیں مگر آپکی سمجھ ایک ہے کہ انمیں سے ہر ایک اسی جمال کی جانب اشارہ کرتی ہے۔ تو یہ منبع فیض جو اپنی

---

[1] حیات ولی، صفحہ ۲۹۴۔

ذات میں یکتا وواحد ہے اور قوابل کے اعتبار سے متعدد ہے اسکو ماہیات کے وقوع کے لحاظ سے فیض الاقدس کے نام سے یاد کیا گیا ہے اور عقلیات کے ثبوت اور وجود کے لوازم خوارجی کے اعتبار سے فیض المقدس کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اور کہنے والوں کے قول 'وہ وجود مطلق ہے' کے سلسلہ میں عرض ہے کہ مطلق سے انکا مطلب ایسا امر نہیں جو افراد میں منقسم ہو جیسا کہ متکلم نے کلیات میں کہا ہے۔ اور نہ 'موجود' افراد کے ضمن میں آیا ہے اور نہ ہی مستقلاً اسکے یہ معنی ہیں۔ جیسا کہ حکماء سمجھتے ہیں۔ لیکن بات یہ ہے کہ 'وہ' اپنے آپ میں متحقق اور اپنی ذات میں متعین ہے۔ اور عقل (والوں) کا قول دو باتوں پر منحصر ہے۔ اولاً خود انسان کا نفس ناطق اور اسکی معرفت کیونکہ وہ (عقل) نفس پر ہی قائم اور اسی کا ماحصل ہے۔ اور دوم ایسی بنیاد جسکو ان اقوام نے اٹھایا ہے جو علوم عقلیہ کی جانب مائل ہیں اور کبھی کبھی ایک چھوٹا سا ذرہ (دقیقہ) اس بنیاد کو ڈھا دیتا ہے۔۔۔۔ اسلئے کہ مضبوط حالت اس سے بہت زیادہ ہے اور شاید اسکے بعد ہی معاد ہے۔

میں آپکے مکارم اخلاق سے امید کرتا ہوں کہ آپ اپنی مستجاب دعاؤں میں اس ناچیز کو نہیں بھولیں گے اور نہ ہی اپنے عمدہ خطوط بھیجنے میں فراموش کرینگے۔ کیونکہ مکاتبت (خط وکتابت) استحباب کی ایک طرز ہے اور ارواح کی مناسبت کی شکل ہے نہ کہ جسموں کی مقارنت (قربت) کی۔

احسن الله تعالیٰ الیکم وافاض نعمته' علیکم. والسلام)

اس مکتوب میں شاہ صاحب نے چند جملوں میں وحدۃ الوجود جیسا دقیق اور پیچیدہ مسئلہ سلجھا دیا ہے جسکے لئے صفحات کی ایک ضخیم جلد بھی شاید ناکافی ہوتی۔ یہ مسئلہ جسکے لئے خود شاہ صاحب نے 'حارت فی بوادیها الافکار' اور 'تقاعست دونها الانظار' کی ترکیبیں استعمال کی ہیں اور 'کیف لی بجوابهافی ورقة اوحلهافی کلمة' کہہ کر اپنی علمی کم مائیگی اور کسر نفسی کا اظہار کیا ہے، اسکو خود سائل کے ہی الفاظ نقل کر کے یہ لکھ کر حل کر دینا کہ هو بعینه معنی وحدة الوجود اور اسکے بعد صرف چند جملوں میں اسکو بیان کر دینا شاہ صاحب کی تحریری قوت کا ایک اعجاز ہے۔ ادبی اعتبار سے یہ خط فصاحت وبلاغت سے لبریز ہے۔ حیات ولی میں رحیم بخش لکھتے ہیں:

''شاہ صاحب کا اعجاز ہے کہ آپنے اس طولانی اور غیر محدود مبحث کو چند چھوٹے چھوٹے جملوں میں اس طرح ادا کر دیا کہ گویا کوئی بڑا کام ہی نہ تھا۔ پھر طرفہ یہ کہ جو جملہ آپکے قلم سے نکل رہا ہے یہ

معلوم ہوتا ہے کہ سانچے میں ڈھل کر نکل رہا ہے۔ ہر ہر فقرہ تصوفی تحقیقات سے بھرا ہوا ہے۔ الفاظ کی بندش اور عبادت کی چستی سے جس قدر عالمانہ پن برستا ہے اسی قدر مطالب کی خوبی سے آپکی شان ظاہر ہوتی ہے'' [1]

نفس مضمون کے علاوہ آپنے اس خط کو جس انداز میں ختم کیا ہے اور مکتوب الیہ سے جس طرح دعا اور توجہ کی درخواست کی ہے وہ بھی آپکی اخلاقی بلندی اور تحریری خصوصیات کو بخوبی ظاہر کرتا ہے۔

المکاتبه نوع من الاستصحاب سے غالب کی 'نصف ملاقات' یاد آجاتی ہے اور مکتوب نویسی میں شاہ صاحب کا مقام بھی متعین ہوجاتا ہے۔

شاہ ولی اللہؒ کا منظوم ادب

شاہ صاحب کی ادبی حیثیت متعین کرنے کے لئے آپکے تحریر کردہ نثری ادب کے علاوہ آپکی منظوم کاوشوں کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ آئندہ صفحات میں آپکی منظومات کا ادبی پہلو اور جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

آپ اپنی نثری کاوشوں کے واسطے جس قدر مشہور ہیں شاعری کے سلسلہ میں اتنے مشہور نہیں۔ آپ دراصل بنیادی طور پر ایسے شاعر نہیں جو اپنی شعری تخلیقات کی بناء پر شہرت حاصل کرتے۔ آپ کی نثری تحریریں، تحقیق و تدقیق اور مذہبی امور کے سلسلہ میں استناد کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان سنجیدہ موضوعات کے بیان میں آپ نے شعوری طور پر مقفع و مسجع نثر سے اجتناب کرتے ہوئے ایک نئے اسلوب کی بنیاد ڈالی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں شاعری جیسے لطیف تخیلاتی ادب کی گنجائش نہ ہونے کے برابر ہے۔ اسکے علاوہ آپ نے اپنے تمام تصنیفی و تخلیقی سفر میں خود کو ان حدود میں محصور کرلیا تھا جو قرآن و حدیث کی وضع کردہ تھیں۔ ان میں شاعری کا دائرہ انتہائی مختصر ہو جاتا ہے اور شاعر کو وہ تخیلاتی میدان فراہم نہیں ہوسکتا جس میں اسکے قلم کی جولانی حقیقت کے بجائے تصور اور سچ کے بجائے جھوٹ پر مبنی ہو۔ قرآن کریم میں شعراء کی اسی برائی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

الم ترانهم فی کل وادٍ یهیمون. وانهم یقولون مالا یفعلون [2]

---

[1] حیات ولی، صفحہ ۲۹۵

[2] القرآن، سورہ الشعراء الایۃ، ۲۲۵-۲۲۶۔

(کیا تم نہیں دیکھتے کہ وہ ہر وادی میں مارے پھرتے ہیں۔ اور وہ ایسی بات کہتے ہیں جس پر عمل نہیں کرتے)

شاہ صاحب کی تعلیم و تربیت ایسے ماحول میں ہوئی تھی کہ آپکو اس حقیقت کا بخوبی احساس تھا۔ اسی لئے آپ نے ادب کی اس صنف پر اپنی توجہ خاطر خواہ مبذول نہیں کی۔ شاید اسی بنا پر شاہ صاحب بحیثیت عربی و فارسی شاعر کے قبولیت عام نہ حاصل کر سکے۔ فارسی غزلوں و رباعیات میں آپنے تصوف کے اسرار و رموز اور حقائق و معارف کا بیان کیا ہے جن میں آپکا تخلص امینؔ ہے۔ آئندہ صفحات میں آپکے عربی کلام کے ادبی پہلوؤں پر گفتگو کی جارہی ہے۔ آپکی شاعری کے محرکات و دواعی کے سلسلہ میں آپ کے ایک اہم سوانح نگار رحیم بخش دہلوی رقم طراز ہیں:

''محبت اور عشق الٰہی میں محترم شاہ صاحب اس قدر محو تھے اور انھوں نے اپنا مبارک اور برتر خیال کن پر اثر اور جوشیلے الفاظ میں کیا ہے۔ اشعار مذکورہ کے پڑھنے اور ہر ہر مصرع پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسکا قائل وہی شخص ہے جو عشق الٰہی اور محبت خداوندی میں پاؤں سے سر تک ڈوبا ہوا ہے اور بے خودانہ سرخوش حالت اور عالم وجد میں اسکی زبان مبارک سے یہ وجد میں لانے والے اشعار سرزد ہوئے ہیں۔ [1]

اگر چہ یہ رائے صاحب حیات ولی نے شاہ صاحب کے فارسی کلام کے نمونے پیش کرتے ہوئے دی ہے مگر آپکی عربی شاعری پر بھی اس شرط کے ساتھ صادق آتی ہے کہ 'محبت و عشق الٰہی' کی جگہ 'محبت و عشق محمدیؐ' کے الفاظ استعمال کئے جائیں۔ آپکا نعتیہ قصیدہ **اطیب النغم فی مدح سید العرب و العجم** تو اس اظہار عشق کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

اسکے علاوہ جو روحانی تصورات آپ پر طاری تھے اور مقامات سلوک کو طے کرتے ہوئے جو مشاہدات حقانی آپ نے اپنی باطنی نگاہوں سے حاصل کئے تھے آپکی شاعری میں انکا بھی کما حقہ اظہار ہے۔ قصیدہ لامیہ جو انھیں تخیلات سے پر ہے آپ کے ابتدائی دور کی یادگار ہے اور فیوض الحرمین کے گیارہویں مشاہدہ کے خاتمہ پر منقول ہے۔ جبکہ قصیدہ بائیہ اطیب النغم و قصیدہ ھمزیہ آپکے اس آخری دور تصنیف کی یادگار ہیں جب آپ حجاز سے واپس آکر تصنیف و تالیف میں منہمک ہو گئے تھے۔

شاہ صاحب کے مطالعہ، علم اور تجربہ کی بناء پر یہ بعید از قیاس بات ہوگی اگر سوچا جائے کہ آپکا کلام قواعد و

---

[1] حیات ولی، صفحہ ۲۸۰۔

ضوابط شاعری سے خالی اور فنی باریکیوں سے معریٰ ہو۔ آپکے کلام میں فن شاعری کی وہ تمام رعایتیں موجود ہیں جو ایک قادر الکلام شاعر کے کلام میں ہونی چاہئیں۔ نزھۃ الخواطر میں اسی پہلو کی جانب اشارہ کیا گیا ہے:

"واما شعرہ' بالعربی فکانما الا عجاز او السحر فی رقۃ اللفظ و معناہ و صفا المور دو مغناہ" [1]

(اور آپکے عربی اشعار سے سلاست الفاظ و معانی، لغات کی طہارت (purity) اور نغمگی میں گویا ایک اعجاز و سحر کی کیفیت رکھتے ہیں)

شاہ صاحب کا جس قدر بھی عربی کلام ہے وہ اپنے شعری محاسن میں اپنی مثال آپ ہے۔ حیات ولی کے مصنف لکھتے ہیں:

"شاعری جو علم و ادب کے لئے ایک گرانمایہ جوہر ہے۔۔۔۔ اس میں اس درجہ کا کمال تھا کہ لوگوں نے گیارہویں صدی کے شعراء کے زمرہ میں آپکو جداگانہ شمار کیا ہے۔۔۔ جب ہم گیارہویں صدی کے شعراء کی فہرست میں آپکو ڈھونڈتے ہیں تو نہایت روشن اور جلی حرفوں میں آپکا نام نامی پاتے ہیں" [2]

بہر نوع ادبی حیثیت سے آپکا مقام عربی شاعری میں بھی اتنا ہی منفرد اور بلند ہے جتنا عربی نثر اور مجموعی حیثیت سے آپکی شخصیت اور علمی تبحر سے مطابقت رکھتا ہے۔

حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت و مدح میں شاہ صاحب کے عربی قصائد بڑی اہمیت کے حامل ہیں اگرچہ انکا منظوم سرمایہ بہت کم ہے مگر جو بھی ہے وہ عشق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ڈوبا ہوا ہے۔ ان میں آپکے قصیدہ بائیہ اور قصیدہ ھمزیہ مشہور ہیں۔ قصیدہ بائیہ کا نام خود شاہ صاحب نے "**اطیب النغم فی مدح سید العرب و العجم**" مقرر کیا۔ انکے علاوہ آپکے صاحبزادہ شاہ عبدالعزیز کے مرتب کردہ دیوان میں شاہ صاحبؒ کے منظومات پر مخمس اور انکے بعض دیگر قصائد ہیں۔

قصیدہ اطیب النغم ۱۰۷ اشعار پر مشتمل ہے۔ شاہ صاحب اسکی وجہ تالیف میں لکھتے ہیں:

"اسکے بعد فقیر ولی اللہ (خدا اس سے درگذر فرمائے) کہتا ہے کہ مدح سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] نزہۃ الخواطر، صفحہ ۴۱۔

[2] حیات ولی، صفحہ ۲۷۵۔

کی اور آپؐ کے مناقب کا پھیلانا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دلائل نبوت کا ذکر بے شبہ برکتیں بڑھاتا ہے اور درجہ بلند کرتا ہے۔ اس باب میں فقیر نے قصیدہ بائیہ کی نظم میں توفیق پائی۔'' [1]

انھوں نے یہ قصیدہ حضرت سواد بن قارب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قصیدہ بائیہ کی پیروی میں لکھا ہے۔ حضرت سوادؓ نے ایک نہایت فصیح و بلیغ قصیدہ بائیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں پیش کیا اور وہ آپؐ کے شرف پسندیدگی سے سرفراز ہوا۔ چنانچہ شاہ صاحبؒ نے اسی ردیف و قافیہ میں یہ قصیدہ تبرکاً تحریر کیا ہے۔ اسمیں بعض غریب و نادر الفاظ کی وجہ سے انھوں نے فارسی میں اسکی مختصر شرح خلاصہ کے طور پر تحریر کی اور ہر ایک مقصد کا جداگانہ فصل میں اس طرح بیان کیا:

فصل اول: اس میں تشبیب کے پانچ اشعار ہیں۔ اسکے بعد گریز یا خلاصی الی المدح کے طور پر دو شعر ہیں۔

فصل دوم: پانچ اشعار حضورؐ کی شفاعت کبریٰ کے بیان سے متعلق ہیں۔

فصل سوم: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے سلسلہ میں انبیاء سابقین کی بشارتیں اور پاک نسبت سے متعلق چار اشعار۔

فصل چہارم: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف حمیدہ اور اخلاق کریمہ کے بیان میں گیارہ اشعار۔

فصل پنجم: حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل قوم عرب کے احوال، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقصد اور قوم کی اصلاح کے بیان میں انیس اشعار ہیں۔

فصل ششم: پانچ اشعار نبوت کے دلائل اور شریعت کے قیام و احکام اطاعت سے متعلق ہیں۔

فصل ہفتم: تیئیس اشعار معجزات کے بیان میں ہیں۔

فصل ہشتم: آل و اصحاب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر دعا اور انکے تذکرہ میں آٹھ اشعار ہیں۔

فصل نہم: طبقات مومنین (تابعین، تبع تابعین قرن بعد قرن) سے متعلق دس اشعار۔

فصل دہم: عشق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چھ اشعار۔

فصل یازدہم: نو اشعار۔ اس طرح کل ۱۰۷ اشعار ہیں۔

شاہ صاحبؒ کی منظومات فصاحت و بلاغت اور فن بدیع (۲) کے محاسن (۳) سے پر ہیں۔ قصیدہ بائیہ و

---

[1] اردو ترجمہ نظم و نثر (اصل مقدمہ در فارسی) شاہ صاحب مترجم دوست محمد اجمیری صفحہ ۱

(۲) علم بدیع وہ علم ہے جسکے ذریعہ فصیح و بلیغ کلام کو عمدہ الفاظ و معانی کے استعمال سے خوبصورت بنانے کے طریقے معلوم ہوں۔

(۳) علم بدیع کے محاسن کی دو اقسام ہیں۔ (۱) محسنات معنویہ (۲) محسنات لفظیہ۔ (البلاغت: صفحہ ۱۲۰)

ھمزیہ میں حماسہ، تخیل، محاسن کلام اور جذبات کی فراوانی کے ساتھ ساتھ انکا فلسفہ اور نقطۂ نظر بھی ظاہر ہوتا ہے۔
قصیدہ بائیہ کی ابتدا ہی جس شعر سے ہوتی ہے اسمیں تشبیہ کی نادر مثال ہے

کان نجوماً اومضت فی الغیاھب　　عیون الافاعی اور وس العقارب

(شاعر کو رات کے تارے بھی شدت آلام کی بناء پر سانپوں کی آنکھیں اور بچھوؤں کے سر کی مانند نظر آتے ہیں)

یہ کیفیت انسان کی اسوقت ہوتی ہے جب وہ انتہائی پریشانی کی حالت میں ہو۔ اسکو کچھ بھی اچھا نہیں لگتا ہر چیز گویا کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔ اس کیفیت کو اگر ہم شاہ صاحب کے دور کے حالات پر منطبق کر کے دیکھیں تو اس تشبیہ اور اس پریشانی کے جذبہ کا فہم اور لطف دوگنا ہو جاتا ہے۔ شعر کا پہلا مصرعہ دراصل حضرت سواد بن قارب ؓ کے قصیدہ کا ہے جس پر تضمین کر کے شاہ صاحب نے یہ قصیدہ لکھا ہے۔

دوسرے شعر میں بھی شاہ صاحب نے محاوروں اور ضرب المثل کے ذریعہ اپنی پریشانیوں اور قلبی تشویش کا بخوبی اظہار کیا ہے۔

اذاکان قلب المرء فی الامر خاثراً　　فاضیق من تسعین رحب السباسب

یہاں تسعین کا لفظ محاورتاً استعمال ہوا ہے۔ اگر کلمہ کی انگشت کا پورا انگوٹھے کی جڑ میں رکھا جائے تو نو کے ہندسہ کی شکل بن جاتی ہے اس طرح کہ حلقہ بہت تنگ ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ محاورہ تنگی اور پریشان حالی کے لئے استعمال ہوتا ہے جسکو فاضیق من تسعین (عدد نو سے تنگ تر) سے ظاہر کیا گیا ہے۔ النفس الخاثر کا مطلب طبیعت کا بھاری ہونا ہے یعنی غمگین دل ہونا۔ اگر انسان غم سے دل تنگ ہو تو بیابانوں کی وسعت بھی اسکے لئے ۹۰ کے عدد سے زیادہ تنگ لگتی ہے۔ اگلے دو اشعار بھی انھیں جذبات کے اظہار کے لئے کہے گئے ہیں۔

تشبیب کا یہ طریقہ ادبی اعتبار سے حماسہ (جذبات غم و بے چینی) اور اسکے اظہار کا بہترین ذریعہ ہے جسمیں شاعر اپنی بے چینی و بے قراری کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کی قلبی کیفیات اسکو مجبور کرتی ہیں کہ کسی ایسی شفیق اور غمگسار ہستی کا سہارا پکڑے جو اسکو دین و دنیا کے غموں سے چھٹکارا دلا سکے اور وہ ہستی سوائے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی نہیں دکھائی دیتی۔ یہاں وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ کی صفت دستگیری کو بخوبی ظاہر کرنے کے لئے قصر افراد (۱) کی مدد لے کر یہ بات بیان کرتا ہے کہ سوائے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی ایسا

---

(۱) قصر افراد: فن بلاغت کی اصطلاح میں ایک شے کو دوسری شے کے ساتھ کسی خاص طریقہ پر مخصوص کرنے کو قصر کہتے ہیں۔ قصر افراد وہ قصر اضافی ہے کہ سننے والا (مخاطب) کلام میں شرکت کا گمان رکھتا ہو اور اسی ابہام کو دور کرنے کے لئے کہنے والا (متکلم) کسی ایک شے یا شخص کے ساتھ قصر کر دے جیسا کہ شعر میں ہے فلست اری الا الحبیب محمد۔ یہ نفی اور استثنٰی کا قاعدہ ہے جو 'الا' سے ظاہر ہوتا ہے اور مقصود کلام حرف استثناء کے بعد ہوتا ہے۔ (البلاغت: صفحہ ۲۱-۲۲)

پیارا بندہ مجھے نظر نہیں آتا جو میری مدد کر سکے

فلست اریٰ الاالحبیب محمد　　رسول الٰہ الخلق جم المناقبِ

اس جگہ سے شاعر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مناقب اور توصیف کی جانب گریز کرتا ہے اور آپ کی سب سے بڑی منقبت یعنی شفاعت کبریٰ کا تذکرہ کرتے ہیں کہ قیامت کے دن تمام انبیاء کرام اللہ کے سامنے زبان کھولنے اور بندوں کی مصیبتوں اور انتظار کو دور کرنے کی سفارش سے کترائینگے۔ اس فصل میں انھوں نے قرآن مجید اور احادیث صحیحہ بخاری و مسلم کی جانب اشارہ کیا ہے اور قیامت کی ہولناکی کا بیان آیات قرآنی کی روشنی میں کیا ہے۔ کلام پاک میں اس دن کی سختی کو ظاہر کرنے کے لئے سورہ مزمل کے پہلے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ دن ایسا ہوگا کہ:

یوماً یجعل الولدان شیباً [1]　　(وہ دن جو بچوں کو بوڑھا بنادیگا)

شاہ صاحب اس بات کو اس طرح بتاتے ہیں:

اذاجاء یومٌ فیه شَیب الذّوائب

حدیث شفاعت جسکا حوالہ شاہ صاحب نے دیا ہے وہ ایک طویل حدیث ہے جو حضرت انسؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ وغیرہ اکابر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنھم سے مروی ہے اور جسمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کارنامہ شفاعت کا تذکرہ ہے جسکے نتیجہ میں اللہ رب العزت اپنے بندوں پر نظر رحمت کرتے ہوئے میزان عدل قائم فرما کر بندوں کا حساب کتاب فرمائیگا۔ اس تلمیح کے ذریعہ شاعر نے آپؐ کے صاحب وسیلہ ہونے اور خلق اللہ کے ساتھ اپنی غمخواری اور شفقت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ ایسا شفیق و کریم نبی ہی میرے غموں سے مجھکو چھٹکارا دلا سکتا ہے۔

اس جگہ سے شاہ صاحب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مناقب کی تفصیل بیان کرنی شروع کی ہے۔ سب سے پہلے آپکی خاندانی نجابت اور انبیاء علیہم السلام خصوصاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی آپؐ کی آمد کی بشارت کا ذکر ہے۔ اور اسی ضمن میں آپؐ کی ان خصوصیات کا بھی تذکرہ ہے جنکا ان بشارتوں میں حوالہ دیا گیا ہے۔ یہاں بھی قرآن مجید اور احادیث صحیحہ میں بتائی گئی خصوصیتوں کی جانب اشارہ ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں ہے۔

ولو کنتَ فظّاً غلیظاً القلب لانفدو من حولک [2]

---

[1] القرآن، سورہ المزمل

[2] القرآن، سورہ آل عمران، آیۃ ۱۵۹۔

(اگر تم تند خو سخت دل ہوتے تو لوگ تمہارے پاس سے ہٹتے)۔

شاہ صاحب اسی خلق کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ **لیس خلقه، بفظٍ** (آپ تند خو نہ تھے)

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی دعاؤں کا حوالہ دیتے ہوئے جو انھوں نے بنائے کعبہ کے وقت کی تھی کہ **ربنا وابعث فیهم رسولاً من انفسهم یتلوا علیهم آیٰتک ویعلمهم الکتاب والحکمة و یزکیهم**[1] آپ کہتے ہیں:

ودعوة ابراهیم عند بنائه　　بمکة بیتاً فیه نیل الرغائبِ

اسکے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیہ مبارک کا بیان ہے۔ جو احادیث مختلفہ سے لیا گیا ہے اور آپ کی سخاوت، بہادری جرأت اور آپؐ کے عزائم کا تذکرہ ہے۔ ان ابیات میں بھی جو لغات استعمال کی گئی ہیں ان میں آپؐ کی صورت مبارکہ اور آپ کی جرأت کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ **اجود خلق الله صدراً** اور **ابسطهم کفاً**(۲) کے الفاظ سے آپ کی سخاوت کا بیان کیا گیا ہے اور **اعظم حرِّ** میں آپ کی شجاعت کی تصویر کھینچی گئی۔ یہاں بھی محاوروں اور ترکیبوں کے استعمال سے تحریر میں ادبی خوبیاں اور لطف پیدا کئے گئے ہیں۔ مثلاً جنگ کی شدت کو **احمرّ الباس** (یعنی خوف کی سرزمین کے سرخ ہوجانے) سے تعبیر کیا گیا ہے جس طرح سے اردو میں لڑائی بھڑ کنا یا میدان کارزار گرم ہونا وغیرہ استعمال کیا جاتا ہے اور **بئس المواجب** سے بدترین قتل گاہ کو ظاہر کیا گیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم نے اپنی نادانی کی بناء پر آپؐ کو ایذائیں پہنچائیں اور آپؐ سے رو گردانی کی۔ اس کے باوجود آپؐ نے ہمیشہ ان کے حق میں دعائیں کیں۔ اور انکو معاف فرمایا۔ ان اشعار میں اس واقعہ کی جانب اشارہ کیا گیا ہے جب ایک اعرابی نے اپنی چادر جسکا حاشیہ بہت کھردرا اور سخت تھا آپؐ کے گلے میں ڈال کر اسے اسطرح کھینچا کہ آپؐ کی گردن مبارک پر اسکا نشان پڑ گیا۔

ومازال یعفو قادراً عن مسیهم　　کما کان منه عندجبذة جاذبِ

یہاں جذب کے بدلے اسکے الفاظ پلٹ کر جبذ استعمال کیا گیا ہے۔ جو لغت مغلوب کہلاتی ہے اور محاسن لفظیہ (۳) کا ایک کمال ہے

---

[1] القرآن: سورہ البقرہ آیت ۱۲۹

(۲) **ابسطهم کفا** (لوگوں میں سب سے زیادہ کشادہ ہاتھ والے): آپ کی سخاوت کی جانب کنایہ ہے۔

(۳) محاسن (محسنات) لفظیہ: وہ الفاظ جن سے کلام میں حسن وندرت پیدا ہو۔ (البلاغت: صفحہ ۱۲۰)

آپؐ نے تمام عمر اپنے لئے نہایت سادہ مگر باوقار زندگی کی دعا کی جسمیں دنیاداروں کی آسودگی اور عیش و عشرت نہ ہو جیسی کہ عجم کے بادشاہوں کی ہوتی تھی اور آپ کمالات میں بے نظیر ہیں۔

بدیعٌ کمالٌ فی المعانی فلاامرءٌ　　یکون لہ' مثلاً ولا بمقاربِ

اس شعر میں 'بدیع' اور 'معانی' کے الفاظ میں ایہام تطبیق پایا جاتا ہے۔ کیونکہ بدیع بھی معانی کے کمال کا ایک حصہ ہے اور اقسام معانی سے ایک قسم بدیع بھی ہے۔ اسی لئے بدیع اور معانی میں ایک شائبہ مطابقت لفظی کا ہے جو ایک حسن معانی ہے۔

اگلے اشعار میں نبوت کی ان دلیلوں کی طرف اشارات ہیں جنکے ذریعہ بعثت سے قبل کے عرب وعجم کے حالات و مذاہب کی روشنی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت وحالات زندگی بیان کئے ہیں مثلاً آپ کا کہیں کسی استاد یا عالم سے تعلیم نہ پانا، آپ کا امی ہونا اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے بذاتِ خود آپؐ کے عادات واطوار کی نگرانی ہونا جسکی بناء پر آپ کا صادق و امین ہونا اور اسی حیثیت سے مشہور ہونا وغیرہ۔ یہ حالات آپؐ کی نبوت کی صداقت کی دلیل ہیں۔

اتانامقیم الدین من بعد فترةٍ　　وتحریف ادیانٍ و طول مشاغب

(ہمارے پاس دین کے قائم کرنے والے ایام فترت کے بعد اور ادیان کی تحریف (بگاڑ) اور کافی بربادی کے بعد آئے ہیں)

اس شعر میں اشارہ اس بات کی طرف ہے جو اگلی کتابوں میں مذکور ہے۔

ولن یقبضه الله حتی یقیم الملة العوجاء بان یقولوا لا الٰه الا الله

(اور اللہ آپکی روح کو ہرگز اسوقت تک قبض نہیں کریگا (یعنی اسوقت تک آپکو زندہ رکھیگا) جب تک کہ کجی ملت کو اس طرح دور نہ کردے کہ وہ لوگ لا الٰہ الا اللہ کہنے لگیں)

اسکے بعد مشرک قوم کے حالات پر افسوس کا اظہار ہے۔ جنھوں نے ادیان میں تحریف کر کے نئے نئے شاخسانے پیدا کردیے۔

فیاویل قوم یشرکون بربهم　　وفیهم صنوفٌ من وخیم المثالب

ودینهم مایفترون برائهم　　کتحریم حامٍ و اختراع السّوائب

یہاں کلام مجید کی ان آیات کی جانب اشارہ ہے جنمیں اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کی ان خودساختہ تحریمات کا ابطال کیا ہے۔

ماجعل الله من بحيرة ولا سائبة ولا وصيلةٍ ولا حامٍ ولكن الذين كفروا يفترون على الله الكذب واكثرهم لا يعقلون [1]

حام وہ اونٹنی تھی جس نے دس نر اونٹ جنے ہوں اسکے بعد اس کو آزاد کر دیا جاتا تھا اور اسکا ذبیحہ اور گوشت حرام قرار دے دیا جاتا تھا۔ اور سائبہ (جمع سوائب) وہ سانڈنی جو معبودان باطل کی بارگاہ میں نذرانہ کر کے آزاد چھوڑ دی جاتی تھی اس سے کوئی نفع دودھ گوشت جفتی یا نسل سازی کی خدمت نہ لی جاتی۔ بحیرہ وہ دودھ دینے والا جانور تھا جسکا دودھ چڑھاوے کے لئے اسکے تھنوں میں روکا جاتا تھا اور یہ سب مشرکین کی اختراعات تھیں جسکی بناء پر وہ جسکو چاہتے حرام وحلال بتا دیتے جسکو اسلام نے روک دیا اور اسکی مذمت کی۔ شاہ صاحب نے ان ہی واقعات اور حالات کی جانب تلمیح کی ہے۔ اگلے اشعار بھی اسی ضمن میں ہیں جنمیں یہود ونصریٰ اور شاہان عجم کی برائیوں کی جانب اشارہ کیا ہے کہ انہوں نے اللہ کی الوہیت میں تثلیث کے ذریعہ پیغمبر (حضرت عیسیٰؑ) کو خدا کے بیٹے کی نسبت دی اور شاہان عجم کسریٰ (شاہان ایران) آرائش اور تعیش میں پھنس کر خوار ہوئے۔ ان اشعار میں شاہ صاحب نے قدیم لغات کا استعمال کیا ہے مثلاً اہل مدینہ کی لغت میں زاوق پارہ کو کہتے ہیں جو ایک چمکدار دھات ہے اور اسی مناسبت سے تزویق آراستہ وپیراستہ کرنے کو کہتے ہیں اور ہر وہ چیز جو منقش اور چمکدار ہو مزوق کہلاتی ہے خواہ اسمیں پارہ کا اثر نہ ہو۔ چنانچہ آپنے عیش پرست سلاطین عجم وایران کے بارے میں کہا:

ویاویل قوم قدابار نفوسهم　　تكلف تزويق وحب الملاعب

ویاویل قوم قداخفّ عقولهم　　تجبّر كسرىٰ واصطلام الضرائب

(حیف ہے ان اقوام پر جنہوں نے خود کو چمک دمک اور آسائش اور لہو ولعب کی محبت میں ہلاک کر لیا)

(حیف ہے ان اقوام پر جنکی عقلیں کسریٰ (شاہ ایران) کی جبر واستبداد اور ٹیکسوں کے بوجھ سے زائل ہوگئیں)

یہ وہ حالات تھے جب اللہ تعالیٰ نے ان گمراہ لوگوں پر رحم فرمایا اور عالی نسب قریش میں سے نبی

---

[1] القرآن: سورہ المائدہ: آیت ۱۰۹۔

آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کو ان میں مبعوث فرما کر ان پر ہدایت کا راستہ کھول دیا۔ آپؐ جو خود امی محض تھے اور کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ طے نہ کیا تھا اللہ کی بھیجی ہوئی وحی کے ذریعہ رشد و ہدایت کا سرچشمہ بن گئے۔ اور آسمانوں، قیامت، شریعت اور حکمت کی ہر خبر آپؐ نے لوگوں کو سنادی۔ یہاں شاہ صاحب اپنے مخصوص انداز میں اپنے پسندیدہ موضوع یعنی شریعت اور حکمت احکام یا اسرار شریعت کی جانب اشارہ کرتے ہیں جسکے بیان میں حجۃ اللہ البالغۃ جیسی عظیم کتاب آپنے تصنیف کی۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ من جملہ اور اخبار کے آپؐ نے رب عرش کے احکام اور اسکی حکمتوں (اسرار) کی خبر دی۔

واخبر عن بدءِ السماء لهم وعن　　مقام مخوف بين ايدى المحاسب

وعن حُكمِ رب العرش فيما يَعنّهم　　وعن حِكم تروىٰ بحكم التجارب

پہلے شعر میں مبدأ و معاد دونوں کا تذکرہ ہے جبکہ مقام خوف میں محاسب (اللہ تعالیٰ) کے روبرو ہر شخص برائے حساب کھڑا ہوگا اور دوسرے شعر میں یہ اشارہ ہے کہ جو احکام رب العرش سے نازل ہوئے انکی حکمتیں اور مصالح تجربات سے ظاہر ہونے والے ہیں۔ یعنی احکام کے دو پہلو ہیں: ظاہری جسمیں حرام و حلال وغیرہ کا ذکر ہے اور باطنی یعنی مصالح منزلیہ یعنی رہنے سہنے اور دنیا میں اپنا وقت گذارنے میں ان احکامات کی ضرورت و اسرار احکامِ ظاہری اور علم اخلاق وغیرہ۔ یہ دوسرا علم تجربہ سے بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ دوسرے شعر میں محسنات لفظیہ میں تجنیس لفظی (۱) کا استعمال ہے۔

حُکم اور حِکمَ کے تلفظ مشابہ ہیں مگر معانی میں اختلاف ہے۔ پہلے لفظ کو احکامات اور دوسرے کو حکمتیں کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ اگلے کئی اشعار میں اسی موضوع کو بیان کیا گیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت و رسالت کے سبب دنیا نے نجات پائی اور آپؐ نے اللہ تعالیٰ کے احکامات کے ذریعہ تمام برائیوں کو مٹا ڈالا اور یہی آپؐ کے دین اور شریعت کی سچائی کی سب سے زیادہ مضبوط دلیل ہے کہ یہ شرع تمام شریعتوں سے زیادہ آسان ہے۔ مندرجہ ذیل شعر میں تجنیس لفظی ناقص وزائد (۲) (مذیل) (۳) پائی جاتی ہے۔

سماحة شرعٍ فى زرانةِ شِرعةٍ　　و تحقيق حق فى اشاره حاجب

---

(۱) تجنیس لفظی: اگر دو لفظ تلفظ میں مشابہ ہوں اور معنی میں مختلف ہوں تو ان کے استعمال کو تجنیس لفظی کہا جاتا ہے۔ (البلاغت: ۱۴۳)

(۲،۳) اگر دونوں الفاظ میں سے ایک میں کوئی حرف زائد ہو اور دوسرے میں کم اس کے علاوہ الفاظ کے حروف یکساں ہوں تو اس کو تجنیس ناقص وزائد یا تجنیس غیر تام کہتے ہیں۔ مذیل اس تجنیس کی ایک قسم ہے جب کہ حرف زائد آخر میں ہو۔ (البلاغت: صفحہ ۱۴۵-۱۴۶۔

پہلے مصرعہ میں شرع اور شِرعۃ میں ۃ کا فرق ہے۔ معنی کے لحاظ سے دونوں ہم معنی ہیں۔ شرع اور شِرعۃ دونوں کے معنی پانی پینے کا گھاٹ ہے اور شرع کے معنی مذہب کا راستہ یا شریعت بھی ہے۔ یہاں اس حدیث کی طرف اشارہ ہے "بعثت بالملة السمحة السهلة" یعنی میں دین میں آسانی اور سہولت کی شریعت لے کر بھیجا گیا ہوں۔ دوسرے مصرعہ میں بھی تحقیق اور حق میں تجنیس مطلق (۱) ہے کہ انمیں ح اور ق ہیں جو دونوں حروف مشابہ ہیں۔ اور یہ بات بھی دین کی سچائی کی دلیل ہے کہ اسکے لانے والے (حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم) اخلاق، دبدبہ اور تالیف قلوب کی خوبیوں سے کمال کے ساتھ متصف کئے گئے ہیں۔

مکارم اخلاقٍ واتمام نعمةٍ　　نبوة تاليفٍ و سلطان غالب

اس شعر میں بھی حدیث شریف "بعثت لا تمم مكارم الاخلاق" کی جانب اشارہ ہے اور یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت تالیف قلوب کے لئے تھی کہ فتح مکہ کے وقت آپؐ نے اپنے شدید ترین دشمنوں سے بھی فرمادیا تھا "لا تثريب عليكم اليوم اذهبوا فانتم الطلقاء"

نبوت کے ان عقلی ونقلی دلائل کے بعد شاہ صاحب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی ان دلیلوں کو بیان کیا ہے جو معجزہ اور خرق عادت کے طور پر آپؐ کے ہاتھوں ظاہر ہوئیں اور جنکی تکمیل بھی آپؐ پر فرمائی گئی ہے۔ وہ سچی دلیلیں اور معجزات جو آپؐ کے ذریعہ ظاہر ہوئے نہایت واضح براہین حق ہیں۔ انمیں عالم غیب کی مدد سے (کم طعام کے باوجود) کئی مرتبہ بھوکوں کو کھلانا پیاسوں کو سیراب کرنا کھانے و پانی کا آپکی برکت ودعا سے بڑھ جانا، آپکی انگلیوں سے پانی کا ابلنا اور کثیر لوگوں کا اس سے سیراب ہوجانا، بہت سے مریضوں اور جاں بلب بیماروں کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے تندرست ہونا اور موت کے منہ سے نکال کر بستر مرگ سے کھڑا کردینا وغیرہ ہے۔

من الغيب كم اعطى الطعام لجائعٍ　　وكم مرةً اسقىٰ الشراب لشارب

وكم من مريضٍ قد شفاه دعاءه　　وان كان قداشفىٰ لو جبةٍ واجبِ

ان ابیات میں بھی محاسن کلام پائے جاتے ہیں۔ مصرعہ دوم وچہارم میں اسقیٰ اور اشفیٰ میں تجنیس لفظی (۲) (مصحف) ہے جو محاسن لفظیہ میں سے ہے

---

(۱) تجنیس مطلق: وہ تجنیس ہے جب دو لفظ بعض حروف میں مشابہت رکھتے ہوں۔ (البلاغت: صفحہ ۱۴۸)

(۲) مصحف: تجنیس کی قسم جہاں دونوں لفظوں میں صرف نقطہ کا فرق ہو۔ (البلاغت: صفحہ ۱۴۵)

دوسرے شعر کے پہلے مصرعہ میں شفا کا لفظ مرض سے چھٹکارے کے معنی میں ہے اور دوسرے مصرعہ میں اشفیٰ کے معنی جھانکنے کے ہیں مگر محاورہ میں اشفیٰ المریض علی الموت کا مطلب مریض کو موت نے جھانک لیا یعنی مریض کی موت واقع ہوگئی ہے۔ اسطرح دونوں ایک مادہ شفی سے مشتق ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے مخالف معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔ یہ بھی محاسن میں سے ہے جسکو تضاد، صنعت طباق (۱) یا مطابقہ کہتے ہیں جو محسنات معنویہ (۲) میں سے ہے

اگلی ابیات میں ام معبد کے خیمہ پر ایک خشک تھنوں والی بکری کے تھنوں سے دودھ کی دھار بہنے اور سراقہ بن مالک کے گھوڑے کے قدم دھنس جانے کے واقعات کی جانب تلمیح ہے۔ یہ واقعات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ہجرت کے دوران پیش آئے تھے۔ اسکے علاوہ آپؐ کے ہاتھ کے مس سے ہتھیلی میں تاعمر خوشبو بس جانا اور سر چھو لینے سے بال تاعمر سفید نہ ہونا جیسے معجزات کا ذکر ہے اس سے آگے اس بد بخت کا حشر بیان کیا گیا ہے جس نے آپؐ کے سر مبارک پر اونٹ کی مینگنیاں ڈال دی تھیں۔

والقیٰ شقی القومِ فرث جزور هم　　علیٰ ظهرهٖ والله لیس بعازبِ

فالقو ببدرٍ فی قلیبٍ مخبثٍ　　وعم جمیع القوم شوم المداعبِ

ان ابیات میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی اس حدیث کی جانب اشارہ ہے جو مشکوٰۃ شریف میں ہے یہاں پہلے مصرعہ کے ابتدائی لفظ والقیٰ کی مناسبت سے تیسرے مصرعہ کے ابتدا میں فالقوا کا استعمال کیا گیا ہے۔

اسکے بعد کے اشعار میں مسلسل معجزات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور معطیات خداوندی کا تذکرہ ہے جن میں آپؐ کو ایک ماہ کے سفر کی مدت تک رعب و داب عطا ہونا۔ آپؐ کے سامنے اور آپؐ کے بعد آپؐ کے دین کی فتوحات کی پیشینگوئیاں۔ پتھروں، بے زبان جانوروں اور سنگریزوں کا آپؐ سے کلام کرنا اور استنِ حنانہ (درخت کے تنہ کے ممبر) کا آپؐ کے فراق میں رونا، معجزہ شق القمر و شق الصدر اور سب سے آخر میں اور سب بڑا معجزہ معجزہ اسریٰ و معراج بیان کئے گئے ہیں۔

---

(۱) صنعت طباق (مطابقہ، تضاد): کلام میں ضدین Opposits کا جمع کر دینا (یعنی ایسے الفاظ کا استعمال جن کے معانی میں تقابل یا ضد ہو۔

(۲) محسنات معنویہ: وہ معانی جن سے کلام میں حسن و ندرت پیدا ہو۔ (ایضاً صفحہ ۱۲۰)

ان تمام معجزات کا ذکر قرآن مجید اور احادیث صحیحہ میں جگہ جگہ آیا ہے۔ معجزۂ اسریٰ خصائص نبوت میں ایسی خصوصیت ہے جو کسی دوسرے نبی کو حاصل نہیں ہوئی اور پنجوقتہ نماز امت کے لئے اسی معراج کا تحفہ ہے۔ اس میں جو کچھ آپؐ نے دیکھا اور سنا وہ سب احادیث میں محفوظ ہے۔ قران مجید میں اس بارے میں ہے۔

سبحٰن الذی اسریٰ بعبدہٖ لیلاً من المسجد الحرام الیٰ المسجد الاقصیٰ [1] اور

فاوحیٰ الیٰ عبدہٖ ما اوحیٰ. ما کذب الفواد ما یرای. [2]

شاہ صاحب نے ان دلائل نبوت (معجزات) کے آخر میں سب سے بڑے معجزے یعنی نزول قرآن کا ایک خاص انداز سے تذکرہ کیا ہے۔

وراعت بلیغ الآیِ کل مجادل　　خصیم تمادیٰ فی مراءِ المطالب

براعة اسلوب و عجز معارض　　بلاغة اقوال و اخبار غائبِ

آی (جمع آیۃ)۔ قرآن کریم کی بلیغ آیات نے ہر جھگڑالو اور مطالب میں الجھنے والوں کو اپنے براعت اسلوب یعنی طریق نادر، معارض (مخالف) کو شکست دینے (عاجز کر دینے) بلاغت کلام اور اخبار غائب یعنی غیب کی خبر دینے نے ڈرا دیا۔

دوسرا شعر رَاعت کے فاعل کا (جو بلیغ آیات ہیں) بدل اشتمال (۱) واقع ہوا ہے۔ اس شعر میں براعة (اسلوب) اور بلاغة (اقوال) میں تجنیس لفظی پائی جاتی ہے جو محسنات لفظیہ کے محاسن میں سے ہے۔

یہاں پہلے مصرعہ کے ابتداء میں فعل راعة' کی مناسبت سے چوتھے مصرعہ کے شروع میں براعة لائے ہیں۔ اگرچہ دونوں کے معنی مختلف ہیں۔

کیونکہ یہ قصیدہ مدح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے اس لئے شاہ صاحب نے اسمیں مبالغہ کیا ہے اور کہا ہے کہ خود اللہ تعالیٰ رب العرش نے آپؐ کے ناموں کے ذریعہ آپؐ کی مدح کی یعنی ایسے نام رکھے ہیں جن سے آپؐ کی مدح ہوتی ہے اور آپؐ کو عطا کردہ مناقب اور زیادہ واضح ہوتے ہیں۔

---

[1] القرآن: سورہ بنی اسرائیل، آیت ۱

[2] القرآن: سورہ والنجم آیت ۱۰-۱۱۔

(۱) : بدل اشتمال : وہ الفاظ یا جملہ مرکب جو کسی ایک لفظ کے بدلہ میں استعمال کئے جائیں اور اس لفظ کی تفسیر کے لئے ہوں۔

وسمّاهُ رب العرش اسماءَ مدحه　　تبیّن ما اعطیٰ لہ من مناقب

روف رحیمٌ احمدُ و محمدٌ　　مقفیّ و مفضالٌ یسمیٰ بعاقب

اور یہ نام قران مجید میں روفؑ، رحیمؑ، احمدؐ اور محمدؐ اور حدیث میں مقفی، مفضال اور عاقب آئے ہیں۔ عاقب اور مقفی کے معنی سب سے آخر میں آنے والے (نبی) کے ہیں اور مفضال بمعنی رحمت ہے۔

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح آپ کی نبوت کے دلائل اور آپ کی خصوصیات و معجزات کے ذکر کے بعد شاہ صاحب آپؐ کی آل و اصحاب کی مدح کی جانب متوجہ ہوتے ہیں اور آپؐ کے ان جری و جانباز اصحاب کا ذکر کرتے ہیں جو آپؐ کے ہمراہ ہر سخت سے سخت جنگ اور مرحلہ پر پیش قدمی کرنے اور بہادری دکھانے پر آمادہ رہتے تھے اور یہ جرأت انھوں نے اپنی شریف و نجیب ماؤں سے پائی تھی۔ یہ شعر شاہ صاحب نے کلام قریش کے طریقہ پر لکھا ہے۔

توارث اقداماً و نیلاً و جُرأة　　نفوسهم من امهات نجائب

عرب اور قریش اس بات پر فخر کرتے کہ وہ شریف اور نجیب ماں کی اولاد ہیں اور یہ کہ اخلاق فاضلہ ماں کی جانب سے میراث میں پہنچتے ہیں۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فخریہ انداز میں فرمایا

انا ابن العواتک ۔ میں عاتکہ (جمع عواتک) کا بیٹا ہوں۔

عاتکہ عرب میں شریف و نجیب بیبیوں کے نام گذرے ہیں جو سب قبیلہ بنی سلیم سے ہیں اور تعداد میں نو ہیں منجملہ انکے جو آپؐ کی دادیاں ہیں انکا نسب اسطرح ہے: (۱) عاتکہ بنت ہلال جو ہاشم کے دادا کی ماں ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پردادا تھے۔ (۲) عاتکہ بنت مرّہ بن ہلال جو حضرت ہاشم آپؐ کے پردادا کی ماں تھیں (۳) عاتکہ بنت الاوقص بن مرّہ بن ہلال جو وہب بن عبد مناف بن زہرہ کی ماں ہیں۔ نانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آپؐ کی والدہ بی بی آمنہ بنت وہب کی طرف سے۔

اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

جزی اللہ اصحاب النبی محمد　　جمیعاً کما کانوا لہ خیر صاحب

اللہ تعالی تمام اصحاب نبیؐ کو جزائے خیر دے کہ وہ لوگ آپؐ کے واسطے اچھے ساتھی تھے۔ اس شعر میں

اصحاب اور صاحب میں اشتقاق پایا جاتا ہے جو محاسن کلام میں ہے۔

اصحاب رسولؐ کے بعد شاہ صاحب ال رسولؐ کی مدح کرتے ہیں لیکن یہ مدح صرف ایک ہی نسل کے لئے نہیں بلکہ تمام ال نبی کے لئے ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں

ثلٰث خصالٍ من تعاجیب ربّنا　　نجابة اعقابٍ لوالد طالب

خلافة عباسٍ و دین نبینا　　تزایَدَ فی الاقطار من کل جانب

اسمیں ال نبیؐ کی تین خصلتیں اور خصوصیات بیان کی گئی ہیں جو عبدالمطلب کی تین شاخوں کی ہیں۔ اول حضرت ابو طالب بن عبدالمطلب کے اعقاب اور وارثوں کی نجابت۔ دوم حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب کے ورثاء (بنو عباس) کی خلافت قاہرہ جسمیں اسلام دنیا کے کونے کونے میں پہنچ گیا اور سوم اور سب سے محترم حضرت عبداللہ بن عبدالمطلب کے صاحبزادے یعنی خود حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا دین جو نہایت سرعت سے اقطار عالم میں ہر طرف پھیل گیا۔

اسکے بعد شاہ صاحب قرن بعد قرن مسلمانوں کے تمام طبقات کے ایسے اصحاب کا ذکر کرتے ہیں جنھوں نے اس دین متین کی اشاعت میں ہر طرح حصہ لیا۔ اور سب کے حق میں دعا کرتے ہیں۔ ایسے تمام گروہوں کا ذکر کرتے ہیں جن میں وہ لوگ ہیں جنھوں نے جان پر کھیل کر جنگوں میں حق کا دفاع کیا، وہ ہیں جو اپنے دلائل قاطعہ سے دشمن کا منہ بند کر دیتے ہیں۔ یعنی متکلمین حضرات جو ملت مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفوں کے الزامات کا مسکت جواب دینے میں مشغول ہیں، وہ جنھوں نے شرع ربی اور اسکے حرام وحلال کو بیان کیا ہے۔ یعنی فقہائے امت اور امام مسالک رحمھم اللہ، وہ جو کتاب اللہ کو تجوید اور اسکے حفظ مراتب کے ساتھ پڑھاتے ہیں، وہ جنھوں نے اسکی تفسیر بیان کی ہے اور اسکے غرائب (یعنی وہ الفاظ ومقامات جو نہایت باریک ہیں) بیان کئے ہیں وہ جو حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم وترویج پر حریص ہوئے ہیں، وہ جو اپنے رب کے ساتھ مخلص ہو گئے ہیں، یعنی جڑ گئے ہیں اور دنیا سے گویا پردہ کر لیا ہے یعنی وہ گوشہ نشین صوفیاء وعابد حضرات جو عبادت الٰہی میں گم ہو گئے ہیں اور انکو دنیا سے کوئی مطلب نہیں رہا اور وہ وعظ ونصیحت پر مدام قائم رہتے ہیں اور جنکی وجہ سے دین خدا دائم ہے۔ ایسے تمام لوگوں اور گروہوں کے لئے شاہ صاحب دست بدعا ہیں:

علی اللہ رب الناس حسن جزائھم　　بما لایوافی عدّہ ذھن حاسب

اسکے بعد قصیدہ کا جزو حاصل ہے۔ جس میں اس والہانہ عشق وعقیدت کا اظہار ہے جو شاہ صاحب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تھے۔ اور جس میں مدینہ منورہ کے دوران قیام میں بے انتہا اضافہ ہوا، نسبت اویسیہ حاصل ہوئی اور وہ زیارت رسولؐ سے بہرہ ور اور متمتع ہوئے۔

اس بارے میں شاہ صاحب اپنا احوال قلب ان اشعار میں بیان کرتے ہیں

فمن شاء فليذكر جمال بثينةٍ　　فمن شاء فليغزل لحب الزيانب

ساذكر حبي للحبيب محمدٌ　　اذاوصف العشاق حب الحبائب

واذكر وجداً قد تقادم عهده　　حواه فوادى قبل كون الكواكب

شاہ صاحب کہتے ہیں کہ دنیا والے اپنے اپنے محبوبوں اور محبوں کا کتنا ہی ذکر کریں اور یاد کریں میں تو اپنے محبوب اور حبیب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی یاد کرونگا اور انکی مدح کرونگا۔ ان ابیات میں اس دقیقۂ تصوف کی جانب اشارہ ہے جسکو صوفیاء فنافی العشق اور بقابالعشق کے نام سے یاد کرتے ہیں، اس جذبہ کو وجد یعنی دیوانگی سے یاد کیا گیا ہے۔ یہی عشق ہے جو اتنا شدید جذبہ ہے جس کی بناء پر انسان اپنے آپ کو بھی فراموش کر دیتا ہے۔ صوفیائے کاملین کے مطابق اعیان ثابتہ کا میل واحدیت کی طرف کائنات کی تخلیق سے بھی پہلے سے ہے۔ وہ واحدیت جسکو حقیقت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بھی دیا گیا ہے ازل سے قبل تھی اور جسنے ازل میں فرمایا تھا 'الست بربکم' تو اسکا جواب آئندہ پیدا ہونے والی تمام مخلوق کی جانب سے 'قالوا بلیٰ' کی شکل میں ملا تھا عشق کے اس جذبہ نے وہ نیرنگی دکھائی جسکا ذکر آئندہ اشعار میں اسطرح ہے۔

ويبدو محياه لعينيَّ فى الكرىٰ　　بنفسي افدية اذاً والاقارب

ويدركني في ذكره قشعريرةٌ　　من الوجد لا يحويه علم الاجانب

والفىٰ لروحي عندذالك هزّةً　　وأُنساً و رَوحاً دون وثبةِ واثب

ان ابیات میں اس عشق کا ذکر ہے جو شاہ صاحب کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے تھا اور یہی اصل عشق ہے۔ جس کے نتیجہ میں وہ نسبت اویسی حاصل ہوتی ہے کہ جاگتے میں حضوری قلب کے ساتھ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار ہوتا ہے اور آپؐ سے بالمشافہ گفتگو ہوتی ہے۔ اس کیفیت کو شاہ صاحب نے اپنی

تصنیفات خصوصاً فیوض الحرمین میں بیان کیا ہے۔اس کیفیت کا وہی ادراک کرسکتا ہے جو خود سلوک اور عشق کے ان مراحل سے گذرا ہو یہاں شاہ صاحب کے عاطفہ وخیال کی شدت اور الفاظ نیز اس اسلوب بیان کی خوبی کا احساس ہوتا ہے جسکے ذریعہ انھوں نے اپنے جذبات اور خیالات کا اظہار کیا ہے۔

شاہ صاحب کہتے ہیں کہ ''میری آنکھوں کے سامنے ابتدائے خواب کی حالت میں روئے مبارک حضور صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر ہوتا ہے اسوقت اپنے نفس اور اقارب کو آپؐ پر فدا و نثار کرتا ہوں (حالت فنافی العشق) آپؐ کی یاد کے سبب محبت وعشق دیوانگی میں رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس کیفیت کو عشق کے بیگانے نہیں جان سکتے۔آپؐ کی یاد کے وقت اپنی روح میں ایک جنبش، ایک ہیجان وتحریک، تازگی اور لطف پاتا ہوں جو بغیر حرکت ایک کیفیت جست (رقص) ہے''

اس آخری شعر میں جن کیفیات تہزّی (ہیجان)، روح (تازگی) اور وثبہ (جست کرنا) کا ذکر ہے وہ صوفیانہ اصطلاح میں لطیفۂ قلبیہ کے احوال ہیں جو سلوک کے مختلف مقامات پر حاصل ہوتے ہیں اور انس (محبت، سکون) لطیفہ روحیہ کے احوال سے جو جنبش معنوی کو چاہتا ہے۔یعنی جسمیں انس ہوگا وہ فنافی العشق ہوکر ساکت ہو جائیگا۔ یہاں شاہ صاحب نے جن جذبات کا اظہار کیا ہے وہ انکی روحانی تربیت اور ذاتی تجربات کا نتیجہ ہیں۔

عربی اعتبار سے قصیدہ کا یہ حصہ عاطفہ، خیال، بیان اور اسلوب ہر لحاظ سے نہایت بلند پایہ تخلیق ہے تصوف کے نہایت پیچیدہ مسئلہ کو چند الفاظ کے ذریعہ بیان کر کے اپنے قلب کے احوال کو ظاہر کر دیا گیا ہے۔ یہ ابیات اپنے اندر محاسن لفظی ومعنوی بھی رکھتے ہیں جنکی وجہ سے انکی ادبی حیثیت میں اضافہ ہوگیا ہے۔

قصیدہ کے آخری حصہ میں وہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے انتہائی عشق اور عقیدت کا اظہار کرنے کے بعد آپؐ کے حضور اپنی درخواست رحم وشفاعت پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں

وصلی علیک اللہ یا خیر خلقه ویا خیر مامولٍ ویا خیر واهبِ

فاشهدان اللہ راحم خلقه وانک مفتاحٌ لکنز المواهب

وانت شفیع یوم لاذوشفاعةٍ بمعنی کما اثنی سوادبن قارب

اسطرح وہ دوبارہ اسی مقام پر آگئے جہاں سے قصیدہ کی ابتدا کی تھی یعنی اس شفاعت کا ذکر جو ابتدا میں ہوا

تھا اور جس سے حضرت سوادؓ بن قارب نے آپ کی ثنا کی تھی۔

اس شعر میں اشارہ ہے کہ پہلا مصرعہ حضرت سواد بن قارب صحابی رضی اللہ عنہ کا تضمین کیا ہوا ہے جو حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں انہوں نے لکھ کر سنایا تھا اور جسکو آپؐ نے پسند فرمایا تھا۔

اسکے بعد کے اشعار جو اس قصیدہ کے آخری اشعار ہیں ان میں اس مدد پر جسکی درخواست ابتدا میں کی گئی تھی اسکے حصول پر اطمینان کا اظہار ہے جس پر قصیدہ کا خاتمہ ہے۔

فانی منکم فی قلاعٍ حصینة　　وحدٍّ حدیدٍ من سیوف المحارب

ولیس ملوماً عی صبٍّ اصابه　　غلیل الهویٰ فی الاکرمین الاطائب

پہلے شعر میں اس مکمل حفاظت اور اطمینان قلبی کی طرف استعارہ ہے جو آپکی رفاقت کی وجہ سے شاعر کو حاصل ہے گویا کہ وہ دشمنوں کے مقابلہ میں فولادی گھیرے اور قلعہ میں محفوظ ہو دوسرے اور آخری شعر میں انھوں نے اپنی بات یہ کہ کر ختم کر دی ہے کہ وہ شخص ملوم (جسکی ملامت کی گئی ہو) ہرگز نہیں ہوسکتا جسکی زبان اس وجہ سے بند ہو جائے کہ اسے پاک اور نیک لوگوں کی مدح کرنے کی وجہ سے عشق کی سوزش دروں نے اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ اس شعر میں کلام کے ختم ہونے اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لائق مدح کہنے میں عاجز رہنے کی بناء پر چپ رہ جانے کی دو وجوہات کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ شدید عشق جسمیں دل کی سوزش شامل ہو سکوت چاہتا ہے۔ دوسرے یہ کہ بزرگوں اور پاک لوگوں کی مدح کو خاطر خواہ بیان کرنے سے زبان عاجز ہے اس لئے خاموشی قابل ملامت نہیں ہے چند الفاظ میں اس بات کو نہایت عمدہ طرز پر بیان کرنا ایجاز کا بہترین استعمال ہے۔ یہاں فی الاکرمین کا مطلب فی مدح الاکرمین ہے جس میں لفظ مدح محذوف ہے۔ اس شعر میں جو الفاظ اور ترکیبیں استعمال کی گئی ہیں وہ عام معنی سے ہٹ کر ہیں جو شاہ صاحب کی زبان پر گرفت کا مظہر ہیں عی صبٍّ کی ترکیب اسی کا نمونہ ہے عیّ کے معنی عجز کے ہیں اور صبٍّ بہاؤ کو کہتے ہیں یہاں اس کا استعمال گفتگو کے بہاؤ سے عجز یعنی زبان بندی اور خاموشی کے لئے کیا گیا ہے۔

ادبی لحاظ سے اس قصیدہ کی بندش اور اسلوب، اعلیٰ درجہ کے قصائد کے مقابلہ پر پیش کی جاسکتی ہے۔ تشبیب کے طور پر جو اشعار ہیں انمیں استعارہ اور محاوروں کا استعمال نہایت خوبی سے کیا گیا ہے۔ شاعر کی قلبی بے چینی کی کیفیات کو ظاہر کرنے کیلئے جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں وہ نادر اللغات اور محسنات لفظیہ و معنویہ سے پر ہیں اور بخوبی اپنے مقصد و موضوع کو ظاہر کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ قصیدہ مدحیہ ہے اس لئے اسمیں اطناب کا بھی

خیال رکھا گیا ہے جو مقتضائے حال کے عین مطابق ہے اس لئے بلیغ ہے۔

تشبیب سے گریز کر کے جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح کی جانب آتے ہیں تو کلام کو بہت سے فنون بلاغت کے ساتھ ادا کرتے ہیں جنکی نشاندہی جابجا کی جا چکی ہے۔ آخر میں عشق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسکے بیان میں گویا وہ اپنا دل نکال کر رکھ دیتے ہیں۔ غرضکہ اس دور کی عربی شاعری میں یہ ایک عمدہ مثال ہے۔

قصیدہ ثانی ھمزیۃ

اس قصیدہ میں قصیدہ بائیہ کے مقابلے میں جو خصوصیات ہیں وہ عربی لغات، متنوع موضوعات اور منفرد اسلوب کی مثال ہیں۔

قصیدہ ھمزیہ کے بیشتر حصہ میں نئی دلیلیں اور تصوف کے نئے دقائق کا بیان ہے۔ اس میں تشبیب کے سولہ اشعار ہیں جن میں شاعر نے تشبیب کے مختلف مروجہ طریقوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جس طرح سابقہ شرائع منسوخ ہوگئیں اور تمام پچھلے طریقے ختم کر دئے گئے اسی طرح آپ کی مدح کے لئے پچھلے تمام طریقے جن میں روشنی کے بیان کیلئے مہر و ماہ سے تشبیہ، جود و رفعت کے لئے آسمان اور بارش کیلئے بادلوں سے تشبیہ، سخاوت کیلئے حاتم طائی اور معن بن زائدہ کی مثال، جرأت اور نرم روی کے لئے سیر اور بادنسیم سے تشبیہ، ذکر عشق میں حسن زنان سے تشبیہ وغیرہ سب طریقے فسخ ہو گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح کے لئے یہ ہرگز مناسب بھی نہیں۔ کیونکہ مشبّہ بہ کی شخصیت وصف میں مشبّہ کی شخصیت سے بہتر سمجھی جاتی ہے اور کیونکہ آپؐ تمام بنی آدم سے ہر وصف میں سب سے برتر ہیں اس لئے کسی طور یہ مناسب نہیں کہ آپؐ یا آپ کی صفات کو کسی چیز سے تشبیہ دی جا سکے بلکہ تعریف کا حق تو یہ ہے کہ آپؐ سے تشبیہ دی جائے یعنی آپؐ مشبہ بہ ہوں نہ کہ غیر سے جو مشبہ ہو سکتا ہے مشبہ بہ نہیں۔ تشبیب کے تیسرے شعر میں ہے۔

ولا تذکر اخاطیّ ومعناً　　اذا کلمت فی معنی السخاءِ

اس شعر میں عرب کے دو مشہور سخی سرداروں کا تذکرہ ہے جنکی سخاوت کا چرچا اس قدر تھا کہ انکا نام اور سخاوت ہم معنی ہو گئے تھے۔ وہ دونوں قبیلہ طے کے حاتم طائی اور معن بن زائدہ تھے۔ انکو اس شعر میں اخ القوم کہا گیا ہے۔ یہ لقب قوم کے سربرآوردہ شخص کے لئے عرب میں رائج ہے۔ قرآن کریم میں بھی الوالعزم پیغمبروں

کواس لقب سے یاد کیا گیا ہے:

والیٰ عادٍ اخاھم ھودا ، والیٰ ثمود اخاھم صالحا(۱)

اسی انداز میں یہاں حاتم طائی کو نام سے نہیں بلکہ اخاطیٍ کے نام سے پکارا ہے۔

اسی شعر میں معن اور معنی میں تجنیس ناقص وزائد یا تجنیس غیر تام کی قسم مذیل ہے۔اس قسم کے الفاظ کا استعمال فن بدیع میں محسنات لفظیہ کی مثال ہے جو شاعر کی فنی ولسانی قدرت اور علم کی وسعت کی دلیل ہے۔دوسرے مصرعہ میں کلّمت کے سلسلہ میں شاہ صاحب نے ایک واقعہ نقل کیا ہے''عرب کے دوران قیام کسی عرب نے جب میرا یہ شعر سنا تو لفظ کلّمتَ کے بارے میں قضیہ پیدا کیا کہ اسکا مشہور استعمال کلّمت نہیں بلکہ تکلّمتَ ہے اور کلّمت کا استعمال صحیح عربی نہیں میں نے اس پر فوراً کلام پاک کی اس آیت کا حوالہ دے کر اسکا جواب دیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پالنے میں گفتگو کرنے کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''ویکلم الناس فی المھد و کھلاً'' جو باب کلّم یُکلم سے ہے نہ کہ تکلم یتکلّم سے اور متعدد احایث میں ہے کہ کلمتُ فلاناو تکلمت مع فلانٍ یعنی میں نے فلاں سے گفتگو کی اور فلاں کے ساتھ ہم کلام ہوا''[۱] اس واقعہ سے شاہ صاحب کی لغات عرب پر گرفت کا پتہ چلتا ہے۔آگے فرماتے ہیں:

وان بیّنتَ فی المنظومِ وَجداً فحاشا ان تُشبّب بالنساءِ

فتلک شرائع للشعر قدماً وقد نسخت بختمِ الا نبیاءِ

اے شخص اگر تو عشق میں شعر کہنا چاہے تو چاہئے کہ تشبیب بالنساء یعنی عورتوں کے حسن کی تعریف سے دور رہ۔ یہاں حاشا کا مطلب کنارہ رہنا یا دور رہنا ہے اس کی اصل حاشیہ ہے جس کے معنی کپڑے کی گوٹ یا کنارہ ہے۔قصیدہ بردہ کا ایک مصرعہ ہے حاشاہ ان یحرم الراجی مکارمہ' (خدا اس کو اس سے دور رکھے کہ کوئی امیدوار اسکے مکارم کا احترام کرے)

اس شعر میں قصیدہ کی تشبیب یعنی اس حصہ میں جہاں عام طور پر شاعر نظم میں لطف ودلچسپی پیدا کرنے کے لئے اصل مدح سے پہلے عورتوں کے محاسن کے بیان سے ابتدا کرتا ہے شاعر محاسن کے اس بیان سے دور رہنے کا مشورہ اس لئے دیتا ہے کہ یہ مدح مدحِ سرکار دو عالم ختم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور کیونکہ ان کی شریعت نے

---

(۱) القرآن: سورہ الاعراف، آیت ۶۵، ۷۳۔

[۱] ترجمہ اجمیری: قصیدہ ہمزیہ: ص ۴۸

پچھلے تمام شرائع کو منسوخ کر دیا ہے اس لئے قصیدہ میں تشبیب کے یہ پچھلے شرائع بھی جن میں اس قسم کی تشبیبیں پائی جاتی ہیں قدیم ہو گئے اور وہ سب منسوخ و متروک ہیں۔

اس شعر میں 'فا' تعلیل کے لئے ہے جس سے شاعر اس بات کا ادعا کرتا ہے کہ نئی تشبیب کی ضرورت ہے جس میں موصوف اور مشبہ بہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے جنکی جانب تشبیب کرنی چاہئے۔ یہ لطیفۂ شعر ہے جسکا نام ادّعاء تعلیل ہے یعنی علت بیان کر کے اس سے کسی بات کا ادّعا کیا جائے اور یہ حسن شعر ہے۔

شاعر اسی دلیل کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتا ہے کہ

فهلا قلت اذ حاولت مدحاً ببأسٍ او سخاءٍ او سناءٍ

اریٰ طیفاً یذکّرنی عهوداً بطیبةَ حیثُ مجتمع الرّجاءِ

(اے شخص (خود شاعر) جب تو بہادری، سخاوت یا رتبہ عالی کی مدح کی جانب متوجہ ہوا تو تو نے یہ کیوں نہ کہا کہ میں اپنے تخیل (شعر) میں جو بہادری، سخاوت وغیرہ دیکھتا ہوں وہ مجھے مدینہ منورہ کے ان عہدوں کی یاد دلاتا ہے جہاں تمام امیدیں مرکوز ہیں۔)

شعر دوم میں جو مقولہ شاعر 'اریٰ طیفاً' کے الفاظ میں کہا گیا ہے وہ پہلے شعر میں 'فهلا قلت' کا بیان ہے۔ ان اشعار میں شاعر نے اپنے خیال کو مدینہ منورہ اور اسکے گردونواح بقیع' قبا اور ان دیگر مقامات کی جانب مبذول کیا ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں اہم حیثیت رکھتے تھے اور سخاوت' بہادری وغیرہ کا ذکر آتے ہی بجلی کی طرح وہ شاعر کی نگاہوں کے سامنے کوند جاتے ہیں اور جنکے مقابلہ میں دیگر تمام واقعات خواب میں آنے والے خیال (طیف) کی طرح ہیں۔

ان اشعار میں جو لغات استعمال کی گئی ہیں وہ مشکل اور غور کے بعد سمجھ میں آنے والی ہیں جیسا کہ وہ خیال جسکا اظہار انکے ذریعہ کیا گیا ہے۔ دوسرے شعر کی ابتدا میں 'اریٰ طیفاً' کے الفاظ سے جس بات کو ظاہر کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ تمام واقعات و حادثات جو شجاعت، عظمت اور سخاوت وغیرہ کے دنیا میں پائے جاتے ہیں وہ ان واقعات اور حالات کے مقابلہ میں جو ان خصوصیات کے اظہار کے لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مدینہ منورہ اور اسکے اطراف و اکناف میں ملتے ہیں گویا کہ خواب میں نظر آنے والے خیالات کی طرح ہیں تو تعریف و مدح کا اصل مرجع وہی واقعات ہیں جو اسوقت پیش آئے۔

طیف اس خیال کو کہتے ہیں جو خواب میں آئے اور رأ. یری خواب میں دیکھنے کو کہتے ہیں حضرت ابراہیم کی زبان سے کلام پاک میں ارشاد ہے یا نبیّ انی اریٰ فی المنام انی اذبحک (۱)۔(اے میرے بیٹے میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تجھکو ذبح کررہا ہوں)

یہ خیال بجلی کے کوندے کی طرح تخیل میں بار بار چمکتا ہے کہ اس کے اظہار کے لئے شاعر نے وبیض (بمعنی بجلی کا کوندا یا چمکتی ہوئی چنگاری) و میض (بمعنی بجلی کی دھیمی چمک) کی لغات استعمال کی ہیں جو عام نہیں شاعر ہر شعر میں مدینہ منورہ اور اسکے اطراف، مقامات ثور، حرا، سلع، بیرحا۔ کدی وکدا وغیرہ کا حوالہ دیتا ہے اور وہاں گذرے ہوئے واقعات کو یاد کرتا ہے۔

ان کے بعد کے اشعار میں جو الفاظ اشیم به (میں نے نظر ڈالی اس پر: شام یشیم شیماً: بجلی کو دیکھ کر بارش کی سمت معلوم کرنا) أحِسُّ (احساس کیا۔ معلوم کیا)۔ تذکرنی (اس چیز نے مجھ کو یاد دلائی) تشوّقنی (مجھکو شوق دلایا) آئے ہیں وہ سب اریٰ طیفاً کا بدل ہیں اور جملہ کا بدل جملہ سے ہے یعنی ان الفاظ سے شاعر یہ ظاہر کررہا ہے کہ میں نے جب ان واقعات پر نظر ڈالی، انکا احساس کیا تو ان سب نے مجھ کو ان ہی حالات کی یاد دلائی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں واقع ہوئے تھے

ان اشعار میں جو تصور شاعر نے باندھا ہے وہ ایسا ہے کہ خود شاعر کو اسکی ضرورت محسوس ہوئی کہ اسکی تشریح کرے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہی:

> ''سمجھنا چاہئے کہ جو کچھ مشہور طریقوں پر شعر کہنے کی ممانعت اور نادر طریقوں کے پیدا کرنے کی نسبت جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نیک خصال اور خلق فاضلہ کے ساتھ پوری ادب سے ملی ہوئی تشبیہ ہے مذکور ہوئی (چنانچہ ہم بیان کرچکے ہیں کہ جو کچھ لوگوں میں حسن اخلاق کی قسم سے پایا جاتا ہے وہ بمقابلہ اس نسبت کے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس میں اخلاق حسن تھے ایک خیال طفیف ونمائش اور بجلی کی ایک چمک ہے) یہ ایک تازہ تشبیہ ہے کہ اس ضعیف بندہ نے اسکی ہدایت پائی خدا کا بیحد شکر ہے'' [۱]

ان اشعار کے بعد شاہ صاحب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اپنے جذبات کے اظہار کی جانب

---

(۱) القرآن، سورہ والصافات

[۱] قصیدہ ہمزیہ : ترجمہ دوست محمد اجمیری ص ۵۲

رجوع کرتے ہیں اور قلبی کیفیت اور جدائی کی باعث روحانی رنج والم کا بیان کرتے ہیں۔قصیدہ کے اس حصہ میں وہ نہایت درد آمیز اور واضح الفاظ میں قلبی کیفیات کو ظاہر کرتے ہیں۔

تصورتُ الدیارَ فهامَ قلبی — وهیَّج ذکر هامِنیّ بُکاءِ ی

روَت عندی شمائل عن حبیب — فابکَتنی وزادت من عناءِ یُ

ایاقلبی باَ حُزانی تقطع — فلاسلوان لی بعد النّواءِ

ویا صدری باٰلامی تشقَّق — فلا ارضیٰ لنفسی بالبقاءِ

فهل من مشتری روحی بِرَوحی — یُروِّحنی بِوعدٍ من لِقاءِ

یُبشرنی بِنُعمٍ بعد بؤس — واسعادٍ لها بعد الشِّقاءِ

سابقہ اشعار میں جب تصور دیار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آیا تو اسکی بناء پر شاعر کے قلب میں جوش اٹھا اور جدائی کی یاد نے اتنا بے قرار کیا کہ آنسو نکل آئے۔دوسرے شعر میں لفظ شمائل ذو معنی ہے۔عام معنی میں شمائل کا مطلب عادات اور خصلتوں سے ہے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے احادیث کی کتابوں میں شمائل نبویؐ کے عنوان سے ابواب ہیں جنمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادات شریفہ اور طرز زندگی کا بیان ہے۔شاہ صاحب کہتے ہیں کہ جب میرے سامنے شمائل حبیبؐ بیان کئے گئے تو میں شدت محبت اور ہیجان قلب کی بناء پر رو پڑا اور میری تکلیف میں اور اضافہ ہوگیا۔

پھر کہتے ہیں کہ اے دل تو شدت غم سے پھٹ کیوں نہ گیا کیونکہ اب میں اپنے لئے (اس حبیب کے فراق میں) زندگی کی کوئی خواہش نہیں رکھتا۔کوئی میری زندگی کا ایسا خریدار ہے جو میری وصال محبوب کی خوشی کے بدلے میری روح (زندگی) خرید لے اور اسکے بدلے ملاقات محبوب کا وعدہ کر کے میرا دل خوش کر دے اور وہ خوشی بھی ایسی خوشی ہوگی جو ناامیدی کے بعد ہو اور وہ سعادت ایسی سعادت ہوگی جو شقاوت اور بدبختی کے بعد ہوگی یعنی اسکی اہمیت اور زیادہ ہوگی اور تکلیف کے بعد آرام اور بدبختی کے بعد خوش بختی کی زیادہ قدر ہوتی ہے۔

ان اشعار میں شاعر کے دلی جذبات کی عکاسی کے ساتھ انکے عشق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بھرپور نمائندگی ہے۔وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جدائی سے محزون وغمگین ہے اور اپنی موت کی تمنا کرتا ہے کہ مرنے کے بعد اسکی روح کا آپؐ سے وصال ہوجائیگا اور موت کو وہ اسعاد اور نعم (خوش بختی اور نعمت عظمی) سے تشبیہ

دیتا ہے۔

ان اشعار میں جذبات کی فراوانی، الفاظ کی پختہ بندش، عاطفہ اور تخیل کی بلندی کے ساتھ ساتھ ادبی چاشنی بھی ہے۔ دوسرے شعر میں لفظ عن آیا ہے۔ علم بدیع کے قاعدہ پر اسمیں صنعت طباق (۱) ہے کیونکہ اس میں دوسرے الفاظ عن سے جو اسی شعر میں ہیں جیسے عندی اور عنائی ان میں مطابقت پائی جاتی ہے اور یکساں ہونے کے باوجود انکے معنی مختلف ہیں۔ ایسے الفاظ کے استعمال کو ایہام اطباق کہتے ہیں۔ تیسرے اور چوتھے اشعار میں قلبی اور صدری۔ تقطع اور تشقق وزن اور معنی کے اعتبار سے یکساں ہیں ان الفاظ میں تجنیس لفظی ہے۔ آخری شعر میں یبشرنی بدل چوتھے شعر میں یروحنی کا کہ جملہ کا بدل جملہ پر ہے اسکے علاوہ آخری شعر میں نعم اور بوس وزن کے اعتبار سے یکساں مگر معنی کے اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اول کے معنی راحت، آرام اور نعمت کے ہیں اور دوسرے کے معنی محنت و مشقت اور تکلیف و یاس کے ہیں۔ الفاظ کا ایسا استعمال تجنیس لفظی کہلاتا ہے جو محاسن کلام میں سے ہے۔

اگلے اشعار میں آپ اسی خیال کو آگے بڑھاتے ہوئے عشق کی ان مشقتوں کو جن سے آپ کا دل بے چین ہے آسان کرنے اور دل کے بے کلی کو کم کرنے کے لئے ناصح کی اس نصیحت کا کہ دل کی اس غمگینی کا علاج یہ ہے کہ عاشق دل کو دنیا کی رنگینیوں میں لگائے تا کہ اسکو تسکین ہو اور غم عشق میں کمی آئے، اسطرح جواب دیتے ہیں کہ

وما عذر المشوّق اذاتلهّی خَلِیَّ القلبِ فی شرعَ الوفاءِ

نثر کے سادہ الفاظ میں اس شعر کا حل اس طرح کیا جاسکتا ہے

و فی شرع الوفاء ما عذر المشوق خلیّ القلب اذا تلهّیٰ

اور وفا کی راہ میں آرزومند عاشق (مشوّق: شوق سے نکلا ہے) جسکا دل بے غم و بے پرواہ ہو جب وہ لہو ولعب اور رنگینیوں میں پھنس جائے تو اسکے لئے کون سا عذر و معذرت باقی رہ سکتی ہے

بِحبِّ الحُبِّ قدامسیٰ رهیناً فَمابال الحدآئقِ والفضاءِ

(چاہ محبت میں (جہاں چاروں طرف دیواریں یعنی پابندیاں ہیں) جوگر کر مقید (رھین) ہو جائے اسکو باغوں اور کھلی فضاؤں سے کیا کام ہے۔)

---

(۱) البلاغت: صفحہ ۱۲۰۔

ومن قاسیٰ اذیٰ من ماءِ عینٍ　　فَهَل یغنیه شئیاً عَینُ ماء

(اور جس نے آنکھ کے پانی (آنسو) سے تکلیف اور مصیبت کو سینچا ہو یعنی مشکل و مصیبت کا علاج کیا ہو اسکو پانی کا چشمہ بھلا کیوں کر راس آئیگا)۔

ان اشعار میں بھی شاعر کے جذبات کی گہرائی اور تخیل کی گیرائی کا اظہار ہوتا ہے کہ اسکے جذبہ عشق کو نہ صرف یہ کہ چین نہیں بلکہ وہ خود بھی اس پابندی اور بے چینی سے باہر آنا نہیں چاہتا اور دنیا کی رنگینیوں اور لہو ولعب کا طالب نہیں۔ ان اشعار میں بھی ادبی پہلو سے خوبیاں موجود ہیں۔ تیسرے شعر میں حب اور جب میں ایک نقطہ کا فرق ہے۔ یہ ترتیب الفاظ بھی تجنیس لفظی کی ایک قسم ہے جسکو مصحف کہتے ہیں۔ آخری شعر کے پہلے مصرعہ کے آخر میں ماء عین کو الٹ کر دوسرے مصرعہ کے آخر میں عین ماء کر دیا ہے۔ پہلے مصرعہ میں ماء عین کے معنی آنکھ کا پانی (آب چشم) اور دوسرے میں عین ماء کے معنی پانی کا چشمہ (سیر کی جگہ) ہے۔ یہ صنعت قلب کہلاتی ہے جو تجنیس لفظی کی ایک قسم ہے۔

اسکے بعد کے اشعار میں شاعر مدح کی جانب گریز کرتا ہے اور کہتا ہے:

وان لا بدّ تمدح ذامعالٍ　　فحسبکَ مدحُ خیر الاصفیاء

وان تمدح رسول اللهِ یوماً　　فَحاذران تُقَصّرِ فی الثّناءِ

(اور اگر تجھ کو کسی عالی مرتبہ کی مدح کرنا ہی ہے تو تیرے لئے کافی ہے کہ خیر الاصفیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح کرے اور اگر تو کسی روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح کرے تو خبردار آپ کی ثناء میں کوئی کوتاہی نہ کرنا)

بعد کے اشعار میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح کے سلسلہ میں شاہ صاحب کے تخیل نے ایک اور اونچی پرواز کی ہے۔ آپؐ کے مرتبہ کو ظاہر کرنے کے لئے ایک بالکل نئے طرز میں انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علوشان اور بلندی مرتبہ کی تعریف کی ہے۔ یہ تخیل بالکل اچھوتا ہے جسکی مثال ادب میں نہیں ملتی۔ شاعر کہتے ہیں:

وحاشا ان تقول له المعالي　　به کلّ المعالی و العُلاء

کریمٌ ان تجمعتِ المعالي　　تریٰ فی جنبهٖ مِثل الهباءِ

معالی الناس ان امعنت فکراً　　برازخُ فی انتقاصٍ وَاعتِدَاءِ

هُو الفردُالذی یُمنیٰ الیہ　　لیعرفَ حَالَ دانِیھم وَناءِ

کاطرافِ الدوائرِ حین یعزیٰ　　لمرکَزِ ھابِقربٍ وَانتِوآءِ

بہٖ صارت مَعالیھم معالے　　بِلا رَیبٍ ھُناکَ ولاَ خِفَآءِ

(حاشا وکلا جوتو یوں کہے کہ آپؐ کے لئے بلندیاں اور عظمتیں ہیں یہ آپؐ کی ثناء میں کوتاہی ہوگی بلکہ (کہنا یہ چاہئے کہ) تمام بلندیاں اور عظمتیں آپکی وجہ سے ہی بلندیاں ہیں۔اس شعر میں یہ جو نکتہ ہے کہ علوشان آپؐ کی ذات سے منسوب ہونے سے ہی ہے نہ کہ یہ کہ آپؐ بلند مرتبہ پر پہونچے ہیں۔آپؐ ایسے کریم النفس ہیں کہ اگر تمام بلندیاں اور بزرگیاں جمع کردی جائیں تو وہ بھی آپؐ کے پہلو (مقابلہ) میں مثل خاک ہونگی)

اسکے بعد شاہ صاحب نے ایک نئے رخ سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بلند مرتبہ بیان کیا ہے جو ادبی اعتبار سے نہایت بلند خیال ہے۔آپنے تمام انسانوں کی عزتیں ایک مثال کے ساتھ بیان کی ہیں۔آپکے مطابق لوگوں کی عزتیں اور قدریں، کم عزتی (انتقاص) اور بلند عزتی (اعتداء) کے درمیان ایک درجہ متوسط اور روک یا پردہ کی طرح ہیں جسکے ایک طرف ناقدری اور کم عزتی ہے اور دوسری طرف بلند مرتبت اور عزت ہے۔(مثلاً بہادری اور شجاعت اندھے بے عقل تہور اور بزدلی (جبن) کے درمیان متوسط درجہ یا برزخ ہے۔یا مکاری اور کمینہ پن کے درمیان حکمت اور عقل کا صحیح استعمال ایک متوسط درجہ یا برزخ ہے۔علیٰ ھذا القیاس) حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ایک واحد و یکتا شخصیت کا (فرد) ایسا پیمانہ ہیں جسکے ساتھ نزدیک و دور کے تمام افراد کا حال جاننے کے لئے انکو منسوب کیا جاتا ہے کہ آپؐ کی ذات مبارکہ ہی تمام اعلیٰ وادنیٰ کے لئے مثال اور اصل ہے۔شاہ صاحب نے اس بات کو ایک نہایت عمدہ استعارہ سے واضح کیا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ جسطرح دائرہ کا اصل نقطہ اسکا مرکز ہوتا ہے جو ایک وسط وعدل اور افراط وتفریط کی میزان ہے اور دائرہ سے قرب وبعد کو اسکے مرکز کی نسبت سے ناپا جاتا ہے (یعنی کوئی نقطہ دائرہ سے اتنا دور یا قریب ہوگا جتنا اسکے مرکز سے) اور کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام کائنات میں مرکز کے مثل ہیں اسلئے تمام لوگوں کی (عزت ومعالی سے) دوری اور قربت آپ کی ہی ذات با برکات کی مناسبت سے منسوب کرکے آنکی جائیگی۔چنانچہ وہ اس دلیل سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ تمام مراتب عالیہ آپؐ کے طفیلی اور حاشیہ بردار بن گئے اور لوگوں کی معالی (عزتیں) آپؐ کی علوشان کی بدولت ہیں اور اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں۔

جس خوبصورتی سے آپ نے اس دلیل کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح وثناء کے لئے اپنی بات واضح کی وہ ان ہی کا حصہ اور ادبی ذوق اور عربی زبان وادب پر انکی مضبوط گرفت کا ایک نمونہ ہے۔

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات نبوت کی ایک بڑی خاصیت یہ بھی ہے کہ آپؐ تمام عالم کے اور تمام زمانوں کے لئے نبی اور رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں شاہ صاحب آپؐ کی مدح میں اس نکتہ کو بھی ایک نئے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

وفی ارسالہٖ للناسِ طراً — اشاراتٌ لاَصحابِ الوالاءِ

فَلا صَادی غَلیل القلبِ الا — ویصدرُمن نَداءِ بارتواءِ

فَفیہ رقیقةٌ بازاءِ کُلٍ — وکلُّ رقیقةٍ سرّاقتداءِ

تعالیٰ اللہ لا تحسبہُ فرداً — یفوقُ الناسَ طرّاً فی العلاء

ولکن الحقائق قدتداعت — مُمَثّلةً امام الاَتقیاءِ

پہلے تین اشعار میں انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام عالم کے لئے مبعوث کئے جانے میں جو راز ہے اسکو بیان کیا ہے۔ پہلے شعر میں کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت میں جو بحیثیت مجموعی تمام عالم انسانیت کیلئے ہے، اصحاب ولا یعنی صاحب دل اور ارباب طریقت کے لئے جنکے قلوب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کاملہ سے پُر ہیں اور جو اصحاب صفاء یا صوفیاء کی تعریف میں فنافی الرسول اور آپؐ کی محبت میں ڈوبے ہوئے ہیں انکے لئے اشارے ہیں جنکو وہی حضرات سمجھ سکتے ہیں جو دل والے ہوں۔ دوسرے شعر میں اس سوز دروں اور سوزش عشق کی جانب اشارہ ہے جو عاشق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آتشِ فراق سے جلا رہی ہے جسکا واحد علاج آپؐ کی توجہ اور تسلی ہے جو نسبت اویسیہ سے حاصل ہوسکتی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ چونکہ آپؐ من حیث المجموع تمام انسانوں کے لئے نبی رحمت بنکر تشریف لائے ہیں اس لئے کوئی پیاسا (روحانی طور پر آپکی محبت میں محو اور آپؐ کے کرم کا متمنی) جسکے قلب میں اس پیاس کی شدت سے سوزش اور جلن ہو جو اسکو جلا کر خاک کر رہی ہو جسکی یہ سوزش اور تکلیف آپؐ کی عطا سے دور نہ ہوسکتی ہو اور جو آپؐ کے جود وکرم سے سیراب نہ ہو سکے۔ مطلب یہ کہ ہر فرد بشر آپؐ کے جود وعطا کا پیاسا اور آپکی توجہ کا طلبگار ہے اور صرف آپؐ کی ذات ہی وہ ذات ہے جو اسکی اس تشنگی کو رفع کرسکتی ہے۔ اس شعر میں صنعتِ قصر کی مدد سے شاہ صاحب نے حضور صلی اللہ علیہ

وسلم کی خصوصیت کو واضح کیا ہے اور صادی (پیاسا)، غلیل القلب (وہ پیاس جس سے سینہ میں جلن ہو)، نَداءٍ (عطاو بخشش) اور ارتواء (سیراب ہونا) جیسے الفاظ سے ظاہر کیا ہے۔

تیسرے شعر میں شاعر نے صنعت قلب کا استعمال کرتے ہوئے پہلے مصرعہ میں کلمات رقیقۃٌ بازاء کلّ کو دوسرے مصرعہ میں الٹ کر (مقلوب کر کے) کلُّ رقیقۃٍ کے استعمال سے نیا مضمون بیان کیا ہے۔ یہ بھی صنعت عکس ہے جو علم بدیع کی ایک قسم ہے۔ اس شعر میں تصوف کا ایک اور لطیف مسئلہ بیان کیا گیا ہے جسکو اگلے دو اشعار میں مکمل کیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ تینوں اشعار ایک طرح سے قطعہ بند ہیں۔ کیونکہ جو خیال پہلے شعر میں پیش کیا گیا ہے اسکی تکمیل دوسرے اور تیسرے شعر میں ہوئی ہے۔ وہ خیال اور مسئلہ اسطرح ہے

انحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی جو مقتدائے کل ہے اسمیں بھی ایک راز اور بھید ہے کہ آپ صرف ایک فرد ہی نہیں جو مرتبت اور علوشان میں تمام مخلوق سے بلند ہوں بلکہ آپ کی ذات گرامی میں ہر شخص کے مقابلہ میں ایک نقطہ ہے جو اس شخص کے حق میں نقطۂ اطاعت ہے اور آپ اس شخص کے لئے اس نقطہ کے حوالہ سے مقتدا ہیں۔ چنانچہ آپ کے بارے میں یہ کہنا مناسب نہیں کہ آپ وہ واحد شخصیت ہیں جو عزت و مرتبہ میں کل انسانوں سے بلند ہیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ تمام حقائق انسانیت (انسانوں کی موجودگی کی حقیقت) نے مجتمع اور اکٹھا ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جامہ اختیار کر لیا ہے جو امام الاتقیاء ہیں۔ یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر و پوشیدہ لطائف و پاکیزگیوں کی صورت جامعیت رکھتے ہیں اور ہر اعتبار اور وجہ سے مقتدائے خلق ہیں۔

عہد عباسی کا مشہور شاعر ابونواس اس مضمون کو اس طرح بیان کرتا ہے:

ولیس علی اللہ بمستنکرٍ ان یجمع العالم فی الواحد

(اور یہ بات اللہ تعالی کے بالکل دشوار نہیں کہ وہ تمام عالم (جن وانس) کو فرد واحد میں جمع کر دے)

چوتھے شعر میں جو تعالیٰ اللہ کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں وہ نفسِ مضمونِ شعر سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ مسئلہ کی اہمیت کو ظاہر کرنے کے لئے بطور جملۂ معترضہ لایا گیا ہے جو اطناب کی ایک قسم ہے۔ اسی شعر کے پہلے مصرعہ میں لفظ فرد ہے اسکا استعمال معانی اور مفہوم کے اعتبار سے سابقہ شعر سے مختلف انداز میں کیا گیا ہے جہاں ھو الفرد الذی ینمیٰ الیہ میں فرد کے معنی فرد واحد کے بجائے فرد مخصوص کے لئے کئے گئے ہیں وہاں مسند الیہ فرد کو معرفہ لانے کے لئے اس سے پہلے ضمیر ھو کے استعمال سے اسکو کسی بھی فرد کے بجائے مخصوص فرد

کے معنی دیئے گئے ہیں تا کہ مفہوم واضح ہو جائے اور اسکے ساتھ ہی مسند الیہ کی تعظیم بھی ظاہر ہو۔ یہ علم معانی کا ایک قاعدہ ہے جس سے الفاظ کو مقتضائے حال کے مطابق کر کے کلام کی بلاغت میں اضافہ کیا جاتا ہے۔

اگلے اشعار میں شاہ صاحب نے شفاعت روز قیامت جسکا تذکرہ قصیدہ بائیہ میں بھی کیا تھا اسکا ذکر ایک نئے انداز سے کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

وَفی امر الشفاعةِ حینَ یُدعیٰ　　لها من بعدِ عُذرِ الاَ نبیاءِ

فَیر حَمهم بدعوتهٖ جمیعاً　　وَیَکرمهم باصنافِ العطاءِ

کا نبوبِ لِرَحمتهٖ تعالیٰ　　وَمَاالا نبوبُ الاّ قیسُ ماءِ

ان اشعار میں اس بات کی طرف ایک اور اشارہ ہے کہ آپؐ کی رسالت تمام انسانوں کے لئے ہے (قران مجید میں وارد ہوا ہے۔ **وما ارسلنک الّا کافّة للناس بشیر و نذیرا**)

یہاں لفظ اشارہ محذوف ہے وہ کہتے ہیں کہ امر شفاعت (یعنی شفاعت کرنے کے لئے اللہ کا حکم) میں بھی اشارہ ہے اصحاب ولا کیلئے جبکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو انبیاء علیہم السلام کے عذر کے بعد شفاعت امت کے لئے بلایا جائیگا اور اس وقت جبکہ تمام انبیاء اپنی اپنی کوتاہیوں کے خیال اور اللہ تعالیٰ کے غضب کے ڈر سے لوگوں سے عذر کر دینگے اور سب لوگ جمع ہو کر آپؐ کے پاس جائینگے کہ آپؐ اللہ تعالیٰ کے حبیب و محبوب ہیں آپؐ ہماری سفارش فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ہم کو اس تکلیف سے نجات دے۔ تب آپؐ فرمائینگے **انالها**. **انالها** (میں ہی اس کام کے لئے موزوں ہوں یعنی شفاعت میرا ہی کام ہے) اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ سے بندوں پر رحم کی درخواست فرمائیں گے چنانچہ اللہ تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا قبول فرما کر بندوں پر رحم کریگا اور قسم قسم کی بخششوں اور عطایا سے نوازیگا۔ یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت ہر فرد کو کم از کم اس حد تک حاصل ہوگی کہ وہ روز محشر کی اس سخت اذیت اور انتظار حول محشر سے چھٹکارا پا جائیگا اور اس کے علاوہ درجہ بدرجہ ایمان اور نیک اعمال اور نیک بختیوں کے لحاظ سے اسی شفاعت کی بدولت عذاب جہنم سے خلاصی ممکن ہوگی اور جنت کے قسم قسم کے آرام و عطایا میسر آئینگے۔

آخری شعر میں اللہ تعالیٰ کی عطا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تقسیم عطا کو نہایت عمدہ استعارہ کے ذریعہ واضح کیا گیا ہے۔ آپؐ کی مثال اس فوارہ سے دی گئی ہے جو ایک پانی کے ملبب حوض سے پانی کو چاروں طرف بکھیر

رہا ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ آپؐ اللہ تعالیٰ کی رحمت (کی تقسیم) کے لئے مثل فوارہ کے ہیں اور فوارہ ہی پانی (کی زیادتی، عمدگی اور فراوانی) کا پیمانہ ہوتا ہے یعنی جتنا صاف اور مقدار میں زیادہ پانی حوض میں ہوگا فوارہ اتنا ہی قوت سے اسکا اخراج کریگا گویا کہ فوارہ پانی کے منبع کا پیمانہ ہے۔

قصیدہ کے آخری پانچ اشعار میں مدح کرنے والے کی جانب سے اپنے عجز کے اظہار کے بعد اپنی کمزوریوں اور ذلت کے واسطہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے توجہ خاص اور مدد کی درخواست کی گئی ہے اور انہیں اشعار پر قصیدہ کی انتہا ہے۔ یہ پانچ اشعار مندرجہ ذیل ہیں:

وَاٰخر مالمادِحہٖ اذاما　　احسَّ العجز عن کنہ الثّناءِ

ینادی ضارعاً بخضوعِ قلب　　وذلٍّ و ابتھالٍ والتجاءِ

رسول اللہ یا خیر البرایا　　نوالک اَبتغی یوم القضاءِ

اذاما حلّ خطبٌ مدلھمٌّ　　فانت الحصن من کلّ بلاءِ

الیک توجھی و بک استنادی　　و فیک مطامعی و بک ارتجائی

اور آخر میں مدح کرنے والا آپؐ کی حقیقی مدح کرنے میں قاصر رہنے پر شرمندگی کا احساس کرتے ہوئے انتہائی عاجزی اور اشک باری کے ساتھ نہایت خضوع اور انکساری سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور اپنی التجاؤں کا اظہار کرتا ہے اور اخلاص سے مناجات کرتا ہے کہ اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اے تمام مخلوق میں بہترین ہستی مجھے آپؐ کی بخشش درکار ہے۔ روز قیامت اور روز قضاء میں جب بڑے بھاری کام درپیش ہوں اور سخت تاریکی چھائی ہو تب آپؐ ہی تمام پریشانیوں اور آفتوں سے میری پناہ اور قلعہ ہیں۔ آپؐ کی جانب ہی میری ساری توجہ اور آپؐ پر میرا پورا بھروسہ ہے اور آپؐ ہی میری امیدوں کے مرجع اور مطمع ہیں۔

دیوان اشعار

قصیدہ بائیہ اطیب النغم اور قصیدہ ہمزیہ کے علاوہ شاہ صاحب نے عربی نظم میں مزید طبع رسائی کی ہے۔ تفہیمات الہیہ میں شاہ صاحب کا قصیدۂ تائیہ اور قصیدۂ لامیہ مندرج ہیں۔ اسکے علاوہ شاہ صاحب کے صاحب زادہ شاہ عبدالعزیز نے اپنے والد محترم کا عربی منظوم کلام ایک دیوان کی شکل میں مدون کیا ہے جسمیں ان قصائد کے علاوہ آپکا وہ کلام جو جگہ جگہ بکھرا ہوا تھا اسکو یکجا کر دیا ہے۔ اس میں تقاریظ' قطعات، نکات معرفت، غزلیہ اشعار، اپنے استاد شیخ ابوطاہر مدنی کی مدح، منظوم مکتوبات اور دیگر اشعار جو آپکے قلم سے وقتاً فوقتاً نکلتے رہے ہیں وہ سب شامل ہیں۔ اسکے علاوہ آپکے قصائد پر آپکے صاحبزادوں شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر نے جو تضمین، تصادیر اور تعجیز باندھی ہیں انکے مطالعہ سے جو کلام سامنے آتا ہے وہ بھی اس دیوان کے ذریعہ حاصل ہو جاتا ہے۔ اس دیوان کے اشعار کو شیخ اسحٰق بن محمد عرفان بن محمد نور الشریف الحسینی بریلوی نے (جو شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالعزیز کے شاگرد رشید تھے اور جنکا انتقال ۱۲۳۴ھ میں ہوا) حروفِ تہجی کے مطابق ترتیب دے کر ایک نسخہ تیار کیا جو ندوۃ العلماء لکھنؤ میں نمبر عبدالحئی ۵۳ کے تحت موجود ہے۔ راقمہ نے اس کا عکس حاصل کر کے اس میں مندرج کلام پر گفتگو کی ہے۔

اس نسخہ میں سب سے پہلے ردیف الف کے تحت شاہ صاحب کے قصیدۂ ہمزیہ پر مؤلف دیوان شاہ عبدالعزیز کی تخمیس ہے۔ اسکے بعد یہ الفاظ درج ہیں۔

ووجدت فی مسودہ الشیخ رضی اللہ عنہ ابیاتاً منسوخۃ من موضع متفرقۃ اسقطھامن التبیض اس اندراج سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اشعار جو شاہ صاحب نے اس قصیدہ میں منظوم کئے انکو تبیض کے وقت نکال دیا گیا تھا۔

اسکے بعد آپکے دوسرے صاحبزادہ شاہ رفیع الدین کی اپنے والد کے کلام پر تصدیر و تعجیز (پہلے اور آخری مصرعہ پر اپنا کلام باندھنا) ہے۔ ردیف الباء میں قصیدہ اطیب النغم پر شاہ عبدالعزیز کی تخمیس ہے اور قصیدہ تائیہ پر شاہ محمد رفیع الدین کی تخمیس ہے۔ قصیدہ تائیہ تفہیمات الٰہیہ کی تفہیم (۳۰) کی شکل میں بھی مندرج ہے جسمیں تیس اشعار ہیں۔

موضوع کے لحاظ سے جہاں آپکے قصیدہ بائیہ وھمزیہ نعتیہ ہیں وہیں قصیدہ تائیہ میں صوفیانہ کلام اور باطنی

خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ آپ اپنا اور اپنے اجداد کا ذکر کرتے ہوئے اس عالم میں پہنچ گئے جو عالم مثال یا عالم جبروت ہے اور وہاں کے مشاہدات کا تذکرہ کرنے لگے۔

قصیدہ کی ابتداء ان اشعار سے ہوئی ہے۔

الا کل حالٍ دون حالی و رتبی　　لقد فات عن حد المدارک صبوتی

ولم یبق لی حال سوی الحق نفسہ　　تساؤت الٰی الحالات من بُعد نسبتی

(سنو! میرے (موجودہ) حال کے علاوہ تمام حالات اور میرا بچپن حد ادراک سے گزر گئے اور سوائے اس حال کے جو میرے نفس سے ملا ہوا ہے وہ حالات میرے انساب (آباؤ اجداد) سے دوری کی بناء پر بدل گئے)

اسکے بعد اپنے نسب کی بڑائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

فجاء ت رجال بعد ھم فتفطنوا　　بان کمال العین اعلیٰ الوسیلة

وجاء ت رجال مفھمون ففھموا　　باسرار ذی الجبروت جلت وعزت

ونبئت بالرحموت عزمکا نھا　　لکل من الجبروت والد ھر عمت

(پس انکے بعد وہ لوگ آئے جنہوں نے اپنے فہم وعرفان سے سمجھ لیا کہ عین مشاہدہ ہی (عرفان ذات کا) اعلیٰ وسیلہ ہے۔ اور وہ لوگ آئے جنکو (باطنی طور پر) خدائے ذوالجبروت کے اسرار سمجھا دیئے گئے اور انکو اپنی رحمت سے اللہ تعالیٰ نے اپنے عز مکان اور تمام عالم دہر اور عالم جبروت کی خبر دیدی)

اسکے بعد عالم دہر اور عالم جبروت کا مقابلہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

کان ھناک الدھر سدرة طورھا　　وجبروتھا نار الکلیم تجلت

کان ھناک الدھر جوھر عنصر　　وجبروتھا فیض الحیٰوة لنسمة

کان ھناک الدھر ارض کثیفة　　وجبروتھا شمس و ضرب اشِعّتة

(پہلے شعر میں آپ نے معراج اور کوہ طور پر حضرت موسیٰؑ کے کلام کرنے کی جانب اشارہ کرتے

ہوئے کہا کہ یہ دہر یا عالم دنیا وہ ہے جسکا منتہاء سدرہ ہے (جہاں سے جبرئیل فرشتہ نے بھی حضورؐ سے آگے بڑھنے سے معذرت کر لی تھی) اور اسکے بعد عالم جبروت میں وہ نور ہے جسکی تجلی نار کی شکل میں کلیم اللہ پر کوہ طور پر ہوئی تھی۔ اس دہر میں عنصر کا جوہر ہے اور جبروت سے نسمہ کی زندگی کا فیض جاری ہوتا ہے یہ دہر ایک ارض کثیف ہے جسمیں کثافت اور تدنس ہے اور جبروت اسکے مقابلہ میں لطیف شعاعِ آفتاب کی مانند ہے)

اور پھر اپنے مشاہدات باطنی کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ لکھتے ہیں۔

فشاهدتها فی الحق غارت عیونها　　وما ثم من وجد و صحو نشوة

وشاهدت ان الامر فیه مرتب　　طواه تفصیل الوجود بوحدة

وذٰلک ان العبد فیه محدّق　　بحق و باضمحلاله فی الحقیقة

(پس میںنے (باطنی طور پر) مشاہدہ کیا کہ اس عالم حق میں اس دہر کی زندگی کی اصل بدل گئی ھے جو کسی وجدانی یا شعوری اعتبار سے درست نہیں ہوسکتی۔ اور میںنے مشاہدہ کیا کہ اس عالم میں امور (الہیہ) مرتب ہیں اور وجود کی تمام حالتیں اور تفصیلیں ایک وحدت میں سمٹ کر یکجا ہوگئی ہیں (وحدۃ الوجود کی جانب اشارہ ہے)۔ اور یہ کہ اس عالم میں درحقیقت بندہ ذاتِ حق میں محصور اور اسی میں مضمحل اور فنا ہے)

اسی سلسلہ میں آگے کہتے ہیں

فان لاح ترکیب هیولٰی وصورة　　لعدت معانیه له' من طبیعة

ترکنا الصیاصی العنصریات خلفنا　　ومتنا عن الناسوت ایّة موتة

(جب اس جسم اور صورت (انسانی) کی ترتیب وترکیب بدل گئی (یعنی اسکی موت واقع ہوگئی) تو اسکے معانی اسکی طرف لوٹ آئے۔ ہم نے اپنے عنصری جسم کے قلعوں کو اپنے پیچھے چھوڑ دیا اور اس عالم ناسوت سے موت کے ذریعہ مر کر جدا ہوگئے)

آخر میں لکھتے ہیں:

فشاهدت امراً لیس بوصف شانه　　اذا الوصف یستدعی قیام علامة

وکل لسان النطق عند ظهوره　　واعطیٰ تمام العلم و الفهم حیرتی

(پس میں نے ایسے امور کا مشاہدہ کیا جنکی صفت بیان نہیں کی جاسکتی۔ جب اس کی علامتوں کے قیام کی بات کی جائے اور لسان نطق (گویائی) اسکے ظہور سے بند ہوگئی اور تمام علوم وفہم حیرت میں گم اور اسکے سپرد ہوگئے)

آخری شعر میں آپنے اپنے اور اپنی اولاد اور دوستوں کے حق میں رحمت کی دعا کی ہے

ویرجو ولی اللہ فی حق نفسہ　　و فی الصحب والا ولاد اوسع رحمة

مندرجہ بالا قصیدہ میں آپنے انہیں خیالات کو منظوم کیا ہے جو الخیر الکثیر یا فیوض الحرمین وغیرہ میں تحریر کئے ہیں۔ یہاں ان مشاہدات کا تذکرہ ہے جو علوم غیبیہ کے حصول کے نتیجہ میں آپکو حاصل ہوئے اور جنکی جانب الخیر الکثیر میں بھی آپنے اشارہ کیا ہے۔ ان مقامات اور درجات کا کما حقہ بیان محال نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ کیونکہ عبارات معانی کیلئے وضع کی گئی ہیں، پس جو صرف الفاظ تک پہنچتا ہو وہ اہل لغت کے زمرے میں آتا ہے۔ جہانتک معانی کا سوال ہے تو ان تک تو وہی پہنچ سکتا ہے جو خود اپنی ذات سے غائب ہو جائے ایسی حالت کو شاہ صاحب نے خیر کثیر میں 'توجہ تامہ کے ذریعہ عدم وجود کی کیفیت' کے نام سے یاد کیا ہے جو اہل عرفان ومعرفت کو حاصل ہوتی ہے اور اسکے بعد جو مشاہدات عارف کو ہوتے ہیں انکو بیان کرنا اسی شخص کے لئے ممکن ہوسکتا ہے جو ان مقامات سے گذرے، اور ساتھ ہی اسکا علم اور قوت بیان اتنا وسیع اور قوی ہو کہ وہ ان حالات کو الفاظ کا جامہ پہنا سکے۔ شاہ صاحب کی تصانیف (نظم ونثر) میں قوت اور علم کے ایسے نمونے جگہ جگہ ملتے ہیں۔

اور یہی آپکے تحریر کردہ ادب کی خصوصیت ہے۔ ادبی لحاظ سے اس قصیدہ میں بھی شاہ صاحب کے ذوق کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

اسکے علاوہ دیوان میں شاہ صاحب کے قصیدہ لامیہ پر انکے صاحبزادہ شاہ رفیع الدین کی تخمیس ہے۔ قصیدہ لامیہ تفہیمات الہیہ (۱) میں بھی مندرج ہے۔ یہ قصیدہ بھی قصیدہ تائیہ کی طرح صوفیانہ تخیلات پر مبنی ہے اور اسمیں اکتیس اشعار ہیں۔ قصیدہ کی ابتداء بھی اسی انداز سے کی گئی ہے:

الا کل شئی ما خلا اللہ زائل　　وکل وجود دون مجلاہ باطل

ولیس نظام الرشد دون ظهوره　　یتم ولا نظم التحقق کامل

---

(۱) تفہیمات، صفحہ ۱۷۴-۱۷۵، جلد ۲۔

(خبردار! تمام اشیاء سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات باری کے زوال پذیر اور زائل ہونے والی ہیں اور تمام موجودات علاوہ اس وجود باجود کے باطل اور لاشئی ہیں۔ اور کوئی نظام رشد وہدایت اسکے ظہور وپرتو کے بغیر مکمل نہیں۔ اور نہ کوئی نظمِ تحقیق وسلوک کامل ہے)

تجلیٰ علیٰ الساعیر و تارة علیٰ الطور ثم العین فی العرب ماثل

(اس نور ذات نے) اپنی تجلی دہکتی ہوئی آگ (آتش نمرود) پر ڈالی اور کبھی کوہ طور پر جلوہ دکھایا اور پھر بالاخر عرب میں وہ (نور محمدیؐ) کی شکل میں نمودار ہوا)

اریٰ کل تنویر بنور کانه سماء من الارشاد للخلق شامل

اذما تحاذی الشمس راسک فی الضحیٰ فقد قرت بالمقصود والکل حاصل

یظل به العبد الضعیف مضلّعاً ویصبح بحر العلم من هو جاهل

(میں نے اس نور کی روشنی دیکھ لی ہے گویا کہ وہ نور ہدایت کا آسمان ہے جو تمام خلق کو شامل ہے، ایسا آسمان جب دوپہر کے وقت سورج ٹھیک سر پر آجائے۔ (یعنی وہ نور ایسے چمکیلے آسمان کی مانند ہے جب سورج دوپہر کے وقت عین اسکے درمیان میں آکر اسکو جگمگا دیتا ہے)۔ تب مقصود حاصل ہونے سے میرے دل میں ٹھنڈک پڑ گئی اور تمام علوم (ظاہر وباطن) حاصل ہو گئے۔ اس نور کے طفیل یہ عبد ضعیف طاقتور ہو گیا اور وہ جو جاہل تھا علم کا سمندر بن گیا۔)

ان اشعار میں نور ہدایت کے اظہار کے لئے عمدہ تشبیہ کا استعمال کیا گیا ہے۔ جو ندرت خیال کا بہترین نمونہ اور قدرت اظہار کا اعلیٰ ثبوت ہے..... آگے فرماتے ہیں:

ولا بدهٰذا النور ثلجاً و فسحة وشرح وافصاح و بالعلم نازل

(اور بیشک یہ نور (دل کی) ٹھنڈک اور کشادگی اور شرح صدر وفصاحت (لسان) کا باعث ہے اور یہ علم کے ذریعہ نازل ہوتا ہے)

آپنے اپنی باطنی اور ظاہری ترقی کے لئے اس نور کیجانب اشارہ کیا ہے جس کا فیضان آپکو اپنے قیام مدینہ کے دوران حاصل ہوا اور جسکے بارے میں آپنے کہا کہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے بذات خود آپکو مقامات سلوک طے کرائے۔ اس نور کے فیض باطنی سے آپکو وہ علوم حاصل ہوئے جنہوں نے آپکو شاہ ولی اللہ

محدث دہلوی بنادیا۔اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آپنے لکھا:

فثلثت العلوم بساحتی　　رسوخ وتأویل و علم عنابل

علمنا بتنجیم و علم عرافة　　و سرمن الاسرار لکل زایل

فهمنا لسان الناس فی کل طبقة　　اذا دار فیما بین قوم مسائل

(پس مینے تین تین طرح علوم کی انواع کو بڑی کدوکاوش سے حل کیا ہے۔ پختہ دلائل تاویلات اور علم عنابل کے ذریعہ ہم نے ستاروں اور انکے انسانوں پر اثرات کا علم سیکھا اور ایسی راز کی باتیں سیکھیں جو عام لوگوں سے دور ہیں۔ہم نے ہر طبقہ کے لوگوں کی زبان سمجھی جب قوموں کے درمیان مسائل درپیش ہوے)

اگلے اشعار میں (اللہ تعالیٰ کی عطا (نیل) کی بدولت) اپنے باطنی درجات اور حصول مراتب کا ذکر کیا ہے

هو البحر لا قعر ولا ساحل له'　　احطت به خبراً بما نال نائل

(وہ ایسا سمندر ہے جسکی نہ کوئی تھاہ ہے اور نہ کنارہ اسکا فہم وسمجھداری نے پوری طرح احاطہ کرلیا جسنے یہ نعمت عظمیٰ پالی)

وعندی علوم لا یکاد یقلها　　سماء ولا برو بحرو ساحل

(میرے پاس وہ علوم ہیں جنکے سامنے آسمان، زمین، سمندر اور ساحل کی وسعتیں بھی کم پڑتی ہیں)

ایک دوسری جگہ اسی خیال کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

وعندی علوم لا یکاد یحیطها　　سماء و لا برو بحرو ساحل

ولٰکن ابناء الزمان وجدتهم　　تساوی لدیهم عاقل ثم غافل

(اور میرے پاس وہ علوم ہیں جنکا احاطہ نہ آسمان کر سکے نہ زمین اور نہ سمندر نہ ساحل۔لیکن آج کے دور کے لوگوں میں میں پاتا ہوں کہ انکے نزدیک عاقل اور غافل سب برابر ہیں۔(یعنی انکو علما اور فضلا کی کوئی قدر نہیں اور علماء اور جہلا سب انکے نزدیک یکساں ہیں))

قصیدہ کے آخر میں شاہ صاحب اللہ تعالیٰ سے دست بدعا ہیں۔

ویر جوولی اللہ رحمۃ ربہ و فضلاً لا نواع العطأ ھوشامل

(اور ولی اللہ اپنے رب کی رحمت اور فضل سے امید کرتا ہے کہ وہ اس کی عطایا میں شامل ہو)

ان قصائد کے علاوہ دیوان میں شاہ صاحب کا جو کلام ہے وہ شعری ادب کی کوئی مستقل صنف نہیں بلکہ موقعہ کی مناسبت سے جو تصور ذہن میں آیا اس کو آپ نے فی البدیہ اشعار کی صورت میں قلمبند کر دیا۔ اس مختلف النوع کلام کی ادبی حیثیت کو جانچنے پرکھنے اور اس کی بناء پر ان کا ادبی مقام متعین کرنے کے لئے اشعار کے مزید چند نمونے پیش کرنا ضروری ہیں۔

دیوان میں درج ہے:

"وقال الشیخ رضی اللہ عنہ' صمت یوماً فغلب علیّ الضعف فتمثل فی خیالی ھٰذان بیتان بلا تعمل وسعی منّی."[1]

تریٰ یا رسول اللہ عجزی و حاجتی و ضعفی ودنفی فی ھواک وعاھتی

اماأن ان ترثی لمن قداصابۃ غلیل الجویٰ فیکم ونار الصبابۃ

(اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ اپنی محبت میں میرے عجز اور میری حاجت اور میری کمزوری اور دائمی سخت مرض کی جانب نظر فرمائیں۔ کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ آپؐ اس پر ترس کھائیں جس کو آپ کے عشق کی سخت ترین آگ اور سوزش دل اور طلب نے گھیر لیا ہے)

اس رباعی میں سوزش قلب اور وارفتگی عشق محمدیؐ کا اظہار ہے جو قصیدہ اطیب النغم اور قصیدہ ھمزیہ میں کارفرما ہے اور جو آپ کے جذبات واحساسات کا آئینہ دار ہے۔

شاہ صاحب نے اپنے ان ہی جذبات کے تحت چند اشعار بطور غزل کے بھی لکھے ہیں۔ دیوان میں 'وقال غزلاً' کے عنوان سے آپ کی ایک غزل نقل کی گئی ہے۔[2]

صبا من حمی لیلاً تظل تفوح فمن جذب ذاک الروح روح تروح

ولاحت بوجھی من معالم دمعتی لنص احادیث الغرام شروح

---

[1] دیوان اشعار، صفحہ ۱۵۷۔

[2] دیوان، صفحہ ۱۵۸۔

(رات کی گرمی سے صبح کی ہوا سخت گرم ہو جاتی ہے۔ مگر اس ہوا کے اثر سے روح کو تازگی ملتی ہے)

(اور میرے آنسوؤں کے بہنے کے نشانات سے میرا چہرہ جل گیا ہے یہ آنسو گویا میرے عشق والہانہ کی شرح ہیں)

اپنی حالت زار کو بیان کرنے کے لئے آپ نے تخیل کا سہارا لیا ہے۔ فرماتے ہیں:

وان کنتم العذال وجداً فوجهه علیه علامات السقام تلوح

علیه یعالیل السحاب خزینة علیه مثاکیل الرعود تنوح

(اگر تم اسکے جذبہ عشق و محبت پر اسکی ملامت کرتے ہو تو (دیکھو) اسکے چہرہ پر کمزوری اور دل شکستگی کے آثار چمک رہے ہیں)

(اسپر غم کے بادل تہہ بہ تہہ امڈے ہوئے ہیں ان (بادلوں) سے گرج کی آواز ایسی آرہی ہے جیسے وہ عورتیں بین کر رہی ہوں جنکے بچے گم ہو گئے ہوں)

ان اشعار میں شاعر نے عاشق کے بین و بکا اور آہوں کو ان بادلوں میں سے آتی ہوئی بجلی کی آواز بتایا ہے جو اس عاشق کے چہرے پر آنسوؤں کی شکل میں برس رہے ہیں۔ اور ان آوازوں میں غم واندوہ کی جو کیفیت ہے اسکو ان عورتوں کی چیخ و پکار سے تشبیہ دی ہے جنکے بچے فوت ہو گئے ہوں اور وہ انکے غم میں رو رہی ہوں۔ ادبی لحاظ سے یہ حسن تعلیل اور تشبیہ واستعارہ کی ایک عمدہ مثال ہے

معرفت کے نکتہ کو بیان کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں [1]

وکم من بعاد کان قربا حقیقة وکم من فراق کان للوصل حالباً

فلا تک فی تلک الوقائع ناظراً الیٰ الشیخ لٰکن للحقیقة طالباً

ففی القرب للناسوت شوب و نما بعادلاهل السرینقی الشوائبا

(کتنی دوریاں درحقیقت قربت ہوتی ہیں اور کتنے فراق وصل کے لئے مددگار ہوتے ہیں)

(پس اے شخص تو ان وقائع (سلوک) میں شیخ کی طرف نظر مت ڈال بلکہ حقیقت کا طالب ہو)

---

[1] ایضاً صفحہ ۱۵۳

(کیونکہ اس دنیا کا قرب دھوکہ اور خیانت ہے اور اس سے دوری اہل سر اور اہل باطن کو عیوب اور گندگیوں سے پاک کرنے والی ہے)

شیخ محمد عاشق پھلتی جو آپ سے نہایت قریب تھے آپنے انکو مخاطب کرتے ہوئے جو شعر کہا وہ مشہور ہے

وانی وان خاطبت الف مخاطب　　فانت الذی اعنی وانت مخاطب

(اگر میں ہزاروں سے بھی مخاطب ہوں تو میرا مقصد تم سے ہی (مخاطب ہونا) ہوتا ہے اور تم ہی میرے مخاطب ہوتے ہو)

اس شعر میں آپ کی محبت والفت جو آپکو شیخ عاشق سے تھی اسکا اظہار انتہائی عمدہ اور پر اثر طریقہ سے ہوتا ہے

ایک مکتوب میں آپ لکھتے ہیں [1]

وجسمی وان کان منکم بعیداً　　ولٰکن قلبی لدیکم رهین

وکانت لنا فی زمانٍ عهوداً　　وربی بما کان منا ضمین

(اور میرا جسم اگر چہ تم سے دور ہو لیکن دل تمہارے پاس گروی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب ہم میں محبت کے عہد و پیمان تھے۔ اور ان میں ہمارے درمیان اللہ ضامن تھا)

شاہ صاحب نے اپنے استاد شیخ ابوطاہر مدنی کی مدح میں بھی اشعار کہے ہیں:

له الملک فی شرق العلوم وغربها　　ینفذ فیها الحکم بحثاً وتبیاناً

هو البحر من ایِّ النواحی وردته　　تموج معروفاً و براً و احساناً

کأن کمالات الانام تجسدت　　فصارت له' فی عالم الجسم رکاناً [2]

(انکے لئے علوم کے شرق وغرب کی بادشاہی ہے۔ جس میں انکا حکم بحث اور تبیان کے شکل میں چلتا ہے)

---

[1] دیوان، صفحہ ۱۷۶۔

[2] ایضاً، ص ۱۷۵

(وہ ایسا سمندر ہیں کہ جس طرف سے بھی تو اس پر پہونچے (تو پائیگا) کہ اس سے نیکی، بھلائی اور احسان موجیں مار رہے ہیں) (گویا کہ مخلوق کے کمالات نے مجسم ہو کر عالم جسم میں آپ کی معزز اور شریف شکل اختیار کر لی ہے)

اس منظوم کلام پر نظر ڈالنے سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ شاہ صاحب اس صنف ادب میں بھی قدرت رکھتے تھے اور محاسن کلام سے بخوبی آگاہ تھے۔ جسکا اظہار آپکی شاعری میں جگہ جگہ ملتا ہے۔ شاہ صاحب کے زبان وقلم سے وہی نکلتا ہے جو آپکے دل میں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو اثر اسوقت آپکی زبان میں تھا آج بھی وہی اثر ہم آپکی تحریروں میں پاتے ہیں۔

ادبی اور فنی اعتبار سے آپکی شاعری ایک مخصوص طرز کی حامل ہے اور عربی ادب میں اپنا منفرد مقام رکھتی ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا ادبی مقام

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے تحریر کردہ عربی نثری و منظوم ادب اور آپکی تصنیفات کا مفصل جائزہ پیش کرنے کے بعد انکی ادبی حیثیت اور اس دور کے ہندوستانی عربی مصنفین اور اصحاب قلم میں آپکا مقام اور عربی ادب میں آپکا حصہ متعین کرنا نسبتاً آسان ہو جاتا ہے۔

شاہ صاحب کے دور حیات (۱۱۱۴ھ / ۱۷۰۳ء تا ۱۱۷۶ھ / ۱۷۶۲ء) خصوصاً اس دور کے آخری تیس سال میں جسمیں آپکی بیشتر بلکہ تقریباً تمام تر تصنیفات معرض وجود میں آئیں، آپکے معاصرین ہندو بیرون ہند میں عربی تحریر و تصنیف اور تحقیق و تدقیق کا کام انجام دے رہے تھے۔ ان میں کچھ ایسے بھی تھے جنکا شاہ صاحب سے براہ راست کوئی رابطہ منظر عام پر نہیں آیا۔ انمیں سے ہر ایک کا اپنا جدا میدان تھا جہاں انکے قلم اپنے جوہر دکھا رہے تھے۔ لیکن شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی حیثیت ایک منفرد درجہ کی حامل تھی آپکے معاصرین نے بھی اپنی تصنیفات میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ آپکے ایک مشہور معاصر شاہ غلام علیؒ جنکو خاتم الاولیاء بھی کہا گیا ہے آپکے بارے میں فرماتے ہیں:

''ایشاں بزرگ بسیار بودند و طریق نو آوردہ اند'' [1]

(آپ بیحد بزرگ ہستی کے مالک تھے اور آپنے ایک نیا طرز اختیار فرمایا تھا)

اس امتیاز اور انفرادیت کی ایک خاص وجہ آپکی مصلحانہ اور مجددانہ حیثیت بھی ہے۔ آپ ایک بلند پایہ مصنف، محقق اور مفکر ہی نہ تھے بلکہ اس دور کے ایک عظیم المرتبت مصلح مجدد بھی تھے اور آپ کو اپنی اس حیثیت کا بخوبی احساس تھا جسکی آپکو بشارات بھی مل چکی تھیں اور جسکا اظہار بطور تحدیث نعمت آپنے جگہ جگہ کیا بھی ہے اسی بناء پر آپکی تحریر میں وہ زور اور شدت پیدا ہوگئی جو دیگر معاصرین میں کم ہی نظر آتی ہے۔ بقول مولانا سید ابوالحسن ندوی:

''ان خطابات سے شاہ صاحب کی ژرف نگاہی، حکمت دعوت، اخلاقی جرأت اور واقفیت عامہ و خاصہ کا ایسا اظہار ہوتا ہے جسکو دیکھ کر تاریخ کا ایک ایسا طالب علم جو اس عہد و معاشرہ کی زبوں حالی، اہل علم و اہل قلم کی مصلحت اندیشی اور داعیوں اور مصلحوں کی اصلاح حال سے مایوسی کی

---

[1] رود کوثر، صفحہ ۵۸۴

کیفیت سے واقف ہے، انگشت بدنداں رہ جاتا ہے اور بے اختیار کہ اٹھتا ہے:

ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی!'' [1]

ادبی اور فنی اعتبار سے شاہ صاحب کی حیثیت جو آپکی نگارشات سے ابھر کر سامنے آتی ہے وہ ایک ایسی شخصیت کی ہے جس نے قلم ہاتھ میں لینے سے قبل اپنی تمام صلاحیتوں کو پوری طرح تربیت یافتہ اور قابو میں کرلیا تھا اور انتہائی محنت وعرق ریزی سے اپنی ذہنی اور جسمانی قوتوں کو ایک نقطہ پر مرکوز کردیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ آپنے اپنی تحریروں میں پیش کردہ علوم وفنون میں قبل از وقت وہ کمال حاصل کرلیا جسکی آپکو اپنی تصنیفات کی تخلیق کے لئے ضرورت تھی۔ ان علوم میں نہ صرف علوم ظاہری شامل تھے بلکہ علوم باطنی میں بھی آپنے وہ ملکہ وتصرف حاصل کرلیا جسکی آپکو اپنی تخلیقی اور تجدیدی سرگرمیوں میں ضرورت تھی۔ آپکو بخوبی احساس تھا کہ ان تمام علوم میں ہر پہلو سے کمال حاصل کئے بغیر اس راہ میں قدم رکھنا بے سود اور منزل مقصود حاصل کرنا ناممکن ہے۔ اس لئے تلمذ، توجہ، صحبت، مطالعہ، مراقبہ غرض ہر طریقہ سے آپنے ان علوم پر اپنی گرفت مضبوط کرلی۔ اسکے علاوہ زبان جو تخلیقاتی سرگرمیوں میں واسطہ (medium) کی حیثیت رکھتی ہے اور ادب جو زبان کی نکھری ہوئی شکل ہے اسکی اہمیت بھی شاہ صاحب کی نگاہوں سے اوجھل نہیں تھی۔ اسی لئے آپنے اپنے تخلیقی سفر کی شروعات سے قبل اس جانب بھی بطور خاص توجہ کی اور عربی زبان وادب کو اسی کے گہوارہ یعنی عرب سے حاصل کیا۔

چنانچہ جب شاہ صاحب ان تمام خصوصیات سے مالا مال ہوگئے تو انھوں نے اپنا میدان عمل نہایت احتیاط اور اطمینان سے منتخب کیا اور اپنی جدوجہد میں ہمہ تن مصروف ہوگئے۔

کسی ادیب کا ادبی حیثیت سے مقام متعین کرنے کے لئے تین چیزوں کا تجزیہ ضروری ہوتا ہے۔ (۱) موضوع (۲) اسلوب (۳) زبان۔ اگرچہ گزشتہ صفحات میں تفصیلی طور پر ان میں سے ہر ایک کا بیان گذر چکا ہے مگر آپکی ادبی حیثیت کے تعین کے لئے مختصراً انکا تذکرہ ضروری ہے۔

(۱) موضوع: موضوع کے لحاظ سے شاہ صاحب ان ادیبوں کی صف اول میں نظر آتے ہیں جنہوں نے سنجیدہ دینی موضوعات پر اپنا قلم اٹھایا ہے۔ لیکن ایک امر جو نہایت وضاحت سے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ آپکے معاصرین ہی نہیں بلکہ متقدمین میں بھی ایسے اصحاب شاذ ہی ملتے ہیں جنہوں نے بیک وقت اتنے موضوعات پر اپنے تبحر اور وسعت علم کا اظہار کیا ہو۔ ایسے محققین اور مصنفین تو اکثر مل جاتے ہیں جنھوں نے کسی خاص موضوع

---

[1] تاریخ دعوت وعزیمت، صفحہ ۳۲۵-۶، جلد ۵

اورفن میں کمال حاصل کیا ہواس علم میں اپنی وسعت نظر اور دقت فہم کا مظاہرہ کیا ہو۔ عام طور پر ماہر فن کسی ایک ہی فن پر اپنی ساری صلاحیتیں صرف کر کے اسکو اوج ثریا پر پہنچانے کی کوشش کرتا ہے اور زیادہ سے زیادہ دو فن تک اسکی رسائی ہوتی ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص متعدد علوم وفنون میں اپنی توجہ بانٹنے کی کوشش کرتا ہے تو عموماً وہ کسی فن میں مہارت حاصل نہیں کر پاتا۔ لیکن شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے بارے میں یہ رائے صحیح نہیں۔ شاہ صاحب کی ایک خاص صفت آپکی جامعیت ہے۔ آپ بیشتر علوم دین (ظاہری و باطنی) کے جامع تھے اور ہر فن میں دلچسپی رکھتے تھے اور نہ صرف دل چسپی رکھتے تھے بلکہ ایسا تبحر حاصل کیا تھا کہ جس موضوع پر اور جس رخ سے اظہار خیال کیا اس کے ہر پہلو کو انتہائی وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا۔ تفسیر، حدیث، فقہ، معانی، بیان، اصول، عقائد، تصوف، کلام، فلسفہ غرض ہر موضوع پر آپکا نقش اسقدر گہرا ہے کہ اس دور کی ادبی تاریخ آپ کے ذکر کے بغیر نامکمل ہے۔ اور اس پر آپکی روحانی تربیت اور باطنی علوم کے حصول کے لئے آپ کی محنت شاقہ سونے پر سہاگہ کا کام کرتی ہے ان سب کے باوصف آپکی جودت طبع، رسائی فکر و ذہن، بلندی خیال، دقت نظر، قوت اجتہاد، تفہیم معانی میں مہارت اور حوصلہ مندی نے آپکو ادبی حیثیت سے اپنے دور کا امام بنا دیا ہے۔

(۲) اسلوب: شاہ صاحب کے اسلوب بیان کے بارے میں تفصیل سے تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ یہاں صرف مختصراً اتنا عرض کرنا ہے کہ آپکی تصانیف میں متنوع موضوعات کے ساتھ ساتھ آپکے اسلوب بیان میں بھی تنوع پایا جاتا ہے۔ موقعہ کے لحاظ سے کہیں آپکی تحریر میں تفصیل، اطناب، مدلل طرز بیان اور کلامیہ انداز پایا جاتا ہے تو کہیں اختصار ایجاز حتمی اور محکم انداز اور واقعاتی بیانیہ اسلوب۔ یہی تنوع آپکی تحریر میں جان پیدا کر دیتا ہے اور باوجود سنجیدہ ہونے کے آپ کی تحریر کہیں سے کمزور یا بے رس نہیں ہونے پاتی۔ اسلوب بیان پر آپکی گرفت اس قدر زبردست ہے کہ انتہائی پیچیدہ موضوع بھی الفاظ کی بندش اور قلم کی روانی کی بدولت آسانی سے قابل فہم بن جاتا ہے۔ اس لحاظ سے بھی آپکی ادبی حیثیت ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ جو دیگر معاصرین سے جدا اور ممتاز ہے۔

(۳) زبان: شاہ صاحب نے عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں اپنے افکار کا اظہار کیا ہے۔ فارسی زبان میں آپکی بعض زبردست تالیفات **فتح الرحمٰن فی ترجمة القرآن**، **انفاس العارفین**، **ازالة الخفاء عن خلافة الخلفاء** وغیرہ ہیں جو ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن مقالہ ہٰذا میں آپکی عربی ادبی خدمات کے تناظر میں آپکی شخصیت کا جائزہ لیا جانا ہے اس لئے آپ کے فارسی ادب سے صرف نظر کر کے صرف آپ کی عربی تالیفات کو بحث کا موضوع بنایا گیا ہے اور عربی تصانیف کے ادبی پہلو پر گفتگو کی گئی ہے۔

ادب کیونکہ زبان دانی کے اظہار کا نتیجہ ہے اس لئے کسی ادبی مقام کو حاصل کرنے کے لئے زبان پر قدرت حاصل ہونا بیحد ضروری ہے۔ شاہ صاحب اس سلسلہ میں بھی اپنے معاصرین اور دیگر اصحاب قلم سے بالکل علیحدہ شخصیت کے حامل دکھائی دیتے ہیں۔ انکی زباں دانی، عربی ادب پر گہری نظر اور وسعت مطالعہ کا اعتراف انکے اکثر تذکرہ نگاروں اور ناقدین نے کیا ہے۔ آپکی اس صفت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آپنے یہ کمال اپنے والد محترم شاہ عبدالرحیم صاحب سے ابتدائی تعلیم وتربیت کے حصول کے علاوہ صرف اپنی قوت مطالعہ اور فہم سے حاصل کیا۔ عرب اور اہل عرب سے آپکا رابطہ اور وہاں علمِ زبان کے حصول کے مواقع کی مدت بہت مختصر ہے۔ یوں کہنے کو تو آپ نے تقریباً دو سال سفر حجاز میں صرف کئے مگر آپ کے صاحب زادہ شاہ عبدالعزیز کے قول کے مطابق شاہ ولی اللہ نے حرمین شریفین میں کل چودہ ماہ قیام فرمایا جبکہ تقریباً ایک سال کی مدت آمد ورفت کے سفروں میں لگ گئی۔ اس دوران آپ نے دو حج بھی ادا کئے اور روضۂ اطہر پر بھی حاضری دی۔ اس طرح آپکو اہل زبان سے زبان سیکھنے کا بہت کم موقع میسر آیا مگر اسی مختصر مدت میں آپنے عربی میں اہل زبان کی سی قدرت حاصل کرلی اور حجاز سے واپس آکر عربی زبان میں وہ تصانیف رقم کیں جنکا مثل ملنا مشکل ہے۔ دوسری طرف ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ آپ کے معاصرین میں ایسے لوگ بھی ہیں جنکو عربی زبان پر ایسا ملکہ عرب میں مدت عمر گذارنے بلکہ وہیں کا ہو رہنے کے بعد ہی حاصل ہوا۔ آپ کے معاصر علامہ مرتضیٰ بلگرامی کو بلگرامی سے زبیدی بننے کے لئے ہندوستان سے ترک وطن کرکے عرب (یمن) میں زبید کے مقام پر بسنا پڑا جہاں انھوں نے اپنی تمام عمر اسی ماحول میں گذاری تب جا کر انکو وہ شہرت نصیب ہوئی جسنے انکو علامہ زبیدی بنا دیا۔ وہاں بھی انہوں نے اپنی مشہور کتاب تاج العروس شرح قاموس لکھنے ومکمل کرنے میں چودہ سال صرف کئے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اپنے دور کے عربی مصنفین میں ایک بلند پایہ مصنف تھے اور آپکی ادبی حیثیت ایک مینارۂ نور کیطرح روشن اور اپنے ماحول سے ممتاز اور بلند ہے جسنے اپنی روشنی سے ہزاروں رہ روان گم گشتہ راہ کو راہ راست کا پتہ بتایا ہے۔ ایسی شخصیت مدت دراز کے بعد صفحۂ ہستی پر پیدا ہوتی ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

(اقبال)

شاہ ولی اللہ دہلوی کی ادبی حیثیت دیگر اصحاب قلم کی نظر میں

شاہ صاحب کی تصنیفات اور تحریروں کے حوالہ سے آپکی ادبی حیثیت اور ہندوستانی عربی ادب میں آپکا مقام متعین کرنے کے بعد دیگر اصحاب قلم اور مصنفین کی آپکے بارے میں کیا رائے ہے اسکا بیان بھی شاہ صاحب کے علمی وادبی مرتبہ کے اظہار کیلئے ضروری ہے۔ یوں تو شاہ صاحب کے زمانہ سے آج تک بیشمار اہل علم اور اہل قلم حضرات نے شاہ صاحب اور آپ کی تصنیفات کے بارے میں تعریفی وتوصیفی عبارتیں قلمبند کی ہیں لیکن چند مشہور اور معتبر حضرات کی گرانقدر آراء پر اکتفاء کرتے ہوئے باب پنجم کو اختتام پذیر کیا جائیگا۔

(۱) رحیم بخش دہلوی:

حیات ولی میں رحیم بخش دہلوی نے شاہ صاحب کے فضل وکمال کے بارے میں لکھا ہے:

''کلام وادب جو عربیت کا بہت بڑا جوہر ہے اس میں آپ کو وہ کمال حاصل تھا جو آج تک ماہرین فن کو تسلیم ہے۔ متقدمین شعراء کے اشعار بکثرت یاد تھے۔ جو سند کے طور پر ہر موقعہ پر برجستہ پیش کرتے تھے۔ ادیبوں اور متکلمین کی فہرست میں آپکا نام نہایت روشن اور جلی حرفوں میں نظر آتا ہے۔ علم لغت میں آپ سے زیادہ کوئی عالم نہ تھا اور اس فن خاص میں جو درجہ متقدمین میں صاحب قاموس کو تھا وہی درجہ متاخرین میں شاہ صاحب کو تھا'' [۱]

آپکی انشاء پردازی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''شاہ ولی اللہ انشاء پردازی کے فن میں بھی بے مثال اور یگانۂ روزگار تسلیم کیے گئے ہیں اور آپکی یہ صفت خاص تمام فاضلوں کو تسلیم ہے کہ بڑے بڑے مضمونوں کو نہایت مختصر اور جامع الفاظ میں اس خوبصورتی سے ادا کرتے تھے کہ مضمون کا اصلی اثر اور زور پورا قائم رہتا تھا۔ آپنے اس فن میں اسقدر کمال بہم پہنچایا تھا کہ آپ کے عام مسودات بڑے بڑے فصیح وبلیغ اور انشاء پرداز نہایت وقعت وقدر کی نگاہ سے دیکھتے اور فن انشاء کے شائق جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ آپکے مکاتیب، خطوط اور خاص خاص مناظروں اور علمی بحثوں میں جا بجا علم انشاء کے نمونے لکھے نظر آتے ہیں جنکے ہر ہر فقرے سے شستہ بیانی کی شہادت ملتی ہے اور لٹریچر کا کمال بہت کچھ ثابت ہوتا

---

[۱] حیات ولی، صفحہ ۲۶۵۔

ہے۔"[1]

(۲) مفتی عنایت احمد کاکوروی:

صاحب نزہۃ الخواطر مولانا عبدالحی الحسینی نے ان الفاظ میں مفتی عنایت احمد کاکوروی کا قول نقل کیا ہے

"وقد حکی عن المفتی عنایة احمد الکاکوروی انه کان یقول : 'ان الشیخ ولی الله مثله کمثل شجرة طوبیٰ اصلها فی بیتهٖ وفرعها فی کل بیت من بیوت المسلمین فمامن بیت ولا مکان من بیوت المسلمین وامکنتهم الا وفیه فرع من تلک الشجرة لا یعرف غالب الناس این اصلها" [2]

(شاہ ولی اللہ کی مثال شجر طوبیٰ کی طرح ہے کہ تنہ انکے گھر میں ہے اور اسکی شاخیں تمام مسلمانوں کے گھروں تک پہنچی ہوئی ہیں۔ مسلمانوں کا کوئی گھر اور ٹھکانا ایسا نہیں جہاں اسکی ٹہنی نہ پہنچی ہو۔ اکثر لوگوں کو خبر بھی نہیں کہ اس ٹہنی کی جڑ کہاں ہے۔)

(۳) محسن بن یحییٰ الترہتی:

وذکر محسن ابن یحییٰ الترهتی فی الیانع الجنی' انه سمع شیخه العلامه فضل حق بن فضل امام الخیر آبادی مرتین..... وکانت وقعت فی یدهٖ نسخة من کتاب 'ازالة الخفاء.....قال بمحضر من الناس:

'ان الذی صنف هٰذالکتاب لبحر زخار لا یری له ساحل هٰذاولیس یقع فیه الا جاهلٌ غبی من الجهال لا یرجی ان یستطب مابه من دائه العضال او حاسد یحسد علیٰ ما اکرمه' الله تعالیٰ له من علیة الخصال وجلیة سجایا الشرف والکمال. [3]

(اور محسن بن یحییٰ ترہتی نے 'الیانع الجنی' میں ذکر کیا ہے کہ انہوں نے اپنے استاد علامہ فضل حق ابن فضل امام خیرآبادی کو دو مرتبہ سنا۔۔۔۔اور انکے ہاتھ میں 'ازالۃ الخفا' کا نسخہ تھا۔۔۔۔کہ وہ

---

[1] حیات ولی، صفحہ ۲۷۳

[2] نزہۃ الخواطر، صفحہ ۴۰۶، جلد ۶۔

[3] الیانع الجنی، صفحہ

لوگوں کے مجمع کو مخاطب کر کے کہتے تھے:

'جس شخص (شاہ ولی اللہ) نے یہ کتاب تصنیف کی ہے وہ (علم کا) ایک بحر زخار ہے جو ناپیدا کنار ہے۔ اس پر اعتراض کرنے والا جاہلوں میں ایسا غبی جاہل ہے جس کے اس لاعلاج مرض سے شفایاب ہونے کی کوئی امید نہیں، یا وہ حاسد ہے جو ان اعلیٰ خصائل و عادات اور شرف و کمال کی نعمتوں سے حسد کر رہا ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے انکو (شاہ صاحب کو) نوازا ہے')

(۴) علامہ شبلی نعمانی (بانی ندوۃ العلماء لکھنؤ)

''ابن تیمیہ اور ابن رشد کے بعد بلکہ خود انھیں کے زمانہ میں مسلمانوں میں جو عقلی تنزل شروع ہوا اسکے لحاظ سے یہ امید نہیں رہی تھی کہ پھر کوئی صاحب دل و دماغ پیدا ہوگا۔ لیکن قدرت کو اپنی نیرنگیوں کا تماشا دکھلانا تھا کہ اخیر زمانہ میں جب کہ اسلام کا نفس باز پسیں تھا، شاہ ولی اللہ جیسا شخص پیدا ہوا جسکی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالی، رازی، ابن رشد کے کارنامے بھی ماند پڑ گئے۔'' [۱]

(۵) نواب سید صدیق حسن خاں قنوجی والیٔ بھوپال :

من 'الحطة فی ذکر صحاح الستة'

''فی ذکر من جاء بعلم الحدیث فی الهند : ثم جاء الله سبحانه و تعالیٰ من بعدهم بالشیخ الاجلُ المحدث الاکمل ناطق هٰذه الدورة و حکیمها و فائق تلک الطبقة وزعیمها الشیخ ولی الله بن عبدالرحیم الدهلوی المتوفی سنة ست و سبعین ومائة والف ، و کذا بأولاده الامجاد واولادِ اولاده اولی الارشاد .....وقد نفع الله بهم وبعلومهم کثیراً من عباده المؤمنین ..... فعلیٰ الهند واهلها شکرهم ما دامت الهند واهلها'' [۲]

من زار بابک لم تبرح جوارحه — تروی احادیث ما أولیت من منن

فالعین عن قرّة ، والکف عن صلة — والقلب من جابر و السمع من حسن

[۱] علم الکلام مرتبہ شبلی نعمانی۔ اعظم گڑھ ۱۹۹۳ء صفحہ :۱۰۵-۱۰۶

[۲] 'الحطۃ فی ذکر صحاح الستۃ' مصنفہ نواب صدیق حسن خاں۔ صفحہ ۷۰-۷۱، نزھۃ الخواطر صفحہ ۴۰۶-۴۰۷

(علم حدیث کو ہندوستان میں کون لایا، اسکا تذکرہ کرتے ہوئے نواب صدیق حسن خاں لکھتے ہیں :

'پھر انکے بعد اللہ تعالیٰ سبحانہ شیخ الاجل اور اکمل محدثین، اس دور کے ناطق اور حکیم اور اس طبقہ محدثین میں فائق وزعیم شیخ ولی اللہ بن عبدالرحیم دہلوی المتوفی ۱۱۷۶ء کو لایا اور اسی طرح انکی اولاد اور اولاد کی اولاد آئی جو سب کے سب صاحب ارشاد تھے.....اور اللہ تعالیٰ نے انکے اور انکے علوم کے ذریعہ اپنے مومن بندوں میں کثیر تعداد کو نفع پہنچایا.....تو ہندوستان اور اسکے باشندوں پر جب تک ہند اور اسکے اہالیان موجود ہیں انکا شکر واجب ہے۔

جو تیرے در پر آیا اسکے اعضاء و جوارح ان احسانات کی حدیث کو بیان کرنے میں مشغول ہوگئے جنکا تو مستحق تھا.....پس عین (آنکھ) قرۃ (ٹھنڈک) سے، ہاتھ صلہ (احسان یا مدد) سے، دل جابر (ٹوٹ پھر جڑ جانے یعنی دلجوئی) سے اور کان حسن (عمدہ باتوں) سے تیرے ممنون احسان ہوئے۔)

نوٹ : قرۃ ،صلۃ، جابر، حسن سے ان محدثین کی جانب کنایہ ہے جو شیوخ کامل اور مشہور راویان حدیث تھے۔یعنی قرۃ بن خالد السدوسی، صلۃ بن اشیم العدوی، حضرۃ جابر بن عبداللہؓ اور امام حسن البصریؒ جنکی خدمات سے فن حدیث کو ترقی ہوئی۔

وقال القنوجی المذکور فی 'ابجد العلوم' :

"کان بیتہ فی الھند بیت علم الدین وھم کانوا مشائخ الھند فی العلوم النقلیۃ بل و العقلیۃ. واللہ یختص برحمتہ من یشاء" [1]

(ابجد العلوم میں قنوجی مذکور لکھتے ہیں: 'ہند میں آپکا گھرانہ علم دین گہوارہ تھا اور (سارا خاندان) علوم نقلیہ بلکہ علوم عقلیہ میں بھی مشائخ ہند تھے اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت سے مختص فرماتا ہے)

اپنی فارسی تصنیف میں قنوجی لکھتے ہیں:

"اگر وجود او در صدر اول و در زمانۂ ماضی می بود امام الائمہ و تاج المجتہدین شمردہ می شد" [2]

---

[1] ابجد العلوم صفحہ ۹۱۲

[2] ماخوذ از رود کوثر صفحہ ۵۵۱

(اگر آپ زمانۂ ماضی اور صدر اول میں پیدا ہوتے تو آپ کو امام الائمہ اور تاج المجتہدین شمار کیا جاتا)

(۶) شیخ شرف الدین محمد الحسینی الدہلوی:

"فاقتضیٰ التدبیر الکلی و الحکمة الازلیه ان تظهر حقیقة الحقائق بالقدر المشترک الجامع بین علوم النبوة والولا یة بل الجامع بین العلوم کلها مرّة اخریٰ فی مظهرها الثالث لیکون منصه لظهور حد ائقها الجامعة الممیزه بین العلوم و مراتبها فهو یقنن قوانین، و یدوّن قواعد یحصل بها الا متیاز التام بین علوم النبوة والو لایة بل بین العلوم المعتدة کلها من التفسیر والحدیث والفقة والکلام والتصوف والسلوک فینزل کل علم منزلته ویبلغ کل عبارة و اشارة مبلغه وهو کامل المکمل زبدة المتقدمین قدوة المتاخرین' قطب المدققین' غوث المحققین الشیخ ولی الله المحدث الدهلوی سلمه' الله سبحانه" [۱]

(۷) مولانا ابوالکلام آزاد:

"پھر بارہویں صدی کا ایک عظیم ترین ظہور علوم و معارف دیکھو۔ زمین بنجر ہو چلی تھی، پھر بھی کھیتوں کی سبزی چمنوں کی لالی سے کوئی گوشہ بالکل خالی نہ تھا۔ تیرھویں کے تمام کاروبارِ علم و طریقت کے اکابر و اساتذہ اسی صدی میں سر برآوردہ ہوئے۔ بعض بڑے بڑے سلاسل درس و تدریس کی بنیادیں اسی میں استوار ہوئیں۔ بایں ہمہ معلوم ہے کہ وہ جو دور آخر کے فاتح اور سلطان عصر ہونے کا مقام تھا اور قطبیت وقت کا' وہ صرف حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہ (رضی اللہ عنہ) ہی کے کئے تھا۔ اور لوگ بھی بیکار نہ تھے کام کرتے رہے مگر جو کام یہاں انجام پایا وہ صرف یہیں کے لئے تھا" [۲]

---

[۱] الوسیلۃ الی اللہ، ماخوذ از نزہۃ الخواطر، صفحہ ۴۰۵۔

[۲] تذکرہ : مولانا ابوالکلام آزاد :صفحہ ۲۶۷-۲۶۸

باب ششم

چند ہم عصر ممتاز شخصیتیں

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے عہد کا ایک جائزہ پچھلے ابواب میں لیا جا چکا ہے وہ دور ایک تبدیلی کا دور تھا۔ پرانی حکومت، پرانی اقدار، پرانا معاشرہ زوال پذیر تھے۔ نئے حکام، نئے سماج، بدلتی ہوئی عادات اور تیزی سے مسخ ہوتی ہوئی زندگی میں جتنی انفرادی اور اجتماعی برائیاں ماحول میں پیدا ہو سکتی تھیں وہ ظہور پذیر ہو رہی تھیں۔ اسی ماحول میں چند ہستیاں اس بگڑتے ہوئے ماحول کی اصلاح کا درد دل میں لیے اپنے طور پر کوششوں میں مصروف تھیں۔ انمیں علماء بھی تھے، صوفیاء بھی، منتظمین اور سیاستداں بھی تھے اور دیگر دردمند لوگ بھی جو اپنے اپنے طور پر ان کاموں کو انجام دے رہے تھے۔ ایک طرف جہاں حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تحریروں کے ذریعہ ایک انقلابی تحریک جنم لے رہی تھی وہیں دوسری طرف شاہ فخر الدین اپنے علم و عرفان سے معاشرہ میں نئی روشنی پھیلانے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ صوفیاء کے حلقے، علماء کے مدرسے، مصنفین کے افکار اور انکی تصنیفات سب کے سب اس دور کے حالات میں کچھ نہ کچھ اصلاح و تربیت کے شریک اور گواہ نظر آتے ہیں۔ یہ سب لوگ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے ہمعصر تھے۔ انمیں کچھ تو ایسے تھے جو خود شاہ صاحب کے شاگرد رہ چکے تھے اور بعد میں انکی تربیت پا کر انکے کام کو آگے بڑھانے میں انکی مدد کر رہے تھے۔ کچھ وہ تھے جو ان سے الگ مگر انکے متوازی ایسے ہی کاموں میں مصروف تھے، کچھ انکے دوست اور رفیق تھے اور کچھ ایسے تھے جنکے افکار اور تحریکیں شاہ صاحب سے جداگانہ تھیں لیکن وہ شاہ صاحب سے یا شاہ صاحب ان سے متأثر ہوئے تھے۔ ان میں چند سے شاہ صاحب کی ملاقات اور ربط ثابت ہے اور کچھ ایسے ہیں جن سے شاہ صاحب کی ملاقات تو شاید نہیں ہوئی مگر وہ انکی تصنیفات اور کارناموں سے متأثر ضرور ہوئے۔ ایسے ہی چند حضرات کے تذکرہ کے بغیر شاہ صاحب کی زندگی کے کسی پہلو پر کام ادھورا رہ جائیگا۔ اسی واسطے معاصرین کے تذکرہ کے لئے علیٰحدہ باب کی ضرورت ہے۔

کسی بھی بڑی ہستی کے کردار کی تعمیر میں اسکے معاصرین کا کسی نہ کسی طور پر ہاتھ ضرور ہوتا ہے۔ انکے افکار، افعال، اور نظریات خود اس ہستی کے افکار پر یا تو اثر انداز ہوتے ہیں یا انکا اثر قبول کر کے اس کے کام کو آگے بڑھانے میں مدد کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان معاصرین کا تذکرہ ضروری ہے۔ اس مقام پر صرف چند حضرات کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔

(۱) شاہ فخر الدین دہلوی:

شاہ فخر الدین دہلوی کے واقعات پروفیسر خلیق احمد نظامی نے ''مناقب فخریہ'' اور ''فخر الطالبین'' جیسے مخطوطات سے منتخب کر کے اپنی کتاب 'تاریخ مشائخ چشت' میں تحریر کئے ہیں۔ ان مخطوطات کا اردو ترجمہ بھی ہو

چکا ہے جو مطبوعہ کتاب کی شکل میں ہے۔[1]

شاہ فخر الدین کی ولادت ۱۱۲۶ھ مطابق ۱۷۱۷ء میں اورنگ آباد میں ہوئی۔ اس لحاظ سے وہ شاہ صاحب سے عمر میں ۱۴ سال چھوٹے تھے۔ انکے والد شاہ نظام الدین کاکوروی ثم اورنگ آبادی، حضرت شاہ کلیم اللہ دہلوی کے عزیز ترین مرید اور خلیفہ تھے اور ان ہی کے حکم کے مطابق وہ دکن چلے گئے تھے۔ شاہ کلیم اللہ نے آپکا نام فخر الدین تجویز کیا۔ آپ کے ایک بہن اور چار بھائی تھے جن میں ایک بھائی حقیقی اور بقیہ سوتیلے تھے۔ آپ والد کی جانب سے 'صدیقی' اور والدہ کی جانب سے 'سید' تھے۔ آپکی والدہ سید محمد گیسودراز کے خاندان سے تھیں۔ والد نے شاہ صاحب کی تعلیم و تربیت کا خاص خیال رکھا تھا۔ کیونکہ وہ خود بھی ایک متبحر عالم تھے اس لئے اس زمانہ کے مشہور علماء سے ہی آپکی تعلیم کی تکمیل کرائی۔

شاہ فخر نے خصوص الحکم، شمس بازغہ وغیرہ کتابیں ایک جید عالم میاں محمد جان سے پڑھیں جو فلسفۂ وحدۃ الوجود کے ماہر استاد تھے۔ ہدایہ مشہور بزرگ وفقیہ مولانا عبدالحکیم سے پڑھی جن کا توکل و تبحر مشہور تھا۔ حدیث کی سند دکن کے مشہور محدث حافظ اسعد الانصاری المکی ثم اورنگ آبادی سے حاصل کی۔ حافظ صاحب شیخ محمد ابراہیم کردی کے شاگرد تھے۔ شیخ محمد ابراہیم کے صاحبزادہ ابوطاہر مدنی حضرت شاہ ولی اللہ کے استاد تھے۔ شاہ فخر الدین اور شاہ ولی اللہ کا علم حدیث کے حصول کا مخرج و مرکز ایک ہی ہے۔ اسکے ساتھ ہی آپنے اپنے والد شاہ نظام الدین سے علم معقولات کی تعلیم حاصل کی۔ درسی کتابوں کے علاوہ طب، تیراندازی اور فنون سپاہ گری میں بھی مہارت حاصل کی۔ مناقب فخریہ میں ہے:

''ذات پاک کہ جمیع علوم وفنون اند کہ دریں فن (سپاہ گری) ہم مہارتے تمام داشتند''۔[2]

علوم ظاہری کے علاوہ شاہ فخر الدین کے والد ماجد نے اپنے صاحبزادہ کی اصلاح باطنی کی طرف توجہ کی اور بچپن میں ہی انکو اپنا مرید کرلیا تھا۔ شاہ فخر الدین کے حالات میں کئی ظاہری مماثلتیں شاہ ولی اللہ کے ساتھ تھیں۔ شاہ فخر الدین کی عمر ۱۶ سال تھی جب انکے والد کا انتقال ہوگیا۔

والد کے وصال کے بعد آپنے لشکر شاہی میں ملازمت کرلی مگر اخفاء کے ساتھ سخت ریاضت و مجاہدہ میں مشغول رہتے اور اس طرح روحانی مراتب طے کرتے رہتے دن بھر لشکر کشی میں مشغول رہتے اور رات بھر رکوع و

---

[1] ملفوظات وحالات شاہ فخر الدین دہلوی (اردو ترجمہ فخر الطالبین ومناقب فخریہ) مترجمہ ومرتبہ میر نذر علی درد کاکوروی

[2] مناقب فخریہ (مخطوطہ)، حبیب گنج کلکشن، مولانا آزاد لائبریری، علیگڑھ، صفحہ ۲۱

سجود میں مصروف۔ اسطرح آپ نے آٹھ سال سخت جدوجہد کی۔ آخر عمر میں خود فرماتے

''من درایام سابقہ محنت در مشغولی ہم بسیار کردہ ام۔۔۔''[1]

لیکن آپ دنیاوی شہرت سے اجتناب فرماتے جب لشکر میں آپ کے کمالات کی شہرت ہوئی تو ملازمت چھوڑ کر اورنگ آباد واپس آگئے اور اپنے والد کا سجادۂ مشیخت سنبھال لیا۔ مگر جس خانقاہ سے آپکا تعلق تھا وہاں اپنے کمالات کا اخفاء ناممکن تھا چنانچہ عقیدتمندوں کا ہجوم بڑھنا شروع ہوگیا اور باوجود وطن چھوڑنے پر دل نہ چاہنے کے آپ نے اورنگ آباد اور اپنے علائق کو خیر باد کہ کر وہاں سے ترک سکونت کر لی اور ۱۱۶۰ھ میں دہلی پہونچ کر شیخ قطب الدین بختیار کاکی کے مزار سے متصل مسجد میں فروکش ہوگئے پھر وہاں سے اپنے والد کے پیر شیخ کلیم اللہؒ کے مزار پر حاضر ہوئے اور تین دن انکے فرزند کے مہمان رہے۔ اس کے بعد کٹرہ پھلیل میں ایک حویلی کرایہ پر لیکر اسمیں رہائش اور درس وتدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ آپکے والد شاہ نظام الدین اورنگ آبادی اور انکے مرشد شاہ کلیم اللہ دہلوی کی نسبت کی بناء پر آپ غیر معروف نہیں رہے اور جلد ہی آپ سے بیعت کرنے اور فیضیاب ہونے کے لئے دور دور سے لوگ آنے لگے۔

دہلی میں کچھ عرصہ قیام کے بعد شاہ فخر الدین پاک پٹن پا پیادہ زیارت کے لئے گئے اور عقیدت اور احترام کی خاطر پاک پٹن میں داخل ہونے سے ایک منزل قبل ہی اپنی جوتیاں اتار دیں اور ننگے پاؤں پاک پٹن میں داخل ہوئے۔ دہلی واپسی کے چند دن بعد آپ کٹرہ پھلیل سے اجمیری دروازہ منتقل ہوگئے اور وہاں امیر غازی الدین خان فیروز جنگ کے قائم کردہ مدرسہ میں درس وتدریس کا کام شروع کیا۔

جس زمانہ میں شاہ فخر الدین اجمیری دروازہ کے مدرسہ میں درس وتدریس میں مشغول تھے اسی دور میں پرانی دہلی میں مہندیوں کے محلّہ میں مدرسہ رحیمیہ میں شاہ ولی اللہ دہلوی پورے انہماک اور اخلاص کے ساتھ رشد وہدایت وتعلیم میں مصروف تھے۔ شاہ فخر الدین کے مدرسہ میں تصوف کا رنگ غالب تھا اور سلوک وعلم باطن کی طرف زیادہ زور دیا جاتا تھا جبکہ مدرسہ رحیمیہ میں احسان وسلوک کے ساتھ علم ظاہر (قران، حدیث، فقہ وغیرہ) پر خاص زور تھا اور قرآن وحدیث کی روشنی میں ایک زبردست انقلابی تحریک کو آگے بڑھانے کی کوشش کی جارہی تھی۔[2]

---

[1] مناقب فخریہ (مخطوطہ)، حبیب گنج کلکشن، مولانا آزاد لائبریری، علیگڑھ، صفحہ ۲۱

[2] تاریخ مشائخ چشت: صفحہ ۴۷۶

علمی ذوق:

شاہ فخر الدین کی فطرت میں علمی ذوق نہایت اعلیٰ درجہ کا تھا۔ آپ مطالعہ کے بہت شوقین تھے عبادت و تدریس کے علاوہ بیشتر وقت اسی شغل میں صرف ہوتا۔ کتابوں کو حاصل کرنے اور جمع کرنے کا بھی بہت شوق تھا۔ آپکے پاس نہایت عمدہ کتب خانہ تھا ہمہ وقت کوئی نہ کوئی کتاب آپکے سامنے رہتی۔ فوائد الفوائد ملفوظ حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء سے تو اتنا عشق تھا کہ ہر وقت سینہ سے لگی رہتی۔

شاہ فخر الدین نے تین کتابیں تصنیف فرمائی تھیں:

۱۔ نظام العقائد ۲۔ رسالہ مرجیہ ۳۔ فخر الحسن

شاہ ولی اللہ اور شاہ فخر الدین کیونکہ دہلی ہی میں رہتے تھے اور انکے شوق، مصروفیتیں اور مطامح نظر اور طریقہ کار یکساں تھے اسلئے انکی آپس میں واقفیت فطری ہے۔ اگر چہ کہیں انکی براہ راست ملاقاتوں کا تذکرہ نہیں مگر شاہ فخر الدین نے فخر الحسن شاہ ولی اللہ دہلوی ہی کے ایک بیان کی تردید میں تحریر کی ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ شاہ فخر الدین کا شاہ ولی اللہ کی تحریروں اور تحریک سے واسطہ تھا۔

شاہ ولی اللہ نے انتباہ اور القول الجمیل میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سلسلہ چشتیہ حضرت علیؓ تک متصل نہیں کیونکہ خواجہ حسن بصری جو سلسلہ چشتیہ کے امام اول ہیں وہ حضرت علیؓ کے زمانہ میں بہت کم عمر تھے اور آپؒ کی ملاقات حضرت علیؓ سے بہ اعتبار تاریخ ثابت نہیں اس لئے شاہ صاحب کے اعتراض کے مطابق انکو روحانی خلافت کس طرح مل سکتی ہے۔ شاہ فخر الدین نے اپنی کتاب فخر الحسن بلقاء الحسن میں اس اعتراض کا مدلل جواب دیا ہے جو احادیث کی متداول کتب اور شروح کے علاوہ ان کتابوں کے حوالوں سے مملو ہے جن سے آپ کے علمی تبحر اور وسعت مطالعہ کا پتہ چلتا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے فخر الحسن بلقاء الحسن کے خیالات کی تردید نہیں کی۔

معمولات ونظام اوقات:

اس دور کے بزرگوں کی عام طور پر عادت تھی کہ معمولات کے معاملہ میں پابندی اوقات کو نہایت سختی سے اپنے اوپر لازم قرار دیتے تھے خواہ عبادات ہوں، اوراد و وظائف ہوں یا دیگر معمولات اوقات کار کی تقسیم اس طور پر کیا کرتے کہ ہر عمل کے لئے جو وقت مقرر ہوتا اسمیں فرق نہ آتا۔ شاہ ولی اللہ ہوں، شاہ فخر الدین ہوں، مرزا

مظہر جانجاناں ہوں یا کوئی دوسری شخصیت، معمولات اور نظام اوقات کے معاملہ میں سب کا یکساں رویہ ہوتا تھا۔

پروفیسر خلیق نظامی نے تاریخ مشائخ چشت میں شاہ فخر الدین کا پورا نظام اوقات تحریر کیا ہے۔ دن کے چوبیسوں گھنٹہ وہ جس طرح صرف کرتے انکے اس معمول میں کسی موسم اور کسی ماحول میں تبدیلی نہ ہوتی۔ وہ تحریر کرتے ہیں:

''شاہ فخر الدین اپنے معمولات کے بہت پابند تھے۔ جن مزارات پر حاضری یا جس کام کی بجا آوری انہوں نے اپنے آپ پر لازم قرار دے لی تھی اسکی پابندی کرتے تھے۔''

فخر الطالبین میں لکھا ہے:

''ہنگامہا در شہر می شوند تاہم معمول خود را ناغہ نمی کنند''[1]

(شہر میں ہنگامے ہوتے رہتے ہیں لیکن وہ اپنے معمولات کو ناغہ نہیں کرتے)

بجنسہٖ یہی حال شاہ ولی اللہ کا تھا۔

اخلاق:

شاہ فخر الدین کا اخلاق نہایت اعلیٰ تھا۔ ہر شخص سے خندہ پیشانی سے ملتے تھے اور اسکی دلجوئی کرتے۔ دشمنوں تک سے نہایت نرمی اور اخلاق سے پیش آتے۔ ایک مرتبہ دہلی کے کسی شخص نے امتحاناً شاہ ولی اللہ صاحبؒ، شاہ فخر الدین صاحبؒ اور مرزا مظہر جانجاناںؒ کو کھانے پر مدعو کیا مگر جب تینوں اسکے مکان پر پہنچ گئے تو زنانہ مکان میں کھانا لینے کے بہانے گیا اور بہت دیر واپس نہ آیا۔ کافی دیر بعد واپس آنے پر بیوی کی علالت کا عذر کر کے کھانے کے بدلے کچھ رقم تینوں بزرگوں کو دی۔ شاہ فخر الدین نے یہ رقم کھڑے ہو کر لی، شاہ ولی اللہ نے بیٹھے بیٹھے لی اور مرزا مظہر جانجاناں نے کہہ کر لی کہ تم نے مجھے بہت تکلیف پہنچائی۔ [2]

شیخی اور اظہار بزرگی سے آپکو سخت نفرت تھی۔ اظہار تعظیم کو برا جانتے اور اس سے ناراض ہوتے۔

معاشرہ کو درست کرنے کی کوشش:

---

[1] تاریخ مشائخ چشت: صفحہ ۴۸۰۔

[2] ایضاً صفحہ ۴۸۶

اس دور کے معاشرہ میں جو خرابیاں دین و مذہب سے دوری اور قرآن وحدیث سے بیگانگی پیدا ہوگئی تھی اسکا حال گذشتہ ابواب میں دیا جاچکا ہے۔ مسلمانان ہند تنزلی اور انحطاط کی آخری حد تک پہنچ گئے تھے۔ مذہب کی روح ختم ہورہی تھی۔ قرآن وحدیث کو سمجھنے سمجھانے کے بجائے انکو تعویز گنڈوں کا ذریعہ اور برکت کا منتر سمجھا جانے لگا تھا۔ ان ہی حالات کے تحت شاہ ولی اللہ نے تفہیم قرآن اور ترویج علم حدیث کی کوشش کی۔ اور قرآن پاک کا فارسی ترجمہ کیا کہ ہر خاص وعام اسے سمجھ کر اس سے استفادہ کرسکے۔

شاہ فخر الدین کی محفل تلقین وارشاد کا بھی یہی مقصد تھا۔ انھیں احساس تھا کہ نافہمی کی وجہ سے لوگ تعلیمات اسلامی سے دور ہوگئے چنانچہ انھوں نے جمعہ کے خطبہ کو اردو میں پڑھنے کا مشورہ دیا۔

''پس اگر خطبہ بہ لفظ ہندی دریں مملکت خواندہ شود برائے چیزے کہ موضوع است حاصل می شود۔ الا برائے سائر الناس فائدہ ندارد کہ از زبان عربی واقف نیستند''[1]

(اگر اس مملکت (ہندوستان) میں خطبہ ہندی (زبانِ ہندوستانی) میں پڑھا جائے تو اسکا اصل مقصد حاصل ہوجائیگا۔ ورنہ عوام الناس کو اسکا کوئی فائدہ نہیں اسلئے کہ وہ عربی زبان سے واقفیت نہیں رکھتے۔)

دنیا دار صوفیوں نے جو گنڈے تعویذوں کا کاروبار شروع کر رکھا تھا اسکے خلاف شاہ ولی اللہ نے اپنی وصیت اور دیگر تصانیف میں بہت لکھا ہے۔ شاہ فخر الدین نے جب یہ برے اثرات دیکھے تو لوگوں کو اعمال و وظائف بتانے سے پرہیز کرنے لگے۔ اگر کسی کو بتانا پڑتا تو صحیح حدیث سے بتاتے۔ لکھا ہے:

اکثرے اعمال حضرت مولانا از حافظ جیو سند دارند وصحت حدیث شریف)

(حضرت مولانا کے اکثر اعمال ووظائف جو صحیح حدیث سے ہوتے انکی سند حافظ جیو دیتے)

حافظ جیو شاہ ولی اللہ کے استاد محمد طاہر کردی بن ابراہیم کردی کے شاگرد اور جامع فن حدیث تھے۔[2]

وفات:

شاہ فخر الدین کا انتقال ۲۷ جمادی الثانی ۱۱۹۹ھ کو شاہ ولی اللہ کے انتقال کے تقریباً ۲۳ سال بعد ہوا۔

---

[1] فخر الطالبین، صفحہ ۴۶

[2] تاریخ مشائخ چشت، صفحہ ۵۰۹

بوقت انتقال آپکی عمر ۷۳ سال تھی حاجی محمد امین نے جو شاہ ولی اللہ کے مرید تھے غسل دیا۔ خواجہ بختیار کاکی کے مزار پاک کے قریب دفن کیا گیا۔ شاہ ولی اللہ کے بعد آپکے صاحبزادوں خصوصاً شاہ عبدالعزیز سے شاہ فخر الدین کو بڑا تعلق تھا۔ اکثر اوقات مشکلات میں انکی مدد کرتے دہلی میں جب شیعوں اقتدار بڑھا تو شاہ عبدالعزیز پر بھی مصیبت نازل ہوئی۔ ایسے وقت میں شاہ فخر الدین ہی نے انکی مدد کی اور اپنی حویلی میں رکھا۔

مناقب فخریہ میں ہے:

''فرزندان شاہ ولی اللہ مغفور را در آنچہ متصدیاں سلطانی از حویلی علیحدہ ساختہ و حویلی را بہ ضبط آوردہ بودند۔ آنحضرت بہ حویلی مبارک جا دادند و غم خواری فرمودند و حویلی مذکور را از جناب سلطان بہ ایشان دہانیدند و با اعزاز و اکرام در آں جا رسانیدند'' [1]

(شاہ ولی اللہ کے فرزند کو جو حویلی بادشاہ کی جانب سے علیحدہ ملی تھی وہ حویلی ضبط کر لی گئی۔ آنحضرت (شاہ فخر) نے اپنی حویلی میں انکو جگہ دی اور غم خواری کی اور انکی حویلی سلطان سے واپس دلائی اور اعزاز و اکرام کے ساتھ اسمیں بسایا)

مسلم یونیورسٹی لائبریری میں ذخیرہ سر شاہ سلیمان میں تفسیر عزیزیہ کا جو قلمی نسخہ (مکتوبہ ۱۲۴۹ھ) ہے اس میں شاہ عبدالعزیز نے جہاں شاہ فخر الدین کا ذکر کیا ہے وہاں انکا تعارف ان القاب سے کیا ہے:

''برادر دینی، جوہر۔۔۔۔۔حق گزینی، سالک راہِ خدا جوئی، ملازم طریقۂ صدق گوئی جناب مولانا عالی جناب خلائق مآب و بالفضل اولانا فخر الملۃ والدین محمد قدس اللہ سرّہٗ الامجد'' [2]

۲۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی:

صوبہ اودھ جو اب اتر پردیش کا ایک علاقہ ہے اور اس سے پیشتر ممالک متحدہ آگرہ و اودھ (یونائٹڈ پروونس یا یو۔ پی۔ کا ایک حصہ تھا) مسلمان بستیوں کے ایک بڑے علاقہ پر مشتمل تھا جو دہلی کے پورب میں آباد تھے۔ یہ علاقہ علم و فضل کا بڑا مرکز تھا۔ اودھ میں بلگرام ضلع ہردوئی مسلمانوں کی اولیں بستی تھی۔

بلگرام ایک مردم خیز خطہ ہے جہاں سید عبدالجلیل اور انکے بعد انکے صاحبزادے سید محمد قابل ذکر علماء تھے

---

[1] مناقب فخریہ (مخطوطہ، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) صفحہ ۳۱

[2] تفسیر عزیزیہ (مخطوطہ) مولانا آزاد لائبریری، صفحہ ۲

لیکن ان سے بھی زیادہ قابل عزت واحترام سید غلام علی آزاد بلگرامی تھے جنہیں حسان الھند بھی کہا جاتا ہے۔[۱]

میر غلام علی آزاد بن سید نوح الحسینی بلگرام کے مشہور ومعزز خاندان سادات زیدیہ سے تعلق رکھتے تھے اور موتمِ الاشبال (ابومحمد عیسیٰ) ابن زید شہید ابن امام زین العابدین ابن امام حسینؓ کی اولاد میں تھے۔ آپ نسباً حسینی، حسباً واسطی، مولداً بلگرامی، مذہباً حنفی، مشرباً چشتی تھے۔ آپکی پیدائش ۲۵ صفر ۱۱۱۶ھ/ ۲۹ جون ۱۷۰۴ء کو بلگرام میں ہوئی۔ شروع سے آخر تک درسی کتابیں سید طفیل محمد اترولوی بلگرامی سے پڑھیں۔[۲] اس کے بعد لغت، سیرت نبویؐ، حدیث، فنون ادب عربی وفارسی کی تعلیم اپنے نانا سید عبدالجلیل بلگرامی سے پائی اور اکثر کتب حدیث اور شعر عربی وفارسی کا اجازہ بھی لیا۔ عروض وقوافی اور بعض فنون ادب اپنے ماموں سید محمد سے حاصل کئے[۳] شاہ لطف اللہ بلگرامی عرف شاہ لدھا (المتوفی ۱۱۴۳ء) کے حلقہ ارادت میں داخل تھے اور ان سے بیعت کی۔ ۳۴ سال کی عمر میں عرب جا کر صحیح بخاری علامہ شیخ محمد حیات سندھی مدنی حنفی سے پڑھی اور سند لی اور صحاح ستہ اور اسکی تمام مقرونات کی ان سے اجازت لی فن حدیث کے بعض فوائد کی سماعت مکہ معظّمہ جا کر شیخ عبدالوھاب الطنطاوی المصری سے کی۔ الطنطاوی نے آپکے عربی اشعار کی نہایت تعریف وتحسین کی اور آپکا تخلص آزاد سن کر اور سمجھ کر کہا ''یا سیدی انت من عتقاء اللہ تعالیٰ''۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں آپکے قصیدۂ مدحیہ پر علمائے مکہ معظّمہ نے آپ کو حسان الھند کا خطاب دیا۔[۴]

آپنے اپنی زندگی میں کل تین سفر کئے۔ پہلا سفر دہلی کے لئے ۱۱۳۴ھ/۲۲-۱۷۲۱ء میں کیا جہاں آپ سید عبدالجلیل بلگرامی سے تکمیل علم کے لیے گئے اور انکے پاس دو سال قیام کیا۔ دوسرا سفر سندھ کے شہر سیوستان (سہوان) کے لیے ذی الحجہ ۱۱۴۲ھ میں کیا اور اس ضمن میں لاہور، ملتان، اُچ اور بھکر بھی گئے۔ چار سال آپ سندھ میں اپنے ماموں کے پاس رہے جہاں انکی نیابت خدمت میر بخشی ووقائع نگاری کی بجالائے اور عروض وغیرہ میں تعلیم بھی حاصل کی۔ تیسرا سفر حرمین شریفین کا ہے جہاں آپ عمر کے چونتیسویں سال ۱۱۵۰ھ میں گئے اور دو سال رہ کر ۱۱۵۱ھ میں حج کر کے ۱۱۵۲ھ میں ہندوستان واپس آئے۔ روانگی کی تاریخ سفر خیر اور واپسی کی سفر بخیر ہے۔ حج کیلئے جاتے ہوئے آپ جب مالوہ سے گذرے تو ۲۲ شعبان ۱۱۵۰ھ کو سرونج کے مقام پر آپکی

---

۱ رودکوثر، صفحہ ۴۱۱؛ مقالات شبلی صفحہ ۱۱۲

۲ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، لاہور، جز واول، صفحہ ۱۰۴، تذکرہ علمائے ہند، صفحہ ۳۶۲، مؤلفہ مولوی رحمٰن علی، مرتبہ ومترجمہ محمد ایوب قادری، کراچی، ۱۹۶۱ء، سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان مصنفہ آزاد بلگرامی، صفحہ ۱۱۸، نزہۃ الخواطر، جلد ۶، صفحہ ۱۱۸۔

۳ ابجد العلوم، مصنفہ نواب صدیق حسن خاں، صفحہ ۹۲۰، بھوپال، ۱۲۹۵ھ، خزانہ عامرہ مصنفہ آزاد بلگرامی، صفحہ ۱۲۳، کانپور، ۱۸۷۱ء

۴ مقدمہ دیوان عربی انتخاب سبع سیارہ مصنفہ آزاد بلگرامی، صفحہ ۳، مطبوعہ لکھنؤ، ۱۳۲۸ھ۔

ملاقات نواب نظام الملک والی دکن سے ہوئی جو مرہٹوں سے جنگ میں مصروف تھے۔ انھوں نے ایک مدحیہ رباعی سنائی نواب نے خوش ہوکر زادِ راہ دیا اور اورنگ آباد آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ حج سے واپسی پر اواخر ۱۱۵۲ھ میں آپ اورنگ آباد آ گئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی جہاں ۴۸ سال بعد تقریباً ۸۴ سال کی عمر میں آپ کی وفات ہوئی [۱] اورنگ آباد میں نظام الملک آصف جاہ نے آپ کی بہت قدر کی اور اپنے دوسرے بیٹے نواب ناصر جنگ کا استاد اور اتالیق مقرر کر دیا۔ آپ ناصر جنگ (بعدہٗ نظام الدولہ) سے منسلک ہو گئے۔ اور اپنے قیام اورنگ آباد کے لیے شاہ مسافر غجدوانی معروف بہ بابا مسافر نقشبندی (م ۱۱۲۶ھ) کے تکیہ کو پسند کیا جو درگاہ پن چکی کے نام سے مشہور تھا۔[۲] نظام الدولہ ناصر جنگ سے آپکی موافقت اور محبت بہت بڑھ گئی لیکن جب ۱۱۶۱ھ میں نظام الملک کے انتقال کے بعد نظام الدولہ ناصر جنگ والی ریاست دکن ہوئے اور آپ کو امارت کا منصب دینے کی خواہش کی تو آپنے انکار کر دیا۔ اورنگ آباد میں آپنے فقر و فنا کی زندگی گذاری۔ فرماتے تھے۔

'این دنیا بنہر طالوت می ماند، غرفہ از آں حلال است و زیادہ از آں حرام۔

دراین دیار کہ شاہی بہر گدا بخشند　　غنیمت ست کہ مارا ہمیں بما بخشند

قال ھذہ الدنیا مثل نھر الطالوت. غرفة منه حلال و الزیادہ حرام. وانشد

عصابة اعطوا العافین سلطنته'　　ان سلمونی لنفسی فھم مغتنم[۳]

ناصر جنگ نے ۱۱۶۴ھ میں ایک ہاتھی سے گر کر انتقال کیا تو اس روز آزاد بھی انکے ہمراہ دوسرے ہاتھی پر سوار تھے۔ آپنے نظم کیا۔۔

ھونا صر الاسلام سلطان الوریٰ　　ابقاہ فی العیش المخلد ربه

حاز المناقب والماثر کلھا　　جبل الوقار یحبنا و نحبه'

آپنے ان دو اشعار کے علاوہ کبھی کسی مالدار شخص کی مدح میں کوئی شعر نہیں کہا [۴]

ناصر جنگ نے آپکی خدمات کے صلہ میں بطور جاگیر ''آلتمغاء'' موضع ہرسول اورنگ آباد عطا کیا۔

---

[۱] دائرۃ المعارف، صفحہ ۱۰۵۔

[۲] دائرۃ المعارف، ابجد العلوم، صفحہ ۹۲۱

[۳] ابجد العلوم، صفحہ ۹۲۱۔

[۴] ابجد العلوم، صفحہ ۹۲۱۔

نواب سید محمد خاں صلابت جنگ نے خدماتِ ملکی سے متاثر ہوکر صدارت کل، سراج المحدثین اور رئیس العلماء کا خطاب دیا۔

بیشتر تذکرہ نگاروں کے مطابق آپنے ۲۱ ذی قعدہ ۱۲۰۰ھ مطابق ۱۵ ستمبر ۱۷۸۶ء کو اورنگ آباد میں وفات پائی اور احاطہ امیر حسن۔ سجزی میں دفن ہوئے جو روضہ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ مادۂ وفات 'آہ غلام علی آزاد' ہے۔[۱] لیکن ابجد العلوم میں صدیق حسن خاں نے آپکی وفات کا ۱۱۹۴ھ لکھا ہے اور تاریخ وفات 'غلام علی آزاد' سے نکالی ہے۔[۲]

غلام علی آزاد عمر میں شاہ ولی اللہ دہلوی سے دو سال چھوٹے تھے لیکن آپ کا وصال شاہ صاحب کے انتقال کے چوبیس سال بعد ہوا۔ انھوں نے بھی وہی پر آشوب زمانہ بلکہ اسکے بعد کا زوالِ سلطنت مغلیہ بھی دیکھا۔ آپ عربی و فارسی دونوں زبانوں میں صاحب تصنیف اور صاحب دیوان تھے۔ نہایت پر گو شاعر تھے اور عربی میں بے تکلف شعر کہتے تھے۔ رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم سے آپکی محبت عشق کا درجہ رکھتی تھی چنانچہ نعت و منقبت نبوی میں آپنے ہزاروں اشعار عربی میں کہے۔

آزاد کی عربی تحریر کی شیخ عبدالعلی بحرینی نے بہت تعریف کی لیکن مولوی مرتضیٰ مدراسی حیدرآبادی کی رائے ہے کہ آزاد کی عربی تحریر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی حجۃ اللہ البالغہ کی عربی تحریر سے پست ہے اور اس سے عربی ادب میں کوئی مفید اضافہ نہیں۔[۳]

آپکی عربی و فارسی کی تصنیفات کی تفصیل بیشتر تذکرہ نگاروں نے دی ہے ان تصانیف میں عربی زبان میں **ضوء الدراری شرح صحیح البخاری الیٰ کتاب الذکوٰۃ، شمامۃ العنبر فی ماورد فی الھند من سید البشر، تسلیۃ الفوادفی قصائد آزاد، سند السعادات فی حسن خاتمہ الساداتِ سبحۃ المرجان فی آثارِ ھندوستان، السبعۃ السیارۃ** (یہ سات دیوان ہیں جسمیں کل دس ہزار اشعار ہیں انمیں اکثر مدح نبیؐ میں ہیں۔ انمیں قصائد: مستزاد، مردف، مزوج اور ترجیع ہیں۔ کسی ہندوستانی شاعر نے کبھی اتنے زیادہ اور ایسے عمدہ اشعار عربی میں نہیں کہے)' دیوان عربی جسمیں تین ہزار اشعار ہیں، **شفاء العلیل فی اصطلاحات کلام ابی الطیب متبنی** وغیرہ ہیں۔

---

۱ حدائق الحنفیۃ، مصنفہ مولوی فقیر محمد، صفحہ ۴۵۶، دائرہ معارف اسلامیہ، صفحہ ۱۰۶، تذکرہ علمائے ہند، صفحہ ۳۶۳۔

۲ ابجد العلوم، صفحہ ۹۲۱

۳ دائرۃ المعارف الاسلامیۃ، صفحہ ۱۰۵۔

فارسی زبان میں بھی آپ صاحب دیوان ہیں اور یہ دیوان نو ہزار ابیات پر مشتمل ہے۔ اسکے علاوہ تذکرہ نگاری میں بھی خزانہ عامرہ (تقریباً ۱۳۵ فارسی شعراء کا ذکر ہے)، روضۃ الاولیاء در بارۂ حالات مشائخ روضہ (جو قلعہ دولت آباد کے قریب واقع ہے)، ید بیضا تذکرہ شعراء، معاصر الکرام تاریخ بلگرام وغیرہ۔[۱]

مآثر الکرام تذکرہ نویسی کی عمدہ مثال ہے جسمیں بلگرام و بیرونِ بلگرام کے اسّی صوفیاء اور تہتر علماء وفضلاء کے حالات مندرج ہیں۔ انھوں نے ملک گیر شہرت کے علماء وصوفیاء کا ذکر کیا ہے لیکن تعجب ہے کہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کا تذکرہ انمیں شامل نہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ ان دو حضرات کی آزاد سے ملاقات کسی تذکرہ یا کسی تحریر سے ثابت نہیں۔ میر غلام علی نے اگرچہ سندھ اور دکن کا سفر کیا اور عمر کے آخری ۴۸ سال بھی دکن ہی میں گذارے مگر دہلی اور اہل دہلی سے انکا واسطہ صرف دو سال کا ہی ہے جب انھوں نے اپنے نانا سید عبدالجلیل کے پاس رہ کر اپنی تعلیم مکمل کی۔ ظاہر ہے کہ وہ زمانہ تصنیف وتالیف کا نہیں تھا اور ۱۱۳۴ھ تک شاہ ولی اللہ بھی اپنے والد محترم سے علم حاصل کر رہے تھے اسوجہ سے ایک دوسرے سے واقفیت کا امکان نہیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ سید غلام علی کا میدان عمل شاہ صاحب سے قطعاً مختلف تھا۔ یہی وجوہات ہیں جنکی بناء پر آزاد نے باوجود معاصر ہونے کے شاہ صاحب کا تذکرہ نہیں کیا اور نہ ہی انکو کما حقہ اہمیت دی۔ میر صاحب بنیادی طور پر تذکرہ نگار اور تاریخ نویس تھے اور ساتھ ہی شاعر بسیار گو بھی مگر انمیں فکر کی وہ گہرائی، مطالعہ کی وسعت اور طرز تحریر کی وہ متانت نہ تھی اور نہ ہی وہ احساس ذمہ داری تھا جسنے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کو انکا اعلیٰ مقام دلایا۔ میر غلام علی کی عربی نعتیہ شاعری سے متاثر ہو کر علمائے عرب نے انکو حسان الھند کا خطاب ضرور دیدیا تھا مگر حجۃ اللہ البالغۃ تو عرب ومصر میں اتنی مقبول ہوئی کہ اسکو درسیات میں شامل کیا گیا اور اس پر کتابیں تصنیف ہوئیں۔ مصر سے اسکے متعدد ایڈیشن چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔

۳۔ مرزا مظہر جان جاناں:

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے معاصرین میں اب تک جن دو اصحاب کا ذکر کیا گیا ہے وہ دونوں اگرچہ شاہ صاحب کے ہم عصر تھے لیکن ہم نے دیکھا کہ ایک یعنی شاہ فخر الدین دہلی میں رہتے ہوئے اور دوسرے یعنی غلام علی آزاد دہلی سے دور دکن میں مقیم رہ کر اپنے اپنے کام میں مصروف تھے لیکن شاہ صاحب سے ان دونوں کی ملاقات یا مصاحبت کا کوئی ثبوت یا تذکرہ میسر نہیں۔ مگر مرزا مظہر جان جاناں کا جو تعلق شاہ صاحب سے تھا وہ

---

۱ تذکرہ علمائے ہند، صفحہ ۳۶۳، ابجد العلوم، صفحہ ۹۲۱، دائرۃ المعارف الاسلامیۃ، صفحہ ۱۰۵۔

صرف عصری نہیں بلکہ شخصی اور ذاتی تھا۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ کے روحانی بھائی، ہمنشیں، ہم عصر مرزا مظہر جانجاناں کے تذکرہ کے بغیر معاصرین شاہ ولی اللہ کا تذکرہ ادھورا رہ جاتا ہے۔ یہ ایسے بزرگ تھے جو وقتِ وصال بھی آپکے قریب تھے۔

مرزا صاحب کے حالات آپکے نامور مرید شاہ عبداللہ المعروف بہ شاہ غلام علی دہلوی نے مقاماتِ مظہری اور کمالات مظہری اور شاہ نعیم اللہ بہرائچی نے بشاراتِ مظہریہ اور معمولات مظہریہ میں تفصیل کے ساتھ لکھے[۱]

مرزا مظہر جانجاناں ۱۲ رمضان المبارک ۱۱۱۱ھ مطابق ۱۷۰۰ء (۱۶۹۹ء) کو بروز جمعہ بمقام کالا گڑھ (مالوہ) پیدا ہوئے۔ آپکا نام حبیب اللہ اور لقب شمس الدین تھا۔ آپکا نسب ۲۸ واسطوں سے محمد بن حنیفہؒ کے ذریعہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مل جاتا ہے۔[۲] آپکے جد اعلیٰ نے سلاطین تیموریہ کی بیٹی سے شادی کر لی تھی اسلئے میرزا کا خطاب پایا اور دربار کے امراء میں انکا شمول ہوا۔ لفظ میرزا کی اصل امیرزادہ ہے۔ کثرت استعمال سے میرزا اور پھر مرزا ہو گیا۔[۳]

آپکے والد مرزا جان بادشاہ عالمگیر کے منصب دار تھے چنانچہ جسوقت عالمگیر کو آپکی پیدائش کی اطلاع دی گئی تو انھوں نے معاً کہا کہ بیٹا باپ کی جان ہوتا ہے اس لئے یہ بچہ جان جاناں ہے اسی وقت سے جان جاناں آپکے نام کا ایک جزو بن گیا آپ اردو شاعری میں بھی ایک خاص مقام رکھتے تھے اور آپکا تخلص مظہر تھا لہذا آپکا اصل نام آپکے تخلص اور بادشاہ کے دیئے ہوئے خطاب میں چھپ گیا اور آپ مرزا مظہر جان جاناں کے نام سے مشہور ہو گئے۔ آپنے علمائے وقت سے علوم دین مروجہ حاصل کئے۔ حدیث حاجی محمد افضل سیالکوٹی سے پڑھی۔ تصوف اور روحانی سلسلہ سے آپ نقشبندی مجددی بزرگ تھے حضرت طیب نور محمد بدایونی سے بیعت کی اور انکے وصال کے بعد شاہ سعد اللہ اور حضرت عابد سنانی سے فیوض و برکات حاصل کیے[۴] مزاجاً آپ غیر معمولی طور پر نازک مزاج اور مستغنی تھے۔ استغناء و بے تکلفی کا یہ عالم تھا کہ ساری عمر کسی بادشاہ یا وزیر کے سامنے سر نیاز خم نہیں کیا۔ زندگی بھر گھر نہیں بنایا۔ کسی کے گھر کھانا نہ کھاتے، ایک جوڑے سے زیادہ کپڑے ایک وقت میں نہ رکھتے اور انتہائی متوکلانہ زندگی گذارتے تھے۔

---

۱ مقدمہ القول الجلی، صفحہ ۳۸

۲ مقدمہ القول الجلی، صفحہ ۳۸

۳ تذکرہ علمائے ہند، صفحہ ۶-۴۹۵، حدائق الحنفیہ صفحہ ۴۵۳۔

۴ تذکرہ علمائے ہند، صفحہ ۶-۴۹۵، حدائق الحنفیہ، صفحہ ۴۵۳

دوسرے مشائخ کی طرح عرس وفاتحہ نہ کرتے۔ نذر ونیاز کے لئے بڑی کڑی شرطیں مقرر کر رکھیں تھیں۔ اھالیان روہیلکھنڈ خصوصاً پٹھان کثرت سے آپکے سلسلہ بیعت واردات سے منسلک تھے۔[1]

علمی اعتبار سے مرزا مظہر جان جاناں کا درجہ بہت بلند تھا۔ دقیقہ رسی، علمیت، مذاق سلیم، انصاف پسندی اور تصوف میں یگانۂ روزگار تھے۔ مرزا صاحب کئی کتابوں کے مصنف تھے انمیں آپکے مکتوبات نہایت قابل توجہ ہیں جنمیں صوفیانہ وشرعی مسائل کی توضیح ہے۔ فارسی کے علاوہ مرزا صاحب اردو میں بھی شعر کہتے تھے اور کئی ریختہ گوشعراء کی تربیت بھی فرمائی۔ انمیں آدم الشعراء ولی دکنی کا نام پیش پیش ہے۔ سراج الدین خاں آرزو انکے ہم عصر تھے۔ مرزا صاحب نے اردو زبان کے قواعد منضبط کئے اور مرزا سودا، میر تقی میر، خواجہ میر درد اور میر حسن جیسے مشہور شعراء کی تربیت میں حصہ لیا۔[2]

مرزا مظہر جانجاناں نے کیونکہ بے اطمینانی اور ہنگامہ آرائی کا وہی دور دیکھا تھا جو شاہ ولی اللہ دہلوی نے بھی دیکھا اسلئے دونوں حضرات کی تحریروں میں اسکی جھلک نظر آتی ہے۔

شاہ ولی اللہ اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں:

''اما اختلالِ حالِ شہر کہ روز فتنہ تازہ گل می کند'' (سیاسی مکتوبات صفحہ ۷۷) [3]

اور مرزا مظہر جانجاناں رقمطراز ہیں:

''از تشویشات ہر روزہ دہلی تنگ آمدہ ام'' (کلمات طیبات: مکتوب ۴۰) [4]

شاہ ولی اللہ اور مرزا مظہر جانجاناں ہم مذاق اور ہم ذوق ونیز ہم عصر وہم وطن (باشندۂ دہلی) ہونے کی بناء پر آپس میں بہت قربت رکھتے تھے اور مرزا صاحب سے آپکے گہرے تعلقات تھے۔ حضرت مرزاؒ کے نام آپکے خطوط کلمات طیبات میں ملاحظہ کرنے کے بعد کہا جاسکتا ہے کہ آپ کو ان سے بڑی عقیدت تھی۔

حضرت مرزا حضرت شاہ ولی اللہ کی بہت قدر کرتے تھے۔ الیانع الجنی میں محسن ترہتی مرزا مظہر جانجاناں کے خلیفہ نعیم اللہ بہرائچی سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے شیخ (مرزا صاحبؒ) کو اکثر شاہ صاحبؒ کے فضائل اور کمالات کا ذکر کرتے سنا ہے اور انھوں نے شیخ غلام علی دہلوی کی زبانی مرزا صاحب کا یہ قول بھی سنا کہ وہ

---

[1] رود کوثر، صفحہ ۳۲-۴۳۰۔

[2] رود کوثر، صفحہ ۳۲-۴۳۰

[3] و [4] تاریخ مشائخ چشت: صفحہ ۳۳۰۔

کہتے تھے:

"ان ابا عبد العزیز (الشاہ ولی اللہ) المحدث قدبین طریقة جدیدة و له طرز خاص فی تحقیق اسرار المعارف و غوامض العلوم، وانهٗ ربانی من العلماء ولعله لم یو جد مثله فی الصوفیة المحققین الذین جمعوا بین علمی الظاهر و الباطن و تکلموا بعلوم جدیدةٍ الارجال معدودون."[1]

(ابوالعزیز (شاہ ولی اللہ محدثؒ) نے نیا طریقہ بیان کیا ہے اور اسرار و معارف اور علوم کی باریکیوں کی تحقیق میں آپکا خاص طرز ہے۔ آپ علمائے ربانیوں میں سے ہیں۔ محقق صوفیوں میں جو علم ظاہر اور علم باطن کے جامع ہوئے ہیں اور جنہوں نے علم جدید کا بیان کیا ہے شاید آپ کی مثل چند ہی افراد ہوئے ہیں)[2]

شاہ ولی اللہ مرزا صاحب کی نسبت لکھتے ہیں:

"آنچہ قدر ایشاں ما مردم میدانیم۔ شما چہ دانید۔ احوالِ مردمِ ہند بر ما مخفی نیست، کہ خود مولد و منشاء فقیر است و بلاد عرب را می دیدہ ایم و سیر نمودہ۔ احوالِ مردم ولایت از ثقات آنجا شنیدہ ایم و تحقیق کردہ کہ عزیزے کہ بر جادۂ شریعت و طریقت و اتباع کتاب و سنت ہم چنیں استوار و مستقیم باشد۔ و در ارشاد طالبان شان عظیم و نفس قوی دارد۔ دریں جزو زماں مثل ایشاں در بلاد مذکور یافتہ نمیشود۔ مگر در گذشتگان بلکہ ہر در جزو زمان وجود ایں چنیں عزیزان کمتر بودہ است چہ جائے ایں زماں کہ پر فتنہ و فساد است۔"[3]

اسکے علاوہ مقامات مظہری میں شاہ ولی اللہ کا ارشاد نقل کیا گیا ہے۔

"مجھکو اللہ نے ایسا صحیح کشف عنایت کیا ہے کہ روئے زمین کی حالت مجھ سے پوشیدہ نہیں ہے، سب کچھ ہاتھ کی لکیروں کی طرح مجھ پر عیاں ہے۔ اس وقت حضرت میرزا جانجاناں کا مثل کسی ملک اور کسی شہر میں نہیں ہے جسکو مقامات کے سلوک کی آرزو ہو انکی خدمت میں حاضر ہو،

---

[1] الیانع الجنی، صفحہ ۱۳۵۔

[2] مقدمہ القول الجلی، صفحہ ۳۹۔

[3] رود کوثر، صفحہ ۴۲۴

یہ لکھ کر شاہ غلام علی نے لکھا ہے ''آپکے فرمانے کے بموجب حضرت شاہ ولی اللہ کے اصحاب استفادہ کیلئے مرزا صاحب کے پاس آئے''۔[۱]

شاہ ولی اللہ خطوط میں آپکو ان القاب سے یاد کرتے تھے

'متع الله المسلمين بافادات قيم الطريقة الاحمدية وروى رياض الطريقة بتوجهات نفسه الزكيه آمين''[۲]

بوقت وفات شاہ صاحب، مرزا صاحب آپکے بالیں پر موجود تھے۔ القول الجلی میں شاہ محمد عاشق رقمطراز ہیں:

''جب محرم الحرام ۱۱۷۶ھ کی آخری تاریخ ہوئی اور عمر شریف (شاہ ولی اللہ) کا باسٹھواں سال شروع ہوا سنیچر کے روز صبح کے وقت حضرت مرزا جانجاناں جو سلسلۂ نقشبندیہ احمدیہ کے مشہور مشائخ میں سے ہیں مع اپنے احباب کے عیادت کو آئے۔ انکی آمد پر تخلیہ کرایا گیا اور بجز چند مخصوصین کے جنکا طفیلی یہ غلام بھی تھا اور کوئی نہ تھا۔ حلقۂ مراقبہ ہوا اور تقریباً آدھا گھنٹہ صحبت گرم رہی۔ جب مجلس مراقبہ ختم ہوئی اور مرزا صاحب نے رخصت چاہی اسی وقت مزاج شریف متغیر ہوا اور آناً فاناً آثار وصال ظاہر ہوئے اور اسی روز وقت ظہر طائر روح پاک نے عالم قدس کی طرف طیران فرمایا اور رفیق اعلیٰ سے واصل ہوگیا''[۳]

اگرچہ آپ شاہ ولی اللہ سے عمر میں صرف تین سال بڑے تھے مگر شاہ صاحب سے زیادہ عمر پائی اور شاہ صاحب کی وفات کے بعد مزید انیس سال زندہ رہے اور شاہ صاحب کے صاحبزادہ شاہ عبدالعزیز کا زمانہ بھی دیکھا۔ ۷ محرم الحرام ۱۱۹۵ھ مطابق ۱۷۸۰ء ایک شیعہ نے تعصب کی راہ سے آپکے سینے پر طمنچہ چلا دیا جسکے زخم سے آپنے ۱۰ محرم الحرام کو وفات پائی۔ ''عاشق حمیداً مات شہیداً'' سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔[۴]

۴۔ سید مرتضیٰ بلگرامی زبیدی:

سید مرتضیٰ بلگرامی کو شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے معاصر سے زیادہ آپ کے درس حدیث سے فائدہ اٹھا کر

۱۔ مقدمہ القول الجلی صفحہ ۳۸-۳۹

۲۔ مقدمہ القول الجلی، صفحہ ۳۸-۳۹۔

۳۔ القول الجلی، صفحہ ۳۴۳۔

۴۔ تذکرہ علمائے ہند، صفحہ ۴۹۶؛ حدائق الحنفیہ، صفحہ ۴۵۳۔

بیرون ہند (زبید: یمن) اس تحریک کو پھیلانے والے کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے۔ ہندی نژاد اور ولی اللہ محدث کے شاگرد ہونے کی نسبت سے ان حضرات کے ضمن میں جو آپ کے معاصر تھے اور جنکو آپ نے اپنی شخصیت و تعلیم سے متاثر کیا تھا سید مرتضیٰ بلگرامی کا تذکرہ بے موقع نہ ہوگا۔

سید محمد مرتضیٰ بلگرامی بلگرام کے سے مردم خیز قصبہ میں ۱۱۴۵ھ میں پیدا ہوئے۔ آپکی کنیت ابوالفیض ہے آپ کا نسبی تعلق واسطی سادات سے تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اپنے قیام حجاز سے متمتع اور تربیت یافتہ ہو کر ہندوستان واپس آ چکے تھے اور مدسہ رحیمیہ میں درس و تدریس کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف اور رشد و ہدایت کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ اس لحاظ سے سید مرتضیٰ شاہ صاحب سے ۳۰۔۳۱ سال چھوٹے تھے۔ پیدائش کے بعد چودہ سال تک آپ ہندوستان میں مقیم رہے اور اس عرصہ میں آپ نے ابتدائی تعلیم بلگرام میں حاصل کی جہاں ہر فن کے اساتذہ میسر تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کرنے کے بعد الہ آباد گئے اور شیخ محمد فاخر الہ آبادی سے فیض تربیت حاصل کیا۔ وہیں انھوں نے مدرسہ رحیمیہ اور شاہ ولی اللہ کی علمی شہرت سن کر دہلی کا قصد کیا اور دہلی آ کر شاہ صاحب کے شاگردوں میں داخل ہو گئے اور تقریباً ایک سال تک ان کی صحبت اور درس و تدریس سے مستفید ہوتے رہے۔

سید سلیمان ندوی نے اپنے مقالہ میں سید مرتضیٰ زبیدی کے دہلی جانے کا حال لکھا ہے:

> ''الہ آباد کے بعد وہ دہلی پہونچے۔ دلی اس زمانہ میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی دلی تھی۔ حکیم الھند کے درس میں تحقیق و تدقیق کا دریا موجیں مار رہا تھا۔ سید مرتضیٰ زانوئے تلمذ تہ کر کے بیٹھ گئے۔ اپنی ایک یادداشت میں نہایت جوش و مسرت کے ساتھ شاہ ولی اللہؒ کی خدمت میں حاضر ہونے کا ذکر کیا ہے۔ صحیح طور پر اگرچہ معلوم نہیں ہے کہ دلی کے علمی حلقہ میں سید علامہ کب تک رہے تاہم انکی تالیفات میں جو تحقیق و جامعیت کا رنگ پایا جاتا ہے اسمیں ''ولی اللہی'' مذاق کا بہت دخل ہے'' [1]

نواب صدیق حسن خان اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:

> ''علامہ مرتضیٰ زبیدی نے اپنی ڈائری میں تقریباً تین سو مشائخ کا ذکر کیا ہے جن سے انھوں نے علم حاصل کیا۔ انمیں ہندوستان کے علماء و مشائخ میں یگانہ روزگار فاضل محدث شیخ ولی اللہ دہلوی

---

[1] رسالہ معارف، فروری، ۱۹۲۷ء نمبر ۲، جلد ۱۹

مولف 'حجۃ اللہ البالغہ' بھی ہیں۔ علامہ مرتضیٰ خود کہتے ہیں، 'میں دہلی میں شیخ ولی اللہ دہلویؒ کے گھر حاضر ہوا۔''[۱]

ایک سال کی مدت اگر چہ علمی میدان میں کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتی۔ مگر جہاں شاہ ولی اللہ دہلویؒ جیسا استاد اور علم کی پیاس رکھنے والا سید مرتضیٰ جیسا شاگرد ہو وہاں کسی خاص مدت کی قید نہیں کیونکہ اصل بات علمی ذوق اور لگن پیدا کرنا ہے اور اچھے استاد کی صحبت میں لائق شاگرد کے لئے یہ لگن تھوڑے عرصہ میں بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ایک سال کے مختصر عرصہ میں سید مرتضیٰ ولی اللہی حلقۂ اثر سے پوری طرح متاثر و متمتع ہوئے۔ اسکے بعد انھوں نے اس نوعمری میں ہی قصد حج کیا اور مکہ معظّمہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ عرب جانے کے بعد ہندوستان واپس نہیں آئے بلکہ حجاز سے یمن کا رخ کیا اور یمن کے تعلیمی مرکز زبید میں مقیم ہو گئے اور وہاں اتنے عرصہ مقیم رہے کہ بلاد عرب اور مصر میں کسی کو احساس بھی نہیں رہا کہ آپ یمنی نہیں بلکہ ہندوستانی ہیں۔ چنانچہ زبیدی آپ کے نام کا ایک جزو بن گیا اور علامہ مرتضیٰ زبیدی کے نام سے مشہور ہو گئے۔ زبیدی نے مختلف اساتذہ اور بزرگوں سے اس تعلیم کی تکمیل کی جسکی بنیاد مدرسہ رحیمیہ میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ڈالی تھی سید مرتضیٰ بلگرامی کا فطری میلان زیادہ تر حدیث و ادب کی طرف تھا۔ دہلوی خاندان اگر چہ حدیث و قرآن کا علم بردار تھا تاہم ملک کا عام علمی ماحول معقولی تھا جس سے غالباً سید مرتضیٰ کچھ خوش نہ تھے۔ جب عرب پہونچے تو وہاں انکو اپنے مذاق کی چیزیں نظر آئیں۔ حدیث، ادب، تفسیر کے ماہرین عرب خصوصاً یمن میں درس دے رہے تھے چنانچہ آپ وہیں قدم جما کر بیٹھ گئے۔[۲]

قیام عرب کے دوران انکی ملاقات سید عبدالرحمان بن مصطفیٰ عیدروسی سے ہوئی جنہوں نے سید مرتضیٰ کو سلسلہ عیدروسیہ میں داخل کر لیا اور آپنے روحانی منازل سلوک طے کرنے شروع کر دئے۔ مرشد کے زیر ہدایت انہوں نے مصر کا رخ کیا اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے۔ وہیں ۱۲۰۵ھ میں طاعون کے مرض میں آپ کی وفات ہو گئی۔[۳]

علامہ مرتضیٰ زبیدی نے ضخیم و مختصر متعدد کتابیں اور رسائل تصنیف کئے۔ رخسانہ نکہت لاری نے متعدد حوالوں سے جنمیں بروکلمان کی تاج العروس اور عبدالشکور کی فہرس الفہارس نیز نزھۃ الخواطر، ابجد العلوم وغیرہ

---

۱ ابجد العلوم، صفحہ ۷۱۳-۷۲۲۔

۲ مرتضیٰ زبیدی حیات اور علمی کارنامے، مصنفہ، ڈاکٹر رخسانہ نکہت لاری، صفحہ ۱۲۷-۱۲۸، ۱۸۵-۲۰۴، ۳۵۱-۳۵۴، لکھنؤ

۳ رود کوثر، صفحہ ۴۱۲-۴۱۵

شامل ہیں، آپکی تصنیفات کی ایک فہرست مرتب کی ہے جو ۱۵۹ تصنیفات پر مشتمل ہے۔[۱] یہ تصانیف جداگانہ علوم وفنون میں ہیں۔ ہر ایک اپنی جگہ بے نظیر ہے لیکن ان میں سے دو کتابیں ایسی قابل ذکر ہیں جنہوں نے علامہ مرتضیٰ کو دیار عرب ومصر بلکہ تمام دنیا میں مشہور کر دیا۔ انمیں ایک تاج العروس شرح قاموس المحیط للفیروز آبادی اور دوسری اتحاف السادة المتقین شرح احیاء علوم الدین لا مام غزالی ہے۔

مجد الدین محمد یعقوب ابو طاہر فیروز آبادی نے نویں صدی ہجری میں قاموس المحیط کے نام سے ایک لغت لکھی تھی۔ یہ قاموس فن لغت میں گویا ایک متن متین ہے۔ کیونکہ فیروز آبادی نے نہایت مختصر الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنی کو سمیٹنے کی کوشش کی۔ سید علامہ کی نظر سب سے پہلے اسی پر پڑی اور پورے چودہ سال میں آپنے اس جامع کتاب کی ایک ضخیم شرح نو جلدوں میں لکھی۔ ہر جلد میں پانچ سو صفحات سے کم نہیں۔ بقول علی طنطاوی:

''قاموس کے شارح زبیدی ایسے شخص تھے جو علمائے نادرۂ روزگار میں سے ہیں۔ انکا اعزاز اس درجہ کا تھا کہ وہ اپنے زمانہ میں اس ربع مسکون کے مشہور علماء میں سے تھے''[۲]

نواب صدیق حسن خاں لکھتے ہیں:

''وقد طبع کتابه تاج العروس شرح القاموس....وهو شاع فی الا مصار و بلغ الیٰ الاقطار.... و کونه امام فیه و شرحه هذا یغنی عن عمل جمله الدفاتر المؤلفة فی فن اللغة''[۳]

علامہ عبدالحی الحسینی نے نزہۃ الخواطر میں لکھا ہے:

''اتمه (یعنی التاج) فی اربعة عشر عاماً وشهرین[۴]

مصر میں جب اس کتاب کی شہرت ہوئی تو عوام تو عوام خواص بھی اس نادر روزگار تصنیف کو دیکھنے کے لیے بے چین ہو گئے۔ قسطنطنیہ سے فرمان خلافت آیا کہ اسکا ایک نسخہ سلطانی کتب خانہ میں فوراً بھیجا جائے۔ مراکش کے سلطان نے ایک نسخہ طلب کیا۔ دیگر امراء نے بھی نسخہ جات اپنے لیے لکھوائے جسمیں ہزاروں ریال صرف کئے۔

۱۔ مرتضیٰ زبیدی حیات اور علمی کارنامے، مصنفہ، ڈاکٹر رخسانہ نکہت لاری، صفحہ ۱۲۷-۱۲۸، ۱۸۵-۲۰۴، ۳۵۱-۳۵۴، لکھنؤ

۲۔ رخسانہ لاری، صفحہ ۱۴۶۔

۳۔ ابجد العلوم، صفحہ ۷۲۱

۴۔ نزہۃ الخواطر، صفحہ ۴۷۱۔

تاج العروس کے بعد دوسری کتاب امام غزالی کی مشہور زمانہ کتاب احیاء العلوم کی شرح ہے جسکو آپ 'اتحاف السادۃ المتقین' کے نام سے تصنیف کیا۔ یہ شرح بھی بڑی تقطیع کی دس جلدوں پر مشتمل ہے۔ علامہ مصنف نے اس تصنیف کے لیے تین اسباب کا ذکر کتاب ہی کے جز واول میں کیا ہے

"اعلم ان الباعث لی علیٰ الاقد ام فی شرح ھٰذا الکتاب امور ثلاثۃ"[1]

پھر ان امور ثلاثہ کو واضح کرتے ہوئے آپنے پہلا سبب تذکرہ صالحین واولی الخیر بتایا ہے۔ دوسرا سبب تالیف نفع رسانی عوام الناس ہے اور تیسرا سبب خود اپنے نفس کو ان صالح امور پر چلنے اور ان اخلاق سیئہ سے رک جانے کے لیے آمادہ کرنا ہے جنکا ذکر کتاب میں کیا گیا ہے۔

اس کتاب کے ذریعہ زبیدیؒ نے امام غزالی کے افکار کو از سر نو مقبول عام کرنے میں بڑی مدد دی اور مصر اور بلاد عرب میں اصل کتاب کو نئے سرے سے مقبولیت حاصل ہوگئی۔ خلیفۃ المسلمین سلطان عبدالحمید اول اور صدر اعظم ترکی راغب پاشا نے آپکی کاوشوں کو سراہا اور آپکو قسطنطنیہ واستنبول آنے کی دعوت دی جو آپنے منظور تو کر لی مگر وہاں جا نہ سکے علامہ زبیدی کو اپنی تصنیفات کیوجہ سے شہرت وعزت ہی نہیں مال ومنال بھی ملا اور عوام، خواص، امراء، وزراء اور عمائدین وسلاطین نے آپکو بیش قیمت تحائف اور نذرانے دیئے اور معاشی حیثیت سے سید علامہ کی حالت بہت اچھی ہوگئی۔[2]

تصانیف کے علاوہ زبیدی نے درس حدیث کا شغل بھی اختیار کیا۔ اور علمائے سلف کی تدریس کا طریقہ یعنی استاد کے متن وسند کے ساتھ حدیث کو زبانی سنانے اور اسکو بیان کر کے مختلف اعتبارات سے اس پر بحث کرنے کو دوبارہ رائج کیا۔ انکا انداز تقریری اور واعظانہ ہوتا اور طلباء انکے وعظ کو قلمبند کرتے جاتے۔ اس طرح یہ درس متعدد جلدوں میں کتابی شکل میں مرتب ہو جاتے۔ یہ درس اتنے توضیحی اور تفصیلی ہوتے تھے کہ اس کی مثال خود علامہ اپنے ایک خط میں دیتے ہیں:

"ام زرع کی مشہور حدیث (جسکا متن بیس بائیس سطر سے زیادہ نہیں) پر میں نے سات اجزاء میں املا کرایا۔ اس حدیث کی شرح چودہ مجلسوں میں ختم ہوئی"[3]

سید مرتضیٰ کے علمی کمالات بیرون ہند اور اطراف عرب ومصر میں ظاہر ہوئے اس لئے ہندوستان کے لوگ

---

[1] اتحاف السادۃ المتقین، شرح اسرار احیاء العلوم الدین مصنفہ سید مرتضیٰ زبیدی جز واول، صفحہ ۴، (مقدمہ) مصر ۱۳۰۶ھ

[2] رود کوثر، صفحہ ۶۱۴

[3] لاری صفحہ ۱۵۷

آپکے علمی پایہ سے خاطر خواہ واقف نہیں۔ آپ ایک لحاظ سے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے شاگرد اور دوسرے لحاظ سے معاصر تھے کہ آپکی تالیفات بھی تقریباً اسی دور میں معرض وجود میں آئیں جب شاہ صاحب ہندوستان میں اپنی تصنیفات کے ذریعہ اپنا مقام حاصل کر رہے تھے۔ شاہ صاحب کے انتقال کے بعد بھی تقریباً ربع صدی تک علامہ زبیدی اپنے کام میں مصروف رہے۔ لیکن ہر دو اصحاب علم وفن کے کمال میں تین بنیادی فرق ہیں جو مختصراً ماحول، مقصد اور موضوع کے نام سے بیان کیے جاسکتے ہیں۔

۱۔ ماحول:

دونوں اصحاب کو ہندوستانی ہونے کے باوجود عربی زبان پر اہل زبان کی طرح قدرت حاصل تھی مگر یہ قدرت علامہ زبیدی نے اپنی اوائل عمر یعنی ۱۴ سال کے بعد تا عمر عرب، یمن اور مصر میں رہ کر حاصل کی جو دیار عرب ہونے کے لحاظ سے عربی زبان وادب کا منبع وگہوارہ تھا جبکہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی عرب اور علمائے عرب سے ملاقات اور تعامل صرف انہیں دو پونے دو سال کا تھا جبکہ وہ ۱۱۴۳ھ سے آخر ۱۱۴۵ھ تک حجاز میں رہے اور مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ کے اساتذہ سے علم حاصل کیا اور سندیں لیں۔ زبیدی کو جو ماحول میسر تھا اس میں عربی داں ہونا اور علوم وفنون عربیہ پر مہارت حاصل کرنا کوئی تعجب خیز بات نہیں۔ لیکن ہندوستان جیسے ملک میں جہاں کی مادری تو کیا سرکاری وعلمی زبان بھی عربی نہیں تھی اور جہاں فارسی کو دربار شاہی کی سرپرستی اور مقامی زبانوں کو عوامی تعاون حاصل تھا اور جہاں عربی صرف دینی اور قرآنی زبان سمجھی جاتی اور اسی انداز سے سیکھی اور سکھائی جاتی تھی کہ طلباء قرآن مجید اور علوم دینیہ سے واقف ہو جائیں۔ ایسی جگہ اور ایسے ماحول میں حجۃ اللہ البالغہ جیسی بلند پایہ کتاب کا تصنیف کرنا بذات خود ایک معجزہ سے کم نہیں۔ اور شاہ صاحب نے تو عربی میں متعدد تصانیف نظم ونثر میں لکھ کر اپنی عربی دانی کا لوہا منوالیا۔ سید مرتضیٰ بلگرامی کو ہندوستان کا علمی ماحول پسند نہ تھا جسکی بناء پر انھوں نے عرب کی راہ لی اور وہاں رہ کر اپنی راہ متعین کی جس کی وجہ سے وہ بلگرامی کے بجائے زبیدی بن گئے۔ شاہ صاحب عرب جا کر باوجودیکہ وہاں کا ماحول انکے علمی وروحانی مذاق کے مطابق تھا جان بوجھ کر ہندوستان واپس لوٹ آئے اور آخر وقت تک دہلوی ہی رہے کیونکہ انکا مقصد صرف تصنیف وتالیف ہی نہیں بلکہ کچھ اور تھا۔

۲۔ مقصد:

اگر ہم علامہ زبیدی کے حالات اور انکی تصنیفات پر نظر ڈالیں تو اس نتیجہ پر پہونچیں گے کہ انکو ہندوستان

میں یہاں کے ماحول کیوجہ سے قیام میں دلچسپی نہیں تھی اور نہ انکی نظر میں یہاں قیام کا کوئی واضح مقصد تھا۔ بنیادی طور پر انکو علم کی پیاس تھی اسکو بجھانا اور اس کے بعد دریائے علم وادب سے ناظرین کو سیراب کرنا ہی انکا اصل مقصد تھا جو بدرجۂ اولیٰ انکو بیرون ہند خصوصاً عرب ماحول میں حاصل ہوگیا اور اسی لیے وہ ترک وطن کر کے وہیں بس گئے۔ اور وہاں رہ کر اپنے قلم کے جوہر دکھائے جس کی وجہ سے وہ اطراف واکناف میں مشہور ہو گئے۔ اور غالباً اپنے مقصد میں کامیاب بھی!

لیکن شاہ صاحبؒ کے سلسلہ میں جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کی بے چین فطرت اور مقصدیت ہی انکو کشاں کشاں عرب لے گئی اور پھر کھینچ کر واپس ہندوستان لے آئی۔ وہ مقصد کیا تھا اسکا ذکر انکے تذکرہ نگاروں اور خود انکی اپنی تصنیف 'الجزء اللطیف' سے آسانی سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔ حیات ولی میں رحیم بخش صاحب شاہ صاحبؒ کے سفر کے مقصد کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں:

''طبیعت مبارک میں وہی کرید چلی آتی تھی جو آغاز عمر میں تھی یعنی جہاں تک ہو سکے علم نبویؐ کی تحصیل وتکمیل میں ترقی کرنا چاہیے۔ غور کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ شاہد مقصود بجز عرب کے کسی سر زمین سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ پس اب مجھے عرب میں چلنا اور وہاں کے مشائخ سے روایت کرنا چاہیے۔ اس کے ساتھ آپ کو حرمین شریفین کی زیارت کا شوق دامن گیر ہوا۔ آپ کے اس سفر مبارک کی اصل غرض یہی تھی جو ہمنے بیان کی۔'' [۱]

مولانا ابوالحسن علی ندوی تاریخ دعوت میں اس طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وہ قرآن کے اشارۂ بلیغ 'لیشھد و امنافع لھم' (الحج۔آیۃ ۲۸) پر عمل کر کے عالم اسلام کے اس قلب مرکز اور دنیا کے گوشہ گوشہ سے آئے ہوئے وفود، اسلام وضیوف الرحمٰن کے علوم و معارف، عقول واذہان اور تجربات ومساعی سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ [۲]

آپ مزید لکھتے ہیں:

''حجاز کے اسی طویل قیام میں جو ایک سال سے زائد رہا انکے ملکات ذہنی وعلمی نے ارتقاء کے وہ منازل طے کئے جو بظاہر ہندوستان میں ممکن نہ تھے اور اسکے لیے حرمین شریفین ہی جیسی مرکزی و

---

[۱] حیات ولی، صفحہ ۲۳۱۔

[۲] تاریخ دعوت وعزیمت، صفحہ ۱۰۷-۱۰۸

عالمی جگہ درکار تھی'' [۱]

خود شاہ صاحب اپنے مقصد سفر حجاز کے بارے میں اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں:

''اس بارہ سال کے عرصہ کے بعد میرے سر میں حرمین شریفین کی زیارت کا سودا سمایا۔ ۱۱۴۳ھ کے اواخر میں حج کی سعادت سے مشرف ہوا اور ۱۱۴۴ھ میں مجاورت مکہ معظمہ، زیارت مدینہ منورہ، شیخ ابوطاہر قدس سرہ اور دوسرے مشائخ حرمین سے روایت حدیث کا شرف حاصل ہوا۔ علمائے حرمین اور دیگر لوگوں کے ساتھ دلچسپ صحبتیں رہیں اور شیخ ابوطاہر سے خرقۂ جامعہ حاصل کیا'' [۲]

شاہ صاحب کے فن حدیث سے خصوصی ربط اور حرمین میں اسکے حصول و ترویج و تعلیم کے آسان مواقع کے علاوہ ہندوستان کے غیر یقینی حالات اور پر آشوب ماحول کے باوجود شاہ صاحب نے مستقل ہجرت اور قیام عرب کا ارادہ کرنے کے بجائے ہندوستان واپسی کا فیصلہ کیا جسکا مقصد وہ تھا جسکے اشارے آپکو مبشرات اور خواب کے ذریعہ عرب میں مل چکے تھے اور وہ بشارت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم جسکا تحقق آپ کو مدینہ طیبہ میں حاصل ہوا جس میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اشارہ ہوا:

''ان مرادک الحق فیک ان یجمع شملا من شمل الامة المرحومة بک'' [۳]

چنانچہ شاہ صاحب کا رجحان و مقصد ہندوستان ہی کو اپنی سرگرمیوں اور علمی و دینی خدمات کا مرکز بنانا تھا اور اسی مقصد کے تحت وہ ہندوستان واپس آ گئے اور واپس آ کر وہ کارنامے انجام دیئے جو انکی تجدیدی اور اجتہادی سرگرمیوں کا براہ راست نتیجہ تھے۔ انہیں کارناموں کی بناء پر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ سے حکیم الامت اور ذکی کے خطابات سے نوازا گیا۔ اسکے علاوہ انھوں نے اپنی اور تعلیم حدیث و علوم دینی کے ذریعہ آپنے شاگردوں اور پیروؤں کا وہ حلقہ علمی پیدا کر دیا (جسمیں انکے لائق و فائق صاحبزادگان بھی شامل تھے) جنہوں نے رہتی دنیا تک انکا نام روشن کر دیا۔

یہ ایک بنیادی فرق تھا جو علامہ زبیدی اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے مقاصد کے درمیان نہایت واضح طریقہ پر نظر آتا ہے۔

---

[۱] تاریخ دعوت و عزیمت، صفحہ ۱۰۷-۱۰۸

[۲] انفاس العارفین، صفحہ ۴۰۶۔

[۳] الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین، صفحہ ۳۱۔

۳۔ موضوع:

علامہ زبیدی عربی زبان کے ایک کثیر التصانیف مصنف تھے اور آپکی تصانیف کی تعداد ڈیڑھ سو تک پہنچ گئی تھی۔ ان کتابوں میں حدیث، تفسیر، لغت، تصوف، فقہ وغیرہ مختلف موضوعات شامل ہیں۔ لیکن انکی دو تصنیفات تاج العروس اور اتحاف السادۃ المتقین دراصل شروح ہیں۔ کتب احادیث میں بھی زیادہ تر احادیث کی تفسیر یا انکی شرح ہیں اور کئی کتب لغت کے بارے میں ہیں۔ یہ فن (شرح کتب) فن تالیف سے نسبتاً آسان ہے جیسا کہ خود مصنف نے اتحاد السادۃ المتقین کے جزو اول میں فرمایا ہے:

"ولا یخفیٰ علیک ان التعقب علی الکتب سیما الطویلة سهل بالنسبة الیٰ تالیفها ووضعها وترصیفها"[۱]

کیونکہ عربی زبان زبیدی کیلئے مثل مادری زبان کے ہوگئی تھی اس لئے یہ شروح انکے لیے اور بھی آسان ہو گئی تھیں۔ اسکے برخلاف شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی اکثر تصنیفات موضوع کے لحاظ سے بالکل طبع زاد (original) ہیں یعنی کسی دیگر مصنف کی تصنیف کی شرح کے بطور نہیں۔ ایسی بلند معیار تصنیفات ایسی زبان میں تحریر کرنا جو نہ صرف یہ کہ مؤلف کی مادری زبان نہ ہو بلکہ جسکا موضوع بھی بالکل اچھوتا ہو اور سنجیدہ بھی ہو مصنف کی وسعت مطالعہ کے ساتھ ہی اسکے عاطفہ، تخیل، اظہار بیان کی قوت، عمیق و وسیع تفکر و تدبر اور تحقیق و تدقیق کی باریک بینی کی نشاندہی کرتی ہیں۔ اسکے علاوہ شاہ صاحب کو عربی کے ساتھ ساتھ فارسی پر بھی اتنی ہی قدرت حاصل تھی اور انکی فارسی تصنیفات کا مثل ملنا دشوار ہے۔

علامہ زبیدی اور شاہ صاحب کے منتخب کردہ موضوعات میں یہی بنیادی اختلاف ہے کہ اول الذکر کی زیادہ تر تالیفات تعقیبات ہیں اور ثانی الذکر کی طبع زاد اور دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ زبیدی کے فن کا میدان الگ تھا اور وہ اپنے فن میں کامل تھے اور اسمیں انکا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔

شاہ ولی اللہ اور زبیدی ہم عصر ہوتے ہوئے اپنے اپنے فن میں ماہر تھے۔ ادبی لحاظ سے اگرچہ دونوں کا مرتبہ بہت بلند ہے مگر شاہ ولی اللہ کا میدان عمل اور ہے اور زبیدی کا اور۔ اس لحاظ سے دونوں الگ الگ اہمیتوں کے حامل ہیں۔

---

[۱] اتحاف السادۃ المتقین، جلد اول (مقدمہ) صفحہ ۳

اختتامیہ

اختتامیہ

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے حالات، تصانیف، آپکی تحریروں کے ادبی پہلو اور آپکے ادبی مقام کا تفصیلی جائزہ لینے، آپکے چند معاصرین اور انکی ادبی خدمات کے تذکرہ اور شاہ صاحب کے بارے میں مشہور فضلاء اور اصحاب قلم کی آراء کا حوالہ دینے کے بعد اب وہ مقام آ گیا ہے جہاں اس مقالہ کا اختتام ہوتا ہے۔ اس سے قبل بطور اختتامیہ چند کلمات میں ان امور کی جانب اشارہ کرنا ضروری ہے جو بطور نتیجہ کے اس تمام مبحث سے اخذ کئے جا سکتے ہیں اور جن سے بارھویں صدی میں ہندوستان کے عربی ادب کے ذخیرہ میں آپکا تعاون اور حصہ متعین کیا جا سکتا ہے۔

شاہ صاحب کے دور میں جو عربی ادب ہندوستان کے مختلف مصنفین کی تصنیفات میں پایا جاتا ہے وہ موضوع کے لحاظ سے یا تو مذہبی ہے یا تشریحی۔ مذہبی ادب میں بھی زیادہ تر کتب احادیث کی شرح مثلاً آزاد بلگرامی کی ضوء الدراری شرح بخاری، فقہ خصوصاً فقہ حنفی کی احادیث کی روشنی میں توجیہ، مرتضیٰ زبیدی کی **الجواهر المنيفة فی ادلة مذهب الامام ابی حنيفه** یا تصوف کے مسائل کے بارے میں مکتوبات کی شکل میں چند تصنیفات ملتی ہیں۔ اسکے علاوہ تذکرہ علمائے حاضر و ماسبق انکے حالات اور تصنیفات کے جائزہ کی شکل میں بھی عربی زبان میں کتابیں ملتی ہیں۔ نیز دیگر متعلقہ موضوعات پر بھی خال خال کوئی کتاب نظر آتی ہے۔ منظوم ادب میں شاہ صاحب کے دور میں شعراء نے نعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہزاروں اشعار کہے جنکی ہندوستان کے علاوہ بیرون ہند بھی تعریف ہوئی ہے۔ مثلاً غلام علی آزاد بلگرامی کو علمائے مکہ نے 'حسان الہند' کا خطاب دیا۔

اس لحاظ سے شاہ صاحب کی تصانیف بھی ان سے مختلف نہیں۔ آپ بھی ان ہی موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں لیکن نقطہ نظر کے اعتبار سے آپکی تصانیف دیگر اصحاب قلم کی تصنیفات سے بالکل مختلف اور ممتاز نظر آتی ہیں۔ آپنے جس انداز سے ان موضوعات کی تشریح کی ہے وہ یقیناً ادب میں ایک گرانقدر اضافہ ہے۔ آپنے جس موضوع کا انتخاب کیا خواہ وہ قرآن وحدیث ہو، تاریخ فقہ ہو، تطبیق مذاہب ہو یا باطنی علوم آپنے ایک نئے انداز میں اس پر اظہار خیال کیا ہے جو بالکل اچھوتا ہے۔

حجۃ اللہ البالغۃ میں آپ نے اسرار شریعت کا جو موضوع منتخب کیا اس پر اس انداز میں آپ سے پہلے کسی نے بھی اظہار خیال نہیں کیا اور نہ اس نظر سے دیکھا۔ اسی طرح الخیر الکثیر میں جو انداز اسی موضوع کو بیان کرنے

کے لئے منتخب کیا گیا وہ آپکی علمیت کا دوسرا پہلو ہے۔ یہی حال آپکی دوسری کتب مکتوبات اور مضامین کا ہے کہ جس موضوع کو اختیار کیا اسکو ایک اچھوتے انداز سے بیان کیا یہی کیفیت آپکی شاعری کی بھی ہے آپنے اپنے منظوم ادب میں جو نعتیہ قصائد یا دیگر متفرق اشعار کہے انکی بھی ادبی پہلو سے اور موضوع کے لحاظ سے ایک منفرد حیثیت ہے۔

موضوع کے لحاظ سے آپکی تصنیفات کی ایک اور خصوصیت ہے۔ آپنے دین کے ہر پہلو، حدیث، فقہ، احکامات، مسائل وغیرہ میں علمائے سابقین فضلائے کرام کی آراء میں تطبیق کی حتیٰ الوسع کوشش کی ہے اور قران و احادیث صحیحہ کی روشنی میں مذہب کے مختلف فرقوں اور گروہوں میں یکجہتی پیدا کرنے کی مجددانہ روش اختیار کی جسکے لئے آپ کو یہ بشارت مل چکی تھی:

ان مرادالحق فیک ان یجمع شملاً من شمل الامة المرحومة بک

ان تمام موضوعات اور نکتہ ہائے نظر کو بیان کرنے کے سلسلہ میں آپ نے اپنی تحریروں میں کسی جگہ بھی ادبی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا آپکی تحریر کا اسلوب بیان اور لسانی محاسن کلام اس طرح اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں جس میں آپکا کوئی مد مقابل نظر نہیں آتا۔ ہندوستان میں بارھویں صدی میں تحریر کردہ عربی ادب میں یہی آپکا حصہ وتعاون ہے جسکے مطالعہ کے بغیر اس دور کے عربی ادب میں ایک خلا باقی رہ جاتا ہے۔ ہندوستانی عربی ادب کی تاریخ کا کوئی طالب علم تاریخ ادب کا تذکرہ کرتے ہوئے اس حقیقت کو فراموش نہیں کرسکتا اور نہ ہی شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے تصنیف کردہ ادب سے صرف نظر کرسکتا ہے۔

شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ کے علوم خاصّہ سے تربیت یافتہ آپکے شاگرد شرف الدین محمد نے اپنی کتاب 'الوسیلہ الیٰ اللہ' میں آپکے علوم، فہم وفراست اور تصانیف کا دیگر اصحاب قلم کی تصانیف سے تقابل کرتے ہوئے نہایت دلچسپ انداز میں ایک مثال دی ہے جو عربی زبان میں شاہ صاحب کے مقام وحصہ کو متعین کرنے کے لئے کافی ہے۔'

"فمثل مصنفاته الشریفة بالنسبة الیٰ التصانیف السابقة فی العلوم مثل رجل ماهر باللغات با سرها اتیٰ جماعة وجد وادیناراً یطلب به کل واحدٍ بلغة العنب فوقع اللدغ والدفع بینهم بسبب اختلاف الفاظهم فاخذ هٰذاالرجل دینا راً من ایدیهم و اشتریٰ عنباً و اعطاهم فلماراٰوا ذٰلک شکروا له، ورضوا بینهم

وتعانقوا. ففهم "[1]

(پس آپ کی تصانیف شریفہ کی مثال بہ نسبت دیگر (سابقہ) علوم کی تصانیف کے ایسی ہے گویا کہ کوئی ماہر لسانیات جو تمام زبانوں کی لغات سے فطری طور پر واقف ہو وہ ایک ایسی جماعت کی طرف آئے جنہیں ایک دینار ملا ہو اور انمیں سے ہر ایک اپنی زبان میں اسکے بدلے انگور طلب کرے لیکن اختلاف زبان کی بناء پر لفظی نزاع پیدا ہو جائے اور سب آپس میں جھگڑنے لگیں۔ پس یہ (ماہر لسانیات) وہ دینار انکے ہاتھ سے لے لے اور اس سے انگور خرید کر انکو دیدے تو وہ اسے دیکھ کر اسکے مشکور ہوں اور آپس میں راضی ہو کر گلے مل جائیں۔ پس اسی مثال سے (آپکا مقام) سمجھ لو)

فجزاه الله خير الجزاء

و آخر دعوٰنا ان الحمد لله رب العالمين. والصلوٰة والسلام علىٰ نبيّه و رسوله محمد صلى الله عليه وسلم

---

[1] القول الجلی صفحہ ٦۴۳-٦۴۴

ضمیمه

ضمیمہ

ہندوستان میں بارھویں صدی ہجری کے علمی و مذہبی ادب میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا ایک اعلیٰ مقام ہے۔ آپ نے اپنے تیس سالہ دور تصنیف میں ہزاروں صفحات لکھے ہیں جن میں علم و ادب کے لحاظ سے بیش قیمت تصانیف شامل تھیں لیکن اہل ہند کی یہ بدنصیبی ہے کہ اس پرتشویش اور پرآشوب ماحول میں کسی نے بھی آپ کی تحریروں کی خاطر خواہ قدر نہیں کی۔ نتیجتاً آپ کی تالیفات کی کمیابی بلکہ نایابی اور ان میں تحریفات کا سلسلہ سقوط دہلی (۱۸۵۷ء) سے کافی پہلے ہی شروع ہوگیا اس نایابی کا یہ عالم ہے کہ تقریباً ۱۲ رسائل و کتب ایسے ہیں جن کے صرف نام ملتے ہیں اور بظاہر ان کا کوئی مخطوطہ بھی موجود نہیں۔ دو کتابیں 'المقدمۃ السنیہ فی انتصار الفرقۃ السنیۃ' اور 'مجموعۂ مکاتیب' (مرتبہ شاہ عبدالرحمٰن و شاہ عاشق پھلتی) ایسے ہیں جن کے ایک ایک مخطوطہ کا علم ہے [۱] (المقدمۃ السنیہ کو ڈاکٹر ابوالفضل محمد فاروقی نے ۱۴۰۴ھ / ۱۹۸۳ء میں ابوالخیر اکیڈمی دہلی سے شائع کیا [۲]) اس کے علاوہ چند غیر مطبوعہ کتابیں ایسی ہیں جو مخطوطات کی شکل میں کہیں نہ کہیں پائی جاتی ہیں۔ جن کتابوں کی طباعت ہوئی ہے ان میں بھی بعض کی اشاعت و فروخت کی کمی کی وجہ سے ناشرین کے پاس برسوں بعد بھی ان کے نسخہ جات غیر فروخت شدہ باقی رہ گئے اور اس کی وجہ سے دوسری یا تیسری طباعت کی نوبت ہی نہیں آئی۔ [۳] دوسری طرف مطبوعہ کتب کے مختلف پریسوں کی طباعت میں عبارت اور الفاظ میں فرق نظر آتا ہے۔ قصیدۂ تائیہ جو دیوان میں مندرج ہے (اور جس کا مخطوطہ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ہے) اس کے کئی اشعار میں تفہیمات الٰہیہ کی مطبوعہ کاپی کی تفہیم ۳۰ میں مندرج قصیدۂ تائیہ کے مقابلہ میں الفاظ میں اختلاف ہے۔ بی-این-جلبانی نے اپنی کتاب 'Teachings of Hazrat Shah Waliullah Muhaddis Dehlavi' میں صفحہ ۱۹۱ کے فٹ نوٹ میں حجۃ اللہ البالغۃ ج ۲ صفحہ ۱۹۷ کے حوالہ سے ایک عبارت تحریر کی ہے جس کا ماخذ نہیں لکھا لیکن وہ جملہ حجۃ اللہ البالغۃ (معہ اردو ترجمہ شموس اللہ البازغۃ) کے حمایت اسلام پریس لاہور کے ۱۸۶۹ء / ۱۲۸۶ھ کے مطبوعہ میں کہیں نہیں آتا اس کی جگہ جلد دوم میں 'الجہاد' کے عنوان کے تحت اس سے ملتی جلتی ایک دوسری عبارت صفحہ ۴۱۵ پر ملتی ہے۔ اسی طرح دیگر مطبوعات کا حال ہے۔ یہ ایک الگ تحقیق کا موضوع ہے کہ شاہ صاحب کی تصنیف کے مخطوطہ کے لحاظ سے کون سے الفاظ یا کون سی عبارت دراصل آپ کی تحریر کردہ اور درست ہے اور

۱۔ شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان صفحہ ۲۹

۲۔ مقدمہ القول الجلی (ترجمہ) صفحہ ۱۶

۳۔ شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان صفحہ ۳۵

طباعت میں یہ فرق کب اور کیونکر ہوا، ہمارے مقالہ سے اس کا تعلق صرف اس قدر ہے کہ آپ کی تحریروں کی ادبی خصوصیات پر کلام کرنے کے لیے جہاں تک ممکن ہو آپ کی اصل تصنیفات جن میں کم سے کم غلطیاں ہوں ان کا حوالہ دیا جائے۔ چنانچہ مطبوعہ تصانیف میں طباعت کے لحاظ سے آپ کے دور سے قریب تر (اور اس بنا پر اغلاط طباعت سے بعید تر) زیر مطالعہ ہوں۔ اور جہاں کسی تصنیف کا مخطوطہ میسر آئے اس سے استفادہ کیا جائے۔

خوش قسمتی سے شعبہ مخطوطات، مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں شاہ صاحب کی کئی اہم عربی اور فارسی تصنیفات کے مخطوطات حبیب گنج کلکشن، یونیورسٹی کلکشن اور دیگر مجموعات میں موجود ہیں۔ حیات وتصانیف شاہ ولی اللہ کے بنیادی مصادر کی حیثیت سے ان کی زبردست اہمیت کے پیش نظر ان مخطوطات کی فہرست اور خاکہ بطور ضمیمہ اس مقالہ کے آخر میں شامل کیا جارہا ہے۔ مطبوعات کے علاوہ ان مخطوطات سے بھی بیحد کارآمد معلومات حاصل ہوئی ہیں اور تحقیق میں بہت مدد ملی ہے۔

ضمیمہ کے پہلے حصہ میں وہ فہرست مخطوطات درج کی گئی ہے جو لائبریری کے کیٹلاگ میں ملتی ہے اور دوسرے حصہ میں مختصراً چند عربی مخطوطات کے بارے میں مفید معلومات فراہم کی گئی ہیں جو نہایت اہم اور قابل ذکر ہیں۔

فہرست مخطوطات (عربی)

سیکشن	نمبر شمار	نام کتاب بشکل مخطوطہ	زبان وموضوع	نمبر کیٹلاگ	تفصیل مخطوطہ
حبیب گنج کلکشن	۱	الارشاد الیٰ مهمات علم الاسناد	عربی شامل فارسی	۴۱/۹۲	
″	۲	الارشاد الیٰ مهمات علم الاسناد (ب ت)	عربیہ متعلقات حدیث	۱۳/۷۳	خط نستعلیق، ورق ۴، سطر مختلف۔ سائز ″۴ء۶ × ″۹ء۹ مجدول بہ شنگرف
″	۳	البدور البازغة	عربیہ الحکمۃ	۳۹/۶۳	خط نسخ خوب، ورق ۱۸۸، سطر ۱۵، سائز ″۶ء۸ × ″۳ء۱۳ فصل وبالجملۃ اعداد لفظیہ وغیرہ بخط شنجرف

″	۴	التفهيمات الالٰهية (ب ت)	عربیہ تصوف	۲۱/۶۷	خط نسخ و نستعلیق، اوراق ۴۶۲، سطر ۱۵ سائز ۸ء۱″ × ۸ء۱۲″ تفہیم وعبارات والفاظ مختلفہ و عنوانات واعداد لفظیہ بخط شنجرف
″	۵	التفهيمات الالٰهية	عربیہ تصوف	۲۱/۱۳	ناقص الطرفین، خط نسخ، ورق ۴۰، سطر ۳۰ سائز ۷ء۷″ × ۸ء۱۱″ التفہیم والعبارات والالفاظ المختلف بخط شنجرف
″	۶	الخير الكثير الملقب بخزائن الحكمة ۱۳۵۱ھ	عربیہ الحکمۃ	۳۹/۶۴	خط نسخ خوب، ورق ۹۸، سطر ۱۶، سائز ۶ء۲۸″ × ۴ء۱۳″ کاتب سید عبداللہ المدنی مقام کتابت حیدرآباد دکن، الخزانۃ ومابعدہ والالفاظ والعبارات المختلفۃ بخط شنجرف
یونیورسٹی کلکشن	۱	الاربعون :(ب ت)	عربیہ مذہب (۲) شامل فارسیہ مذہب	۱۳۳/۳۴۴	خط نستعلیق، ورق ۱، سطر ۲۰، سائز ۷″ × ۷ء۱۰″
″	۲	الانصاف فی بیان سبب الاختلاف (ب ت)	عربیہ مذہب (۳)	۸۶	خط نستعلیق، ورق ۱۷، سطر مختلف سائز ۷ء۶″ × ۱۰″۔ کاتب مولانا حکیم نور کریم دریابادی مرحوم
″	۳	التفهيمات الالٰهية	عربیہ مذہب		یونیورسٹی نمبر ۲
″	۴	التفهيمات الالٰهية	عربیہ مذہب		جزء منہا غیر مکمل یونیورسٹی نمبر ۳
″	۵	حسن العقيدة	عربیہ مذہب مشمولہ فارسیہ مذہب وتصوف	۱۵۰	یونیورسٹی نمبر ۲۷، ورق ۳، سطر ۱۸
″	۶	الدر الثمين فی مبشرات النبی الأمينؐ (ب ت)	عربیہ مذہب (۲) عربیہ حدیث شامل فارسیہ مذہب	۱۳۲/۳۴۴	۴۰ احادیث ورق ۴، سطر ۲۱، سائز ۷″ × ۷ء۱۰″
″	۷	الرسالة فی الكتب الأحاديث و الصحيح البخاری	عربیہ مذہب (۳) مشمولہ فارسیہ اخبار	۲۶/۲۹	ورق ۲، سطر ۱۸

″	۸	رسالۂ وحدۃ الوجود	عربیہ کلام		یونیورسٹی ضمیمہ نمبر ۸
″	۹	عقائد ولی اللہ	عربیہ عقائد		یونیورسٹی ضمیمہ نمبر ۳، ورق ۷، سطر ۱۷
″	۱۰	العقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید (ب ت)	عربیہ مذہب (۳)		یونیورسٹی نمبر ۸۶، ورق ۱۳ سطر مختلف سائز ۷″ × ۷″ء۱۰
″	۱۱	العقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید (ب ت)	عربیہ مذہب (۳) مشمولہ فارسیہ مذہب وتصوف	۱۵۰	یونیورسٹی نمبر ۲۵، ورق ۱۹ سطر ۱۸
″	۱۲	العقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید (ب ت)	عربیہ مذہب مشمولہ فارسیہ اخبار	۲۹	یونیورسٹی نمبر ۲۵
″	۱۳	الفتح الخبیر (۱۲۶۹ھ) رسالہ الفوز الکبیر (باب پنجم الفتح الخبیر)	عربیہ مذہب (۱) عربیہ تصوف شامل فارسیہ مذہب	۸۵ ۳۴۴	اصول تفسیر ورق ۲۳، سطر مختلف سائز ۷″ × ۷″ء۱۰
″	۱۴	القول الجمیل	عربیہ مذہب		یونیورسٹی نمبر ۱، اوراق ۱۵، شکستہ آمیز
″	۱۵	المقدمہ فی العلم الحدیث والصحیح البخاری	عربیہ مذہب مشمولہ فارسیہ مذہب و تصوف	۱۵۰	یونیورسٹی نمبر ۲۶
ذخیرہ فرنگی محل	۱	الاربعین	عربیہ حدیث	۲۸۱/۲۴۰	
″	۲	الدرّ الثمین	عربیہ حدیث		اوراق ۶
″	۳	النوادر من احادیث سید الاوائل والاواخر	عربیہ حدیث	۱۱۴/۷۳	اوراق ۱۴، سطر ۲۱
ضمیمہ سبحان اللہ	۱	اربعون حدیثاً	عربی حدیث	۲۹۷ء۲/۳۹	یہی مخطوطہ ذخیرہ فرنگی محل میں نمبر ۲۸۱/۲۴۰ کے تحت ہے
″	۲	تفسیر سورۃ الفاتحہ والبقرہ	عربیہ تفسیر	۲۹۷،۱۱۲/۳۷	شکست آمیز نستعلیق، ورق ۴۶، کاتب کریم بخش خاں
جواہر میوزیم	۱	اطیب النغم فی مدح سید العرب والعجم	عربی ادب	ج ع ۳۳۴	

کل تعداد عربی مخطوطات = ۲۷

فہرست مخطوطات (فارسی)

سیکشن	نمبر شمار	نام کتاب بشکل مخطوطہ	زبان وموضوع	نمبر کیٹلاگ	تفصیل مخطوطہ
حبیب گنج کلکشن	۱	الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ ۱۱۶۹ھ	تصوف	۲۱/۹۲	خط نستعلیق معمولی، اوراق ۴۹، سطر ۱۶، سائز ۶ء۲″×۹ء۹″۔ مجدول بہ شنگرف، عنوانات وفصل وغیرہ بخط شنگرف، کاتب محمد عاشق ملقب بہ علی بارہوی پھلتی
″	۲	سرور المحزون فی ترجمۃ نور العیون (ب ت)	سیرۃ النبیؐ	۹/۱۴	خط نستعلیق، ورق ۴۰، سطر ۱۳، سائز "۴ء۱×"۹ء۶ الفاظ مختلفہ بخط شنگرف، برسرورق مہر مربع مندرس غیر مقرو
″	۳	مجموعۂ رسائل شاہ ولی اللہ دھلوی ۱۱۹۷ھ	مجامیع	۲۴/۸	خط نستعلیق ورق ۱۶۲، سطر مختلف سائز ۶ء۵″×۸ء۸″۔ کاتب نبی بخش نظامی، مکتوب ومابعدش بخط شنگرف، اشعار عربیہ خط کشیدہ بخط شنگرف
یونیورسٹی کلکشن	۱	شرح القصیدۃ التائیۃ لابن عمر الفارض	مذہب وتصوف	۲۳۵	ورق ۱۰
″	۲	الفوز الکبیر فی اصول التفسیر (ب ت)	مذہب اصول تفسیر	۳۴۴	
″	۳	صرفِ میر منظوم	ادب وصرف	۵/۱	یونیورسٹی ضمیمہ۔ ضمیمہ (۲) عربیہ صرف کے ساتھ
″	۴	فتح الرحمٰن فی ترجمۃ القرآن	مذہب وتصوف	۲۳۸	ورق ۵۸۸
″	۵	فتح الرحمٰن فی ترجمۃ القرآن (نصف اول)	تفسیر		یونیورسٹی ضمیمہ (۶) ورق ۶۱۶

؍	۶	فتح الرحمٰن فی ترجمة القرآن (نصف ثانی) کتابت ۱۱۶۴ھ	تفسیر	۱	ضمیمہ یونیورسٹی کلکشن، نستعلیق، ورق ۲۵۸، کاتب ولایت علی
؍	۷	فتح الرحمٰن	مذہب وتصوف	۷۰	یونیورسٹی
؍	۸	الامداد فی مأثر الاجداد	مذہب وتصوف	۱۵۴	یونیورسٹی
؍	۹	الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ	مذہب وتصوف	۱۵۰	یونیورسٹی
؍	۱۰	الانسان العین فی مشائخ الحرمین	مذہب وتصوف	۱۵۶	یونیورسٹی
؍	۱۱	رسالہ در طبقات کتب احادیث واسنادان	مذہب وتصوف	۱۵۱	یونیورسٹی
؍	۱۲	شوارق المعرفة	مذہب وتصوف	۱۵۳	یونیورسٹی
؍	۱۳	العطیة الصمدیة فی الانفاس المحمدیة	مذہب وتصوف	۱۵۵	یونیورسٹی
؍	۱۴	الوضیّة فی الوصیة والنصیحة	مذہب وتصوف	۱۵۲	یونیورسٹی
سبحان اللہ کلکشن	۱	سرور المحزون فی ترجمة نور العیون	سیرت	۹۲۰/۱۴	
؍	۲	سرور المحزون فی ترجمة نور العیون کتابت ۱۱۴۸ھ	سیرت	۹۲۰/۵۰	ضمیمہ سبحان اللہ، نستعلیق، ورق ۳۲ کاتب واجد علی
؍	۳	فتح الرحمٰن (نصف اول)	تفسیر	۱۱۲ء/۲۹۷/۱۴	
؍	۴	الفوز الکبیر فی اصول التفسیر	اصول تفسیر	۱۱۳ء/۱/۲۹۷	
سلیمان کلکشن	۱	التفہیمات الالٰہیة "انتخاب"	تصوف	۱۱۸/۱۸	نستعلیق، ورق ۶۱
عبدالسلام کلکشن	۱	فتح الرحمٰن فی ترجمة القرآن	شروح وتراجم	۶۸۳/۷	

ج-ف	۱	ازالة الخفا عن خلافت الخلفاء		۸۶	
؍	۲	سرور المحزون فی ترجمة نور العیون		۱۱۹	
؍	۳	هدایت الصرف		۱۶۰	

کل فارسی مخطوطات =۲۶

چند عربی مخطوطات کا مختصر خاکہ

فہرست مخطوطات عربی میں سے چند مخطوطات کا اس ضمیمہ میں مختصراً تذکرہ کرنا بے محل نہ ہوگا۔ ان مخطوطات سے اس مقالہ کی تکمیل میں بہت مدد ملی اور اس لحاظ سے بھی انکا ذکر ضروری ہے:

(۱) البدور البازغہ: للشیخ العلامة الاجل والفهامّة الاکمل الشاہ ولی اللہ المحدث الدهلویؒ

مقالۂ ہٰذا کی تیاری میں اسی مخطوطہ سے اقتباسات لیے گئے ہیں۔ مخطوطہ کے ابتداء میں ان مسائل کا ذکر کرتے ہوئے جو اس کتاب میں بیان کیے گئے ہیں، آپ نے اس تصنیف کا خلاصہ ان الفاظ میں تحریر کیا ہے:

فاتحة

"فی مسائل من الحکمة اهمل بیانها الجمهور من اهل البرهان مما یتعلق بغرضنا فی هٰذا الکتاب. الذین امعنوا فی تفتیش الحقائق قبلنا لا یجب ان یکونوا مصیّبین فی کل ماجز موا بهٖ ولا ان یکونوا بالغین اقصیٰ غایة التفتیش فی کل مسئلة بل الواقع خطأ هم فی بعض والاکتفاء بالا جمال فی بعض والا صابة فی بعض."

(اس کتاب میں ہمارے مقصد سے متعلق مسائل حکمت ہیں جنکے بیان کو جمہور اہل عقل و برہان نے نظر انداز کر دیا ہے، جنہوں نے ہم سے پہلے ان حقائق کی تفتیش و تحقیق میں جدوجہد کی، وہ نہ تو ان معاملات میں درست ہی تھے جن پر انہوں نے کام کیا اور نہ ہی ان مسائل میں مقصد تحقیق کی آخری حد تک پہونچ پائے، بلکہ بعض اوقات ان سے غلطی ہوئی اور بعض مسائل میں انہوں نے اجمال و اختصار سے کام لیا اور بعض میں وہ مشکلات میں مبتلا ہو گئے)

گویا کہ آپ نے اس کتاب میں وہ مسائل حکمت بیان کیے ہیں جو ان سے پیشتر کسی نے اس انداز میں بیان نہیں کیے اور اگر اس کی کوشش کی تو اس میں کامیابی نہیں ملی۔ شاہ صاحب نے تین مقالات میں ان مسائل کو بیان کیا جنکی جانب آپ نے شروع ہی میں اشارہ کیا تھا۔ ان مسائل کا اگر چہ حجۃ اللہ البالغہ میں بھی ذکر کیا گیا ہے مگر وہاں اسکا مقصد اور سلسلہ کلام دوسرا تھا۔

یہ مخطوطہ لائبریری کے حبیب گنج کلکشن میں ہے۔

(۲) التفهيمات الالٰهيه : من تصنيف العالم العلّامه و الفاضل الفهامه الشيخ الكبير الشاه ولى الله المحدث الدهلوىؒ.

تفہیمات دراصل کوئی ایک تصنیف نہیں بلکہ طویل اور مختصر تفہیمات پر مبنی رسالہ جات کا مجموعہ ہے۔ اسی لیے یہ تصنیف مختلف ضخامت میں طبع ہوئی ہے۔ اسکے مخطوطہ میں تمام رسائل ایک جگہ جمع کر دیے گئے ہیں اسی وجہ سے یہ ۴۶۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ مخطوطہ میں **الرسالة الاولىٰ** سے **الرسالة الثامنة عشر** کے عنوانات سے ۱۸ رسائل ہیں۔ صفحہ اول پر **الرسالة الاولىٰ** میں **التفهيمات الالٰهيه** کے عنوان سے مقدمہ ہے جو تین صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد تفہیمات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو نمبر ا سے نمبر ۳۰۹ تک سلسلہ وار مندرج ہے اور **الرسالة السابعه** تک چلتا ہے۔ اس کے بعد جو تفہیمات ہیں ان پر کوئی نمبر نہیں ڈالا گیا۔ صرف <.....> کے نشانات کے درمیان تفہیمات درج ہیں اس کے بعد 'فى مبشرات النبى الكريم عليه الصلوٰة و التسليم' کے عنوان سے بارہ رویاء (خواب) بیان کیے گئے ہیں۔ مخطوطہ کے آخری حصہ میں عربی میں ۵ خطبات ہیں جن پر یہ مخطوطہ ختم ہوتا ہے۔ یہ مخطوطہ مجلد ہے اور اسمیں عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں تفہیمات تحریر ہیں۔ بلکہ بعض جگہ ایک ہی تفہیم میں دونوں زبانیں بیک وقت استعمال کی گئی ہیں۔ بعض تفہیمات اشعار پر مشتمل ہیں۔ چنانچہ تفہیم نمبر ۲۹۵ میں جو فارسی میں ہے عربی قصیدۂ ہمزیہ بھی شامل ہے۔ تفہیم ۳۰۴ قصیدۂ تائیہ ہے جو تیس ابیات پر مشتمل ہے۔ **الرسالة السابعه عشر** یعنی سترہویں رسالہ کا موضوع 'المقالة الوضية فى النصيحة و الوصية' ہے جو بعد میں ایک الگ کتاب کی شکل میں اسی عنوان سے شائع ہوا۔ اسکی زبان فارسی ہے اور اس میں وصیتیں یا نصیحتیں کی گئی ہیں۔

یہ مخطوطہ غیر مورخہ لیکن مکمل حالت میں حبیب گنج کلکشن میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری میں ہے۔ اگر چہ یونیورسٹی کلکشن میں بھی اسکے چند غیر مکمل اجزاء موجود ہیں۔

(۳) الدرالثمین فی مبشرات النبی الامینؐ

یہ مخطوطہ یونیورسٹی کلکشن میں ہے۔ یہ تصنیف کتاب کی شکل میں اسی عنوان سے طبع ہو چکی ہے۔ اسکے پہلے تیرہ مبشرات یا رؤیا بحالت خواب یا کشف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کی روح مبارکہ سے شاہ صاحب اور حضورؐ کے ارشادات کی شکل میں ہیں جن کو شاہ صاحب نے احادیث کا نام دیا ہے۔ اس کے بعد میں 'اخبر نی سید الوالد' کے بعد آپ کے والد شاہ عبدالرحیم کے اسی طرح کے پندرہ رؤیا یا مبشرات ہیں اور پھر دو مبشرات آپکے چچا محترم کے 'بلغنی عن سیدی العم' کے عنوان سے ہیں۔ اس کے بعد بارہ مبشرات اپنے استاد شیخ ابو طاہر مدنی، انکے والد ماجد اور دیگر بزرگوں کے سلسلۂ روایت سے درج ہیں۔ اس طرح کل ۴۰ مبشرات پر یہ مخطوطہ ختم ہوتا ہے۔ مخطوطہ کے خاتمہ پر تحریر ہے:

"وعند هذا انهت الرسالة. والحمدلله اولاً و آخراً و ظاهراً و باطناً. تمت الرساله- المسماة بالدرالثمين فی مبشرات النبی الامين. تأليف امام المحدثين رئيس المتفهمين مولانا ولی الله بن عبدالرحيم العمری الدهلوی و نقله من خط....."

کاتب کا نام اور تاریخ درج نہیں۔

(۴) الخیر الکثیر الملقبه بخزائن الحکمة

یہ مخطوطہ حبیب گنج کلکشن میں ہے۔ ابتدا میں تحریر ہے:

"للشيخ العارف الكبير المعروف بالشاه ولی الله الدهلوی وغيرها من الرسائل وجمعها للعلا مه الصوفی محمد عاشق الملقب بالعلی ابن شيخ عبيد الله البارهوی الپهلتی"

اسکا مقدمہ جو فارسی میں ہے ۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد اصل تصنیف ہے۔ آخری صفحہ پر دائیں جانب حاشیہ میں لکھا ہے:

"قدتمت الرسالة الخير الكثير نقلاً عن النسخة للنواب اکبر یار جنگ بهادر علیٰ يدالخير السيد عبدالله المدنی فی التاريخ ۲۹ شعبان ۱۳۵۱ھ ببلدة

حیدر آباد دکن."

بائیں گوشہ میں لکھا ہے۔

"تمت المقابلة علیٰ النسخة المنقولة عنها فی خامس شوال المکرم ۱۳۵۱ھ
عبدالقدوس الهاشمی."

(۵) النوادر من احادیث سید الاوائل والاواخر:

یہ مخطوطہ فرنگی محل کے ذخیرہ میں ہے۔اس تصنیف میں شاہ صاحب نے وہ نادر احادیث جمع کی ہیں جو عام طور پر کتب احادیث میں نہیں ملتیں۔اور جن کو آپ نے مسند الخضر علیه السلام و مسند المعمر سے لیا ہے۔زیادہ تر احادیث شیخ ابوطاہر مدنی کے حوالہ سے مروی ہیں۔دو احادیث خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ایک حدیث جن اور ایک حدیث مصافحہ۔'ذکر مسند الجن' کے عنوان سے جو حدیث بیان کی اس کی روایت آخر میں اس طرح ہے:

".....عن الجن انهم قالوا سمعنا القرآن من النبی صلی الله علیه وسلم"

اسی طرح حدیث مصافحہ میں ہے:

"من الجن رویناه من طریقین- صافحت اباطاهر صافح اباه ..... وهو صافح بعض الجن الذین صافحهم رسول الله صلی الله علیه وسلم۔"

اسی طرح دوسری احادیث مسائل جن کے بارے میں ہیں۔مخطوطہ کا اختتام ان الفاظ پر ہوا ہے۔

"تمت الرسالة المتبرکة المسماة بالنوادر من احادیث سید الاوائل والاواخر."

نقل کرنے والے کا نام مولانا حسن علی الہاشمی درج ہے۔اور الفاظ "تم مساء الرابع من شهر....." درج ہیں۔

(۶) اطیب النغم فی مدح سید العرب والعجم:

یہ مشہور قصیدۂ بائیہ کا مخطوطہ ہے۔قصیدہ کے ابتدائی حصہ پر بائیں گوشہ کے حاشیہ پر یہ عبارت ہے:

"هٰذه القصیدة البائیه المسمی با طیب النغم فی مدح سید العرب و العجم

المؤلفة مولانا شاه ولی الله المحدث الدهلوی العمری قدس الله سره"

قصیدہ کے اختتام پر یہ عبارت تحریر ہے:

"قال المصنف هٰذا آخر عقلناه علیٰ القصیدة و فرغناه فی ذٰلک یوم الثلٰوث الرابع والعشرین فی الربیع الثانی سنه ستة و خمسین بعد الالف والمائه فی الهجرة. والحمدلله رب العالمین. وکان الفراغ فی نقله یوم السبت التاسع فی جمادی الثانی عام الف ومأتین ستة و تسعین فی النسخة التی نقلت یوم الجمعة الفره فی الجمادی الثانی ۱۱۸۲ھ هجری بید العاصی فضل علی عفی عنه علیٰ ید احقر عباد الرحمٰن عبده احمد بن عثمان تغمده الله فی الجار الغفران و رزقه فی نعیم الجنان"

مولانا آزاد لائبریری میں شاہ صاحب کی فارسی تصانیف کے ۲۶ مخطوطات بھی موجود ہیں جن کی فہرست ضمیمہ کا جزو ہے۔ لیکن کیونکہ انکا مطالعہ ہماری تحقیق کے دائرہ کار سے باہر ہے اس لیے ان کا خاکہ پیش کرنا ضروری نہیں۔

المصادر والمراجع

المصادر والمراجع

مطبوعات

عربی

۱) القرآن المجید

۲) ابجد العلوم : نواب صدیق حسن خاں؛ المطبعة الصدیقیه، بھوپال ۱۸۷۸ء

۳) اتحاف السادة المتقین بشرح اسرار احیاء علوم الدین : مرتضیٰ بلگرامی؛ مطبعة میمنة، مصر ۱۸۸۷ء/۱۳۰۶ھ

۴) الارشاد الیٰ مهمات علم الاسناد : شاه ولی الله محدث دهلوی؛ سجاد پبلشرز، لاهور ۱۹۶۰ء

۵) اطیب النغم فی مدح سید العرب والعجم والقصیدة الهمزیة : شاه ولی الله محدث دهلوی؛ مطبع مجتبائی دهلی: ۱۸۹۰ء/۱۳۰۸ھ

۶) الانصاف فی بیان سبب الاختلاف : شاه ولی الله محدث دهلوی مع ترجمه کشاف (مترجم) محمد احسن صدیقی نانوتوی؛ مطبع مجتبائی، دهلی ۱۸۹۱ء

۷) البلاغ المبین فی احکام رب العالمین و اتباع خاتم النبیین: شاه ولی الله، محدث دهلوی؛ المکتبه السلفیه، لاهور، ۱۹۶۲ء/۱۳۸۱ھ

۸) البدور البازغة: شاه ولی الله دهلوی؛ سلسلة مطبوعات المجلس العلمی ۱۹۳۵ء/۱۳۵۴ھ

۹) تاریخ آداب اللغة العربیة : جرجی زیدان؛ دار المکتبه، بیروت ۱۹۶۷ء

۱۰) تأویل الاحادیث فی رموز قصص الانبیاء : شاه ولی الله محدث دهلوی؛ مطبع احمدی، دهلی (ب ت)

۱۱) التفهیمات الالٰهیة : شاه ولی الله محدث دهلوی؛ سلسلۂ مطبوعات المجلس العلمی، بجنور ۱۹۳۶ء/۱۳۵۵ھ

۱۲) الثقافة الاسلامیة فی الهند : سید عبدالحیٔ الحسنی؛ مطبوعات المجمع العلمی العربی، دمشق ۱۹۵۸ء

۱۳) الجامع الترمذی مع تقریر شیخ الهند؛ کتب خانه رشیدیه، دهلی (ب ت)

۱۴) حجة الله البالغه : شاه ولی الله محدث دهلوی؛ حمایت اسلام پریس، لاهور ۱۸۶۹ء/۱۲۸۶ھ

۱۵) الحطة فی ذکر الصحاح الستة : صدیق حسن خاں؛ مطبع نظامی کانپور ۱۲۸۳ھ

۱۶) الخیر الکثیر : شاه ولی الله دهلوی؛ سلسله مطبوعات المجلس العلمی، بجنور ۱۹۳۳ء/۱۳۵۲ھ

۱۷) الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین : شاه ولی الله دهلوی؛ کتب خانه علویه رضویه، لائل پور ۱۹۶۶ء/۱۳۸۶ھ

۱۸) دیوان المتنبی : ابو طیب احمد بن الحسین المتنبی؛ مطبعة الهندیة بالموسکی، مصر ۱۹۲۳ء/۱۳۴۲ھ

۱۹) رساله شرح تراجم ابواب صحیح البخاری : شاه ولی الله دهلوی؛ دائرة المعارف العثمانیه، حیدرآباد ۱۹۴۹ء

۲۰) سبحةالمرجان فی آثار هندوستان: غلام علی آزاد بلگرامی (تحقیق) فضل الرحمان ندوی؛ معهد دراسات الاسلامیه، علیگڑه ۱۹۷۶ء، بمبئی ۱۸۸۵ء

۲۱) شرح دیوان المتنبی : الواحدی؛ مطبعة مدینه، برلن ۱۸۶۱ء

۲۲) الصحیح البخاری للامام ابی عبدالله محمد بن اسماعیل البخاری: دارالفکر للطباعة والنشرو التوریع، استانبول (ب ت)

۲۳) الصحیح المسلم للامام مسلم بن الحجاج مسلم القشیری بشرح النووی للامام یحیٰی (تحقیق) عبدالله ابوزینة: مطبعة الشعب، قاهره (ب ت)

۲۴) العقد الجید فی احکام الاجتهاد والتقلید: شاه ولی الله دهلوی؛ مطبع مجتبائی، دهلی ۱۹۲۵ء/ ۱۳۴۴ھ

۲۵) فی الادب الجاهلی : طٰہٰ حسین المصری؛ دارالمعارف للطباعة والنشر، مصر ۱۹۵۸ء

۲۶) فیروز اللغات (لغت عربی اردو)۔ناشرین جے ایس سنت سنگھ اینڈ سنز، دہلی (ب ت)

۲۷) القول الجمیل فی بیان سواء السبیل: شاه ولی الله دهلوی؛ شاه ولی الله اکادمی، لاهور (ب ت)

۲۸) مشکوٰة المصابیح (تحقیق) محمد ناصر الدین البانی؛ المکتب الاسلامی للطباعة والنشر، دمشق ۱۹۶۱ء

۲۹) المنجد (معجم اللغة العربیة) : لویس معلوف الیسوعی؛ المطبعة الکاثو لیکیة، بیروت ۱۹۵۴ء

۳۰) نزهة الخواطر وبهجة المسامع والنواظر : شریف عبدالحیٔ بن فخرالدین حسنی؛ دائرة المعارف العثمانیه، حیدرآباد ۱۹۷۸ء

۳۱) النقدالادبی : احمد امین؛ مطبعة لجنة التألیف و الترجمه والنشر، قاهره ۱۹۵۲ء/ ۱۳۷۱ھ

۳۲) الیانع الجنی فی اسانید الشیخ عبدالغنی: محمد محسن بن یحییٰ الترهتی ۱۸۷۰ء/ ۱۲۸۷ھ

فارسی

۱) اتحاف النبلاء فی تراجم الکملاء: نواب صدیق حسن خاں؛ نظامی پریس، کانپور ۱۸۷۲ء/ ۱۲۸۹ھ

۲) اتحاف النبیہ (انتباہ کے بقیہ دو ابواب): شاہ ولی اللہ دہلوی؛ مکتبہ سلفیہ، لاہور ۱۹۶۹ء

۳) الامداد فی مآثر الاجداد (مع انفاس العارفین): شاہ ولی اللہ دہلوی (ب ت)

۴) الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ: شاہ ولی اللہ دہلوی؛ مطبع احمدی دہلی ۱۸۹۴ء/ ۱۳۱۱ھ

۵) انفاس العارفین: شاہ ولی اللہ دہلوی؛ مطبع احمدی، دہلی (ب ت)

۶) تذکرہ علماء ہند: مولوی رحمان علی؛ مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ ۱۹۱۴ء

۷) الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف: شاہ ولی اللہ دہلوی؛ مطبع احمدی، دہلی (ب ت)

۸) سیر المتاخرین: مولوی غلام حسین طباطبائی؛ مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ ۱۸۹۸ء

۹) کلمات طیبات (مرتب) حافظ محمد علی مرادآبادی؛ مطبع مطلع العلوم، مرادآباد ۱۸۹۰ء/ ۱۳۰۸ھ

۱۰) المقالۃ الوضیۃ فی الوصیۃ والنصیحۃ: شاہ ولی اللہ دہلوی؛ شاہ ولی اللہ اکادمی، حیدرآباد (سندھ) ۱۹۶۴ء

۱۱) مقدمہ فتح الرحمٰن: شاہ ولی اللہ دہلوی (ب ت)

اردو

۱) اردو شرح حجۃ اللہ البالغۃ: عبید اللہ سندھی؛ مکتبہ بیت الحکمۃ لاہور ۱۹۵۰ء

۲) ارمغان شاہ ولی اللہ دہلوی: پروفیسر محمد سرور؛ سندھ ساگر اکادمی، لاہور ۱۹۹۷ء

۳) اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ: ڈاکٹر محمد مظہر بقا؛ بقا پبلیکیشنز، کراچی ۱۹۸۶ء

۴) افادات حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی: صدر الدین اصلاحی؛ ولی اللہ اکادمی، لاہور ۱۹۴۴ء

۵) افکار شاہ ولی اللہ: قاضی جاوید؛ ادارۂ ثقافت، لاہور ۱۹۷۷ء

۶) الامام ولی اللہ محدث دہلوی: عبد القیوم مظاہری؛ ادارۂ معارف ملی، کانپور ۱۹۶۷ء

۷) امام ولی اللہ دہلوی کی حکمت کا اجمالی تعارف: مولانا عبید اللہ سندھی؛ مکتبہ الفرقان، بریلی (ب ت)

۸) انفاس العارفین: شاہ ولی اللہ دہلوی (مترجم) محمد فاروق القادری؛ مکتبہ الفلاح، دیوبند (ب ت)

۹) البدور البازغۃ: شاہ ولی اللہ دہلوی (مترجم) قاضی مجیب الرحمٰن؛ ادارۂ مطبوعات، لاہور ۲۰۰۰ء

۱۰) البلاغت: (مرتب) سید محمد غیاث الدین مظاہری؛ مکتبہ عزیزیہ، الہ آباد ۱۹۸۷ء

۱۱) تاریخ ادب عربی: مقتدیٰ حسن ازہری؛ مرکزی دار العلوم، بنارس ۱۹۷۵ء

۱۲) تاریخ ادب عربی: استاد احمد حسن زیات (تلخیص) سید طفیل احمد مدنی (مترجم) عبد الرحمٰن طاہر سورتی؛ ایوان کمپنی، الہ آباد ۱۹۸۵ء/ ۱۴۰۵ھ

۱۳) تاریخ دعوت وعزیمت (جلد پنجم): سید ابوالحسن علی ندوی؛ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ ۱۹۸۴ء

۱۴) تاریخ مسلمان پاک وبھارت: ہاشمی فرید آبادی؛ انجمن ترقی اردو، پاکستان ۱۹۵۳ء

۱۵) تاریخ مشائخ چشت: خلیق احمد نظامی؛ سلسلہ ندوۃ المصنفین، دہلی ۱۹۵۳ء/۱۳۷۲ھ

۱۶) تاریخ ہند؛ خدا بخش لائبریری، پٹنہ (رسالہ زمانہ کانپور ۱۹۱۲ کا انتخاب)؛ لبرٹی پریس، دہلی ۱۹۹۳ء

۱۷) تاریخ ہند (اردو ترجمہ) ماؤنٹ الفنسٹن؛ انجمن ترقی اردو، علی گڑھ ۱۸۶۷ء

۱۸) تاریخ ہندوستان: مولوی ذکاء اللہ دہلوی؛ مطبع انسٹی ٹیوٹ، علی گڑھ ۱۹۱۹ء

۱۹) تذکرہ: مولانا ابوالکلام آزاد (مرتبہ) مالک رام؛ ساہتیہ اکادمی نئی دلّی ۱۹۶۸ء

۲۰) تذکرہ اہل دہلی: سر سید احمد خاں؛ انجمن ترقی اردو، کراچی ۱۹۵۵ء

۲۱) تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ: مناظر احسن گیلانی؛ نفیس اکیڈمی، کراچی ۱۹۵۹ء

۲۲) تذکرہ علماء ہند: رحمان علی (مترجم) محمد ایوب قادری؛ آفسیٹ پریس، کراچی ۱۹۶۱ء

۲۳) تراجم علمائے حدیث ہند: ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی؛ سید برقی پریس، دہلی ۱۹۳۷ء

۲۴) ترجمہ القرآن: مولانا اشرف علی تھانوی؛ تاج کمپنی لمیٹیڈ، لاہور، کراچی (ب ت)

۲۵) ترجمہ منظوم ومنثور قصیدہ اطیب النغم وقصیدہ ہمزیہ مع ترجمہ شرح مصنف از فارسی: (مترجم) دوست محمد اجمیری: تاریخ ترجمہ در نظم ۶ ربیع الثانی ۱۳۳۴ھ (ب ت)

۲۶) تعلیمات مولانا عبید اللہ سندھی: پروفیسر محمد سرور؛ سندھ ساگر اکیڈمی، لاہور ۱۹۵۵ء

۲۷) تقویم ہجری وعیسوی: ابونصر محمد خالد؛ انجمن ترقی اردو، دہلی ۱۹۷۷ء

۲۸) حجۃ اللہ البالغہ - ایک تجزیاتی مطالعہ (مرتب) پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی؛ ادارہ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ ۲۰۰۲ء

۲۹) حدائق الحنفیہ: فقیر محمد جلیمی؛ مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ ۱۹۳۰ء

۳۰) حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی قرآنی فکر کا مطالعہ: محمد سعود عالم قاسمی؛ اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی ۱۹۹۴ء

۳۱) حیات طیبہ: مرزا حیرت دہلوی؛ مکتبۃ السلام، لاہور ۱۹۵۸ء

۳۲) حیات ولی: رحیم بخش دہلوی؛ افضل المطابع، دہلی (ب ت)

۳۳) دائرۃ المعارف اسلامیہ (اردو)؛ دانش گاہ پنجاب، لاہور ۱۹۸۹ء

۳۴) رود کوثر: شیخ محمد اکرام؛ تاج پرنٹرز، کراچی ۱۹۸۷ء

۳۵) سلک مروارید ترجمہ العقد الجید (مترجم) محمد احسن صدیقی نانوتوی؛ مطبع مجتبائی، دہلی ۱۹۲۵ء/۱۳۴۴ھ

۳۶) شاہ کار اسلامی انسائیکلوپیڈیا: قاسم محمود؛ انٹرنیشنل پریس، کراچی ۱۹۸۴ء

۳۷) شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان: حکیم محمود احمد برکاتی؛ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی ۱۹۹۲ء

۳۸) شاہ ولی اللہ اور انکی سیاسی تحریک: مولانا عبید اللہ سندھی؛ سندھ ساگر اکادمی، لاہور ۱۹۵۲ء

۳۹) شاہ ولی اللہ اور قرآن وحدیث: مولانا عبید اللہ سندھی؛ ادارۂ طلوع اسلام، دہلی (ب ت)

۴۰) شاہ ولی اللہ اور انکا فلسفہ: مولانا عبید اللہ سندھی؛ سندھ ساگر اکادمی، لاہور ۱۹۴۴ء

۴۱) شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات: (مرتب) پروفیسر خلیق احمد نظامی؛ سلسلۂ تصانیف مشائخ، علیگڑھ ۱۹۵۰ء

۴۲) شاہ ولی اللہ کے عمرانی نظریے: شمس الرحمٰن محسنی؛ سندھ ساگر اکادمی، لاہور ۱۹۹۹ء

۴۳) شموس اللہ البازغہ ترجمہ حجۃ اللہ البالغہ؛ حمایت اسلام پریس، لاہور ۱۹۰۵ء/۱۳۲۳ھ

۴۴) عربی ادبیات میں پاک وہند کا حصہ: ڈاکٹر زبید احمد۔ (مترجم) شاہد حسین رزاقی؛ ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور ۱۹۸۷ء

۴۵) عربی ادب میں ہندوستان کا حصہ: شمس تبریز خاں؛ نظامی پریس، لکھنؤ ۱۹۸۹ء

۴۶) عربی تنقید مطالعہ اور جائزہ: ڈاکٹر محمد اقبال حسین ندوی؛ سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انگلش اینڈ فارن لینگویجز، حیدرآباد ۱۹۹۱ء

۴۷) علم حدیث میں برعظیم پاک وہند کا حصہ: ڈاکٹر محمد اسحاق (مترجم) شاہد حسین رزاقی؛ مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی ۱۹۸۳ء

۴۸) علم الکلام: شبلی نعمانی؛ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ ۱۹۹۳ء

۴۹) علمائے ہند کا شاندار ماضی: محمد میاں؛ مکتبہ برہان جامع مسجد، دہلی ۱۹۶۳ء

۵۰) الفرقان (شاہ ولی اللہ نمبر، بشکل کتاب) مرتبہ محمد منظور نعمانی، بریلی ۱۹۴۱ء

۵۱) قاموس المشاہیر: نظامی بدایونی؛ نظامی پریس، بدایوں ۱۹۲۴ء

۵۲) القول الجلی فی ذکر آثار الولی: شاہ محمد عاشق پھلتی (مترجم وشارح) مولوی حافظ تقی انور علوی کاکوروی؛ کامرشیل پرنٹرس کھدرا، لکھنؤ ۱۹۹۷ء

۵۳) مآثر الکرام: غلام علی آزاد بلگرامی (مترجم) شاہ خالد میاں فاخری؛ آفسٹ پریس، کراچی ۱۹۸۳ء

۵۴) مجموعہ وصایا اربعہ ترجمہ المقالۃ الوضیہ (مترجم) محمد ایوب قادری؛ شاہ ولی اللہ اکیڈمی، حیدرآباد ۱۹۶۴ء

۵۵) مرآۃ السلاطین ترجمہ سیر المتأخرین (مترجم) گوکل پرشاد؛ مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ ۱۸۹۸ء

۵۶) مرتضیٰ زبیدی بلگرامی - حیات اور علمی کارنامے: ڈاکٹر رخسانہ نکہت لاری؛ آفسٹ پرنٹرز، دہلی ۱۹۹۰ء

۵۷) مسلم ثقافت ہندوستان میں: عبدالمجید سالک؛ ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور (ب ت)

۵۸) مشاہدات و معارف ترجمہ فیوض الحرمین مترجم پروفیسر محمد سرور؛ سندھ ساگر اکیڈمی، لاہور ۱۹۴۷ء

۵۹) مقالات شبلی: شبلی نعمانی؛ مطبع معارف، اعظم گڑھ ۱۹۵۵ء

۶۰) مقالات طریقت: عبدالرحیم ضیاء؛ مطبع متین کرتان، حیدرآباد (دکن) ۱۸۷۵ء/۱۲۹۲ھ

۶۱) ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ: ثروت صولت؛ مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی ۱۹۸۴ء

۶۲) ملفوظات شاہ عبدالعزیز (مترجم) مولوی محمد علی لطفی و مفتی انتظام اللہ شہابی؛ پاکستان ایجوکیشنل پبلشرز لمیٹڈ، کراچی ۱۹۶۰ء

۶۳) ملفوظات و حالات شاہ فخر الدین دہلوی: (مترجم و مرتب) میر نذر علی درد کاکوروی؛ سلمان اکیڈمی، نیو کراچی ہاؤسنگ سوسائٹی، کراچی ۱۹۶۱ء

۶۴) نادر مکتوبات شاہ ولی اللہ دہلوی: مترجم مولانا نسیم احمد فریدی؛ شاہ ولی اللہ اکیڈمی، پھلت مظفر نگر ۱۹۹۸ء

۶۵) نقش حیات: سید حسین احمد مدنی؛ دلّی پرنٹنگ ورکس، دہلی ۱۹۵۳ء

۶۶) ہندوستان میں اسلامی علوم و ادبیات: (مرتب) عماد الحسن آزاد فاروقی؛ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۱۹۸۶ء

۶۷) ہندوستانی مسلمان: سید ابوالحسن علی ندوی؛ تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ ۱۹۶۱ء

۶۸) ہندوستانی مفسرین اور انکی عربی تفسیریں: ڈاکٹر محمد سالم قدوائی؛ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی ۱۹۷۳ء

رسائل و جرائد

۱) الرحیم (حیدرآباد، سندھ) مئی ۱۹۶۵ء

۲) معارف (اعظم گڑھ) ۲/۹۱ فروری ۱۹۲۷ء

۳) ایضاً ۳/۶۵ مارچ ۱۹۵۰ء

انگریزی

1) A Journey From Bengal to England : George Foster ; Munshiram Manoharlal Publishers Private Limited, New Delhi 1977

2) History of Aurangzeb : Jadunath Sarkar; Orient Longman Limited, Bombay 1973

3) Life of Shah Waliyullah : G. N. Jalbani ; Idarah -i- Adbiyat-i Delli, Delhi 1980

4) Religion and Thought of Shah Wali Allah Dihlavi 1703-1762 : J. M. S. Baljon ; E.J. Brill, Leiden, The Neitherlands 1986

5) Rise of Peshwas : H. N. Sinha; The Indian Press (Publications) Limited, Allahabad 1954

6) Shah Wali Allah-A Saint Scholar of Muslim India : A. D. Muztar ; National Commission on Historical and Cultural Research, Islamabad 1979

7) Shah Wali Allah And His Times : Saiyid Athar Abbas Rizvi ; Ma'rifat Publishing House, Canberra, Australia 1980

8) Teachings of Hazrat Shah Waliyullh Muhaddis Dehlavi : (Translation) G.N. Jalbani; Kitab Bhavan, New Delhi 1988

9) The Fall of the Mughal Empire : J.N. Sarkar ; Orient Longman Limited, Calcutta

10) The Later Mughals : W. Irvin ; M. C. Sarkar and Sons, Calcutta

11) The Oxford Encyclopedia of the Modern Islamic World ; Oxford University Press, New York 1995

Articles :

1) Shah Waliullah of Delhi : Prof. K.A. Nizami, Article No. 198/B

2) The Political Role of Shaikh Sirhindi and Shah Waliullah : Prof Irfan M. Habib, Article No. 289/B

مخطوطات

عربی

۱	الاربعون	یونیورسٹی کلکشن۔مولانا آزادلائبریری مسلم یونیورسٹی علیگڑھ	
۲	الارشاد الیٰ مهمات علم الاسناد	حبیب گنج کلکشن	ایضاً
۳	اطیب النغم	جواہر میوزیم	ایضاً
۴	الانصاف فی بیان سبب الاختلاف	یونیورسٹی کلکشن	ایضاً
۵	البدور البازغة	حبیب گنج کلکشن	ایضاً
۶	تفسیر سورة الفاتحه والبقره	ضمیمہ سبحان اللہ	ایضاً
۷	التفهیمات الالٰهیه	حبیب گنج کلکشن	ایضاً
۸	حسن العقیده	یونیورسٹی کلکشن	ایضاً
۹	الخیر الکثیر	حبیب گنج کلکشن	ایضاً
۱۰	الدر الثمین	یونیورسٹی کلکشن	ایضاً
۱۱	الدیوان العربی شاه ولی الله (مرتبه شاه عبدالعزیز)	ندوۃ العلماء (نمبر عبدالحیٰ ۵۳) لکھنؤ	
۱۲	الرسالة فی الکتب الاحادیث والصحیح البخاری	یونیورسٹی کلکشن۔مولانا آزادلائبریری مسلم یونیورسٹی علیگڑھ	
۱۳	رساله وحدة الوجود	ایضاً	ایضاً
۱۴	عقائد ولی الله	ایضاً	ایضاً
۱۵	العقد الجید فی احکام الاجتهاد و التقلید	ایضاً	ایضاً
۱۶	الفتح الخبیر (رسالہ الفوز الکبیر فارسی: باب پنجم)	ایضاً	ایضاً
۱۷	القول الجمیل	ایضاً	ایضاً
۱۸	المقدمة فی علم الحدیث والصحیح البخاری	ایضاً	ایضاً
۱۹	النوادر من احادیث سید الاوائل والاواخر	ذخیرہ فرنگی محل	ایضاً

فارسی

۱	ازالۃ الخفاء عن خلافت الخلفاء	ج۔ف۔مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علیگڑھ	
۲	الامداد فی مآثر الاجداد	یونیورسٹی کلکشن	ایضاً
۳	الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ	حبیب گنج کلکشن	ایضاً
۴	الانسان العین فی مشائخ الحرمین	یونیورسٹی کلکشن	ایضاً
۵	تفسیر عزیزیہ (شاہ عبدالعزیز دہلوی)	سر سلیمان شاہ کلکشن	ایضاً
۶	رسالہ در طبقات کتب احادیث واسنادان	یونیورسٹی کلکشن	ایضاً
۷	سرور المحزون فی ترجمہ نور العیون	حبیب گنج کلکشن	ایضاً
۸	شرح القصیدہ التائیہ (لابن عمر الفارض)	یونیورسٹی کلکشن	ایضاً
۹	شوارق المعرفہ	یونیورسٹی کلکشن	ایضاً
۱۰	صرف میر منظوم	یونیورسٹی کلکشن	ایضاً
۱۱	العطیہ الصمدیہ فی انفاس المحمدیہ	یونیورسٹی کلکشن	ایضاً
۱۲	فتح الرحمٰن فی ترجمہ القرآن	یونیورسٹی کلکشن	ایضاً
۱۳	الفوز الکبیر فی اصول التفسیر	یونیورسٹی کلکشن	ایضاً
۱۴	مجموعہ رسائل شاہ ولی اللہ دہلوی ۱۱۹۷ھ	حبیب گنج کلکشن	ایضاً
۱۵	مناقب فخریہ: (کاتب غازی الدین محمد) ۱۲۸۴ھ	حبیب گنج کلکشن	ایضاً
۱۶	الوضیہ فی الوصیہ والنصیحہ	یونیورسٹی کلکشن	ایضاً
۱۷	ہدایت الصرف	ج۔ف۔	ایضاً

نوٹ: تمام مخطوطات (علاوہ ان مخطوطات کے جنکے آگے بریکٹ میں انکے مصنف، کاتب یا مرتب کا نام ہے) شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تصنیفات کے ہیں۔

SHAH WALI ULLAH DEHLAVI :

HIS CONTRIBUTION TO ARABIC LANGUAGE AND LITERATURE

THESIS

SUBMITTED FOR THE AWARD OF THE DEGREE OF

Doctor of Philosophy

IN

ARABIC

BY

SALMA SHERWANI

UNDER THE SUPERVISION OF

DR. MASOOD ANWAR ALAVI

DEPARTMENT OF ARABIC
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH (INDIA)

2002